روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سورۃ یونس مکمل
سورۃ ھود مکمل
سورۃ یوسف مکمل

جلد ۱۰

افادات

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دام مجدہم
خطیب جامع مسجد نور
گوجرانوالہ، پاکستان

طبع بارہ

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

نام کتاب: معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ یونس، ہود، یوسف مکمل)

افادات: حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ۔

مرتب: الحاج لعل دین ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت: پانچ سو (۵۰۰)

سرورق: سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ

کتابت: محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ

ناشر: مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت: ۲۶۰/- دو سو ساٹھ روپے

تاریخ طبع گیارہ .... اپریل 2008 بمطابق ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ دروس القرآن محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ

(۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور

(۳) مکتبہ قاسمیہ الفضل مارکیٹ لاہور

(۴) مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور

(۵) کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

(۶) کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۷) مکتبہ حنفیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۲ کراچی

(۸) اسلامیہ کتب خانہ اڈا کاکول ایبٹ آباد

(۹) مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

(۱۰) مکتبۃ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ یونس تا یوسف مکمل) جلد ۱۰

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
پیش لفظ	۲۳	استوی علی العرش	۴۰
سورۃ یونس	۲۵	شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ	"
درس اوّل آیت ۱ تا ۲	۲۶	تدبیر امر	۴۲
آیات و ترجمہ	"	مسئلہ شفاعت	۴۳
نام اور کوائف	"	عبادت الٰہی	۴۴
مضامین سورۃ	۲۷	وقوع قیامت	۴۵
حروف مقطعات	۲۸	کفار کا انجام	۴۶
شاہ ولی اللہؒ کا نظریہ	۲۹	درس سوم ۳ (آیت ۵ تا ۱۰)	۴۷
حرفِ آخر	"	آیات و ترجمہ	"
محکمات اور متشابہات	۳۰	ربطِ آیات	۴۸
کتاب حکیم	۳۱	سورج اور چاند	"
معیار رسالت	۳۲	چاند اور سورج کے مدار	۵۰
مرد و زن کا دائرہ کار	۳۳	نشاناتِ قدرت	۵۲
نبی کے فرائض منصبی	۳۴	معاد پر ایمان	۵۳
کفار کی الزام تراشی	۳۵	دنیا اور آخرت کا تقابل	۵۴
درس دوم ۲ (آیت ۳ تا ۴)	۳۷	اہل ایمان کے لیے انعامات	۵۵
آیات و ترجمہ	"	اہل جنت کی تسبیحات	"
ربط آیات	۳۸	سلامتی کے نغمے	۵۶
صفت ربوبیت	۳۹	درس چہارم ۴ (آیت ۱۱ تا ۱۴)	۵۸

آیات و ترجمہ	۵۸	توحید اور شرک	۸۲
ربط آیات	۵۹	انتہائی تعظیم شرک ہے	۸۴
جلد بازی کا نتیجہ	،،	قبروں کی تعظیم	۸۵
بد دعا کی ممانعت	۶۱	غیر اللہ کی نذر و نیاز	۸۶
قانون امہال و تدریج	،،	قبر پرستی	۸۷
شرک پر اصرار	۶۲	مسئلہ شفاعت	۸۸
مسرفین سے شکوہ	۶۴	شرک کی ابتداء	۹۰
سابقہ اقوام کی ہلاکت		معجزات کی فرمائش	۹۱
موجودہ قوم کی آزمائش	۶۵	درس ہفتم ۷ (آیت ۲۱ تا ۲۳)	۹۴
دنیا اور عورت کا فتنہ	۶۶	آیات و ترجمہ	،،
حکومت بطور امانت	۶۷	ربط آیات	۹۵
درس پنجم ۵ (آیت ۱۵ تا ۱۷)	۶۹	تکلیف کے بعد راحت	۹۶
آیات و ترجمہ	،،	مشرکین کی حیلہ سازی	۹۷
ربط آیات	۷۰	بحر و بر کا سفر	۹۹
آیات بینات	،،	سمندری سفر اور طوفان	
معاودت سے انکار	۷۱	نجات کے بعد بغاوت	۱۰۲
قرآن میں ترمیم کی خواہش	۷۲	سرکشی کا وبال	۱۰۳
قرآنی قانون کا نفاذ	۷۵	درس ہشتم ۸ (آیت ۲۴ تا ۲۷)	۱۰۵
حیات پیغمبر بطور دلیل	۷۷	آیات و ترجمہ	،،
بڑا ظالم	۷۹	انسانی زندگی کی مثال	۱۰۶
درس ششم ۶ (آیت ۱۸ تا ۲۰)	۸۱	قدرتی آفات	۱۰۹
آیات و ترجمہ	،	دار السلام کی طرف دعوت	۱۱۰
ربط آیات	۸۲	اصحاب الجنۃ	۱۱۱

اصحاب النار ۱۱۱
معرفت الٰہی ۱۱۲
درس نہم ۹ (آیت ۲۸ تا ۳۰) ۱۱۴
آیات وترجمہ "
میدانِ حشر "
مشرکین کے لیے پابندی ۱۱۶
عابد اور معبود میں تفریق "
ہر نفس کا محاسبہ ۱۱۹
مشرکین کی مایوسی ۱۲۰
درس دہم ۱۰ (آیت ۳۱ تا ۳۳) ۱۲۲
آیات وترجمہ "
ربط آیات "
روزی رساں ذات ۱۲۳
سماعت اور بینائی ۱۲۴
اعضائے انسانی کی حکمت "
کان کی ساخت ۱۲۵
آنکھوں کی ساخت ۱۲۶
کان اور آنکھ بلحاظ فضیلت ۱۲۷
زندہ اور مردہ کا خالق ۱۲۹
فسق ذریعہ محرومی ۱۳۱
درس یازدہم ۱۱ (آیت ۳۴ تا ۳۶) ۱۳۲
آیت وترجمہ "
ربط آیات ۱۳۳
ابتدائی تخلیق اور اعادہ ۱۳۳
راہنمائی بطرف حق ۱۳۵
راہنمائی کی ضرورت ۱۳۶
اتباع الظن ۱۳۹
اچھا گمان ۱۴۰
درس دوازدہم ۱۲ (آیت ۳۷ تا ۴۰) ۱۴۲
آیات وترجمہ "
ربط آیات ۱۴۳
قرآن کی حقانیت "
تفصیل الاحکام ۱۴۴
شک سے پاک کلام ۱۴۶
مثال لانے کا چیلنج ۱۴۷
بلاوجہ تکذیب ۱۴۸
ایماندار اور کافر ۱۴۹
درس سیزدہم ۱۲ (آیت ۴۱ تا ۴۵) ۱۵۱
آیات وترجمہ "
ربط آیات ۱۵۲
تکذیب رسالت "
ظاہری اور باطنی سماعت ۱۵۴
دل کے اندھے "
مستشرقین کی ریشہ دوانیاں ۱۵۵
خود فریبی "
عرصہ زندگی ۱۵۶

خدا کے حضور پیشی	١٥٧	(١) موعظت	١٧٦
انکارِ معاد	″	(٢) شفا	″
درس چہاردہم ١٤ (آیت ٤٦ تا ٥٢)	١٥٩	(٣) ہدایت	١٧٧
آیات و ترجمہ	″	(٤) رحمت	١٧٨
ربطِ آیات	١٦٠	فضل و رحمتِ خداوندی	١٧٩
بعض وعید کا اظہار	١٦١	درس ہفدہم ١٧ (آیت ٥٩ تا ٦٠)	١٨١
خدا کے ہاں حاضری		″ آیات و ترجمہ	
ہر امت کے لیے رسول	١٦٢	ربطِ آیات	″
عذاب کی فرمائش	١٦٣	نزولِ رزق	١٨٢
ایک مقررہ وقت	١٦٤	خود ساختہ حلت و حرمت	١٨٣
عذاب کی اچانک آمد	١٦٥	نعمت کی ناشکری	١٨٤
ٹھیک ٹھیک بدلہ	١٦٦	حلت و حرمت کا اختیار	١٨٥
درس پانزدہم ١٥ (آیت ٥٤ تا ٥٦)	١٦٨	اللہ پر افتراء	١٨٧
آیات و ترجمہ	″	درس ہژدہم ١٨ (آیت ٦١ تا ٦٦)	١٨٨
ربطِ آیات	″	آیات و ترجمہ	″
ظلم کا فدیہ	١٦٩	ربطِ آیات	١٨٩
بعد از وقت ندامت	١٧١	نظرِ خداوندی	
حق کا فیصلہ	١٧٢	علمِ خداوندی	١٩١
مادی اور حقیقی ملکیت	″	اولیاء اللہ کے مناقب	١٩٢
زندگی و موت	١٧٣	ولایت کا غلط تصور	١٩٣
درس شش ہم ١٦ (آیت ٥٧ تا ٥٨)	١٧٥	ولی کی پہچان	١٩٤
آیات و ترجمہ	″	اولیاء اللہ کے لیے بشارت	١٩٦
ربطِ آیات	″	پیغمبر اسلام کے لیے تسلی	″

گمان کی پیروی	۱۹۷	قوم کا تکبر	۲۱۸
درس نوزدہم ۱۹ (آیت ۶۷ تا ۷۰)	۱۹۹	حق کا انکار	۲۲۰
آیات وترجمہ	″	جادو کی خباثت	۲۲۱
ربط آیات	۲۰۰	جادوگروں کی ناکامی	۲۲۲
رات اور دن بطور دلیل	″	حصول اقتدار کا طعن	″
رات کے فائدے	۲۰۱	آباؤ اجداد کی تقلید	۲۲۳
سکون کی ضرورت	۲۰۲	جادوگروں کا اجتماع	″
نشانات قدرت	۲۰۳	حق کا بول بالا	۲۲۶
عقیدہ ابن اللہ	۲۰۴	درس بست و دو ۲۲ (آیت ۸۳ تا ۸۷)	۲۲۷
خدا کے حضور پیشی	۲۰۶	آیات وترجمہ	″
درس بستم ۲۰ (آیت ۷۱ تا ۷۴)	۲۰۸	ربط آیات	۲۲۸
آیات وترجمہ	″	چند اہل ایمان افراد	″
ربط آیات	۲۰۹	چند بنی اسرائیل نوجوان	۲۲۹
حضرت نوح علیہ السلام کا وعظ	۲۱۰	فرعون کے مظالم	۲۳۰
توکل علی اللہ	۲۱۱	خدا پر بھروسہ	۲۳۱
کفار کو چیلنج	۲۱۲	اہل ایمان کی آزمائش	۲۳۲
بے لوث خدمت	۲۱۳	قوم موسیٰ علیہ السلام کو علیحدگی کا حکم	۲۳۳
مکذبین کی غرقابی	″	گھروں میں نماز کا حکم	″
مسلسل تکذیب	۲۱۴	مسجد کے آداب	۲۳۴
درس بست و یک ۲۱ (آیت ۷۵ تا ۸۲)	۲۱۶	نماز کی تلقین	۲۳۵
آیات وترجمہ	″	درس بست و سہ ۲۳ (آیت ۸۸ تا ۸۹)	۲۳۶
ربط آیات	۲۱۷	آیات وترجمہ	″
موسیٰ علیہ السلام کی بعثت	″	ربط آیات	″

تخلیقِ ارض و سماء	۳۲۳	آیات و ترجمہ	۳۴۷
عرش بر آب	۳۲۵	ربطِ آیات	
مقصدِ تخلیقِ کائنات	۳۲۷	واضح راستہ	۳۴۸
بعث بعد الموت	۳۲۸	لفظ شاہد کی توجیہات	۳۴۹
عذابِ الٰہی	۳۲۹	توریت کا نتیجہ	۳۵۰
درسِ چہارم ۴ (آیت ۹ تا ۱۲)	۳۳۱	تورات بطور پیشوا اور رحمت	۳۵۱
آیات و ترجمہ	״	منکرین کا انجام	۳۵۲
ربطِ آیات	۳۳۲	حق بجانب اللہ	۳۵۳
عروج کے بعد زوال	״	درسِ ہفتم ۷ (آیت ۱۸ تا ۲۴)	۳۵۵
تکلیف کے بعد راحت	۳۳۳	آیات ترجمہ	״ ۳۵۶
صبر اور عملِ صالح	۳۳۴	ربطِ آیات	۳۵۶
اہلِ ایمان کے لیے تسلی	۳۳۵	افترا علی اللہ	۳۵۷
نبی بحیثیت نذیر	۳۳۶	اللہ کے حضور پیشی	.
درسِ پنجم ۵ (آیت ۱۳ تا ۱۶)	۳۳۸	اللہ کے راستے سے روکنے والے	۳۵۸
آیات و ترجمہ	״	اسلام کے خلاف سازشیں	۳۵۹
ربطِ آیات	۳۳۹	منکرین کے لیے دُگنا عذاب	۳۶۱
قرآن بطورِ چیلنج	״	اہلِ ایمان کے لیے جنت	۳۶۲
چیلنج کی بنیاد	۳۴۱	نیک و بد کا تقابل	۳۶۳
نزول بعلم اللہ	۳۴۲	درسِ ہشتم ۸ (آیت ۲۵ تا ۲۷)	۳۶۶
معبودِ برحق	۳۴۳	آیات و ترجمہ	
دنیا کی خواہش	.	تاریخ انبیاء	.
آخرت میں محرومی	۳۴۵	زمانہ قبل از نوح علیہ السلام	۳۶۷
درسِ ششم ۶ (آیت ۱۷)	۳۴۷	نوح علیہ السلام کا دور	۳۶۸

ایام اللہ کا انتظار ۲۷۹
اہل اللہ کا تحفظ ۲۸۰
اللہ پر حق کا قیام ۲۸۱
درس بست و ہشت ۲۸ (آیت ۱۰۴ تا ۱۰۷) ۲۸۴
آیات و ترجمہ ״
ربط آیات ۲۸۵
خدائے واحد کی عبادت ۲۸۶
وفات بطور دلیل ״
ایمان پر استقامت ۲۸۷
شرک کی بیماری ۲۸۸
مافوق الاسباب استعانت ۲۸۹
شرک کا وبال ۲۹۰
خیر و شر کا اختیار ״
درس بست و نہ ۲۹ (آیت ۱۰۸ تا ۱۰۹) ۲۹۲
آیات و ترجمہ ״
حق کی آمد ״
ہدایت کا فائدہ ۲۹۳
گمراہی کا نقصان ۲۹۴
اسلام میں جبر نہیں ۲۹۵
جبر فساد کی جڑ ہے ۲۹۶
مسلمانوں میں فرقہ بندی ۲۹۷
اتباع وحی ״
صبر کی تلقین ۲۹۸

سورۃ ھود ۳۰۱
درس اوّل (آیت ۱ تا ۴) ۳۰۲
آیات و ترجمہ ״
نام اور کوائف ۳۰۳
مضامین سورۃ ״
حروف مقطعات ۳۰۴
محکم آیات ۳۰۶
اصول تفسیر ۳۰۷
عبادت خداوندی ۳۰۹
استغفار کی برکات ״
متاع حسن ۳۱۰
خوف خدا ۳۱۱
درس دوم ۲ (آیت ۵ تا ۶) ۳۱۳
آیات و ترجمہ ״
ربط آیات ״
شان نزول ۳۱۴
اللہ کا علم محیط ۳۱۵
رزق کی ذمہ داری ۳۱۶
مستقر اور مستودع ۳۲۰
کتاب مبین ۳۲۱
درس سوم ۳ (آیت ۷ تا ۸) ۳۲۲
آیات و ترجمہ ״
ربط آیات ״

گمراہی بسبب زینت اور مال	۲۳۷
جائز اور ناجائز زینت	۲۳۹
موسیٰ علیہ السلام کی بددعا	۲۴۰
دعا کی قبولیت	۲۴۱
انبیاء اور بددعا	۲۴۲
دعا اور آمین	۲۴۳
استقامت کا حکم	۲۴۴
درس بست و چہار ۲۴ (آیت ۹۰ تا ۹۲)	۲۴۶
آیات و ترجمہ	″
ربط آیات	۲۴۷
بنی اسرائیل کی روانگی	″
فرعون کی طرف سے تعاقب	۲۴۸
بنی اسرائیل کی پریشانی	۲۴۹
فرعونیوں کی غرقابی	″
فرعون کا ایمان لانا	۲۵۰
نعش فرعون کی سلامتی	۲۵۱
فراعین مصر	۲۵۲
نشان عبرت	۲۵۳
بدن بمعنی زرہ	″
درس بست و پنج ۲۵ (آیت ۹۳ تا ۹۷)	۲۵۵
آیات و ترجمہ	″
ربط آیات	۲۵۶
بنی اسرائیل کا عروج و زوال	۲۵۶
بنی اسرائیل کی علمی خیانت	۲۵۸
قرآن کریم کی حقانیت	۲۵۹
حضور کے لیے تسلی	۲۶۲
منکرین کی ہٹ دھرمی	۲۶۳
درس بست و شش ۲۶ (آیت ۹۸)	۲۶۵
آیات و ترجمہ	″
ربط آیات	″
حضرت یونس علیہ السلام کی بعثت	۲۶۶
حضرت یونس علیہ السلام کی لغزش	۲۶۷
حضرت یونس علیہ السلام پر ابتلاء	۲۶۸
مصیبت سے نجات	۲۶۹
صحرا میں سامان زیست	۲۷۰
قوم یونس کی توبہ	۲۷۱
حضرت یونس علیہ السلام کا ازالہ فقدان	۲۷۳
درس بست و ہفت ۲۷ (آیت ۹۹ تا ۱۰۳)	۲۷۴
آیات و ترجمہ	″
ربط آیات	۲۷۵
ہدایت اور گمراہی کا قانون	″
دین میں جبر نہیں	۲۷۶
عقیدے کی نجاست	۲۷۷
عقل کا استعمال	″
مشاہدہ نشانات قدرت	۲۷۹

آغاز تبلیغ	٣٧٠	وقتِ انتقام	٣٩٦
توحید باری تعالیٰ	٣٧١	نوح علیہ السلام کو اندازِ رسانی	״
قوم کا جواب	٣٧٢	نوح علیہ السلام کی دعا	٣٩٧
بشریتِ انبیاء	٣٧٣	کشتی کی تیاری	״
انسانوں کے درجات	٣٧٤	ایمان اور اعمال صالحہ بطور کشتی	٣٩٩
مشرکین کا دوسرا اعتراض	٣٧٦	سفارش کی ممانعت	٤٠٠
کامیابی کا مدار	٣٧٧	نوح علیہ السلام کے ساتھ ٹھٹھا	״
درس نہم ٩ (آیت ٢٨ تا ٣١)	٣٧٩	مکذبین کا انجام	٤٠١
آیات و ترجمہ	״	درس دوازدہم ١٢ (آیت ٤٠ تا ٤٣)	٤٠٢
نبی کی وجہ امتیاز	٣٨٠	آیات و ترجمہ	״
ہدایت جبراً نہیں ملتی	٣٨١	ربط آیات	٤٠٣
تبلیغ دین کا اجر	٣٨٢	طوفان کی علامت	״
اہل ایمان کی قدردانی	٣٨٣	ہر قسم کے جانور	٤٠٤
نبی کی شخصی حیثیت	٣٨٤	گھر والے اور اہلِ ایمان	٤٠٦
امیر و غریب میں تفاوت	٣٨٥	سوار ہونے کی دعائیں	٤٠٧
درس دہم ١٠ (آیت ٣٢ تا ٣٥)	٣٨٨	کشتی کی روانگی	٤٠٨
آیات و ترجمہ	״	بیٹے کے ساتھ مکالمہ	٤٠٩
ربط آیات	٣٨٩	قوم کی غرقابی	٤١٠
عذاب کا مطالبہ	٣٩٠	درس سیزدہم ١٣ (آیت ٤٤ تا ٤٧)	٤١١
نوح علیہ السلام کا جواب	٣٩١	آیات و ترجمہ	״
اختراع کا الزام	٣٩٢	ربط آیات	٤١٢
درس یازدہم ١١ (آیت ٣٦ تا ٣٩)	٣٩٥	طوفان تھم گیا	״
آیات و ترجمہ	״	جودی پہاڑ	٤١٣

بیٹے کے لیے دعا ۴۱۴
اللہ تعالیٰ کا سخت جواب ۴۱۵
خالی نسلی قرابت مفید نہیں ،،
نوح علیہ السلام کی لغزش ۴۱۶
ماتریدی کی توجیہ ۴۱۸
شیخ الاسلامؒ کی توجیہ ۴۲۰
معافی کی درخواست ،،
درس چہار دہم ۱۴ (آیت ۴۸ تا ۴۹) ۴۲۲
آیات و ترجمہ ،،
ربط آیات ،،
دسویں محرم کی فضیلت ۴۲۳
کشتی سے اُترنے کا حکم ،،
اللہ کی طرف سے سلامتی ۴۲۴
سلامتی عربی ادب میں ۴۲۵
اللہ کی طرف سے برکت ۴۲۶
عذاب کے مستحقین ۴۲۷
غیب کی خبریں ،،
نبی عالم الغیب نہیں ہوتا ۴۲۸
صبر کی تلقین ۴۳۰
درس پانزدہم ۱۵ (آیت ۵۰ تا ۵۲) ۴۳۱
آیات و ترجمہ ،،
ربط آیات ۴۳۲
ہود علیہ السلام اور آپ کی قوم ،،
صابی مذہب ۴۳۳
اہرام مصر ۴۳۴
قوم عاد کا مسکن ۴۳۵
اخوت کی مختلف صورتیں ،،
ہود علیہ السلام کی دعوت توحید ۴۳۷
شرک کی بنیاد ۴۳۸
استغفار کی برکات ۴۳۹
درس شانزدہم ۱۶ (آیت ۵۳ تا ۵۷) ۴۴۰
آیات و ترجمہ ،،
ربط آیات ۴۴۲
معجزے کا مطالبہ ،،
معبودانِ باطلہ پر اصرار ۴۴۳
شرک سے بیزاری ۴۴۵
توحید پر ثابت قدمی ۴۴۶
عدل و انصاف کا راستہ ۴۴۷
درس ہفدہم ۱۷ (آیت ۵۸ تا ۶۰) ۴۴۹
آیات و ترجمہ ،،
ربط آیات ،،
قوم عاد کے دو خاندان ۴۵۰
قوم عاد کا وفد ۴۵۱
قوم عاد پر عذاب ۴۵۲
اہل ایمان کی نجات ۴۵۴
آیات اور رسولوں کا انکار ،،

سرکشوں کی پیروی	۴۵۵
لعنت کا طوق	۴۵۶
درس ہژدہم ۱۸ (آیت ۶۱ تا ۶۳)	۴۵۸
آیات وترجمہ	〃
ربطِ آیات	۴۵۹
قوم ثمود	〃
صالح علیہ السلام کی بعثت	۴۶۰
دعوت الی التوحید	۴۶۱
مٹی سے انسانی تخلیق	۴۶۲
زمین کی آبادکاری	۴۶۳
استغفار کی تلقین	۴۶۴
خدا سے براہِ راست دعا	۴۶۵
توسل کی حقیقت	۴۶۶
آباؤ اجداد کا طریقہ	۴۶۷
توحید پر استقامت	۴۶۸
درس نوزدہم ۱۹ (آیت ۶۴ تا ۶۸)	۴۷۰
آیات وترجمہ	〃
ربطِ آیات	۴۷۱
نشانی کا مطالبہ	〃
اونٹنی کے لیے شرائط	۴۷۲
شعائر اللہ کی تعظیم	۴۷۳
عذابِ الٰہی کی آمد	۴۷۵
بدبخت آدمی	۴۷۶
اہلِ ایمان کی نجات	۴۷۶
ظالموں کی ہلاکت	۴۷۷
سامانِ عبرت اور تنبیہ	۴۷۸
درس بستم ۲۰ (آیت ۶۹ تا ۷۶)	۴۷۹
آیات وترجمہ	〃
ربطِ آیات	۴۸۰
ابراہیم علیہ السلام کو بشارت	۴۸۱
ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی	۴۸۲
مسئلہ علمِ غیب	۴۸۳
بیٹے اور پوتے کی بشارت	۴۸۵
ابراہیم علیہ السلام کے اہل بیت	۴۸۶
قوم لوط کے متعلق تشویش	۴۸۷
درس بست و یکم ۲۱ (آیت ۷۷ تا ۸۳)	۴۸۹
آیات وترجمہ	〃
ربطِ آیات	۴۹۰
لواطت کی بیماری	۴۹۱
فرشتوں کی آمد	۴۹۲
لوط علیہ السلام کی پیش کش	۴۹۳
قوم کے ساتھ تکرار	۴۹۴
فرشتوں کی طرف سے تسلی	۴۹۵
لوط علیہ السلام کی بیوی	۴۹۶
عذابِ الٰہی آگیا	〃
درس بست و دوم ۲۲ (آیت ۸۴ تا ۸۶)	۴۹۸

آیات وترجمہ	۴۹۸	کمزوری کا طعنہ	۵۱۹
ربط آیات	۴۹۹	خاندان کا لحاظ	۵۲۰
حضرت شعیب علیہ السلام	"	حق و باطل میں امتیاز	"
شعیب علیہ السلام کی دعوت	۵۰۰	عذاب کی آمد	۵۲۱
ماپ تول میں کمی	۵۰۲	مکمل تباہی	۵۲۳
حقوق العباد	۵۰۳	درس بست و پنج ۲۵ (آیت ۹۶ تا ۱۰۱)	۵۲۴
عذاب کا خطرہ	۵۰۴	آیات وترجمہ	"
فساد فی الارض	"	ربط آیات	۵۲۵
بقیت اللہ ہی بہتر ہے	۵۰۵	موسیٰ علیہ السلام کی بعثت	"
درس بست و سہ ۲۳ (آیت ۸۷ تا ۹۰)	۵۰۷	دوزخیوں کی قیادت	۵۲۶
آیات وترجمہ	"	دنیا و آخرت کی لعنت	۵۲۷
ربط آیات	۵۰۸	تذکیر بایام اللہ	۵۲۸
شعیب علیہ السلام پر طعن	"	معبودان باطلہ سے مایوسی	۵۲۹
کسب و تصرف پر پابندی	۵۰۹	درس بست و شش ۲۶ (آیت ۱۰۲ تا ۱۰۹)	۵۳۱
حلال روزی	۵۱۱	آیات وترجمہ	"
قول و فعل کی مطابقت	۵۱۲	ربط آیات	۵۳۳
اصلاح احوال	۵۱۳	اللہ تعالیٰ کی گرفت	"
توفیق ایزدی	۵۱۴	نشان عبرت	۵۳۴
قوم سے دلی خیرخواہی	"	انسانوں کی زبان بندی	۵۳۵
درس بست و چہارم ۲۴ (آیت ۹۱ تا ۹۵)	۵۱۶	شقاوت وسعادت	"
آیات وترجمہ	"	شقی وسعید کا انجام	۵۳۶
ربط آیات	۵۱۷	ارض و سما کی ابدیت	۵۳۷
ناقہی کا بہانہ	۵۱۹	ماشاء اللہ کی توجیہات	۵۳۹

شرک اور اس کا بدلہ	۵۴۰	ربط آیات	۵۶۲
درس یکصد و بست و ہفت ۲۷ (آیت ۱۱۰ تا ۱۱۲)	۵۴۲	فساد فی الارض کی ممانعت	″
آیات و ترجمہ	″	متاع دنیا میں رغبت	۵۶۳
ربط آیات	۵۴۳	فساد کے اثرات	۵۶۴
نزول تورات	۰	اسلام میں جبر نہیں	۵۶۵
اختلاف فی الکتاب	۵۴۴	دین میں اختلاف	۵۶۷
قانون امہال و تدریج	۵۴۵	جہنم بھر جائے گی	۵۶۸
کلام الٰہی میں تردد	۵۴۶	درس یکصد و سی ۳۰ (آیت ۱۲۰ تا ۱۲۳)	۵۷۰
استقامت کا حکم	۵۴۷	آیات و ترجمہ	″
عقیدے کی پختگی	۵۴۸	دلی تسلی کا مضمون	۵۷۱
اعمال میں استقامت	۵۴۹	حق کی آمد	۵۷۲
استقامت بطور سخت حکم	۵۵۰	وعظ و نصیحت	″
درس یکصد و بست و ہشت ۲۸ (آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵)	۵۵۲	یاد دہانی	۵۷۳
آیات و ترجمہ	″	خدائی فیصلے کا انتظار	″
ربط آیات	″	علم غیب	۵۷۴
استقامت علی الدین	۵۵۳	عبادت الٰہی	۵۷۶
ظالم اور مظلوم میں کش مکش	۵۵۴	توکل علی اللہ	۵۷۷
ظلم کی سیاست	۵۵۵	**سورۃ یوسف**	۵۷۹
اقامت صلوٰۃ	۵۵۷	درس اول ۱ (آیت ۱ تا ۳)	۵۸۰
برائی کے بعد نیکی	۵۵۸	آیات و ترجمہ	″
صبر کا اجر	۵۵۹	نام اور کوائف	″
درس یکصد و بست و نہ ۲۹ (آیت ۱۱۶ تا ۱۱۹)	۵۶۱	مضامین سورۃ	۵۸۱
آیات و ترجمہ	″	حضور علیہ السلام کا روشن مستقبل	″

حروف مقطعات	٥٨٢	محبت کی وجوہات	٦٠٦
قرآن اور عربی زبان	٥٨٣	درس چہارم ۴ (آیت ۱۱ تا ۱۴)	٦٠٨
قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں	٥٨٥	آیات و ترجمہ	.
احسن القصص	٥٨٦	ربط آیات	٦٠٩
واقعہ یوسف بطور دلیل رسالت	٥٨٧	باپ سے درخواست	.
درس دوم ۲ (آیت ۴ تا ٦)	٥٨٨	کھیلوں کی حیثیت	٦١٠
آیات و ترجمہ	.	کھیلوں کی قباحت	٦١١
ربط آیات	٥٨٩	یعقوب علیہ السلام کی تشویش	٦١٢
حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب	٥٩٠	اقتدار کی جنگ	٦١٣
یوسف علیہ السلام کا خاندان	٥٩١	بھائیوں کا اصرار	"
خواب کی اقسام	٥٩٢	درس پنجم ۵ (آیت ۱۵ تا ۲۰)	٦١٥
خواب کی حقیقت	٥٩٣	آیات و ترجمہ	"
خواب کی تعبیر	٥٩٤	ربط آیات	٦١٦
یوسف علیہ السلام کی برگزیدگی	٥٩٦	سپرد چاہ	٦١٧
آل یعقوب پر اتمام حجت	..	وحی الٰہی کا نزول	٦١٨
درس سوم ۳ آیت ۷ تا ۱۰	٥٩٩	یوسف علیہ السلام کی دعا	٦١٩
آیات و ترجمہ	"	بھائیوں کی حیلہ سازی	
ربط آیات	٦٠٠	خون آلود قمیص	٦٢٠
واقعہ یوسف میں نشانیاں	"	یوسف علیہ السلام کی برآمدگی	٦٢١
سائلین کون تھے	٦٠١	یوسف علیہ السلام کی فروختگی	٦٢٢
برادران یوسف کا صلاح مشورہ	٦٠٢	درس ششم ٦ (آیت ۲۱ تا ۲۲)	٦٢٥
قتل یا گمشدگی	٦٠٣	آیات و ترجمہ	"
یوسف علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں مماثلت	٦٠٥	ربط آیات	

کنعان سے مصر تک	۶۲۶
مصر میں قدر وقیمت	۶۲۷
یوسف علیہ السلام کی عزت افزائی	″
حاملین فراستِ صادقہ	۶۲۹
تاویل الاحادیث کا علم	″
کمال حکمت وعلم	۶۳۰
ایک غلط فہمی	۶۳۱
نیکی کا بدلہ	۶۳۲
درس ہفتم ۷ (آیت ۲۳ تا ۲۴)	۶۳۴
آیات وترجمہ	″
تشریح آیات	۶۳۵
درس ہشتم ۸ (آیت ۲۵ تا ۲۹)	۶۴۲
آیات وترجمہ	″
قمیص پھٹ جانا	۶۴۳
بائیبل اور قرآن میں تضاد	۶۴۴
خاوند سے شکایت	۶۴۵
یوسف علیہ السلام کی بے گناہی	۶۴۶
علامت کی اہمیت	۶۴۷
عورتوں کی مکاریاں	۶۴۸
عزیز مصر کی معاملہ فہمی	۶۵۰
درس نہم ۹ (آیت ۳۰ تا ۳۱)	۶۵۱
آیات وترجمہ	″
ربط آیات	″
محبت کے چرچے	۶۵۲
مجلس طعام کا انعقاد	۶۵۳
یوسف علیہ السلام کا سامنے آنا	۶۵۵
ہاتھ کاٹ ڈالے	۶۵۶
فرشتہ صورت انسان	″
فرشتہ عربی ادب میں	۶۵۷
درس دہم ۱۰ (آیت ۳۲ تا ۳۵)	۶۵۹
آیات وترجمہ	″
ربط آیات	۶۶۰
چھری کاٹنے کا استعمال	″
زلیخا کا اعتراف حقیقت	۶۶۲
یوسف علیہ السلام کی دعا	۶۶۴
عرش کا سایہ	۶۶۵
برائی کے وقت خوفِ خدا	۶۶۶
دعا کی قبولیت	۶۶۷
قید بطور مصلحت	۶۶۸
درس یازدہم ۱۱ (آیت ۳۶ تا ۳۸)	۶۶۹
آیات وترجمہ	″
تبدیلی رائے	۶۷۰
قید وبند کی تاریخ	۶۷۱
دو شاہی ملزمان	۶۷۲
قیدیوں کے خواب	۶۷۳
تعبیر خواب	۶۷۵

فریضۂ تبلیغ	۶۷۷	آیات و ترجمہ	۷۰۳
اتباع ملت ابراہیمی	"	ربط آیات	۷۰۴
عقیدۂ توحید پر استقامت	۶۸۰	شاہی دربار سے پیغام	"
درس دوازدہم ۱۲ (آیت ۳۶ تا ۴۲)	۶۸۲	یوسف علیہ السلام کا جواب	۷۰۶
آیات و ترجمہ	"	[illegible] درجات کا ذریعہ	"
ربط آیات	۶۸۳	بادشاہ کی طرف سے تحقیق	۷۰۷
واحد معبود برحق	۶۸۴	زلیخا کا اقرار حق، یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی	۷۰۹
خود ساختہ نام	۶۸۶	یوسف علیہ السلام کی انکساری	۷۱۰
تبلیغ کی ضرورت	۶۸۷	درس پانزدہم ۱۵ (آیات ۵۴ تا ۵۷)	۷۱۳
خواب کی تعبیر	۶۸۸	آیات و ترجمہ	"
یوسف علیہ السلام کی لغزش	۶۸۹	ربط آیات	۷۱۴
دائرہ اسباب میں اعانت	۶۹۱	یوسف علیہ السلام شاہی دربار میں	"
شاہی دربار میں تبلیغ	۶۹۲	وزارت خزانہ کا مطالبہ	۷۱۵
درس سیزدہم ۱۳ (آیت ۴۳ تا ۴۹)	۶۹۳	غیر مسلم کی ملازمت	۷۱۹
	"	یوسف علیہ السلام کا اقتدار	۷۲۰
بادشاہ کا خواب	۶۹۴	زلیخا سے نکاح	۷۲۱
سات گائیں	۶۹۵	درس شانزدہم ۱۶ (آیت ۵۸ تا ۶۲)	۷۲۳
سات خوشے	۶۹۶	آیات و ترجمہ	"
تعبیر کی تلاش	۶۹۷	ربط آیات	۷۲۴
یوسف علیہ السلام کی خدمت میں	۶۹۸	یوسف علیہ السلام کی تدبیر	"
یوسف علیہ السلام کا جواب	۷۰۰	عالمی قحط	۷۲۵
پندرھواں سال	۷۰۱	قیمت پر کنٹرول	۷۲۶
درس چہاردہم ۱۴ (آیت ۵۰ تا ۵۳)	۷۰۳	گرانی کا حل	۷۲۷

برادرن یوسف کی مصر آمد ۷۲۸
بن یامین کو روکنے کی فرمائش ۷۳۰
پونجی کی واپسی ۷۳۱
درس ہفدہم ۱۷ (آیت ۶۳ تا ۶۶) ۷۳۳
آیات وترجمہ ″
ربط آیات ۷۳۴
بن یامین کے لیے فہمائش ۷۳۵
باپ کا جواب ″
بیٹوں کی طرف سے اصرار ۷۳۶
ضمانت کا مطالبہ ۷۳۸
اسباب اور توکل ۷۳۹
درس ہشتدہم ۱۸ (آیت ۶۷ تا ۶۸) ۷۴۰
آیات وترجمہ ″
ربطِ آیات ۷۴۱
متفرق دروازوں سے داخلہ ″
توکل بر خدا ۷۴۳
اس نصیحت کی وجوہات ″
مسئلہ نظر ۷۴۴
علم اور عمل ۷۴۶
درس نوزدہم ۱۹ (آیت ۶۹ تا ۷۵) ۷۴۹
آیات وترجمہ ″
ربط آیات ۷۵۰
بن یامین سے تعارف ″
برادرانہ تعلقات ۷۵۲
پیمانے کی گمشدگی ۷۵۳
چوری کا الزام ۷۵
برادران یوسف کا انکار ۷۵۷
چوری کی سزا ۷۵۸
درس بستم ۲۰ (آیت ۷۶ تا ۷۹) ۷۵۹
آیات وترجمہ ″
ربط آیات ۷۶۰
سامان کی تلاشی ″
بھائیوں کا ردِ عمل ۷۶۱
یوسف علیہ السلام پر الزام تراشی ۷۶۲
یوسف علیہ السلام کے تاثرات ۷۶۴
تدابیر خداوندی ۷۶۵
علم کی فضیلت ″
حیلہ سازی کی شرعی حیثیت ۷۶۶
حرام حیلہ ۷۶۸
برادران یوسف کی عاجزی ″
درس بست و یک ۲۱ آیت ۸۰ تا ۸۲) ۷۷۱
آیات و ترجمہ ″
ربط آیات ۷۷۲
بھائیوں کی مشاورت ۷۷۳
بڑے بھائی کا فیصلہ ۷۷۴

باپ کے سامنے سرگزشت	۷۷۴
باپ کی بے یقینی	۷۷۶
یوسف علیہ السلام کی باپ سے بے رغبتی	۷۷۷
امید کا دامن	۷۷۸
درس بست و دو ۲۲ (آیت ۸۴ تا ۸۷)	۷۸۰
آیات و ترجمہ	"
ربط آیات	۷۸۱
یعقوب علیہ السلام کی حالت زار	"
بیٹوں سے مکالمہ	۷۸۲
کثرت غم پر اشکال	۷۸۳
امام محمدؒ کی توجیہ	۷۸۴
مایوسی گناہ ہے	۷۸۷
درس بست و سہ ۲۳ (آیت ۸۸ تا ۹۳)	۷۸۸
آیات و ترجمہ	"
ربط آیات	۷۸۹
یوسف علیہ السلام سے تیسری ملاقات	۷۹۰
اناج کی درخواست	۷۹۲
صدقے کا مفہوم	۷۹۳
پردہ اٹھ گیا	۷۹۴
تقویٰ اور صبر	۷۹۵
غلطی کا اعتراف	۷۹۶
عام معافی کا اعلان	۷۹۷
باپ کے لیے قمیص کا تحفہ	۷۹۸
پورے خاندان کو دعوت	۷۹۹
درس بست و چہار ۲۴ (آیت ۹۴ تا ۹۸)	۸۰۱
آیات و ترجمہ	"
ربط آیات	۸۰۲
خوشبوئے یوسف علیہ السلام	۸۰۳
یعقوب علیہ السلام بینا ہو گئے	۸۰۵
منصب انبیاء	۸۰۶
معافی کی درخواست	"
قبولیت دعا کا وقت	۸۰۸
درس بست و پنج ۲۵ (آیت ۹۹ تا ۱۰۰)	۸۱۰
آیات و ترجمہ	"
ربط آیات	۸۱۱
یعقوب علیہ السلام کا استقبال	"
والدین کی عزت افزائی	۸۱۴
سب سجدہ ریز ہو گئے	۸۱۵
سجدہ کی شرعی حیثیت	۸۱۶
خواب کی سچی تعبیر	۸۱۸
شیطان کی مداخلت	۸۱۹
درس بست و شش ۲۶ (آیت ۱۰۱ تا ۱۰۴)	۸۲۱
آیات و ترجمہ	"
ربط آیات	۸۲۲
یعقوب علیہ السلام کی وفات	"

یوسف علیہ السلام کا آخری زمانہ	۸۲۳	نشاناتِ قدرت سے اعراض	۸۳۶
تاویل حدیث کا علم	۸۲۴	مشرکین کی کثرت	۸۳۸
اللہ کے سامنے انکساری	۸۲۵	عذاب الٰہی سے بے فکری	۸۴۰
موت علی الاسلام کی دعا	۸۲۶	صراطِ مستقیم	۸۴۲
تمام انبیاء کی دعا	۸۲۷	درس بست و ہشت ۲۸ (آیت ۱۰۹ تا ۱۱۱)	۸۴۵
نیک لوگوں کی معیت	۸۲۸	آیات و ترجمہ	"
اختتام واقعہ یوسف علیہ السلام	۸۲۹	ربط آیات	۸۴۶
رسالت کی صداقت	۸۳۰	انبیاء از نوع انسانی	۸۴۷
مسئلہ حاضر و ناظر	۸۳۱	مرد و زن میں تفریق	"
اکثریت گمراہ ہے	۸۳۲	دیہاتی اور شہری تمدن	۸۴۹
بے لوث خدمت	۸۳۳	نیک و بد کا انجام	۸۵۰
درس بست و ہفت ۲۷ (آیت ۱۰۵ تا ۱۰۸)	۸۳۴	انبیاء کی مایوسی	"
آیات و ترجمہ	"	نصرت الٰہی	۸۵۲
یوسف علیہ السلام کی تدفین	۸۳۵	سامانِ عبرت	۸۵۳
تصدیق رسالت	•	قرآن پاک کی حقانیت	۸۵۴
حضور علیہ السلام کا روشن مستقبل	۸۳۶	ہدایت اور رحمت	۸۵۵

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ الْاَمِیْنِ

اما بعد

سورۃ یونس، سورۃ ہود، اور سورۃ یوسف پر مشتمل سلسلہ دروس القرآن کی دسویں جلد پیش کرتے وقت ہم اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہیں کہ جس کی توفیق سے ادارہ دروس القرآن اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اگرچہ منزل ابھی دور ہے مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور قارئین کے تعاون نے اسے قریب کر دیا ہے ہم تمام قارئین سے اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے دعا کے خواستگار ہیں۔

ان تینوں سورتوں کا تعلق مکی دور سے ہے اور دیگر مکی سورتوں کی طرح ان میں بھی اسلام کے چار بنیادی مضامین بیان کیے گئے ہیں

۱۔ قرآنِ پاک کی حقانیت و صداقت اور اس کا وحی الٰہی ہونا۔

۲۔ توحید خداوندی اور اس کے عقلی اور نقلی دلائل۔

۳۔ بعثتِ انبیاء، ان کا طریقہ تبلیغ، اقوام کا ردِ عمل اور نافرمانوں کے لیے سزا۔

۴۔ وقوعِ قیامت، محاسبہ اعمال اور جزا و سزا

ان سورتوں کا زمانہ نزول مکی زندگی کا آخری حصہ معلوم ہوتا ہے جب کہ پیغمبر اسلام اور اہلِ ایمان کے خلاف کفار کی ریشہ دوانیاں بہت بڑھ چکی تھیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وعظ و تبلیغ کے تمام وسائل استعمال کر چکے تھے مگر قوم کی طرف سے مسلسل انکار اور ایذا رسانیوں میں اضافہ ہو رہا تھا اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی

تھی کہ اللہ تعالیٰ اس قوم پر بھی قہر کی نگاہ ڈالے اور جس عذاب کو یہ خود اپنی زبانوں سے طلب کر رہے ہیں، اُس کا مزہ چکھا دے۔

سورۃ یونس اور ہود میں ان انبیاء کے حالات کے علاوہ دیگر انبیاء حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حد درجہ اقوام کی نافرمانی اور پھر اُن پر آنے والی سزا کا ذکر ہے۔ البتہ سورۃ یوسف میں صرف آپ ہی کے واقعات نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ قصہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے احسن القصص سے تعبیر کیا ہے۔ اس سورۃ کی شانِ نزول کے متعلق یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہودیوں کے ایما پر مشرکین مکہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا تھا کہ بنی اسرائیل کا اصل وطن تو شام و فلسطین تھا مگر جب انہوں نے فرعون سے نجات حاصل کی تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ ان کا تعلق مصر سے کیسے قائم ہوا اور یہ اتنی بڑی تعداد میں وہاں کیسے جمع ہو گئے؟ یہود و مشرکین کا خیال تھا کہ آپ علیہ السلام اس سوال کا جواب نہیں دے سکیں گے تو انہیں اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کا ایک موقع میسر آجائے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ سوال کے جواب میں پوری سورۃ یوسف نازل فرما کر مخالفین کے منہ بند کر دیے اور واضح کر دیا کہ مصر میں بنی اسرائیل کے ورود کی ابتدا خاندان یوسف سے ہوئی تھی۔ اس سورۃ کے نزول کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ واقعہ یوسف علیہ السلام کی مماثلت میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی بھی فرما دی، جس طرح یوسف علیہ السلام کے بھائی اپنی تمام تر تدابیر کے باوجود ناکام اور یوسف علیہ السلام کامیاب ہوئے اسی طرح قریش مکہ کو بھی یہ بات سمجھا دی گئی کہ برادرانِ یوسف کی طرح تم بھی اپنے بھائی کی جتنی چاہو مخالفت کر لو۔ مگر کامیابی اُنہی کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔

یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بہت سے حقائق بیان کیے گئے ہیں مثلاً یہ کہ خدا تعالیٰ کی تقدیر اٹل ہوتی ہے اور اُس کے فضل سے کوئی کسی کو محروم نہیں کر سکتا۔

تمام مقاصد صبر و استقامت کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ حسد اور عداوت خود حاسد کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو جوہرِ عقل عطا فرمایا ہے اس سے فائدہ اٹھانا خود انسان کا کام ہے۔

انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جزا و سزا کا دار و مدار ایمان و کفر پر ہے اور اس میں کسی مقرب ترین شخصیت کا بھی ذاتی تعلق مفید نہیں ہوسکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے نافرمان بیٹے اور حضرت لوط علیہ السلام کی نافرمان بیوی کی مثالیں بیان کی گئی ہیں کہ پیغمبر کے ساتھ قریب ترین ذاتی تعلق کے باوجود وہ عذابِ الٰہی سے نہ بچ سکے۔ اس کے برخلاف جو لوگ ایمان لے آئے، وہ کامیاب و کامران ہوئے اگرچہ ذاتی طور پر ان کا پیغمبر کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔

احقر العباد

(راجہ) لعل دین ایم اے (علوم سلامیہ)

شالامار ٹاؤن لاہور

سورۃ یونس

مکمل

سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّتِسْعُ اٰيٰتٍ وَّفِيْهَا اَحَدَ عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۃ یونس مکی ہے اور یہ ایک سو نو آیات اور گیارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ① اَكَانَ لِلنَّاسِ
عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ
قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ②

ترجمہ: الٓر۔ یہ آیتیں ہیں حکمت والی کتاب کی (۱) کیا لوگوں کے لیے یہ بات تعجب خیز ہے کہ ہم نے وحی بھیجی ہے ایک مرد کی طرف ان میں سے (اور اس سے یہ کہا ہے) کہ ڈرائیں لوگوں کو اور خوشخبری سنائیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں کہ بیشک ان کے لیے سچائی کا پایہ ہے ان کے رب کے پاس۔ کہا کفر کرنے والوں نے کہ بیشک یہ کھلا جادوگر ہے (۲)

نام و کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ یونس ہے۔ اس کے آخری حصے میں دسویں رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی نافرمانی اور ایمان لانے کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ اسی

نسبت سے اس کا نام سورۃ یونس ہے۔ اس سورۃ کا ایک نام الٓر بھی ہے جو کہ سورۃ کے پہلے لفظ سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی، لہٰذا مکی سورۃ کہلاتی ہے۔ اس کی ایک سو نو آیات اور گیارہ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۱۰۸۲ الفاظ اور ۶۵۶۷ حروف پر مشتمل ہے

مضامین سورۃ

اس سورۃ کے مضامین پہلی سورۃ توبہ کے مضامین سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ گذشتہ سورۃ کے آخر میں توحید و رسالت کا ذکر تھا تو اس سورۃ میں یہی مضمون ابتدا میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ سورۃ میں زیادہ تر جہاد بالسیف کا تذکرہ تھا اور اسی سلسلہ میں غزوہ تبوک کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں مگر اس سورۃ میں زیادہ تر جہاد باللسان کا ذکر ہے۔ بہرحال ان دونوں سورتوں میں جہاد بھی قدر مشترک ہے۔ پچھلی سورۃ میں کفار کے تین گروہ یعنی کافر، اہل کتاب اور منافق لوگوں کا رد کیا گیا تھا جب کہ اس سورۃ میں مشرکین کے ساتھ بحث مباحثہ، اُن کا رد اور اُن کو اسلام کی دعوت کا ذکر کیا گیا ہے۔ تو گویا سورۃ یونس میں ایک تو توحید اور شرک کا مسئلہ بالوضاحت بیان کیا گیا ہے اور دوسرا مسئلہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کی نبوت و رسالت کا ہے جسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور نبوت و رسالت پر شکوک و شبہات کا اظہار کرنے والوں کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ پھر تیسرا مسئلہ معاد یعنی قیامت کا ہے کہ یہ بھی اجزائے ایمان میں سے ایک اہم جزو ہے۔ تو اس سورۃ میں قیامت کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ ملے گا۔ اس کے علاوہ اس سورۃ میں سابقہ قوموں کے حالات انبیاء کی دعوت اور ان کی اقوام کا ردعمل اور پھر ان کا انجام بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان واقعات میں فرعون اور اُس کی قوم کا واقعہ خاص طور پر بیان ہوا ہے۔ اس سورۃ

کا سب سے اہم موضوع دعوت الی القرآن ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی صداقت وحقانیت کو واضح کرکے اس کے پروگرام کی طرف دعوت دی ہے۔ اس مضمون کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نیز توحید کے عقلی اور نقلی دلائل پیش کرکے شرک کا رد کیا گیا ہے۔ بہرحال قرآن کے اسلوب بیان کے مطابق مکی سورتوں میں زیادہ تر بنیادی عقائد کا ذکر کرکے اُن کی اصلاح کا سبق دیا جاتا ہے مکی سورۃ ہونے کے ناطے سورۃ یونس کا بھی یہی طرۂ امتیاز ہے۔

حروفِ مقطعات

اس سورۃ کی ابتداء حروفِ مقطعات الٓرٰ سے ہوئی ہے جن کے متعلق مفسرین کرام کی مختلف آراء ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں آنے والے اس قسم کے مفرد حروف یا تو اللہ تعالیٰ کے کسی اسم پاک کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا ان میں قرآن پاک کی کسی خاص بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ البتہ بعض مفسرین مختلف حروف کی مختلف تشریح کرتے ہیں مثلاً یہ کہ ال سے اللہ مراد ہے اور را سے اللہ کی رأفت اور رحمت کا اظہار ہوتا ہے۔ تو گویا الٓر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! دیکھو میں نے تمہاری ہدایت اور راہنمائی کے لیے اپنی رأفت اور رحمت کے ساتھ کتنا اچھا کلام نازل فرمایا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں را کا اشارہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمان کی طرف ہے اور پورا مطلب یہ ہے انا اللہ الرحمٰن میں تمہارا اللہ ہوں جو رحمان بھی ہوں اور یہ میری رحمت کے کرشمے ہیں کہ تمہاری ہدایت کے لیے ایک رسول برحق کو بھیجا، ایک کتاب بھی نازل فرمائی اور تمہارے لیے تمام ظاہری اور باطنی لوازمات زندگی مہیا فرمائے۔ اس سورۃ میں آگے آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کتنے عظیم نعمات سے نوازا ہے۔ بعض یہ بھی

کہتے ہیں رأی سے رؤیت مراد ہے۔ اور اس طرح معنی یہ بنتا ہے أَنَا اللّٰهُ أَرٰی یعنی میں تمہارا اللہ ہوں جو تمہاری ہر حرکت کو دیکھ رہا ہوں۔

شاہ ولی اللہؒ کا نظریہ

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ[1] بذریعہ کشف یا ذوق ان حروف کے معانی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہر سورۃ کی ابتدا میں آنے والے حروف مقطعات اُس سورۃ کے مضمون کا خلاصہ ہوتے ہیں اور ان حروف کو دیکھ کر سورۃ کی اندرونی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم لفظ قاضی کا استعمال کرتے ہیں، تو اس کا پورا مفہوم فوراً سمجھ آجاتا ہے کہ یہ ایک ایسی شخصیت کا ذکر ہے جس کی یہ یہ اہلیت ہوتی ہے اور وہ فلاں کام انجام دیتا ہے۔ اسی طرح ہم بی اے، ایم اے یا پی ایچ ڈی کا لفظ بولتے ہیں تو ان الفاظ کے معانی و مفہوم کی پوری حقیقت ہمارے ذہن میں ہوتی ہے۔ اسی طرح شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات سے بھی مخفی حقائق کی نشاندہی ہوتی ہے جیسے حضرت شاہ صاحبؒ اپنی کتاب الخیر الکثیر میں لکھتے ہیں کہ الٓمٓ میں مقاماتِ انبیاء کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے نبی اس دنیا میں آکر ہمیشہ شرور کے ساتھ متصادم رہتے ہیں۔ مشرک، کافر، منافق، دہریے اور دیگر باطل عقیدے والے اور بے دین لوگ دینِ حق کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اُن کے مقابلے میں اللہ کے سچے دین کو پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ الٓمٓ میں حق و باطل کے اسی تصادم کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ سورۃ ہذا میں اس نظریہ کی جگہ جگہ تفسیر نظر آئیگی کہ اللہ کے نبیوں نے اور بالخصوص حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں کس طرح شرور و فتن کا مقابلہ کیا۔

حرف آخر

علامہ جلال الدین سیوطیؒ اس ضمن میں آخری بات یہ فرماتے ہیں۔[2] کہ حروفِ مقطعات کا یہ نظریہ ہونا چاہیے اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ

[1] الفوز الکبیر ص۱۰۸۔ ۱۰۹ ، [2] جلالین ص۲ ج ۱

بِذٰلِكَ یعنی ان حروف کا حقیقی معنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لہٰذا ہمارا عقیدہ یہی ہونا چاہئیے اٰمَنَّا بِہٖ یعنی ہم اس پر ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان حروف کی جو بھی مراد ہے وہ برحق ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہی راستہ سلامتی والا ہے۔ اس معاملہ میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ ان الفاظ کی تعبیر و تشریح حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت علیؓ کے اشارات میں بھی ملتی ہے مگر بعد کے زمانے میں لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے لگے تو مفسرین نے ان حروف کے معانی کو انسانی ذہنوں سے قریب تر لانے کے لیے بعض توجیہات بھی کیں۔ مگر حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا محتاط اور سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ اس معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے اور یہ نظریہ رکھا جائے کہ ان حروف سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے، وہی برحق ہے اور اسی پر ہمارا ایمان ہے۔ اللہ کے تمام رموز کو جاننا نہ ممکن ہے اور نہ ہی ہمارے لیے ضروری ہے۔

محکمات اور متشابہات

قرآنِ پاک میں بعض چیزیں محکم ہیں اور بعض متشابہ۔ متشابہات پر صرف ایمان لانا ضروری ہے جب کہ محکمات پر ایمان لانے کے علاوہ ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر جہاں کہیں شک و شبہ پڑ جائے تو ایسی باتوں کو محکمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر محض متشابہات کے پیچھے ہی پڑے رہے اور ان کو کریدنے کی فضول کوشش کرتے رہے تو گمراہ ہونے کا خطرہ ہے۔ بعض لوگ متشابہات کو غلط معانی پہنا کر ہی گمراہ ہوئے۔ قرآن پاک کی آیات اور الفاظ کو غلط معانی دینے والے لوگ ہمارے زمانے میں بھی موجود ہیں

اور ہمارے زمانے میں بھی پرویزی، چکڑالوی اور قادیانی وغیرہ گمراہ فرقے موجود ہیں جو قرآن کی تاویلیں کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں ہدایت پانے کے بجائے گمراہی کی کھائیوں میں جا گرتے ہیں۔ ہماری عقلیں چونکہ ناقص ہیں لہٰذا ہمیں متشابہ آیات میں الٹی سیدھی تاویلیں کرنے کی بجائے ان سے محکم آیات کی روشنی میں راستہ تلاش کرنا چاہیئے۔ پھر بھی جو بات سمجھ میں نہ آئے تو اس پر محض ایمان لا کر اُسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی بات اللہ کے نبی سے قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس پر عمل کرنا چاہیئے خواہ وہ چیز ہماری عقل میں آئے یا نہ آئے، ہمارا فرض اُس پر ایمان لانا ہے

کتاب حکیم

ارشاد ہوتا ہے تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ قرآن پاک کی طوال یعنی لمبی سورتوں والا حصہ پچھلی سورۃ پر ختم ہو چکا ہے اور اب اس سورۃ مبارکہ سے دوسرا حصہ مثانی شروع ہو رہا ہے۔ یہ حصۂ قرآن چودھویں پارے میں سورۃ نحل تک جائے گا اور اس کے بعد مئین سورتیں شروع ہو جائیں گی۔ بہر حال آیت مبارکہ میں لفظ آیات سے مراد اس سورۃ کی آیتیں بھی ہو سکتا ہے، اور قرآن پاک کی مطلق آیات بھی مراد لی جا سکتی ہیں۔ فرمایا یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو حکیم ہے۔ حکیم کا مطلب محکم بھی ہو سکتی ہیں یعنی وہ کتاب جو محکم مضبوط اور پکی ہے۔ سورۃ بینہ کے الفاظ کُتُبٌ قَيِّمَةٌ کا بھی یہی معنیٰ ہے کہ یہ بہت مضبوط اور واقعہ کے مطابق کتاب ہے جس میں تغیر و تبدل کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے تمام واقعات، اوامر و نواہی تحریف سے بالکل پاک ہیں۔ یہ عقل سلیم اور فطرت کے عین مطابق ہیں اور ان میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ یہ آیات انسان کی فلاح کے لیے بہترین پروگرام پیش کرتی ہیں، اس کے تمام احکامات

قیامت تک کے لیے کار آمد ہیں۔ اب کوئی پیغمبر یا کوئی ایسی کتاب نہیں آئے گی جو ان احکام کو منسوخ کر سکے۔ گویا یہ محکم کتاب کی اٹل آیتیں ہیں۔ کتاب حکیم کا مطلب حکمت والی کتاب بھی ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کی ساری تعلیم حکمت سے لبریز ہے۔ قرآن پاک نے حکمت و دانائی کا مکمل کورس فراہم کر دیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی اسے بہت بڑی بھلائی عطا کر دی گئی۔ حکمت کا معنیٰ فہم اور دانش کی باتیں ہوتا ہے۔ گویا یہ کتاب حکمت و دانائی کی نہایت عمیق اور دقیق باتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں جہالت، کمزوری یا غلطی والی کوئی بات نہیں۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی صداقت کا حتمی اعلان ہو چکا ہے۔ اس سورۃ میں قرآن حکیم کی حقانیت اور صداقت کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔ آگے دوسری آیت میں رسالت کی طرف بھی اشارات ملتے ہیں اور پھر تیسری آیت سے توحید کی حقیقت کو آشکارا کیا گیا ہے۔ آگے دیگر متفرق مضامین بھی آئیں گے ان کو مختلف دلائل کی روشنی میں بتکرار ذکر کیا گیا ہے۔

معیارِ رسالت

قرآن پاک کی حقانیت کے بیان کے بعد اب دوسری آیت میں رسالت کی طرف اشارہ ہے أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا کیا یہ بات لوگوں کے لیے تعجب انگیز ہے أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ کہ ہم نے ان میں سے ایک مرد کی طرف وحی بھیجی ہے۔ استفہامیہ انداز میں فرمایا، کیا یہ کوئی قابل اعتراض بات ہے؟ روایات میں آتا ہے کہ مشرکین حضور کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ کوئی شاعر کہتا، کوئی کاہن کہتا، کسی نے دیوانگی اور افترا کا الزام لگایا (نعوذ باللہ) مشرکین کا نظریہ یہ تھا کہ اگر نبوت ملنی تھی تو مکے کے کسی بڑے آدمی

کو ملتی۔ ابوالحکم (ابوجہل) بڑا آدمی ہے، مغیرہ بڑا دولت مند ہے۔ لاکھوں اشرفیوں کی تجارت ہے، بڑے جانوروں کا مالک ہے اور بڑے لونڈی غلام رکھتا ہے۔ نبوت کا حقدار تو وہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ طائف کی بستی میں سردار مسعود، عبدیالیل اور حبیب جیسے باغوں کے مالک بڑے بڑے سردار ہیں جن کی مالی حالت بڑی اچھی ہے، نبوت تو اُن کو ملنی چاہیئے تھی، بھلا محمد جیسے غریب آدمی کو یہ شرف کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ تو اس اعتراض کا جواب اللہ نے قرآن پاک میں مختلف انداز سے دیا ہے اَھُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ کیا تیرے رب کی رحمت کے تقسیم کنندہ یہ مشرک ہیں۔ فرمایا یہ لوگ مال و دولت اور جاہ و اقتدار کو معیارِ رسالت قرار دے رہے ہیں، حالانکہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس منصب جلیلہ کا مستحق کون ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ اُس نے فرائضِ نبوت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صلاحیت و استعداد کس شخصیت میں ودیعت کر رکھی ہے، اخلاق کی بلندی، علم کا کمال اور باطنی کیفیات کا عروج جو نبی کی ذات میں ہوتا ہے وہ کسی دوسری شخصیت میں نہیں ہوتا، لہٰذا نبوت کے انتخاب میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہی اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے

مرد وزن کا دائرہ کار

نبوت کے ساتھ رجل کا لفظ قرآن پاک میں کثرت سے آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کا تاج ہمیشہ مردوں کے سر پر رکھا ہے، کسی عورت کو نبوت کا منصب عطا نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ عورتوں کے ذمے ہمیشہ آسان کام لگائے جاتے ہیں جب کہ کارِ نبوت بڑا مشقت طلب کام ہے۔ البتہ نبوت کے بعد دوسرا بڑا درجہ صدیقیت کا ہے جو بعض عورتوں کو بھی نصیب ہوا ہے۔ عورت کی منصب نبوت سے محرومی کو اس کی

---

[1] سیرۃ النبی ص ۲۵/۱

توہین پہ محمول نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ تقسیم کار مرد و زن کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے عین مطابق ہے۔ اللہ نے عورت میں مشقت برداشت کرنے کا مادہ مرد کی نسبت کم رکھا ہے۔ اسی لیے اُن کے فرائض نسبتاً کم محنت طلب ہیں۔ محنت مزدوری، کھیتی باڑی، جہاد وغیرہ مردوں کے ذمہ ہیں جبکہ عورتوں کو امورِ خانہ داری کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اسی طرح نماز باجماعت، نمازِ جمعہ، نمازِ عیدین جیسے اجتماعی امور میں عورت کو استثنا حاصل ہے۔ عنانِ حکومت جیسا کٹھن کام بھی مردوں کے ذمہ ہے۔ نظامِ حکومت میں عورتوں کو گھسیٹ کر لے جانا انگریز کی سنت ہے یا دہریوں کا خاصہ ہے۔ جبکہ دینِ حق اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام بتاتا ہے وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ تم گھر میں بیٹھ کر اپنی ذمہ داری کے کام انجام دو۔ عورتیں اپنے گھروں میں بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر سکتی ہیں۔

امہات المؤمنین نے مخلوق کے لیے تعلیم کا فریضہ نہایت احسن طریقے سے انجام دیا مگر کسی ام المؤمنین نے امورِ حکومت میں کبھی کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ نہ ہی یہ مثل صحابیات میں کہیں ملتی ہے۔ عورت کو ممبری، وزارت اور امارت تک لے جانا یورپ کی تعلیم کا اثر ہے۔

نبی کے فرائض منصبی

اس آیت میں آمدہ مِنْهُمْ سے مراد مخاطبینِ قرآن کا خاندان اور ان کی جنس یعنی انسانیت ہے۔ چونکہ اللہ کا نبی انسانوں کی طرف مبعوث ہوتا ہے لہٰذا نبی کا اُن کی جنس میں سے ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ متوحش نہ ہوں اور اُس سے بآسانی استفادہ کر سکیں۔ اور نبی کے فرائض میں یہ چیز شامل فرمائی اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ کہ وہ لوگوں کو اُن کے بُرے انجام سے ڈرائیں۔ انذار اور بشارت ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ جہاں ڈرانے کی بات ہے وہاں بشارت کی بات بھی کی ہے۔ اِس مقام پر انذار کو مقدم رکھا ہے کہ

لوگوں کو کفر، شرک، نفاق اور ان کی غلط کاریوں سے ڈرایا جائے۔ اللہ نے انذار کا حکم اپنے نبی کو جگہ جگہ فرمایا ہے۔ سورۃ مدثر میں فرمایا قُمْ فَاَنْذِرْ آپ کھڑے ہو جائیں اور ان کو معصیت سے ڈرائیں۔

برائی سے ڈرانے کے بعد اہل ایمان کو بشارت دینے کا حکم بھی ساتھ ہی دیدیا وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا آپ ایمان لانے والوں کو خوشخبری بھی سنا دیں کہ حقیقی کامیابی انہی کو حاصل ہوگی چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں فلاح کے بڑے بڑے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں بھی فرمایا کہ اے پیغمبر علیہ السلام آپ اہل ایمان کو خوشخبری دے دیں اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ کہ ان کے لیے ـــــ ان کے رب کے ہاں سچائی کا پایہ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ قَدَمَ صِدْقٍ کا ترجمہ دَرَجَةً رَّفِیْعَةً کرتے ہیں کہ ایمان والوں کے لیے اللہ کے ہاں بڑا اونچا درجہ ہے۔ اس میں کمال، عروج اور ترقی کی ساری حقیقتیں آجاتی ہیں جو اللہ نے ایمان والوں کے لیے مقرر کی ہیں۔

کفار کی الزام تراشی

فرمایا اللہ کا نبی تو انذار اور بشارت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ برے عقیدے، برے اخلاق اور برے اعمال والوں کو ڈرا رہا ہے اور اچھے عقیدے، اچھے اخلاق اور اچھے اعمال والوں کو جنت کی بشارت دے رہا ہے، مگر کافروں کی حالت یہ ہے قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ وہ نبی کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادوگر ہے (معاذ اللہ) قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے کہ اللہ کے نبی کو کبھی شاعر کہا گیا اور کبھی کاہن۔ حالانکہ اللہ کا نبی نہ کاہن ہے اور نہ شاعر۔ وہ تو وحی کے ذریعے موصول ہونے والا اللہ کا پیغام سناتا ہے۔ یہ اللہ کا وحی کلام ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اور اس میں ایسی عجیب اور مستحکم باتیں ہیں جو لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہیں اور مشرکین کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں۔ بہرحال کافروں اور مشرکوں نے اللہ

کے کلام کو جادو کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی جو کہ صریح جھوٹ ہے۔ نہ اللہ کا کلام جادو ہے اور نہ اللہ کا نبی جادوگر ہے۔ آگے موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں جادوگروں کا ذکر بھی آئے گا کہ اُن کے اخلاق نہایت ہی پست ہوتے ہیں۔ وہ غرض کے بندے ہوتے ہیں جو جادو کے ذریعے کمائی کرتے ہیں مگر اللہ

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي
سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا
مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۞ (۳) إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا
وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا إِنَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ وَالَّذِينَ
كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا
كَانُوا يَكْفُرُونَ (۴)

ترجمہ :- بیشک تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو چھ دن کے وقفے میں ۔ پھر وہ مستوی ہوا عرش پر تدبیر کرتا ہے معاملے کی ۔ نہیں ہے کوئی سفارشی مگر اُس کی اجازت کے بعد ۔ یہی ہے اللہ تمہارا پروردگار ۔ پس اِسی کی عبادت کرو ۔ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے (۳) اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے یہ وعدہ ہے اللہ کا سچا ۔ بیشک وہی ابتداء میں پیدا کرتا ہے مخلوق کو ۔ پھر دوبارہ اُس کو لوٹائیگا ۔ تاکہ بدلہ دے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے انصاف کے ساتھ ۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اُن کے لیے پینا ہوگا کھولتا ہوا پانی اور عذاب ہوگا دردناک اس وجہ سے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے (۴)

ربطِ آیات

اس سورۃ کی پہلی دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا ذکر کیا۔ فرمایا یہ کتاب وحی الٰہی کے ذریعے نازل ہوئی اور یہ علم و حکمت کا خزینہ ہے۔ پھر دوسری آیت میں رسالت کے متعلق فرمایا کہ یہ نافرمان لوگ اس بات پہ تعجب کرتے ہیں کہ ہم نے ایک مرد کی طرف وحی بھیجی ہے جس کا مقصد ایمان سے بے بہرہ لوگوں کو ڈرانا اور اہل ایمان کو خوشخبری سنانا ہے۔ مگر کافر لوگ جب اس دعوت کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو کہنے لگے یہ تو کھلا جادوگر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس لغو اعتراض کا رد فرمایا اور نہایت لطیف پیرایہ میں معاد کا ذکر بھی فرمایا کہ ایمان والوں کے لیے اُن کے رب کے ہاں سچائی کا پایہ ہے اور وہ آخرت میں کامران و کامیاب ہونے والے لوگ ہیں۔ اللہ نے فرمایا یہ کتنی غلط بات ہے کہ مشرکین رسالت کا انکار کر رہے ہیں حالانکہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آتی ہو۔ یہ ان کا محض تعصب اور عناد ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول پر ایمان لانے سے انکار کر رہے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بعثتِ انبیاء اُس ذات کا کام ہے جس نے تمام کائنات کو پیدا فرمایا ہے۔

اب آج کی آیات میں پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں اور پھر اُس کی وحدانیت کا ذکر کر کے اُس کی توحید کا مسئلہ سمجھایا ہے اور ساتھ ساتھ اس کی عبادت کا حکم بھی دیا ہے۔ دراصل رسول جس بات کو بیان کرتا ہے وہ اللہ کی وحدانیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عظیم کاموں میں سے ایک کام بعثتِ انبیاء بھی ہے جیسا کہ سورۃ کہف میں فرمایا وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر اس لیے کہ وہ بشیر و نذیر ہوں۔ گویا بعثتِ انبیاء اللہ کی صفت ہے اور جو اس صفت کا انکار کرے وہ کافر ہے۔

صفتِ ربوبیت

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
بیشک تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا
یہاں پر سب سے پہلے ربوبیت کی صفت بیان کی گئی ہے اور قرآن پاک
میں اکثر مقامات پر ایسا ہے کہ ربوبیت کی صفت کا تذکرہ کر کے
الوہیت کا مسئلہ سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک
کی ابتدا بھی صفتِ ربوبیت سے ہوئی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور اس کی انتہا میں یہی صفت ہے قُلْ
اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ ربوبیت
کا مطلب کسی چیز کو بتدریج درجہ کمال تک پہنچانا ہوتا ہے اور یہ صفت
خدا تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ذات میں نہیں پائی جاتی۔ اسی لیے
فرمایا کہ تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا
کیا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ چھ دنوں کے وقفے میں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں پر چھ دن سے
مراد اس دنیا کے چھ دن نہیں بلکہ یہاں پر دن سے مراد وہ دن ہے
جو اللہ کے ہاں شمار ہوتا ہے۔ اس کو آخرت کا دن بھی کہہ سکتے ہیں
اور اس دن کے متعلق سورۃ حج میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے
"اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ"
تمہارے پروردگار کے ہاں ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے
تو اس طرح گویا خدا تعالیٰ نے ارض و سماء کو چھ ہزار سال کے وقفے میں
پیدا کیا۔ اس کی قدرت تامہ اور حکمت تو ایسی ہے کہ وہ یکدم بھی ہر
چیز کو پیدا کر سکتا ہے مگر اس نے انسان کو سمجھانے کی مصلحت
کے تحت تدریج اختیار کی اور اس کام کے لیے چھ دن کا وقفہ
لیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے اَلتُّؤَدَةُ مِنَ الرَّحْمٰنِ

وَالْعُجْلَةُ مِنَ الشَّیْطٰنِ یعنی آہستگی رحمان کی صفت ہے جب کہ جلد بازی شیطانی نعل ہے۔ بہ حال پہلے اللہ کی صفت ربوبیت کا ذکر ہوا۔ اس کے بعد صفتِ خلق کا اور آگے صفتِ الوہیت کا ذکر ہوگا۔

استوی علی العرش

آسمان و زمین کو چھ دن کے وقفہ میں پیدا کرنے کے بعد فرمایا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ پھر اللہ تعالےٰ عرش پر مستوی ہوا۔ استوی کا معنیٰ قائم ہونا، قرار پکڑنا یا کسی دوسری چیز کے ساتھ برابر ہونا آتا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں اِسْتَوٰی عَلَی الدَّآبَّۃِ فلاں شخص سواری پر قائم ہوگیا۔ قرار پکڑ لیا۔ استوی کا معنیٰ ارادہ کرنا بھی آتا ہے جیسے "ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ" (بقرہ) پھر اس نے آسمانوں کی طرف ارادہ فرمایا اور انہیں سات آسمانوں کی شکل میں بنا دیا۔ اسی طرح استوی کا معنیٰ غالب آنا بھی ہے۔ جیسے شاعر کہتا ہے۔

اِسْتَوٰی بِشْرٌ عَلَی الْعِرَاقِ

مِنْ غَیْرِ سَیْفٍ وَّ دَمٍ مُّھْرَاقٍ

(بشر عراق پر قابض ہوگیا۔ غالب آگیا بغیر خونریزی کے)

تو اس مقام پر بھی استوٰی علی العرش کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی یعنی غالب ہے۔ اور عرش ایسی چیز ہے جو ساری مخلوق میں بلند ترین ہے۔ ساتوں آسمانوں کے بعد بہشت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا بلند ترین درجہ جنت الفردوس ہے جس کے اوپر عرشِ الٰہی کا سایہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سب سے بلند ترین چیز عرش پر جب اللہ تعالیٰ کا قبضہ ہے تو باقی چیزیں تو بطریقِ اولیٰ اس کے تسلط میں ہیں۔ استوی علی العرش سے یہی بات سمجھانا مقصود ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اصطلاح کے مطابق عرش تمام

شخص اکبر کا قلب ہے۔ اور اس پر مستوی ہونے کی کیفیت ایسی نہیں ہے جیسے ہم تخت، چارپائی یا کرسی وغیرہ پر بیٹھتے ہیں۔ کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کے استویٰ کو بھی ہم اپنے اوپر محمول کریں تو پھر خدا تعالیٰ کی جہت لازم آئیگی اور اس کا طول عرض بنے گا حالانکہ ذات خداوندی، جہت، زمان اور مکان سے منزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں مگر ہماری طرح نہیں بلکہ جیسا اس کی شان کے لائق ہے، اس کی پنڈلی ہے مگر اپنی شان کے مطابق، چہرہ ہے مگر مخلوق کی طرح نہیں بلکہ جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ اسی لیے امام مالکؒ، امام ترمذیؒ، سفیان ثوریؒ، امام ابوحنیفہؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، وغیرہم فرماتے ہیں کہ استویٰ علی العرش کے الفاظ کو ظاہر پر رکھتے ہوئے اُس کی کیفیت کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیئے کہ وہ عرش عظیم پر مستوی ہے جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ ایک شخص نے امام مالکؒ سے استویٰ علی العرش کی کیفیت کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا اَلْاِسْتِوَآءُ مَعْلُوْمٌ وَّالْکَیْفُ مَجْھُوْلٌ یعنی استویٰ کا ظاہری معنی تو معلوم ہے کہ قائم ہونا یا غالب ہونا ہے مگر اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ ہمارے لیے صرف ایمان لانا ہی واجب ہے۔ کیفیت کے متعلق کرید کرنا درست نہیں بلکہ بدعت ہے۔ آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ میں تمہارے متعلق یہی خیال کرتا ہوں کہ تم بدعتی آدمی ہو، لہٰذا میری مجلس سے اُٹھ جاؤ۔ بہرحال نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے استویٰ کا معنی معلوم ہے مگر اس کی کیفیت کا علم نہیں۔ وہ اپنی شان کے مطابق عرش پر مستوی ہے، ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

امام شاہ ولی اللہؒ اس بات کو آسان طریقے سے اس طرح فرماتے ہیں کہ عرش پر خدا تعالیٰ کی تجلی اعظم پڑتی ہے جو سارے عرش کو رنگین کر دیتی ہے پھر عرش سے نیچے کی چیزیں بھی اس تجلی سے متاثر ہوتی ہیں اور پھر تمام

کائنات اس کا اثر قبول کرتی ہے اور اس طرح تجلی اعظم کا اثر تمام کائنات پر پڑتا ہے۔

تدبیر امر

اللہ تعالیٰ کے استویٰ علی العرش کے ذکر کے بعد فرمایا یُدَبِّرُ الْاَمْرَ وہ معاملے کی تدبیر کرتا ہے۔ سورۃ الٓمٓ سجدہ میں ہے "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ" وہ بلندیوں سے پستیوں تک ہر چیز کی تدبیر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شے کا تدبیر کنندہ صرف خدا تعالیٰ ہے۔ مگر مشرک لوگ اس مسئلہ میں بھی بھٹک جاتے ہیں اور شرک کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود اور خالق ہونے میں تمام مشرک بھی متفق ہیں کہ واجب الوجود بھی وہی خدا ہے اور ہر چیز کا مالک بھی وہی ہے مگر جب تدبیر کی صفت آتی ہے تو پھر اس میں غیر اللہ کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ ہمارے معبود بھی ہیں جو ہماری مرادیں پوری کرتے ہیں اور ہماری سفارشیں کرتے ہیں۔ البتہ جو مخلص مومن ہیں وہ تدبیر کو اللہ کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں کہ ذرّے ذرّے تک کی تدبیر صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہی کرتی ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی چار صفات درجہ بدرجہ کام کرتی ہیں۔ سب سے پہلے صفت ابداع کا اظہار ہوتا ہے جیسے فرمایا بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نیز فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی آسمانوں اور زمین کا بغیر آلے اور مادے کے پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے استعمال کے بغیر ایجاد کر دینا خاصۂ خداوندی ہے۔ یہ صفت ابداع ہے۔ پھر دوسرے نمبر پر صفت خلق آتی ہے۔ خلق کا معنی بھی پیدا کرنا ہے مگر کسی دوسرے مادے یا آلے کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی کے مادے سے اور جنات کو آگ کے مادے سے پیدا فرمایا یہ اس کی صفتِ خلق کا ظہور

ہے۔ جب بعض چیزیں معرضِ وجود میں آجاتی ہیں تو پھر اُن میں توازن قائم
کرنے کے لیے، کسی کو گھٹانے کے لیے اور کسی کو بڑھانے کے لیے کسی
کو زندگی بخشنے کے لیے یا کسی پر موت طاری کرنے ـــــ کے لیے اللہ تعالیٰ
کی تیسری صفت تدبیر کام کرتی ہے چنانچہ ہر ذرے ذرے کی تدبیر خدا تعالیٰ
براہِ راست کرتا ہے۔ جو اس صفت میں کسی کو شریک کرتا ہے، وہ بھی
مشرک بن جاتا ہے اور پھر چوتھی صفت تدلی ہے جس کا مطلب یہ ہے
کہ جب کوئی انسان پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تجلی اعظم کا عکس اُس کے
قلب پر بھی پڑتا ہے۔ لیکن یہ کئی واسطوں کے ذریعے آتا ہے تجلی اعظم کا
کا اثر عرش الٰہی پر پڑتا ہے۔ نیچے امام نوعِ انسان ہوتا ہے، اُس کے
قلب پر پڑتا ہے اور پھر اُس کے واسطے سے وہ اثر روحِ انسانی پر
پڑتا ہے روحِ انسان میں بڑے بڑے مرکز ہوتے ہیں جن کے ذریعے
تجلی اعظم کا اثر ہر انسانی قلب پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرنے کے
بعد انسانی ذہن بہت تیز ہو جائیگا۔ اگر اُس نے دنیا میں ایمان قبول
نہیں کیا تو اس کو بڑا افسوس ہوگا کہ وہ ایمان سے کیوں محروم رہا۔
اُس کے قلب پر پڑنے والی تجلی اُسے ستائیگی اور ملامت کرے گی
کہ دنیا میں رہ کر تم نے کیا کیا؟ ابتدا ہی سے ہر انسان کے قلب پر تدلی
کا بیج بویا ہوا ہے جو کہ تجلی اعظم کے ذریعے سے آتا ہے۔ بہر حال فرمایا
کہ اللہ تعالیٰ معاملے کی تدبیر کرتا ہے اور صفت تدبیر بھی اُسی کے ساتھ
خاص ہے۔

مسئلہ شفاعت فرمایا مَا مِنْ شَفِيعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ کوئی سفارشی نہیں
ہے مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بعد۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین نے
سفارشی بنا رکھے ہیں جن کے متعلق اُن کا عقیدہ ہے کہ خدا راضی ہو یا ناراض
یہ سفارشی ہمارا کام ضرور کرا دیں گے۔ یہ باطل عقیدہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ

کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکیگا "مَنْ ذَا الَّذِی یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ" (البقرہ) میں بھی یہی بات ہے اللہ کے نبی اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بھی سفارش کریں گے تو اللہ کی اجازت سے۔ اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو سفارش کا حق نہیں پہنچتا یہ جبری سفارش والا عقیدہ تو مشرکین کا ہے۔ اور صحیح سفارش بھی اُن لوگوں کے حق میں ہوگی جن کے دل نور توحید سے روشن ہوں گے۔ اُن کے لیے انبیاء، شہداء اور نیک لوگ سفارش کریں گے۔ جو لوگ ایمان سے خالی ہوں گے اُن کے لیے قطعاً سفارش نہیں ہو سکے گی۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔

فرمایا، یاد رکھو! ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ یہی ہے تمہارا رب، جو خالق اور مدبر ہے۔ وہ ذرّے ذرّے کا مالک ہے فَاعْبُدُوْہُ لہٰذا عبادت بھی صرف اسی کی کرو۔ اللہ کا نبی بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ ۔۔۔دت صرف ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کی کرو۔ فرمایا اَفَلَا تَ۔۔۔ ۔۔۔رُوْنَ کیا تم دھیان نہیں کرتے؟ نصیحت نہیں پکڑتے؟ ۔۔۔نہ کا نبی تمہیں واضح بتاتا ہے۔ اللہ کی کتاب تمہاری راہنمائی کرتی ۔۔۔ نشانات قدرت تمہیں پکار پکار کر توحید کی دعوت دے رہے ۔۔۔ تم اول فول باتیں کرتے ہو۔ کبھی اللہ کے سچے نبی کو نبی ماننے ۔۔۔ انکار کرتے ہو اور اُسے جادوگر کا لقب دیتے ہو اور کبھی کتب الٰہی ۔۔۔ انکار کرتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑیں گے ۔۔۔ یہ سفارشی ہماری مرادیں پوری کرنے والے ہیں ہم ان کی ۔۔۔ ضرور کریں گے یا یہ ہمیں ضرور ہی چھڑا لیں گے۔ بہرحال فرمایا ۔۔۔ رب وہ ہے جس کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ وہ خالق اور مدبر ہے لہٰذا عبادت بھی اسی کی کرو۔ اللہ کا قانون یہی ہے۔

وقوعِ قیامت

آگے اللہ تعالیٰ نے معاد کا ذکر فرمایا ہے۔ قرآن کی صداقت، رسول کی رسالت اور وقوعِ قیامت آپس میں مربوط چیزیں ہیں کیونکہ اس دنیا میں کتب سماویہ اور انبیائے کرام پر ایمان لانے یا نہ لانے ——— کا بدلہ تو قیامت کو ہی ملے گا۔ تو فرمایا، لوگو! یاد رکھو! اس دنیا میں تم جو چاہو کر لو، غلط سلط عقائد وضع کر لو، اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا لو، مگر اِلَیۡہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا بالآخر تم سب کو اُسی اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے وَعۡدَ اللّٰہِ حَقًّا یہ اللہ پاک کا سچا وعدہ ہے اور اسمیں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہر شخص نے اپنے رب تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال و عقائد کی جوابدہی کرنا ہے۔ فرمایا، ذرا اس بات پر غور کرو اِنَّہٗ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ بیشک ابتداء میں پیدا کرنے والا وہی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کائنات کی تمام چیزیں وہ کس طرح پیدا کرتا ہے ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ پھر وہ اس کو دوبارہ لوٹائے گا۔ مرنے کے بعد وہ پھر زندہ کر کے اپنے سامنے کھڑا کرے گا، اور اس سے پوری زندگی کا حساب لے گا۔

فرمایا دوبارہ لوٹانے کا مقصد یہ ہے لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالۡقِسۡطِ تاکہ ایمان لانے والوں اور اچھے عمل کرنے والوں کو انصاف کے ساتھ پورا پورا بدلہ ملے۔ اچھے اور برے اعمال کی جزا یا سزا اس دنیا میں بھی کسی حد تک ملتی ہے مگر مکمل طور پر نہیں، لہٰذا نیکی کی مکمل جزا اور برائی کی سزا تو آخرت میں ہی ملیگی جب ہر چیز کھل کر سامنے آجائے گی اور کوئی شخص اپنے کسی کام کا انکار نہیں کر سکے گا۔ اس دنیا میں تو بعض چیزیں پردہ میں بھی رہ جاتی ہیں اور اس دُنیا کی عدالتوں سے غلطی بھی سرزد ہو سکتی ہے مگر مالک الملک کی عدالت میں ہر چیز نکھر کر سامنے آجائے گی اور نہ کوئی دھوکا دے سکیگا، نہ کوئی چیز پوشیدہ رہ سکے گی اور نہ کوئی وکیل جھوٹ موٹ مِلا کر کسی کو چھڑا سکے گا۔ وہاں ہر عمل کا پورا پورا

بدلہ ملے گا۔ فرمایا اسی مقصد کی تکمیل کے لیے قیامت کا آنا برحق ہے اور یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔

کفار کا انجام

اس کے برخلاف کفار کے انجام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا جن لوگوں نے کفر کیا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں اور قیامت کے دن کا انکار کیا لَھُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ پیاس کے وقت ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔ جب کافر لوگ اس پانی کو حلق سے نیچے اتاریں گے تو وہ ان کی آنتوں کو کاٹ کر باہر پھینک دے گا، اتنا گرم ہوگا۔ اس کے علاوہ فرمایا وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ انہیں نہایت تکلیف دہ سزا ملے گی کیوں؟ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے۔ بلا وجہ کسی کو سزا نہیں دی جاتی۔ اللہ نے فرمایا کہ کافروں کو کھولتا ہوا پانی اور دردناک سزا ان کے کفر کی وجہ سے دی جائیگی۔ ان کے پاس ہمارے رسول آئے کتابیں آئیں، ان کو توحید کی دعوت دی گئی، شرک سے منع کیا گیا اچھے اعمال کی طرف راغب کیا گیا اور اس کے بدلے انہیں خوشخبری سنائی گئی۔ ساتھ ساتھ بُرے افعال کے انجام سے ڈرایا گیا مگر ان لوگوں پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے اللہ کی وحدانیت اور انبیاء کی رسالت کا انکار کیا۔ قرآن پاک کی صداقت وحقانیت کو تسلیم نہ کیا۔ لہٰذا جب لوگ اس مالک الملک کی طرف لوٹائے جائیں گے تو پھر سخت سزا میں مبتلا ہوں گے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات خلق اور تدبیر کا ذکر کیا ہے۔ سفارش کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کا درس دیا ہے اور آخر اہل ایمان اور کفر کی جزا اور سزا کا ذکر فرما کر ان کے انجام سے بھی آگاہ کر دیا

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ
مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ
اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑤
اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ⑥ اِنَّ الَّذِيْنَ
لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا
بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ⑦ اُولٰۗىِٕكَ
مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ⑧ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ⑨
دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا
سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑩ ع ۱

ترجمہ ۵۔ وہی (اللہ) ہے جس نے بنایا ہے سورج کو لو چاند کو
روشنی اور مقرر کی ہیں اس کے لیے منزلیں تاکہ تم جان لو گنتی سالوں
کی اور حساب ۔ نہیں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے اس کو مگر حق کے
ساتھ ۔ وہ تفصیل سے بیان کرتا ہے آیتیں اُن لوگوں کے لیے
جو سمجھ رکھتے ہیں ⑤ بیشک رات اور دن کے اختلاف میں

اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ البتہ نشانیاں
ہیں اُن لوگوں کے لیے جو بچتے ہیں (٦) بیشک وہ لوگ جو نہیں
امید رکھتے ہماری ملاقات کی اور راضی ہو گئے ہیں وہ دنیا کی
زندگی پر مطمئن ہو گئے ہیں وہ اس کے ساتھ۔ اور وہ لوگ جو ہماری
آیتوں سے غافل ہیں (٧) یہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانا دوزخ کی
آگ ہے اس وجہ سے کہ وہ جو کچھ کماتے تھے (٨) بیشک وہ
لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے۔ پہنچائے
گا اُن کو اُن کا پروردگار ان کے ایمان کی وجہ سے۔ جاری ہیں اُن
کے سامنے نہریں۔ نعمتوں کے باغوں میں (٩) اور دُعا اُن کی
اُن باغوں کے اندر یہ ہوگی۔ پاک ہے تیری ذات اے اللہ!
اور ملاقات اُن کی آپس کے اندر سلام ہوگا۔ اور آخری دُعا اُن کی
یہ ہوگی کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا
پروردگار ہے (١٠)

ربطِ آیات

اس سورۃ کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حقانیت کو واضح کیا، پھر نبوت پر اعتراض کرنے والوں کا رد فرمایا اور توحید کے دلائل بیان فرمائے۔ زمین و آسمان کی پیدائش۔ اللہ کی صفات ربوبیت، خالقیت، تدبیر اور اختیار اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دی۔ پھر قیامت کا ذکر فرمایا اور واضح کیا کہ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوکر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے۔ پھر ایمان والوں کے انعامات اور کافروں کے بُرے حشر کا تذکرہ کیا اور بتلایا کہ ارض و سما کی پیدائش دراصل توحید کی دلیل ہے کیونکہ ان تمام چیزوں کا خالق اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

سورج اور چاند

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کے سلسلہ میں عقلی دلیل پیش کی ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ جوہر عقل کو صحیح طور پر استعمال کرے تو وہ اللہ تعالیٰ

کی وحدانیت پرآسانی سے ایمان لاسکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے هُوَالَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے سورج کو چمکدار بنایا وَّالْقَمَرَ نُوْرًا اور چاند کو روشن بنایا۔ اس کائنات میں نہ صرف انسان بلکہ ہر جاندار سورج اور چاند سے مستفید ہو رہا ہے جانداروں کے علاوہ نباتات، پودے، درخت اور کیڑے مکوڑے تک سورج کی ضیاء اور چاند کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نظام شمسی میں سب سے بڑا سیارہ سورج ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی روشنی اور حرارت رکھ دی ہے جو پورے نظام کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح چاند کی دھیمی اور ٹھنڈی روشنی ایک طرف انسانوں کے لیے روشنی مہیا کرتی ہے تو دوسری طرف پھلوں میں مٹھاس پیدا کرنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی خاصیت رکھی ہے کہ یہ انسان کی خدمت پر مامور ہیں۔ اللہ نے سورج کے لیے ضیاء کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی روشنی تیز اور گرم ہوتی ہے اور چاند کو نور فرمایا ہے کہ اس کی روشنی مدہم اور میٹھی ہوتی ہے۔ اس نظام شمسی میں اللہ نے سورج کی روشنی کو مستقل حیثیت دی ہے جب کہ باقی سیاروں کی روشنی سورج سے مستعار ہوتی ہے۔ چاند اور دیگر سیارے بذات خود روشن نہیں ہیں بلکہ جب سورج کی روشنی ان پر پڑتی ہے تو وہ بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے چاند کا مشاہدہ ہم ہر روز کرتے ہیں جب سورج کی روشنی چاند پر پڑتی ہے تو پھر منعکس ہو کر اس کی شعاعیں زمین تک بھی پہنچتی ہیں۔

اب سائنس نے اس حد تک ترقی کر لی ہے کہ سورج کی حرارت (SOLAR - ENERGY سولر انرجی) کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ جس طرح آجکل سوئی گیس عام گھروں میں ایندھن

کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد سورج کی حرارت بھی خاص آلات کے ذریعے استعمال ہونے لگے گی۔ جب گیس کے ذخائر ختم ہو جائیں گے تو اس کی جگہ شمسی توانائی لے لے گی اور پھر اس سے نہ صرف گھروں میں چولھے جلیں گے بلکہ بڑے بڑے کارخانے اور بھٹیاں بھی یہ توانائی استعمال کر سکیں گے۔ اللہ نے سورج میں جلنے کا جو مادہ رکھا ہوا ہے۔ یہ جب تک اللہ کو منظور ہے اسی طرح جلتا رہیگا اور نظام شمسی کی حدود میں روشنی اور حرارت پہنچاتا رہے گا۔

چاند بھی زمین کی طرح ایک ٹھوس کرہ ہے۔ چاند پر بھی بڑے بڑے صحرا، پہاڑ، پتھر اور گڑھے ہیں مگر زمین کے برخلاف اس پر کوئی ندی نالہ نہیں۔ سیارہ چاند بالکل خشک ہے اور اسی لیے وہاں پر زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں۔ جو لوگ اب تک چاند پر پہنچے ہیں وہ پانی اور خوراک کا ذخیرہ زمین سے لے کر گئے ہیں۔ چاند کے بعد دوسرے سیارے مریخ کے متعلق بھی معلومات حاصل کی جا رہی ہیں۔ وہاں پر سبزے کے آثار پائے جانے میں جو وہاں تک پہنچنے کے لیے جو بہت بڑے ذرائع ہو کا اب سائنسدان وہاں کی کچھ تصاویر لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں چاند کے علاوہ باقی سیارے زمین سے بہت دور ہیں جن کی مسافت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی راکٹ اپنی تیز ترین رفتار سے اڑان کرے تو بھی وہاں پہنچنے میں دو سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ بہرحال قدرت کے اس نظام کو انسان عقل کے ذریعے غور و فکر کر کے سمجھ سکتا ہے اور پھر اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔

چاند اور سورج کے مدار

فرمایا چاند کو روشنی بنایا وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ اور اس کے لیے منزلیں مقرر کر دیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چاند کی اٹھائیس ۲۸ منزلیں ہیں اور وہ ہر روز نئی منزل میں ہوتا ہے۔ پھر ایک یا دو دن غائب رہتا ہے

اور اس طرح پورے مہینہ میں اپنی منزلیں طے کر لیتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے سورج کے لیے بھی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔ سورج اپنی حرکت بارہ برجوں میں جاری رکھتا ہے۔ سال بھر اِن منزلوں پر چلنے کی وجہ سے موسمی تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے۔ کبھی گرمی، کبھی سردی، کبھی بہار اور کبھی خزاں۔ اگر سورج پورا سال ایک ہی راستہ پہ چلے تو موسم تبدیل نہ ہوں بلکہ سارا سال ایک موسم رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت کے تحت سورج کی منزلیں مقرر کر دی ہیں جن کی وجہ سے انسان مختلف موسموں میں مختلف ضروریات حاصل کر لیتا ہے۔

فرمایا، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کی ہیں لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کر سکو۔ رات اور دن کا نظام بھی اللہ نے اِن سیاروں کی گردش کے ساتھ منسلک کر رکھا ہے لہٰذا ایک دِن اور ایک رات کی تکمیل پر چوبیس گھنٹے شمار ہوتے ہیں اور پھر ایک ایک دِن کر کے مہینوں، سالوں اور صدیوں کی گنتی معلوم کر لی جاتی ہے۔ اگر دِن اور رات کا تغیر و تبدل نہ ہو تو تقویم کا معلوم کرنا ممکن نہ ہو۔ تمام کاروبار اور عبادات کا نظام دِن رات کے سلسلے سے منسلک ہے دِن کے وقت کام کر کے آدمی تھک جاتا ہے تو رات کو آرام کر کے اگلے دن کے کام کاج کے لیے پھر تیار ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اِس نظام میں بڑی مصلحت رکھی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ چاند اور سورج کو تمہارے تقویم اور حساب کا ذریعہ بنایا۔ ایک حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان موجود ہے کہ اللہ کے اچھے بندے (خِيَارُ عِبَادِ اللّٰهِ) وہ ہیں جو سورج اور چاند کی نقل و حرکت سے اوقات معلوم کر کے اللہ کی عبادت کا اہتمام کرتے ہیں۔ گویا عبادات کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کے ساتھ منسلک کر رکھا ہے

فرمایا مَا خَلَقَ اللّٰہُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس سے پیدا کیا ہے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے زمین اور فلکیات کا سارا نظام اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت اور تدبیر کے ساتھ چل رہا ہے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ اپنی نشانیاں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ جو لوگ عقل و شعور سے کام لیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے، علیم کل ہونے، رب ہونے، معبود ہونے اور واجب الوجود ہونے کو معلوم کر کے ایمان یقین کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کا ایک مربوط نظام قائم کر رکھا ہے کہ صرف اسی میں غور و فکر کر کے انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ نشانیوں کو مفصل بیان کرنے کا یہی مطلب ہے

نشاناتِ قدرت

آگے ارشاد ہوتا ہے اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ بیشک رات اور دن کے اختلاف میں وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ بیشک نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو بچتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ کفر، شرک اور معاصی سے بچ نکلنے والے خوب پہچانتے ہیں کہ ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ اور حکمتِ بالغہ کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ ان میں سے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اور جو لوگ کفار اور مشرکین کی طرح عقل کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتے وہ بہرے اور گونگے ہیں۔ ان کے لیے یہ نشاناتِ قدرت کچھ مفید نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کے عقلی دلائل پیش کیے ہیں کہ صاحبِ عقل و خرد اللہ کی پیدا کردہ مخلوق اور اس کے نظامِ کائنات کو دیکھ کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ اس کو قائم کرنے والا اور چلانے

والا وہی وحدہٗ لاشریک ہے۔

معاد پر ایمان

توحید کے بعد آگے معاد کا ذکر آرہا ہے۔ معاد پر ایمان بھی اجزائے ایمان میں سے ہے۔ اس کے بغیر انسان ایماندار نہیں ہوسکتا۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا بیشک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے ہر عمل کا جواب دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ آخرت کے لیے کوئی تیاری نہیں کریں گے، وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہے اسی دُنیا میں ہے۔ آگے کون پوچھے گا انکے دلوں میں شیطان نے ایسا وسوسہ ڈال دیا ہے کہ نہ وہ قیامت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ جزا اور سزا پر۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی دنیا میں کھاپی لو، آگے کچھ نہیں ہے۔ سورۃ المؤمنون میں اس طرح بیان کیا گیا ہے اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ دنیا کی زندگی اتنی ہی ہے کہ ہم مرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں مگر دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ دوسرے مقام پر اس طرح آتا ہے کہ جو لوگ آخرت کے عقیدے پر ایمان نہیں رکھتے وہی لوگ اکثر کفر اور شرک بھی کرتے ہیں اور برائیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اُن کا یہی عقیدہ اُن کی نیکی کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پھر وہ نہ تو کوئی اچھا کام کرتے ہیں اور نہ کسی ظلم و زیادتی سے بچتے ہیں کیونکہ اُن کا محاسبے کے عمل پر یقین ہی نہیں ہوتا۔ اگر انہیں جواب دہی پر یقین ہوتا تو وہ برائیوں سے بچ جاتے۔ یہاں پر رجی کا لفظ آیا ہے جس کا معنیٰ اُمید بھی ہوتا ہے اور خوف بھی جیسے سورۃ نوح میں ہے مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے وقار سے خوف نہیں کھاتے۔ تاہم یہاں پر یرجون کا معنیٰ اُمید ہی زیادہ موزوں

ہے یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی اُمید ہی نہیں رکھتے۔

دنیا اور آخرت کا تقابل

فرمایا ایک تو وہ قیامت پر یقین نہیں رکھتے اور دوسری بات یہ ہے وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وہ دنیا کی زندگی پر ہی راضی ہو گئے ہیں اُن کی ساری تگ و دو اسی دنیا کی زندگی کے لیے ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (الروم) وہ دنیا کے ظاہری حالات کو خوب جانتے ہیں" وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ" مگر آخرت کے بارے میں یکسر غافل ہیں۔ فرمایا جو لوگ ہماری ملاقات پر یقین نہیں رکھتے اُن کی تیسری صفت یہ ہے وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا اور اس زندگی کے ساتھ ہی مطمئن ہو گئے ہیں۔ وہ اسی دنیا کو اپنا مقصود و منتہا بنائے بیٹھے ہیں۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کی دعا منقول ہے اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَایَةَ رَغْبَتِنَا اے اللہ! دنیا کو ہمارا بڑا مقصد نہ بنا اور نہ اسے ہمارے علم کی انتہائی پہنچ بنا اور نہ ہماری رغبت کی منتہا بنا کہ ہم آخرت سے غافل ہو کر رہ جائیں۔ اور چوتھی بات یہ فرمائی وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔ ہماری نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ اگر ذرا بھی دھیان دیں تو انہیں توحید کے بے شمار دلائل مل جائیں مگر وہ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں

الغرض! اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قیامت کے منکرین کی چار قباحتیں بیان فرمائی ہیں کہ ایک تو وہ ہماری ملاقات پہ یقین نہیں رکھتے، دوسرا اس دنیا کی زندگی پہ راضی ہو گئے ہیں۔ تیسرا اس دنیا کے ساتھ مطمئن ہو گئے اور کہتے ہیں رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ" (ص) اے ہمارے رب ہمیں قیامت سے پہلے ہی

ہی جو کچھ دیتا ہے دے دے۔ اور چوتھی قباحت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے غافل ہیں۔ اُن کے اردگرد قدرت کے ہزاروں نشانات بکھرے پڑے ہیں مگر وہ ان سے بالکل غافل پڑے ہیں ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ اُن کا ٹھکانا دوزخ میں ہے۔ اس وجہ سے کہ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ جو کمائی انہوں نے کی۔ اس دُنیا کی زندگی میں انہوں نے اپنے ذہنوں میں اعتقاد فاسد کو جمایا۔ کفر، شرک، اور معاصی کا ارتکاب کر کے خدا کے قانون کو توڑا، لہٰذا اُن کا ٹھکانا جہنم میں ہوگا۔ یہ معاد کا ذکر بھی ہوگیا۔

اہل ایمان کے لیے انعامات

اب منکرین کے مقابلے میں ایمان والوں کا ذکر ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے۔ اللہ کی وحدانیت کو صحیح طریقے سے مانا اور کفر و شرک سے بیزاری کا اعلان کیا۔ نبی کی نبوت پر، خدا کی کتاب پر، ملائکہ پر اور تقدیر پر ایمان لائے۔ اللہ کے رسول کی مسلّمہ باتوں پر یقین لائے، اور اس کے علاوہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ نیک اعمال بھی انجام دیے۔ نماز اور روزہ کی پابندی کی، حج اور زکوٰۃ کو ادا کیا۔ صدقہ و خیرات کیا، انسانوں کے ساتھ نیکی کی، مصیبت میں صبر اور راحت میں شکر ادا کیا۔ جہاد میں حصہ لیا۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ اللہ تعالیٰ اُن کے ایمان کی وجہ سے اُن کی راہنمائی کرے گا۔ تمام اعمال کا دار و مدار ایمان پر ہے اگر ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ ہیں تو ان کا پروردگار راہنمائی کرے گا۔ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ نعمت کے باغوں میں، اور وہ ایسے باغ ہوں گے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی۔ اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ نے جنت کی خوشخبری بھی سُنا دی۔

اہل جنت کی تسبیحات

فرمایا جب اہل ایمان راحت کے مقام میں پہنچیں گے تو دَعْوٰھُمْ

فِيهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ تو وہاں اُن کی دُعا یہ ہوگی۔ اے اللہ! تیری ذات پاک ہے۔ اللہ کی یہ تسبیح غیر ارادی طور پر جنتیوں کی زبان پر جاری ہو جائے گی۔ جنت میں کسی مالی یا بدنی عبادت کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ صرف قولی عبادت ہوگی جو کہ تسبیحات کی صورت میں اُن کی زبانوں سے ادا ہو گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ تسبیح اہلِ جنت کو الہام کی جائیگی اور وہ ہر وقت سبحان اللہ، الحمد للہ وغیرہ کا ورد کرتے رہیں گے۔ جس طرح سانس انسان کو الہام کیا گیا ہے اور وہ غیر ارادی طور پر ہر وقت اور ہر حالت میں سانس لیتا رہتا ہے۔ اسی طرح اہلِ جنت اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل بیان کرتے رہیں گے۔ اے پروردگار! تیری ذات ہر عیب، نقص، شرکت کمزوری اور عجز سے پاک ہے۔

سلامتی کے کلمے

فرمایا جنتیوں کی ایک صفت یہ بھی ہوگی وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ وہاں پر اُن کی ملاقات سلام سے ہوگی۔ جب جنت والے ایک دوسرے کو ملیں گے تو ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔ جب فرشتوں سے ملاقات ہوگی تب بھی سلام ہوگا۔ اُدھر اللہ تعالیٰ فرمائیگا۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ اے میرے بندو! تم پر سلام ہو۔ سورۃ یٰس میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر سلام ہو۔ غرضیکہ ہر ملاقات سلام کے ساتھ ہوگی۔ اور اس کے علاوہ ہر مجلس میں اُن کی آخری دُعا یہ ہوگی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ بیشک تمام تعریفیں اُس اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ دنیا کے سارے سامان بھی اسی نے بنائے ہیں اور ابدی راحت کے مقام جنت میں بھی یہی مہربانی فرمائے گا۔ لہٰذا تمام کی تمام تعریفیں اسی ذات کے لیے ہیں۔

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کے نقلی

دلائل پیش کر دیئے ہیں اور ساتھ ساتھ قیامت کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ اس ضمن میں قیامت کے دن پر ایمان لانے والے اور اس کے منکرین کا مال بھی علیحدہ علیحدہ بیان فرما دیا ہے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ
إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي
طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١﴾ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا
لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ
لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا
وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ
كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٣﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ
فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾

ترجمہ:- اور اگر اللہ تعالیٰ جلدی کرے لوگوں کے لیے برائی کو جیسے کہ وہ جلدی طلب کرتے ہیں خیر کو۔ تو البتہ فیصلہ کر دیا جائے اُن کی طرف اُن کی عمروں کا۔ پس ہم چھوڑتے ہیں اُن لوگوں کو جو نہیں امید رکھتے ہماری ملاقات کی وہ اپنی سرکشیوں کے اندر ہی سرگرداں ہو رہے ہیں (۱۱) اور جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف تو وہ پکارتا ہے ہمیں اپنی کروٹ کے بل بھی اور بیٹھے ہوئے بھی اور کھڑے بھی۔ پس جب ہم کھول دیتے ہیں اُس سے اُس کی تکلیف کو تو وہ گذر جاتا ہے گویا کہ اُس نے ہمیں پکارا نہیں کسی تکلیف کے لیے جو اسکو پہنچی تھی۔ اسی طرح مزین کیا

ہے مسرفوں کے لیے وہ جو کچھ وہ کیا کرتے تھے (۱۲) اور البتہ
تحقیق ہم نے ہلاک کیا ہے کئی قوموں کو تم سے پہلے جب کہ
انہوں نے ظلم کیا اور آئے اُن کے پاس اُن کے رسول کھلی
نشانیاں لے کر اور نہیں تھے وہ لوگ کہ ایمان لاتے ۔ اسی طرح
ہم بدلہ دیتے ہیں اُن لوگوں کو جو مجرم ہوتے ہیں (۱۳) پھر
ہم نے بنایا ہے تم کو نائب زمین میں اُن کے بعد تاکہ ہم دیکھیں
کہ تم کیا عمل کرتے ہو (۱۴)

ربطِ آیات

قرآن کریم کی حقانیت اور پھر رسالت کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے توحید کے عقلی اور نقلی دلائل ذکر کئے۔ اس کے بعد قیامت کا مسئلہ بھی بیان فرمایا اور ایمان والوں کی اُس کامیابی کا ذکر کیا جو انہیں اللہ کے ہاں حاصل ہونے والی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے منکرین قیامت کا ذکر کیا جو اسی دنیا پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور اسی کو اپنا منتہائے مقصود سمجھ رہے ہیں۔ اللہ نے اُن کی ناکامی اور ان کو ملنے والی سزا کا ذکر بھی کیا۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کا شکوہ بیان کیا ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے آگے گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہیں، مگر جب اللہ اُس تکلیف کو دُور فرما دیتا ہے تو اللہ کا شکریہ تک ادا نہیں کرتے بلکہ اس طرح گزر جاتے ہیں۔ جیسے انہوں نے کسی تکلیف کے ازالے کے لیے کوئی دُعا کی ہی نہ ہو۔

جلد بازی کا نتیجہ

ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ اور اگر اللہ تعالیٰ جلدی کرے لوگوں کے لیے برائی کو جیسا کہ وہ خیر کو جلدی طلب کرتے ہیں تو اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ مطلوبہ چیز انہیں جلدی سے مہیا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اکثر جلدی بھی عطا کر دیتا ہے۔ پھر بعض اوقات انسان حالات سے بد دل ہو کر برائی کے لیے بھی ہاتھ اٹھاتے ہیں اور اس کے لیے بھی وہ جلدی کرتے ہیں، تو ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس طرح انہیں اچھی چیز جلدی مل جاتی ہے اسی طرح اگر بری

چیز بھی فوراً دے دی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو لَقُضِیَ اِلَیْھِمْ اَجَلُھُمْ تو ان کی عمروں کا فوراً ہی خاتمہ ہو جائے اور وہ ہلاک ہو جائیں۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کی ناشکری، کفران نعمت اور جلد بازی کا ذکر فرمایا ہے اپنے حق میں بددعا کرنے کا ذکر سورۃ انفال میں بھی ہو چکا ہے اللہ کا فرمان ہے کہ کفار و مشرکین پیغمبر اور قرآن پاک کی مخالفت میں اس حد تک دور نکل جاتے تھے کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ اپنے حق میں بددعا کرتے تھے "وَاِذْ قَالُوا اللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ" کہتے تھے کہ اے اللہ! اگر یہ پیغمبر اور قرآن حکیم برحق ہیں تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب بھیج دے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں یہ بھی موجود ہے اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے کیونکہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے لائے ہوئے دین کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ نبی علیہ السلام سے کہتے کہ اگر آپ دعویٰ نبوت و رسالت میں سچے ہیں، اگر واقعی قیامت آنے والی ہے تو پھر ہمارے سروں پر آسمان کا ٹکڑا گرا دے تاکہ تیری صداقت واضح ہو جائے اس آیت کریمہ میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا کہ انسان بھلائی کا تو ہر وقت طلبگار رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے مال و دولت میں اضافہ ہو۔ ہر طرح کا آرام و راحت حاصل ہو مگر جب تنگ دل ہو کر کسی وقت سزا کی دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جلد بازی نہیں کرتا، وگرنہ وہ فوراً ہلاک ہو جائے۔ دوسرے مقام پر اللہ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے گناہوں کے سبب ان کو فوراً پکڑنے تو زمین پر چلتا پھرتا کوئی انسان اور جانور نظر نہ آئے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی کمال مہربانی اور لطف و کرم ہے کہ وہ فوراً گرفت

نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا ہے۔ اگر انسانوں کی طرح وہ بھی جلد بازی کرے تو سب کو ہلاک کر دے۔

بد دعا کی ممانعت

حدیث شریف میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تنگ دِل ہو کر اپنے خلاف، اپنی اولاد کے خلاف اور اپنے اموال کے خلاف بد دعا نہ کیا کرو، کہیں یہ بد دعا اُس گھڑی کے موافق نہ ہو جائے جس میں دُعا قبول ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے بھی ہیں کہ انسان دُعا کرتا ہے تو ضرور قبول ہو جاتی ہے اسی لیے فرمایا لَا تَدْعُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ وَلَا عَلٰٓى اَوْلَادِكُمْ وَلَآ اَمْوَالِكُمْ لَا تُوَافِقُ سَاعَةً فَيُسْتَجَابُ (مسلم شریف) بہرحال حضور علیہ السلام نے بد دعا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اگر ایسی دُعا قبول ہو گئی تو نقصان ہو جائے گا۔

قانون امہال و تدریج

آگے ارشاد ہوتا ہے فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ہم چھوڑتے ہیں اور مہلت دیتے ہیں اُن لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے۔ ملاقات سے مراد مرنے کے بعد زندہ ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور پیشی ہے۔ فرمایا جو لوگ قیامت کے عمل کے منکر ہیں ہم اُن کو چھوڑتے ہیں اس حال میں فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ کہ وہ اپنی سرکشیوں میں ہی سرگرداں ہو رہے ہیں۔ یہ مہلت دینے کی بات ہو رہی ہے جسے قانونِ امہال و تدریج سے تعبیر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اکثر مہلت دیتا ہے کیونکہ وہ حلیم اور غفور ہے۔ یہ اُس کی مہربانی اور لطف کا نتیجہ ہے کہ اِس دنیا میں مجرم بھی پھلتے پھولتے رہتے ہیں اور پھر خدا تعالیٰ خاص وقت پر اُن کی گرفت کرتا ہے کیونکہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (البروج) فرمایا تیرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔ مولانا رومؒ بھی تو کہتے ہیں ؎

تو مشو مغرور بر حلم خدا
دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

اللہ تعالیٰ کی بردباری پر تمہیں مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ دیر سے پکڑتا ہے مگر سختی سے پکڑتا ہے۔ اللہ کے اس قانون امہال و تدریج کو قرآن پاک میں کثرت سے بیان کیا گیا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ نافرمانوں کی مہلت سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے اور نہ انہیں اللہ کا محبوب سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ تو خدا تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت ہے۔ بخاری شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ جب تم دیکھو کہ کوئی شخص نافرمانی میں بڑھ رہا ہے اور خدا تعالیٰ اُسے انعام واکرام سے نواز رہا ہے تو ہرگز دھوکا نہ کھاؤ کیونکہ یہ تو استدراج ہے۔ کسی نہ کسی وقت یہ آدمی ضرور پکڑا جائے گا۔ اگر زندگی میں اس کی گرفت نہ بھی ہوئی تو مرنے کے بعد فوراً گرفت ہو جائے گی۔ بہرحال نافرمانوں کے لیے مہلت اللہ تعالیٰ کی بردباری اور تحمل کی وجہ سے ہوتی ہے۔

شرک پر اصرار

فرمایا دیکھو! انسان کا حال یہ ہے وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے دَعَانَا لِجَنْبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا تو پھر وہ ہمارے سامنے دُعا کرتا ہے خواہ کروٹ کے بل (لیٹا ہوا) ہو یا بیٹھا ہو یا کھڑا ہو۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور ظاہری اسباب ناکام ہو جاتے ہیں تو انسان اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ انسان اس پر قائم رہے اور مصیبت میں اللہ ہی کو پکارے، اُس کو نافع اور ضار سمجھ کر مشکل کشائی کی درخواست کرے۔ مگر افسوس کہ انسان کی یہ حالت قائم نہیں رہتی فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ جب ہم اس کی تکلیف کو رفع کر دیتے ہیں مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ

تو وہ ایسے گزر جاتا ہے کہ اُس نے ہمیں کسی تکلیف کے وقت پکارا ہی نہیں۔ تکلیف کے دُور ہو جانے پر وہ اس طرح بھول جاتا ہے کہ نہ اُسے کبھی تکلیف آئی اور نہ اُس نے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ یہ انسان کی خود غرضی اور لاپرواہی کی انتہا ہے۔ سورۃ نحل میں اس طرح آتا ہے۔ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ پھر جب تم سے تکلیف دور ہو جاتی ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے جب تکلیف پیش آتی ہے تو خدا تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ مہربانی فرما کر تکلیف کو رفع کر دیتا ہے تو اس کا اعزاز غیر اللہ کو دیتے ہیں اور اُن کے نام کی نذر و نیاز دینے لگتے ہیں اور پھر وہی کفریہ اور شرکیہ رسوم شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کے سامنے مثالیں موجود ہیں۔ تکلیف رفع ہوئی تو فوراً دیگ پکا کر داتا صاحب کے دربار پر حاضر ہو گئے مشکل اللہ نے حل فرمائی مگر شکریہ داتا صاحب کا ادا کیا جا رہا ہے۔ سورۃ عنکبوت میں موجود ہے کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو بحفاظت پار اترنے کے لیے خالص اللہ کو پکارتے ہیں فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ پھر جب خشکی پر پہنچ جاتے ہیں تو اللہ کے شریک ٹھہرانے لگتے ہیں کبھی خواجہ اجمیری کے نام کی نذر ہوتی ہے اور کبھی پیران پیر کو نیاز پیش کی جاتی ہے۔ یہ شرک پر اصرار نہیں تو اور کیا ہے اکثر لوگوں کا یہی حال ہے۔ تاہم بعض کامل الایمان لوگ بھی ہیں جو ہر خیر و شر کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ تکلیف میں اُسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور راحت میں اسی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ مومن کی حالت عجیب ہے کہ اَمْرَ الْمُؤْمِنِ كُلَّهٗ خَيْرٌ

مومن کے لیے ہر حالت ہی بہتر ہوتی ہے اِذَا اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ فَصَبَرَ جب اُسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے وَاِذَا اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ اور جب اسے کوئی راحت ملتی ہے تو یہ اس کیلئے بہتر ہوتی ہے وہ دونوں حالتوں میں اپنا توازن قائم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو کسی وقت بھی نہیں بھولتا۔

مسرفین سے شکوہ

فرمایا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اسی طرح مزین کیا گیا ہے مسرفوں کے لیے جو کچھ وہ کام کرتے ہیں۔ کفر، شرک، وہ بدعت کا ارتکاب کرنے والوں کو شیطان ان کے کام مزین کر کے دکھاتا ہے۔ یہ لوگ حد سے بڑھے ہوئے ہیں جو ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرتے ہیں۔ شکر کی بجائے ناشکری کو اپناتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے بُرے اعمال کو ہی خوشنما سمجھ کر اُن پر عمل کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے یہ شکوہ کیا ہے۔

سابقہ اقوام کی ہلاکت

فرمایا وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ اسی طرح ہم نے تم سے پہلی قوموں کو ہلاک کیا لَمَّا ظَلَمُوْا جس وقت انہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا۔ قرون قرن کی جمع ہے جس کا معنیٰ طبقہ، سنگت، قوم یا جماعت ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ ہم نے بہت سی پہلی قوموں فرقوں یا پارٹیوں کو اُن کے ظلم کی پاداش میں ہلاک کیا۔ یاد رکھو! اگر تم بھی ظلم کا ارتکاب کرو گے تو خدا کا قانون وہی ہے، وہ تمہیں بھی ہلاک کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کچھ مدت کے لیے مہلت دے دے۔ مگر ظلم کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہی نکلے گا۔ کفر، شرک، بدعت اور معاصی کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلے گا۔ فرمایا جنہوں نے ظلم کیا، ان کو ہم نے ہلاک کیا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ اُن کے پاس ہمارے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ اُن کو واضح ہدایات اور معجزات پیش کیے۔ انبیاء کرام نے اپنی تقاریر و مواعظ میں بڑے واضح دلائل کے ساتھ خدا کی

وحدانیت کی طرف دعوت دی وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا مگر وہ لوگ ایمان نہ لائے۔ انہوں نے خدا کے انبیا، کتب، ملائکہ اور معاد کا انکار ہی کیا۔ اپنی زبانوں سے کہتے تھے کہ جاؤ، ہم نہیں مانتے۔ جو قیامت یا عذاب ہم پر لاتا ہے لے آؤ۔ فرمایا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ہم مجرموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ جو لوگ برائی پر ڈٹ جاتے ہیں، ظلم کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں، شقاوت میں پختہ ہو جاتے ہیں اور سعادت سے محروم ہو جاتے ہیں تو ان کو سزا بھی ایسی ہی ملتی ہے اچھائی کی توفیق سلب ہو جانا بذاتِ خود بہت بڑی سزا ہے۔ اور پھر آگے چل کر دوزخ کے ہاں سخت ترین عذاب ہے جو مجرمین کے لیے تیار کیا گیا ہے سابقہ اقوام کا حال اللہ نے بیان فرمایا کہ نافرمانی کی بنا پر بعض لوگ ہلاک ہوئے اور بعض طبعی موت مر کر ختم ہو گئے اور اب اُن میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔ فرمایا اے موجودہ وقت کے لوگو! ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ پھر اُن کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں نائب بنایا۔ اب تمہیں اللہ نے موقع دیا ہے آج سے سو سال پہلے جو لوگ تھے، وہ تو ختم ہو گئے۔ اب تم ان کے جانشین ہو، اُن کی جگہ تمہیں لاکر اللہ تعالیٰ اب تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔ حکومتوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ پہلے حکمران ختم ہو گئے، ان کی جگہ حکومت کی باگ ڈور نئے لوگوں نے سنبھالی، اب یہ اُن کا امتحان ہے۔ اللہ نے فرمایا، ہم نے زمین کی خلافت اب تمہیں دی ہے لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔ کیا تم بھی پہلے لوگوں کا راستہ اختیار کر کے ہلاکت کی طرف جاتے ہو یا نیک اعمال کر کے خلافت کا صحیح حق ادا کرتے ہو لِنَنْظُرَ کا معنی ہے تاکہ ہم دیکھیں۔ ہمگر اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے دیکھ رہا ہے اور اسے ہر چیز

موجودہ قوم کی آزمائش

اُس کی نگاہ میں ہے گی۔ اس لیے یہاں پر دیکھنے کا معنی ظاہر کرنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ظاہر کر دے گا کہ پہلے لوگوں نے ایسے کام کیے اور اب تم نے یہ کچھ کیا ہے۔

دنیا اور عورت کا فتنہ

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے اِتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ اے لوگو! دنیا سے بچتے رہو اور عورتوں کے معاملات سے بچتے رہو۔ کیونکہ اِنَّ اَوَّلَ فِتْنَةِ فِیْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ فِی النِّسَاءِ کیونکہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلے فتنہ عورتوں ہی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ عورتوں کے حقوق ادا کرو۔ اُن کو فحاشی کے راستے پر مت ڈالو۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ آج عورتوں کو ممبر بنایا جا رہا ہے۔ وزارتیں پیش کی جاتی ہیں۔ آج کی عورتیں کھیل تماشے کے تھیٹروں کی زینت بن رہی ہیں مگر کسی کو کچھ پرواہ نہیں۔ اُدھر جب قرآن و سنت کی بات آتی ہے قانونِ شہادت کا اسلامی قانون نافذ ہوتا ہے تو عورتیں سڑکوں پر نکل آئی ہیں اور مطالبہ کرتی ہیں کہ انہیں بھی مردوں کے برابر گواہی کا حق ملنا چاہیئے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ شہادت کے معاملہ میں دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہیں اور یہ بھی دیوانی مقدمات میں ہے ورنہ عائلی معاملات اور فوجداری مقدمات میں عورت کی شہادت بالکل قابلِ قبول نہیں۔ اللہ نے مرد کے مقابلے میں عورت کی آدھی شہادت کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ فطرتاً نسیان والی ہیں۔ اس لیے دو عورتوں کی شہادت بدیں وجہ ضروری ہے کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔ مگر عورتوں کو اللہ کا حکم پسند نہیں، وہ احکامِ خداوندی کے خلاف احتجاج کر کے ———————— خدا کے غضب کو دعوت دے رہی ہیں۔ عورتوں کو اس مقام تک پہنچانے میں مردوں ہی کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے عورتوں کو اس راستے پر ڈالا۔ وہی انہیں

دنیا کی نصف آبادی اور ایک گاڑی کے دو مساوی پہیے بنتے ہیں اور پھر خود ہی اُن کے نام نہاد حقوق کے پاسبان بن جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے بھائی! جو حقوق اللہ اور اس کے رسول نے عورت کو نہیں دیے وہ تم دلا دو اور پھر اس کا نتیجہ بھی تمہارے سامنے ہے کہ ہر طرف بے حیائی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ دنیا اور عورتوں کے فتنے سے بچتے رہو۔

تمہارے سامنے انگریزوں اور یورپین اقوام کی مثالیں موجود ہیں۔ کیا وہ عورت کو حد درجہ آزادی دے کر کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں؟ اس میں بے شمار قباحتیں ہیں۔ ہمارے ہاں تو پھر بھی کسی حد تک سکون ہے، یہاں پر اللہ اور اس کے دین کے نام لیوا موجود ہیں جو عورت کی بے راہ روی اور نام نہاد آزادی میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں مگر امریکہ اور یورپ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں اطمینان اور سکونِ قلب نام کی کوئی چیز نہیں۔ وہ محلات میں رہتے ہوں یا بڑے بڑے ہوٹلوں کی زینت ہوں، جدید تمدن نے انہیں بہت ذلیل کیا ہے۔ اُن کے اپنے فلاسفر اپنی تہذیب پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ وہاں نیکی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ بدکاری کی وجہ سے نسلیں خراب ہو چکی ہیں اور بداخلاقی حد کو پہنچ چکی ہے۔

حکومت بطور امانت

بہرحال جس جماعت کو یا قوم کو حکومت مِل جائے، وہ اس کے پاس بطور امانت ہوتی ہے۔ حکومتی معاملات میں من مانی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اللہ کے دین کو نافذ کرنا چاہیئے۔ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم لوگوں کے حقوق کس حد تک ادا کرتے ہو اور حکومت کی ذمہ داری کیسے سنبھالتے ہو؟ فرمایا تم دنیا کے نظامِ حکومت میں ممبر بن جاؤ، وزیر یا صدر بن جاؤ ثُمَّ تَكُونُ حَسْرَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ پھر یہ چیزیں قیامت کو تمہارے لیے حسرت کا باعث ہوں گی۔ تم افسوس

کروگے کہ یہ ذمہ داری نہ اٹھائی ہوتی۔ ہماری زندگی ہمارے پاس امانت ہے
پہلوں نے اس امانت کا حق ادا نہیں کیا تو وہ ہلاک ہوئے۔ اب تم
اُن کے جانشین ہو۔ تمہارے اعمال کی بھی آزمائش ہوگی اور پھر تم
پہ واضح کر دیا جائے گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ
لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ
لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ
إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾
قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ
فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾
فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ
بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾

ترجمہ:۔ اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر ہماری آیتیں واضح تو کہتے ہیں وہ لوگ جو نہیں اُمید رکھتے ہماری ملاقات کی کہ لے آ ہمارے پاس قرآن کے علاوہ یا اِس کو تبدیل کر دے۔ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ نہیں ہے میرا کام کہ میں اِس کو تبدیل کروں اپنی طرف سے۔ نہیں پیروی کرتا میں مگر اس چیز کی جو وحی کی جاتی ہے میری طرف۔ میں خوف کھاتا ہوں بڑے دن کے عذاب سے اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی ﴿۱۵﴾ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ اللہ چاہتا تو میں نہ تلاوت کرتا اِس کو تم پر اور نہ وہ خبر دیتا تم کو اس کی۔ پس بیشک میں ٹھہرا ہوں تمہارے

درمیان تم کا ایک حصہ اس سے پہلے۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے (۱۶)
پس کون زیادہ ظالم ہے اُس سے جو افترا باندھے اللہ پر جھوٹا
یا جھٹلائے اُس کی آیتوں کو۔ بیشک نہیں فلاح پائیں گے جرم
لوگ (۱۷)

ربطِ آیات

سورۃ یونس مکی دور کے آخر میں نازل ہوئی۔ اس کا مرکزی مضمون قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت ہے۔ سورۃ کی ابتدائی آیت میں ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حقانیت کا ذکر فرما دیا تھا۔ اس کے بعد دو مسئلے بیان ہوئے۔ ایک توحید کے عقلی دلائل کا اور دوسرا قیامت اور جزائے عمل کا۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حقانیت بیان کی ہے اور اس کے ساتھ رسالت کی صداقت کو بھی عقلی دلیل سے ثابت کیا ہے۔

آیاتِ بینات

چنانچہ قریش مکہ کے ساتھ مکالمے کا ذکر ہو رہا ہے وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ جب اُن پر ہماری واضح واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ یہ اُس کتاب کی آیات کا ذکر ہے جس میں تمام بنیادی عقائد موجود ہیں اور جو اس زندگی سے متعلق تمام احکام، مسائل اور دلائل پر مشتمل ہے۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر بنیادی مسائل ہی کا ذکر ہے جن میں توحید کے دلائل، کتاب الٰہی پر ایمان، نزولِ وحی اور اس پر ایمان، ملائکہ اور تقدیر پر ایمان، اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان اور حیات بعد الممات کی تفصیلات آتی ہیں۔ تو فرمایا کہ جب ہماری واضح آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جن میں قرآن پاک کی حقانیت اور توحید باری تعالیٰ کی ہزاروں لاکھوں نشانیاں موجود ہیں۔ اُن کے گرد و پیش میں بے شمار دلائل بکھرے پڑے ہیں۔ قرآن پاک اور اللہ کا پیغمبر اُن کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اگر ذرا بھی ان دلائل پر غور کر لو تو معاملہ صاف ہو جائے گا اور تمہیں اللہ کی ذات و صفات پر ایمان لانے میں کوئی مشکل باقی نہیں رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جتنے بھی نبیاء اس دنیا میں مبعوث فرمائے ہیں، سب نے اپنی اپنی اقوام کے

سامنے ہمیشہ واضح بات ہی کی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں قرآن پاک میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا، لوگو! میری بات کو اچھی طرح سمجھ لو ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً (یونس) اس بارے میں تمہیں کوئی اشتباہ نہیں رہنا چاہیئے۔ میں بالکل صاف بات کر رہا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا ضروری ہے اور شرک نہایت ہی قبیح چیز ہے جس سے بچنا لازمی ہے۔ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ وضاحت کی ہے۔ مسئلہ رسالت کو بھی بالوضاحت بیان کیا ہے اور پھر معاد کے ضمن میں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا ہے قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

معاد سے انکار

فرمایا جب اُن کے سامنے واضح آیات کی تلاوت کی جاتی ہے۔ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا تو جن لوگوں کو ہماری ملاقات کا یقین نہیں ہے یعنی وہ وقوع قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ حیات بعد الممات کے قائل نہیں ہیں، اُن کا جواب یہ ہوتا ہے جو آگے آرہا ہے قیامت پر ایمان لانا بنیادی اجزائے ایمان میں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے ایمان کے کسی ایک جزو کا بھی انکار کیا اُس نے مکمل طور پر کفر کیا۔ جب لوگ دنیا میں قبیح اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں اور انہیں اُن کے برے انجام سے ڈرایا جاتا ہے تو وہ بجائے اس کے اپنی اصلاح کر لیں۔ وہ وقوع قیامت، حساب کتاب اور جزا سزا کا ہی انکار کر دیتے ہیں اور ڈرانے والوں کو کہتے ہیں کہ یہ سب تمہارے خود ساختہ افسانے ہیں، کوئی قیامت نہیں آئے گی، نہ کوئی دوبارہ زندہ ہوگا اور نہ کسی کا حساب کتاب ہوگا۔ اس بات کو قرآن پاک میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ کہیں فرمایا کہ جب ہم فنا ہو جائیں گے، ہماری ہڈیاں بکھر جائیں گی، ہمارے جسم کے ذرات منتشر ہو جائیں گے تو پھر کون انہیں

اکٹھا کرے گا؟ کہتے تھے کہ آج تک تو کسی کو مر کر زندہ ہوتے نہیں دیکھا
بہرحال یہاں ملاقات سے ناامید ہونے سے مراد قیامت کا انکار
لیا گیا ہے۔

رَجَا کا معنیٰ ایک تو اُمید ہے اور دوسرا خوف بھی ہے۔ جیسے سورۃ نوح میں ہے مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت اور وقار سے خوف ہی نہیں کھاتے۔ تو اس مقام پہ خوف کا معنیٰ بھی لیا جا سکتا ہے اور پورے جملہ کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ لوگ جو اللہ کی ملاقات سے خوف نہیں کھاتے وہ اس طرح کرتے ہیں۔ ان کا بیان آیت کے اگلے حصے میں آرہا ہے تاہم مفسرین کرام یہاں پر زیادہ تر رَجَا کو اُمید کے مضمون میں ہی لیتے ہیں کہ ان لوگوں کو اللہ کے حضور پیش ہو کر جوابدہی کی اُمید ہی نہیں کہ کوئی ایسا وقت بھی آنے والا ہے۔

قرآن میں ترمیم کی خواہش

فرمایا جو لوگ ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے۔ وہ کہتے ہیں اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اس کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن پاک لے آؤ اَوْ بَدِّلْهُ یا اگر مکمل طور پر کوئی دوسرا قرآن نہیں لا سکتے تو اسی کو تھوڑا بہت تبدیل کر دو۔ مشرکین مکہ کا مقصد یہ تھا کہ اس قرآن کریم کی بعض باتیں تو ہم مان لیتے ہیں اور بعض کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا اس میں جو چیزیں ہماری مرضی کے خلاف ہیں یا تو اُن کو تبدیل کر دو یا سرے سے ہماری مرضی کا قرآن لے آؤ تو ہم تسلیم کر لیں گے۔

باقی رہی یہ بات کہ اُن لوگوں کو قرآن حکیم کی کونسی باتوں پر اعتراض تھا جو وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اخلاقیات کو تو وہ مانتے تھے کہ یہ بہت اچھی باتیں ہیں۔ قرآن پاک میں پند و نصائح ہیں مگر جب اُن کے عقیدے پر زد آتی تھی تو وہ انکار کر دیتے تھے کیونکہ وہ اپنے جاہلانہ

اور شرکانہ عقائد کو چھوڑنے کے لیے قطعی تیار نہ تھے۔ سورۃ انبیاء میں حضرت ابراہیم کے بت شکنی کے واقعہ میں آتا ہے کہ جب آپ نے کفار کو ہر طرح لاجواب کر دیا اور بتوں کی مذمت سے باز نہ آنے کی حامی نہ بھری تو کہنے لگے حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ "ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلا دو اور اس طرح اپنے معبودوں کی مدد کرو، ورنہ دلائل کے اعتبار سے یہ نوجوان ہمارے بتوں کی پوجا چھڑا دیگا۔ بھلا ہم ان بتوں کو کیسے چھوڑیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں۔ مشرکین مکہ بھی یہی بات کہتے تھے کہ ہمارے بتوں کی مذمت نہ کرو، پھر ہم تمہاری بات سننے کے لیے تیار ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ آؤ ہمارے ساتھ سمجھوتہ کر لو۔ کچھ تمہاری باتیں ہم مان لیتے ہیں اور کچھ ہماری باتیں تم مان لو۔ سورۃ قلم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ یعنی مشرکین چاہتے تھے کہ آپ تھوڑا سا نرم ہو جائیں۔ ہمارے معبودوں کے معاملہ میں سختی نہ کریں تو ہم بھی آپ کی بعض باتیں تسلیم کر لیں گے۔ بہرحال ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یا تو سرے سے پورا قرآن بدل دو یا اسی میں بعض ترامیم کر کے ہماری منشا کے مطابق کر دو۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اس قرآن پاک کو بدلنا میرا کام نہیں ہے یعنی اس میں تغیر و تبدل کا مجھے ہرگز اختیار نہیں بلکہ مخلوق میں سے کوئی بھی ذات ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو تبدیل کر سکے۔ ایسا کرنا تو خدا تعالیٰ کے ساتھ بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔ اپنے کسی حکم کو تبدیل کرنا یا اسے منسوخ کر دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ سورۃ بقرہ میں اس کا یہ قانون موجود ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا جو ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں

یا بھلا دیتے ہیں تو ہم اُس سے بہتر یا ۔ اُس جیسی آیت اس کی جگہ لے آتے ہیں۔ مقصد یہ کہ کسی آیت میں تغیر و تبدل یا منسوخ کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ سورۃ کہف میں ہے لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ اللہ تعالیٰ کے کلام کو کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ کفر کی بات ہے۔ اللہ نے اپنے نبی کو فرمایا ہے کہ آپ ان لوگوں سے صاف صاف کہ دیں کہ مجھے کسی آیت کو تبدیل کرنے کا اختیار نہیں ہے اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ میں تو صرف اسی بات کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے دوسرے مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یہی حکم دیا ہے اِتَّبِعْ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (الانعام) کتاب میں جو بھی وحی کی گئی ہے آپ اس کی اتباع کرتے رہیں۔ ہر آمدہ حکم کی تعمیل کریں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دیں۔

ہم قرآن پاک میں جگہ جگہ پڑھتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کی اور اس کے مختلف احکام کو از خود تبدیل کر کے اپنی مرضی کے مطابق بنا لیا۔ مثال کے طور پر سورۃ بقرہ میں ہی آتا ہے۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ جو بات ان کو کہی گئی تھی، ظالموں نے اس کو تبدیل کر دیا۔ پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہم نے ان پر آسمان سے عذاب نازل فرمایا۔ غرضیکہ بنی اسرائیل نے اللہ کی کتاب میں تحریف کی تو وہ ملعون اور مغضوب علیہ ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ ایسے مجرموں کو بعض اوقات اس دنیا میں مہلت بھی دے دیتا ہے مگر آخرت میں تو ایسے بدبخت کسی صورت بچ نہیں سکتے۔ مہلت کا یہ قانون گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔

فرمایا میں تو صرف وحی الٰہی کا اتباع کرتا ہوں اور اس میں تغیر و تبدل

کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ اگر میں اپنے رب تعالیٰ کی نافرمانی کروں گا۔ تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے، لہٰذا میں تو وہی قرآن پیش کرونگا جو بذریعہ وحی مجھ پر نازل ہوا ہے اور جس کی اشاعت کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ ہمیں تو اس کتاب میں پیش کردہ نظام کو قائم کرنے کا حکم ملا ہے۔ حضور علیہ السلام نے دُعا میں سکھایا[1] اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتٰبِ یعنی اے کتاب کو نازل کرنے والے مولا کریم! ہم تو اسی کتاب میں نازل ہونے والے پروگرام کو دنیا میں رائج کرنے کے پابند ہیں اور اسی کی خاطر تیرے راستے میں جہاد کرتے ہیں۔ ہمارا کوئی دنیاوی یا ذاتی مقصد نہیں ہے لہٰذا ہم دنیا میں تیرا ہی کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں، اس لیے مجھے قرآن پاک کی کسی آیت میں تغیر و تبدل کی مجال نہیں ہے۔

قرآنی قانون کا نفاذ

اب آپ قرآن پاک کی اس واضح آیت کو مد نظر رکھ کر ذرا موجودہ حکومتوں کے نظام کا جائزہ لیں کہ دنیا میں آج جتنے بھی حکمران موجود ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی کس حد تک پابندی کر رہے ہیں۔ غیر مسلم اقوام تو خارج از بحث ہیں، ہم دنیا کی پچاس کے قریب مسلمان ریاستوں پر بھی نظر ڈالتے ہیں تو اس معاملہ میں سخت مایوسی ہوتی ہے کہ کسی ایک ریاست میں بھی من وعن قرآن پاک کے قانون پر عملدرآمد نہیں ہو رہا ہے۔ قرآنی پروگرام کے نفاذ کا خیال تو اسے آسکتا ہے جو قرآن پاک کی تلاوت کرے گا۔ اور پھر اس کو سمجھنے کی کوشش کرے گا اور جس نے قرآن کریم کو پڑھا ہی نہیں، وہ اس کے قوانین کو نافذ کیسے کرے گا؟ آج کتنے لوگ ہیں جو قرآن پاک کے مطالب و معانی کے عمق میں جانے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ اس کو کماحقہ سمجھنے کے لیے سخت محنت اور بڑا وقت دینے کی ضرورت ہے۔ محض امتحان پاس کرنے کے لیے

[1] ابوداؤد صفحہ ۳۵۳ ج ۱

چند سورتیں پڑھ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آٹھ سال میں سورۃ بقرہ کی تفسیر مکمل کی تھی۔ اس کے مضامین، علوم، معارف اور حقائق کو معلوم کیا تھا۔ قرآن پاک میں تمام اصول موجود ہیں عمل کے لیے واضح لائحہ عمل موجود ہے۔ اس کے لیے پوری پوری عمر وقف کرنے کی ضرورت ہے۔ تب جاکر ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ امت کے ذکی ترین لوگوں میں سے ہیں۔ انہیں ایک مسئلہ میں تردد پیدا ہوگیا تو اس کو حل کرنے کے لیے قرآن پاک کی تین سو مرتبہ تلاوت کی۔ ہر ہر آیت پر غور و فکر کرتے اور مسئلہ کا حل تلاش کرتے۔ آخر تین سو مرتبہ کی تلاوت کے بعد وہ ایک آیت پر آکر رک گئے اور اپنا مقصود پالیا۔ مطلب یہ ہے کہ حقیقت کو پانے کے لیے بڑی بڑی قربانی اور زیادہ سے زیادہ محنت بھی کرنی پڑے تو کر گزرنے سے گوہر مقصود حاصل ہوگا۔ آج ہمارے قائدین اسمبلیوں میں بیٹھ کر بحث کرتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ کا سرمایہ دارانہ نظام بہتر ہے یا روس اور چین کا اشتراکی نظام؟ کونسا نظام زیادہ ترقی یافتہ ہے اور کونسا کمتر ہے؟ ترکوں نے جرمن قانون لے لیا تھا اور ہم دوسروں کی طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ یہ سب لغو نظام ہیں۔ ہمارے لیے ان میں سے کوئی بھی مفید نہیں پھر قرآن پاک کو چھوڑ کر کون سے نظام کو اپنائیں گے؟ سورۂ مرسلت میں اسی بات کو شروع کیا گیا ہے "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ م بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ" قرآن پاک کو چھوڑ کر دوسرے کون سے پروگرام پر ایمان لاؤ گے۔ جب تک دنیا قائم ہے۔ قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا پروگرام نہیں آئیگا تو اس کو چھوڑ کر کدھر جاؤ گے۔ اسی پروگرام کے متعلق قرآن کریم نے ابتدا ہی میں فرمادیا "ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْہِ" اللہ کی اس

آخری کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر اس پروگرام کو اپنانے والوں کے متعلق فرمایا أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ دائمی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ بہر حال قرآن کریم کے پروگرام کو سمجھنے اور اس کو نافذ کرنے کے لیے، بڑی محنت، افرادی قوت اور وقت کی ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریز لوگ تو مختلف کیمٹیاں بنا کر حدیث پر تحقیقات (RESEARCH ریسرچ) کر رہے ہیں اس پر کثیر رقم خرچ کر رہے ہیں مگر ہم زبانی ایمان لانے تک ہی محدود ہیں نہ اس ضمن میں کوئی محنت و کاوش ہوتی ہے اور نہ قرآنی پروگرام پر عملدر آمد کا موقع آتا ہے۔ ہماری ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنے ذخیرہ علوم سے مستفید ہونے کی بجائے دوسروں کا منہ تک رہے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ کو آزمانے کے بعد اقتصادی نظام کے لیے چین کے نظام کی طرف آنکھیں اٹھتی ہیں اور کبھی روس اور جرمن کے نظاموں سے اُمید وابستہ کی جاتی ہے۔ پچاس سال سے اشتراکی نظام کو بھی آزمایا جا رہا ہے مگر اس میں بھی الحاد، بے دینی، استبداد اور دماغی خرابی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ تو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا کہ اگر میں بھی اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف کروں گا تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

حیاتِ پیغمبر بطور دلیل

ارشاد ہوتا ہے قُل اے پیغمبر! آپ کہہ دیں لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ اگر اللہ چاہتا تو میں یہ آیات قرآنی تم پر تلاوت نہ کرتا۔ مقصد یہ ہے کہ تم اس قرآن پر ایمان نہیں لاتے اور اسے تبدیل کرنے کا مطالبہ کرتے ہو، اللہ بھی اگر ایسا ہی چاہتا تو میں تمہیں پڑھ کر نہ سناتا۔ مگر خدا تعالیٰ کی مشیت تو اسی پروگرام کو غالب کرنا ہے

لہٰذا اسی کی تلاوت کرنا میرا فرض ہے۔ اگر اللہ کو تمہاری بات منظور ہوتی وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ تو وہ تمہیں اس قرآنِ پاک کی خبر ہی نہ دیتا۔ مگر اس کی مشیت تو اسی میں ہے کہ میں یہی کلامِ الٰہی تمہیں پڑھ کر سناؤں یہ کوئی میرا خود ساختہ پروگرام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اگر تمہیں اس بارے میں کوئی شک ہے کہ قرآن میں اپنی طرف سے بنا کرے آیا ہوں تو ذرا اس دلیل پر غور کرو فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ میں نے تمہارے درمیان عمر کا ایک بڑا حصہ (چالیس سال) گزارے ہیں۔ تم مجھے اور میرے خاندان کو جانتے ہو۔ میری شرافت، دیانت سے واقف ہو، اخلاق و اطوار کو پہچانتے ہو۔ ابھی پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ حجرِ اسود کی تنصیب کے لیے تم نے مجھ ہی پر اعتماد کیا تھا، تم مجھے صادق اور امین کہتے تھے ہو آج تک میرے کردار پر کسی کو انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی وعدہ خلافی نہیں کی، کسی پر بہتان نہیں لگایا، کسی کو تکلیف نہیں دی، کسی کا مال نہیں چھینا، کسی کی تذلیل و توہین نہیں کی بلکہ دوسروں کی خدمت کو شعار بنا رکھا ہے۔ ان تمام شواہد کے باوجود اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ تم اتنی بھی عقل و شعور نہیں رکھتے اور یہ نہیں سوچ سکتے کہ جو شخص چالیس سال تک سچا اور دیانتدار رہا ہے وہ یکایک جھوٹ پر کیسے اتر آئے گا اور خود قرآن بنا کر اسے اللہ کی طرف منسوب کرے گا (العیاذ باللہ) یہ تو معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص اتنے اعلیٰ کردار کا حامل ہے، جس کی زندگی کا کوئی گوشہ تمہاری نظروں سے اوجھل نہیں وہ یکدم جھوٹ کیسے بولنے لگے گا۔ جو شخص اللہ کی مخلوق کے سامنے غلط بیانی نہیں کرتا، وہ اللہ پر کیسے افترا باندھے گا۔ فرمایا ذرا عقل کو بروئے کار لاؤ تو تمہارے تمام شبہات دور ہو جائیں گے۔

ابو داؤد شریف کی روایت میں عبد اللہ ابن ابی الخنساء کا واقعہ آتا ہے کہ اس نے حضور علیہ السلام کے ساتھ کوئی معاملہ کیا تو کہنے لگا آپ یہیں ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔ آپ وہیں کھڑے اُس کا انتظار کرتے رہے حتیٰ کہ تین دن گزر گئے۔ جونہی اُس شخص کو یاد آیا تو اُس جگہ پر پہنچا تو دیکھا کہ حضور علیہ السلام اس کا انتظار کر رہے ہیں، معذرت کی کہ میں بھول گیا تھا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا، اے نوجوان! تو نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔ مجھ سے وعدہ لے لیا تھا میں خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا غرضیکہ حضور علیہ السلام کی پوری زندگی تو شیشے کی طرح صاف ہے اور آپ سے کسی غلط بات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تو اب یکدم حضور کی ذات سے غلط بیانی کو کیسے منسوب کر لیا۔ فرمایا یہ قرآن نہ تو میرا اپنا بنایا ہوا ہے اور نہ میں اس میں تبدیلی کرنے کا مجاز ہوں۔ میں اپنی زندگی کو تمہارے سامنے بطور دلیل پیش کر رہا ہوں، اب بھی تمہیں کچھ نہیں آتی۔

بڑا ظالم فرمایا فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا افتراء باندھے فرمایا اگر میں بھی (نعوذ باللہ) غلط بات کروں گا تو اسی فہرست میں آؤں گا۔ میرے لیے یہ بات ہرگز لائق نہیں کہ میں خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھوں

اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اور اس سے بڑا ظالم بھی کوئی نہیں جو خدا تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلاتا ہے۔ جھوٹا دعویٰ کرنے والا مفتری اور کذاب ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہوتا۔ فرمایا نہ تو میں اللہ پر جھوٹ باندھ رہا ہوں کہ قرآن پاک کو غلط طور پر اس کی طرف منسوب کر رہا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا نازل کردہ ہے اور میں اسی کی منشاء کے مطابق اس کی اشاعت کر رہا ہوں اور جو کچھ میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں، یہ من وعن وہی ہے جو اللہ نے نازل فرمایا

ہے۔ اور میں خدا تعالیٰ کی کسی آیت کو (العیاذ باللہ) جھٹلا کر ظالموں میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ فرمایا یاد رکھو! جو کوئی اللہ پر افتراء باندھتا ہے یا اس کی آیتوں کو جھٹلاتا ہے وہ مجرم ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ کہ وہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں کرتا۔ میں نہ تو مفتری ہوں اور نہ مجرم۔ میں تو اللہ کی مشیت کے مطابق اس کے احکام کی تعمیل کر رہا ہوں۔ اصل میں اللہ تعالیٰ اور اس کی آیتوں کو جھٹلانے والے تم خود ہو، لہٰذا تمہیں اپنے انجام سے باخبر ہونا چاہیئے۔ تم لوگ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ
وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ
بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ
وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٨﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً
وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ
لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٩﴾ وَيَقُولُونَ
لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ
ع ۲ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾

ترجمہ :- اور عبادت کرتے ہیں یہ لوگ اللہ کے سوائے اُن چیزوں کی جو نہ اُن کو نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ فائدہ دے سکتی ہیں ۔ اور کہتے ہیں یہ لوگ (کہ جن کی عبادت کرتے ہیں) یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس (اے پیغمبر) آپ کہہ دیں ۔ کیا تم بتلاتے ہو اللہ کو وہ چیز جو وہ نہیں جانتا آسمانوں میں اور نہ زمین میں ۔ پاک ہے اس کی ذات اور بلند ہے اُن چیزوں سے جن کو یہ اُس کے ساتھ شریک بناتے ہیں ﴿۱۸﴾ اور نہیں تھے لوگ مگر ایک ہی امت پس اختلاف کیا انہوں نے اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو پہلے ہو چکی تھی تیرے پروردگار کی طرف سے تو البتہ فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان اُن چیزوں میں جن میں

خلاف کرتے ہیں (۵) اور کہتے ہیں یہ لوگ کہ کیوں نہیں اتاری
گئی اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے، کہہ دیجئے آپ
کہ بیشک غیب اللہ ہی کے لئے ہے، پس
انتظار کرو تم، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں (۲۰)

ربط آیات

اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت کا بیان تھا۔ مشرک
لوگ اس قرآن کو ماننے کے لئے اس لئے تیار نہ تھے کہ اس میں ان کے عقائد کی تردید کی
گئی تھی۔ اس میں ہمارے معبودوں کی توہین کی گئی ہے۔ لہٰذا آپ کوئی دوسرا قرآن لے
آئیں یا اسی میں ہماری مرضی کے مطابق ترمیم کر دیں تو ہم ماننے کے لئے تیار ہیں۔ اس کے جواب
میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان سے کہلوایا کہ کتاب اللہ میں تغیر و تبدل کرنا میرے
اختیار میں نہیں ہے۔ میں تو صرف وحی الٰہی کی پیروی کرتا ہوں۔ اگر میں اس میں تبدیلی کی
کوشش کروں تو بڑے دن کے عذاب میں پھنس جاؤں گا۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ خود کسی
حکم کو منسوخ کرے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا حکم جاری کر دے تو یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ کسی
مصلحت کی بناء پر ایسا کرے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کی صداقت کو بیان
فرمایا اور آپ علیہ السلام سے یہ اعلان کروایا کہ اس سے بڑا ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ
بولتا ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ جو خدا کے سچے رسول اور اس کی سچی کتاب کو نہیں مانتا اس
سے بڑھ کر بھی کوئی ظالم نہیں۔ فرمایا اہل کتاب نے اللہ کی کتاب میں تحریف کی تو وہ
ذلیل اور مغضوب علیہم ہوئے۔ ان پر اللہ نے عذاب نازل فرمایا۔ رسالت کی حقانیت
کے بعد اب اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے پھر توحید کا مسئلہ سمجھایا ہے اور شرک کی تردید
فرمائی ہے۔ یہ مضامین اس سورۃ میں یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ کہیں قرآن کی صداقت
ہے تو کہیں توحید اور شرک کا بیان ہے اور کہیں قیامت کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ سارے
مضامین آپس میں مربوط ہیں اور سورۃ کے آخر تک چلتے گئے ہیں۔

توحید اور شرک

سب سے پہلے توحید کے متعلق دلائل کے طور پر ارض و سما کی تخلیق، چاند اور سورج

کی گردش اور رات دن کے اختلاف کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے براہِ راست مشرکین کا ذکر کیا ہے اور ان کے افعالِ قبیحہ کو بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ اور مشرک لوگ پرستش کرتے ہیں اللہ کے ورے ان چیزوں کی جو نہ انکو نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ فائدہ دے سکتی ہیں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا معنیٰ اللہ کے سوا بھی ہوتا ہے اور اللہ کے ورے بھی۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمہ، قرآن کا سب سے پہلا بہترین اردو ترجمہ ہے جس میں آپنے دُوْن کا معنیٰ نیچے یا ورے کیا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑا معبود تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں مگر اُس کے نیچے چھوٹے معبود بھی بنا رکھے ہیں جن کے متعلق اُن کا دعویٰ تھا کہ یہ بھی اللہ ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ جب دُوْن کا معنیٰ سوا کرتے ہیں تو اس کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ مشرک اللہ کے علاوہ اُس کا مدمقابل مان کر کسی دوسرے خدا کی پوجا کرتے ہیں جیسا کہ مجوسی اور ثنوی فرقے والے دو خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا خدا ہے اور دوسرا برائی کا۔ ایک روشنی کا خدا ہے اور دوسرا تاریکی کا ہے۔ ایک کو یزداں کا نام دیتے ہیں اور دوسرے کو اہرمن کا۔ مگر مشرکوں کا عقیدہ مختلف ہے وہ واجب الوجود اور خالق تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ اُس نے اپنے اختیارات دوسروں کو بھی دے رکھے ہیں اور وہ بھی لوگوں کی حاجتیں پوری کرتے ہیں اور بگڑی بناتے ہیں۔ یہی شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ اُس نے فرشتوں کو انسانوں کی پیدائش سے کروڑوں بلکہ اربوں سال پہلے پیدا کیا۔ پھر جنات پیدا کیے اور اس کے بعد انسان اور ہر جسم یا وجود رکھنے والی چیز تخلیق کی۔ اسی لیے قرآن پاک نے فرمایا اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الزمر) ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ چنانچہ معدودے چند دہریوں کو چھوڑ کر تمام کافر اور مشرک بھی خالق خدا تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں۔ مشرک عرب کے ہوں یا ہندوستان کے وہ یہی کہیں گے کہ

پیدا کرنے والا یزدان یا ایشور ہے۔ فارسی میں خدا کہتے ہیں اور یہ لفظ اللہ کا ترجمہ ہے یعنی ایسی ذات جس کا وجود ذاتی ہے کسی کا دیا ہوا نہیں۔ اللہ کے علاوہ ہر چیز کا وجود عطائی ہے، ذاتی نہیں۔ مقصد یہ کہ خدا تعالیٰ کی ذات کو تو سب ہی مانتے ہیں مگر توحید اور شریعت کا انکار کر کے کافر اور مشرک بن جاتے ہیں۔ گویا جو لوگ اللہ کو مانتے ہوئے کسی دوسرے کو بھی کسی حیثیت میں اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہی مشرک ہیں۔

انتہائی تعظیم شرک ہے

شرک زیادہ تر عبادت میں ہوتا ہے جس طرح اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اسی طرح دوسروں کی بھی کی جاتی ہے۔ امام بیضاویؒ عبادت کی تشریح اَقْصٰی غَایَۃِ التَّعْظِیْمِ کرتے ہیں یعنی کسی کی انتہائی تعظیم کو عبادت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص اللہ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی انتہائی تعظیم اس اعتقاد کے ساتھ کرتا ہے کہ یہ شخص نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر کام کرنے پر قادر ہے۔ تو ایسا شخص مشرک بن جائے گا۔ کیونکہ واجب الوجود، خالق، علیم کل اور مختار کل اللہ تعالیٰ کی صفات مختصہ ہیں۔ ذرے ذرے کو جاننے والا صرف اللہ ہے۔ نہ جبرائیل جانتا ہے نہ کوئی رسول اور نبی۔ ان صفات میں جو بھی کسی مخلوق کو شریک کرے گا، اس کے مشرک بننے میں ن شبہ نہیں رہ جاتا۔

تعظیم کبھی زبان سے ہوتی ہے۔ کبھی جسم سے اور کبھی مال سے۔ جسم کی تعظیم رکوع، سجود یا دست بستہ کھڑا ہونا ہے۔ زبان کی تعظیم یہ ہے کہ کسی کی حمد و ثنا کے ترانے گائے جائیں۔ مال کی تعظیم یہ ہے کہ کسی کے نام کی نذر و نیاز دی جائے۔ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" میں عقیدہ کارفرما ہے پھر یہ تعظیم اس نظریہ کے ساتھ کی جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے ہمیں فائدہ ہوگا اور اگر نہ کی تو نقصان ہو جائے گا۔ یا یہ نظریہ بھی ہوتا ہے کہ فلاں ہستی کی تعظیم کی جائے گی تو وہ اللہ کے ہاں

ہماری سفارش کرے گا یا ہمیں تقرب دلائے گا یا ہماری مشکل حل کرائے گا، یہ تمام نظریات باطل ہیں اور شرک میں داخل ہیں۔ یہ سارے معاملات صرف اللہ کی ذات کے ساتھ ہی روا ہیں۔

قبروں کی تعظیم

ہمارے ہاں بعض قبروں کی خاص تعظیم کی جاتی ہے۔ چھٹی صدی کے مفسر قرآن امام رازیؒ عظیم آدمی ہوئے ہیں۔ تفسیر کے علاوہ انہوں نے علم افلاک پر کتابیں لکھی ہیں۔ منطق میں ماہر تھے، آپ فرماتے ہیں کہ مشرک لوگ بتوں، ٹھاکروں، درختوں اور ستاروں کی تعظیم کرتے ہیں، ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں مگر ہمارے زمانے کے بعض مسلمان قبروں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ صاحب قبر اللہ کی بارگاہ میں ہماری سفارش کرے گا۔ داتا صاحب کی قبر پر نذر و نیاز اور چادر پوشی تعظیم کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسے مزار ہیں جن کے سامنے سجدے ہوتے ہیں، لوگ دست بستہ کھڑے ہو کر ان سے حاجات طلب کرتے ہیں یا حاجت برائی کے لیے سفارش چاہتے ہیں۔ اس انتہائی تعظیم کی خاطر عرق گلاب سے قبر کو غسل دیا جاتا ہے، پھول ڈالے جاتے ہیں، ہزاروں چادریں نذر ہوتی ہیں اور قبروں پر نذر و نیاز کا لامتناہی سلسلہ تو ہمیشہ جاری رہتا ہے اگر یہ سب کچھ صاحب قبر کو نافع اور ضار سمجھ کر کیا جائے تو واضح شرک ہے اور اگر اسے نافع اور ضار نہ سمجھا جائے تو اس کو شرک تو نہیں کہہ سکتے مگر اس عمل کے بدعت، مکروہ اور حرام ہونے میں کوئی شک نہیں۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ تفسیر بیان القرآن میں لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی وہ تعظیم مراد نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، تو قبر کے سامنے سجدہ کرنا کفر تو نہیں ہوگا مگر شریعت مطہرہ میں حرام ضرور ہے کیونکہ سجدہ عبادت کا ہو یا تعظیمی، یہ صرف خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص

ہے۔ پہلی امتوں میں غیر اللہ کے لیے سجدہ تعظیمی روا تھا مگر سجدہ عبادت کسی امت میں بھی جائز نہیں رہا۔ تاہم ہماری امت کے لیے ہر قسم کا سجدہ حرام ہے، خواہ وہ عبادت کا ہو یا تعظیم کے لیے۔ مگر سجدہ کے لیے نزوانیج حکم ہے۔ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَھُنَّ (حم سجدہ) سورج، چاند یا کسی مخلوق کے سامنے سجدہ نہ کرو۔ بلکہ سجدہ صرف اس ذات کے لیے جو ان سب کا خالق ہے۔

غیر اللہ کی نذر و نیاز

غیر اللہ کی نذر و نیاز دے کر بھی شرک کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ سورۃ انعام میں پرانے مشرکوں کا ذکر آتا ہے جو اپنی پیداوار میں سے ایک حصہ اپنے معبودوں کے نام کا نکالتے تھے۔ ہمارے ہاں گیارہویں کا عقیدہ بھی ایسا ہی ہے۔ اگر کوئی شخص اس لیے گیارھویں دے دیتا ہے کہ اس کے بغیر گھر سے خیر و برکت اٹھ جائیگی تو یہ فعلی شرک ہے۔ جو شخص کوئی چیز نبی، ولی یا قبر والے کے نام پر نامزد کرے اور پھر اس کی قبر پر چڑھائے تو یہ نیاز میں شرک ہے۔ اور اگر اللہ کے نام پر کسی فوت شدہ کے ایصال ثواب کے لیے کوئی چیز دیتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ گیارہویں شریف کے بعض دلدادہ یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم تو ایصال ثواب کے لیے دیتے ہیں بھئی! اگر ایسا ہے تو پھر گیارہویں کا نام کیوں لیتے ہو؟ پھر گیارہ تاریخ کیوں مقرر کرتے ہو؟ کتاب و سنت میں ایصال ثواب کے لیے تاریخ کے تقرر کا کوئی حکم ہے؟ کسی جمعرات، تیسرے، ساتویں یا چالیسویں کی کوئی اہمیت ہے؟ شریعت نے ایسی چیزوں کا کہاں حکم دیا ہے؟ اسی چیز کو تو بدعت کہا جاتا ہے۔ اگر ثواب ہی پہنچانا مقصود ہے تو جب چاہو صدقہ و خیرات کرو، کون روکتا ہے؟

اس میں ایک اور قباحت بھی ہے۔ ختم گیارہویں کا ہو یا تیسرے کا

یا چالیسویں کا، سب لوگ کھاتے ہیں حالانکہ اگر ایصالِ ثواب مقصود ہے تو پھر یہ غربا اور مساکین کا حق ہے۔ مالدار اور برادری والے کھا گئے تو ثواب کیسے ہوگا؟ یتیموں اور مسکینوں کو کھلا کر اس کا ثواب پہنچاؤ تو کچھ بات بھی بنے۔ اگر گیارہویں سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا تقرب مقصود ہے تو اس کا شرک ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اسی طرح اگر داتا دربار پر بکرا اس مقصد کے لیے دیا گیا کہ داتا صاحب ہماری سفارش کر دیں گے، ہماری مراد پوری کر دیں گے یا کرا دیں گے یا خدا تعالیٰ کا قرب دلا دیں گے تو ہر صورت میں شرک کا ارتکاب ہے۔ یہی غایت درجہ کی تعظیم ہے، یہی عبادت ہے۔

قبر پرستی

ہمارے ہاں وسیع پیمانے پر قبر پرستی ہو رہی ہے۔ قبر کے سامنے دست بستہ کھڑا ہونا، اس کے سامنے رکوع یا سجود کرنا، اس قبر والے سے دعا مانگنا یا کرانا، قبر کو چومنا یا ہاتھ لگانا سب ایسی چیزیں ہیں جو قبروں کی حد درجہ تعظیم میں آتی ہیں۔ قبر کو اس نیت سے ہاتھ لگانا یا ہاتھ لگا کر منہ پر ملنا کہ صاحبِ قبر خوش ہو کر ہماری بگڑی بنا دیگا۔ واضح شرک ہے۔ یہ کام تو پیغمبر علیہ السلام کی قبر کے ساتھ بھی روا نہیں۔ ذرا فاصلے پر ادب سے کھڑے ہو کر، نظریں نیچی کر کے خاموشی کے ساتھ صلوٰۃ و سلام پڑھو، حضور علیہ السلام کی قبر کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہ کرو جو خود آپ کی تعلیمات کے خلاف ہو۔ آپ نے تو آخری وقت میں یہ دعا کی تھی اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا کر اس کی پوجا ہونے لگے۔ یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء اور بزرگوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا جس کا ذکر حضور علیہ السلام نے مرض الموت میں کیا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَآئِھِمْ مَسَاجِدَ یہودیوں اور نصرانیوں پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ

بنالیا۔ قبروں پر گنبد کھڑے کئے۔ ان پہ چادریں چڑھائیں اور پھر ان کی تعظیم کے لیے لوگوں کو خاص تاریخ پر جمع کیا۔ یہ چیز حرام، ناجائز اور اسراف میں داخل ہے۔ تمام بزرگانِ دین اس سے منع کرتے آئے ہیں۔

کسی قبر والے سے سوال کرنا تو انتہائی درجے کی گراوٹ ہے اور اللہ کے ساتھ شرک ہے۔ کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا تو صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے اور تمام مخلوق اللہ ہی کی محتاج ہے۔ سورۂ الرحمٰن میں موجود ہے۔ یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمان و زمین کی ساری مخلوق اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتی ہے۔ کوئی اپنی زبان سے مانگ رہا ہے اور کوئی چیز اپنی حالت سے طلب کر رہی ہے۔ مانگنے والے سارے ہیں اور دینے والی صرف ایک ذاتِ خداوندی ہے۔ وہی سب کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ باقی تمام ملائکہ، انبیاء اور عام انسان و حیوان اسی کے محتاج ہیں۔ بوستان سعدی صاحب کی بڑی نصیحت آموز کتاب ہے۔ آپ اس میں فرماتے ہیں ؎

دل اندر صمد باید اے دوست بست
کہ عاجز تر اند از صنم ہر کہ ہست

دل کو صمد کے اندر ہی لگانا چاہیئے اے دوست! کیونکہ باقی سب چیزیں بت سے بھی عاجز ہیں۔ نفع نقصان کا اختیار مخلوق میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔

مسئلہ شفاعت

فرمایا مشرک لوگ ایک تو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور دوسری بات یہ کہتے ہیں وَیَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ ہم جن کی عبادت کرتے ہیں، نذر و نیاز دیتے ہیں اور ان کی حد درجہ تعظیم کرتے ہیں یہ ہمیں خدا کے ہاں چھڑا لیں گے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ سفارش دو قسم کی ہے۔ ایک سفارش وہ ہے جو اللہ کی اجازت سے فرشتے، انبیاء، شہداء اور کامل الایمان

صلحاء لوگ کریں گے۔ اور یہ سفارش اس شخص کے حق میں قبول ہوگی۔
جس کا عقیدہ درست ہوگا اور جس کے حق میں خدا تعالیٰ راضی ہوگا۔ سفارش
کی دوسری قسم جبری سفارش ہے جس کے مشرکین قائل ہیں۔ امام رازیؒ
اس کو جبری اور قہری سفارش سے موسوم کرتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ
فرماتے ہیں کہ مشرک لوگ خدا تعالیٰ کی ذات کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس
کر کے ایسی سفارش کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعض اوقات کسی جابر سے
جابر بادشاہ کو بھی اپنے کسی وزیر یا مقرب کی سفارش ماننا پڑتی ہے کیونکہ
وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کی بات نہ مانی تو اس کے اقتدار کو خطرہ لاحق ہو
سکتا ہے اسی طرح مشرک لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے معبود خدا کی مرضی کے
خلاف بھی سفارش کر کے ہمیں چھڑا لیں گے۔ عیسائیوں کا بھی یہی عقیدہ
ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے گناہوں کا کفارہ بن کر انہیں چھڑا لیں
گے۔ یہودی کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دوزخ کے دروازے
پر کھڑے ہوں گے اور کسی ختنہ شدہ اسرائیلی کو جہنم میں نہیں گرنے دیں
گے۔ یہی جبری سفارش ہے۔ جو اس سفارش کا قائل ہے، وہ شرک کا
مرتکب ہے۔ آج کا مسلمان بھی یہی کہتا ہے کہ ہمیں کچھ پروا نہیں، ہمیں
ہمارے پیر صاحب ہر صورت میں بچالیں گے۔ اللہ نے ایسی سفارش
کی تردید کی ہے اور ان لوگوں کا رد فرمایا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاں
یہ ہمارے سفارشی ہیں اور ہم کچھ بھی کرتے پھریں۔ یہ ہمیں بچالیں گے۔
فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا
يَعْلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ کیا تم اللہ کو ایسی چیز
بتلاتے ہو جس کو وہ آسمان و زمین میں نہیں جانتا۔ اگر اس کا کوئی سفارشی ہوتا
تو وہ ضرور اللہ کے علم میں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ درحقیقت ایسا کوئی سفارشی
تو موجود نہیں ہے مگر تم اسے خدا کے علم میں لاتے ہو کہ فلاں فلاں ہمارا

سفارشی موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ ایسا کوئی سفارشی کائنات میں موجود نہیں جو کوئی بات اللہ تعالیٰ سے جبراً منوا لے۔ بلکہ سُبۡحٰنَهٗ اس کی ذات تو پاک ہے وَتَعٰلٰی اور بلند ہے عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ایسی چیزوں سے جن کو یہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

شرک کی ابتدا

فرمایا، یاد رکھو! وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً سارے کے سارے لوگ ایک ہی امت پر تھے۔ سب لوگ عقیدۂ توحید اور قیامت کے برحق ہونے پر متفق تھے۔ فَاخۡتَلَفُوۡا پھر بعد میں انہوں نے اختلاف کیا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام سے کچھ عرصہ پہلے تک لوگ عقیدہ توحید پر قائم تھے اس دوران حضرت شیث علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام بھی گزرے ہیں لیکن لوگوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ پھر نوح علیہ السلام کے زمانے میں شرک کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر ان مشرکین کو سزا بھی ملی اور وہ سب کے سب طوفان میں غرق ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء باطل ہے۔ اس نظریے کے مطابق پہلے سب لوگ بندر تھے جو ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے۔ بعض تاریخی روایات کے مطابق پہلے لوگ کفر اور شرک پر تھے۔ آثار کو پوجتے جب عقل میں پختگی آئی شعور پیدا ہوا، تمدن نے ترقی کی تو عقیدہ توحید پیدا ہو گیا۔ یہ بالکل باطل اور کفریہ عقیدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پہلے سب لوگ عقیدہ حق پر متفق تھے۔ پھر بعد میں اختلافات پیدا ہوئے اور وہ شرک کی طرف مائل ہو گئے۔ اس دنیا پر اولین انسان حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور آپ بالاتفاق خدا کے نبی ہیں آپ بلاشبہ عقیدۂ توحید پر تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ پہلے لوگ مشرک تھے پھر بعد میں موحد ہوئے، قطعاً غلط ہے۔ شرک کی ابتداء حضرت نوح علیہ السلام سے چند عرصہ پہلے

ہوئی۔ یہی بات درست ہے۔

فرمایا، پھر لوگوں نے اختلاف کیا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو تیرے رب کی طرف سے پہلے ہو چکی ہے لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں یعنی ان کو فوراً سزا دے دی جاتی۔ مگر یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون امہال و تدریج کے مطابق سرکشوں کو بعض اوقات مہلت دیتا رہتا ہے اگر وہ اس دنیا میں بچ بھی جائیں تو اس کا مسلمہ قانون یہی ہے کہ قیامت کے دن ان کے درمیان ضرور فیصلہ کر دیا جائے گا اور پھر وہ اپنے اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ہدایت اور گمراہی کو واضح کر دیا ہے۔ مگر جو لوگ حق کو چھوڑ کر گمراہی میں پھنس گئے ہیں۔ ظلم و زیادتی کے مرتکب ہوئے ہیں، ان کا قطعی فیصلہ قیامت کے دن لازماً ہو جائے گا۔

معجزات کی فرمائش

فرمایا وَيَقُولُونَ اور یہ لوگ کہتے ہیں لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے کوئی نشانی یا معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا۔ مشرک کہتے تھے پہلے پیغمبر عصا، ید بیضا، احیائے موتی اور پتھر سے اونٹنی نکالنے والے معجزات سے کر گئے مگر آخری پیغمبر پر ایسی کوئی نشانی کیوں نہیں نازل ہوئی؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، فَقُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ غیب کی بات تو اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ تو اسی کے علم میں ہے کہ کون سی نشانی کب ظاہر ہوگی۔ کسی نبی کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ کوئی معجزہ اپنی مرضی سے پیش کر سکے کیونکہ خدا تعالیٰ کا یہ اٹل قانون

ہے وَمَا کَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (الرعد)
کوئی رسول اپنی مرضی سے کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا مگر جب اللہ چاہے
گویا نبی کا معجزہ اور ولی کی کرامت اللہ کا فعل ہوتا ہے۔ یہ چیز کسی بندے
کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اُسے صرف اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ معجزہ
طلب کرنا عنادی لوگوں کا کام ہے، وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ جتنے
معجزات حضور علیہ السلام کے ہاتھ پہ ظاہر ہوئے ہیں۔ اتنے کسی دوسرے
نبی سے ظاہر نہیں ہوئے۔ آپ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن پاک ہے۔
یہ ایسی بے مثال کتاب ہے جس کا مقابلہ کرنے سے ساری انسانیت
عاجز ہے۔ یہ ایک دائمی معجزہ ہے۔ ایمان لانے والے لوگ معجزے
طلب نہیں کرتے بلکہ وہ صداقت اور حقانیت کو فوراً پہچان جاتے ہیں
ایسے مطالبات تو عنادی لوگ کرتے ہیں۔ مکے کے مشرکین مطالبہ
کرتے تھے کہ مکے کی پہاڑیاں سونے کی بن جائیں۔ یہاں دریا بہنے
لگیں اور کھیتی باڑی ہونے لگے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ آپ سیڑھی لگا
کر آسمان پہ چڑھ جائیں اور وہاں سے ہمارے سامنے کتاب لے
کر آئیں تو پھر ہم ایمان لائیں گے کبھی کہتے اگر آپ سچے ہیں تو ہم پر
آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے یا جس قیامت سے ہمیں ڈراتا ہے اُس
کو برپا کر دے۔ مگر ہر فرمائش کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے
خلاف ہے وہ جب چاہتا ہے اپنی مصلحت کے مطابق کوئی
نشانی ظاہر کر دیتا ہے۔ مکے والوں نے چاند کا معجزہ طلب کیا تو اللہ
کے حکم سے حضور علیہ السلام نے چاند کی طرف اشارہ کیا تو وہ دو ٹکڑے
ہو کر ایک ٹکڑا پہاڑ کی اِس طرف نظر آیا اور دوسرا دوسری طرف
تھا۔ ابوجہل چونکہ عنادی تھا۔ وہ اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لایا
کہنے لگا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (القمر) یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ پہلے لوگ بھی

جادو کرتے تھے، آج محمد نے بھی جادو کر دیا (العیاذ باللہ)۔
فرمایا اگر تم نشانیاں دیکھنے پر ہی بضد ہو فَانْتَظِرُوْا تو انتظار کرو اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ دیکھیں کب نشانی آتی ہے اور تمہارے کفر اور شرک کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ پھر جان لینا کہ کس کے حصے میں ہدایت ہے اور کون گمراہی پر سرگرم ہے؟ کس کو ترقی ملتی ہے اور کون تنزل میں جاتا ہے؟ تم بھی انتظار کرو میں بھی خدا کے حکم کا انتظار کرتا ہوں۔

وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ
إِذَا لَهُمْ مَكْرٌ فِي آيَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ
رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ۲۱ هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ
بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ
وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ
بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ
هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۲۲ فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ
يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا
بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ ۖ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ
إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۲۳

ترجمہ: اور جس وقت چکھاتے ہیں ہم لوگوں کو مہربانی تکلیف کے بعد جو ان کو پہنچی ہو تو ناگہاں ان لوگوں کے لیے حیلہ ہوتا ہے ہماری آیتوں کو جھٹلانے کے بارے میں ۔ اے پیغمبر، آپ کہ دیجئے اللہ تعالیٰ بہت جلدی تدبیر کرنے والا ہے ۔ بیشک ہمارے فرشتے لکھتے ہیں ان چیزوں کو جو چھپ کرتے ہیں (۲۰) اللہ تعالیٰ کی وہی ذات ہے جو چلاتا ہے تم کو خشکی اور دریا میں ۔ یہاں تک

کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور وہ کشتیاں ان لوگوں کو لے کر
چلتی ہیں خوشگوار ہوا کے ساتھ اور یہ خوش ہو جاتے ہیں اس کے
ساتھ تو اچانک آجاتی ہے ان کے پاس تند ہوا اور آجاتی ہے
ان کے پاس موج ہر طرف سے اور پھر وہ گمان کرتے ہیں کہ
اب وہ گھیر لیے گئے تو اُس وقت پکارتے ہیں اللہ کو۔ خالص کرنے
والے ہوتے ہیں اُس کے لیے اطاعت کو اور کہتے ہیں کہ اگر تو ہمیں
نجات دے دیگا تو ضرور ہو جائیں گے ہم شکر ادا کرنے والے ﴿۲۲﴾
پھر جب وہ ان کو نجات دیتا ہے تو اچانک وہ بغاوت کرتے
ہیں زمین میں ناحق۔ اے لوگو! بیشک تمہاری بغاوت تمہارے نفسوں
پر ہے۔ یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا۔ پھر ہماری طرف ہی تم
سب کا لوٹ کر آنا ہے۔ پس ہم بتلا دیں گے تم کو جو کچھ
تم کام کیا کرتے تھے ﴿۲۳﴾

ربطِ آیات

پہلے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی حقانیت اور صداقت کو بیان کیا پھر توحید کے عقلی اور نقلی دلائل کا ذکر کیا اور سابقہ اقوام کی نافرمانیوں کا اشارۃً حال بیان کیا۔ پھر قرآن کے اٹل، دائمی، ناقابلِ تحریف و ترمیم ہونے کا ذکر کیا۔ رسالت کی صداقت کے ضمن میں حضور علیہ السلام کی پاکیزہ زندگی کو بطور دلیل پیش کیا۔ پھر معجزات طلب کرنے والے منکرین کے جواب میں فرمایا کہ یہ لوگ محض ضد اور عناد کی وجہ سے نشانیاں طلب کرتے ہیں ورنہ نشانیاں تو اللہ نے بے شمار ظاہر فرما دی ہیں۔ اس سلسلہ میں حضور علیہ السلام سے کہلوایا کہ کوئی نشانی پیش کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اپنی مشیت اور حکمت کے مطابق جب اللہ چاہتا ہے کوئی نشانی ظاہر کر دیتا ہے۔ فرمایا میرے اور تمہارے درمیان حتمی فیصلے کے لیے تم بھی انتظار کرو اور میں بھی اللہ کے حکم کا منتظر ہوں۔

پھر اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی تردید فرمائی کہ یہ لوگ اللہ کے وسیلے

دوسروں کی عبادت کرتے ہیں۔ اُن کو نافع اور ضار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت مختصہ ہے اور اس کے سوا کوئی نافع اور ضار نہیں ہے فرمایا اُن کی عبادت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں جو اللہ کے ہاں سفارش کر کے ہمیں بچا لیں گے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ سب جھوٹے ہیں۔ کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو جبری سفارش کر کے اللہ سے کوئی بات منوا لے۔ یہی تو شرک ہے جب کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اُن چیزوں سے پاک ہے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

تکلیف کے بعد راحت

دیروزہ درس کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی دو حالتوں یعنی تکلیف اور راحت کا ذکر کیا ہے اور انسان کی ایک عام روش کا تذکرہ کیا ہے کہ انسان دونوں حالتوں میں اپنی صحیح حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتے بلکہ افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ البتہ بہت خاص لوگ ہوتے ہیں جو اپنی اصلیت پر قائم رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شکوے کے طور پر فرمایا ہے وَإِذَآ أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ جب ہم لوگوں کو اپنی رحمت اور مہربانی کا مزہ چکھاتے ہیں بعد اس کے کہ ان کو تکلیف پہنچی۔ اللہ نے بعض لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ کبھی وہ تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں، قحط پڑ گیا، بیماری پھیل گئی، مال وجان کا نقصان ہو گیا، زلزلہ یا طوفان آگیا یا کوئی دیگر حادثہ پیش آگیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور تکلیف کو رفع کر دیا۔ بیماری کی جگہ صحت آگئی۔ قحط دور ہو کر خوشحالی کا دور دورہ آگیا۔ تجارت میں نفع ہو گیا۔ باعزت مکان مل گیا۔ باعزت عہدہ حاصل ہو گیا تنگی کی جگہ فراوانی آگئی۔ مال و دولت میں اضافہ ہو گیا۔ جانوروں کے لیے چارہ اور پانی عام ہو گیا۔ یہ ساری چیزیں اللہ کی رحمت میں شامل ہیں تو فرمایا کہ جب تکلیف کے بعد راحت آجاتی ہے۔ اللہ مہربانی فرماتا ہے إِذَا لَهُم

مَّكْرٌ فِىٓ اٰيَاتِنَا تو اچانک وہ لوگ ہماری آیتوں کے احکام کو ٹالنے کے لیے حیلے بہانے بنانے شروع کر دیتے ہیں۔

مشرکین کی حیلہ سازی

گذشتہ درس میں مشرکین کی حیلہ سازی کا ذکر ہو چکا ہے کہ جب انہیں حضور علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ آپ پر ہماری مرضی کی کوئی نشانی کیوں نہیں نازل ہوتی، حالانکہ تکوینی طور پر انسان کے گرد و پیش ہزاروں نشانیاں بکھری پڑی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی کھلی دلیل ہیں۔ خود قرآن پاک سے بڑی نشانی کون سی ہو سکتی ہے؟ پھر پیغمبر علیہ السلام کی ذاتِ مبارک بہت بڑی نشانی ہے۔ آپ کا چہرہ اقدس نشانی ہے حتیٰ کہ آوازِ پیغمبر معجز است یعنی حضور علیہ السلام کی آواز مبارک بھی ایک معجزہ ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذاتِ مبارکہ میں بیشمار معجزات ظاہر فرمائے۔ صحیح احادیث میں ایسے معجزات کی تعداد تین ہزار آتی ہے مگر آپ علیہ السلام نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا کہ میرا سب سے بڑا معجزہ وحی الٰہی یعنی قرآن پاک ہے جو اللہ نے مجھے عطا کیا۔ تو فرمایا کہ معجزات کی فرمائش یہ لوگ محض احکام کو ٹالنے کے لیے حیلے کے طور پر کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہدایت کو قبول ہی نہیں کرنا چاہتے، نہ اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا چاہتے ہیں اور نبی آخر الزماں کی رسالت کو ماننا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر قرآن کریم کے پروگرام سے تو یہ لوگ بدکتے ہیں، لہٰذا ہماری آیتوں کو ٹالنے کے لیے حیلہ سازی کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا قُلِ (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا اللہ تو بہت ہی جلدی تدبیر کرنے والا ہے عربی زبان میں مکر کا لفظی معنی المخفی تدبیر ہوتا ہے۔ اس لفظ کو اردو اور پنجابی کے مکر پر محمول نہیں کرنا چاہیئے جس کا معنی دھوکا اور فریب

ہوتا ہے۔ یہ لفظ قرآنِ پاک میں پوشیدہ تدبیر کے معنوں میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے، جیسے "وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ" انہوں نے بھی مخفی تدبیر کی اور اللہ نے بھی پوشیدہ چال چلی، یہودیوں نے چاہا کہ عیسٰی علیہ السلام کو دنیا سے معدوم کر دیں مگر اللہ تعالیٰ کی تدبیر کامیاب ہوئی "وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ" اور اللہ تعالیٰ بہترین مخفی تدبیر کرنے والا ہے۔

تو فرمایا کہ اگر یہ لوگ اللہ کی آیتوں کو ٹالنے کے لیے مخفی تدبیر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ تو بہت جلد مخفی تدبیر کرنے والا ہے۔ اللہ نے مزید واضح کیا کہ ہمارا نظام یہ ہے کہ "اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ" جو کچھ یہ لوگ حیلہ سازی کرتے ہیں ہمارے فرشتے اس کو لکھ لیتے ہیں اور وہ فرشتوں کے دفتر میں محفوظ ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ تو بذاتِ خود علیم کل ہے۔ وہ ہر چیز کو ذاتی طور پر جانتا ہے اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں، تاہم فرشتوں کے ذریعے لکھ رکھنے کا اس نے ایک نظام قائم کر رکھا ہے تاکہ قیامت کے دن ہر شخص کے سامنے پیش کر دیا جائے جس کو دیکھ کر وہ انکار نہ کر سکے۔ اس طرح گویا اللہ نے انسان کی ناشکر گزاری کا ذکر فرمایا کہ تنگی کے بعد جب انہیں راحت پہنچتی ہے تو پھر وہ شکر گزاری کرنے کی بجائے ہماری آیات کو ٹالنے کے لیے حیلے بہانے شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک زندہ مثال مشرکین مکہ کی ہے۔ جب ان کے علاقے میں قحط پڑ گیا تو ان کے ایک وفد نے مدینہ طیبہ پہنچ کر حضور علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ ان کے لیے خوشحالی کی دعا کریں۔ آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے قحط کو دور کر دیا مگر وہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے اس کی آیات سے انکار کے

یلے چلے بنانے لگے۔ اللہ نے ایسے ہی لوگوں کا شکوہ بیان کیا ہے۔

بحروبر کا سفر

اب اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بحروبر کے سفر کے تناظر میں لوگوں کے تجربہ ذہن کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ اللہ تعالیٰ کی وہی ذات ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ اب تو سائنسی دور ہے جس میں وسائل نقل وحمل بہت ترقی کر چکے ہیں ہر ملک میں ریلوں اور سڑکوں کے جال ہیں جن پر ریل گاڑیاں اور بسیں اور کاریں چوبیس گھنٹے رواں دواں نظر آتی ہیں۔ ان کے علاوہ فضائی سفر کی بہترین اور تیز ترین سہولتیں میسر ہیں مگر پرانے زمانے میں دور دراز علاقوں کا سفر ایک کٹھن کام تھا۔ خاص طور پر جنگلوں اور صحراؤں کا سفر تو خطرات سے بھرپور ہوتا تھا۔ اور ان سب سے بڑھ کر سمندری سفر تھا جس کا زیادہ تر انحصار ہواؤں کے رخ پر ہوتا تھا۔ ناساز گار موسم اور مخالف ہوائیں سمندری طوفان کا سبب بن جاتیں اور اس طرح بحری سفر خطرناک ترین سفر کی صورت اختیار کر جاتا۔ آج سے آٹھ سو سال پہلے ابن بطوطہ کا سفرنامہ پڑھیں۔ اس شخص نے متواتر ستائیس برس سفر میں گزارے۔ اندلس کا رہنے والا تھا آغاز شباب میں دنیا کا سفر شروع کیا اور بڑھاپے میں واپس اپنے وطن پہنچا۔ یہ دنیا کا طویل ترین سفر تھا جس کے متعلق اس نے بڑے بڑے واقعات اور سفر کی صعوبتوں کا ذکر کیا ہے۔ خراسان، حجاز، دمشق وغیرہ گیا، تمام جزائر پھرے اور بارہ سال تک اس برصغیر میں بھی پھرتا رہا مقصد یہ ہے کہ پرانے زمانے میں بحروبر کا سفر بہت مشکل کام تھا۔

سمندری سفر اور طوفان

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر سمندری سفر کا ذکر کیا ہے ارشاد ہوتا ہے حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ فرمایا جب تم کشتی یا بحری جہاز میں سوار ہوتے ہو وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ اور وہ کشتیاں یا جہاز خوشگوار ہوا کے ساتھ چلتی ہیں وَفَرِحُوا بِهَا اور وہ اس سے خوش

ہوجاتے ہیں۔ پھر اچانک کیا ہوتا ہے جَآءَتۡهَا رِيۡحٌ عَاصِفٌ تند یا مخالف ہوا چلتی ہے اور جہاز اور کشتیاں ہچکولے کھانے لگتے ہیں۔ وَجَآءَهُمُ الۡمَوۡجُ مِنۡ كُلِّ مَكَانٍ اور ہر طرف سے پانی کی موجیں آکر گھیر لیتی ہیں۔ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ اُحِيۡطَ بِهِمۡ اور مسافروں کو یقین ہوجاتا ہے کہ اب وہ گھیر لیے گئے ہیں، اور ان کے جہاز کے بچ نکلنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ تو ایسی حالت میں کیا کرتے ہیں دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ گڑگڑا کر اللہ ہی کو پکارتے ہیں اور اپنی اطاعت کو اس کے ساتھ خاص کرتے ہیں صرف اسی ایک خدا کے نام کی دہائی دیتے ہوئے اقرار کرتے ہیں لَئِنۡ اَنۡجَيۡتَنَا مِنۡ هٰذِهٖ اگر تو ہمیں اس طوفان سے نجات دے دے، ہماری کشتی کو پار لگا کر ہمیں مصیبت سے بچا لے لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيۡنَ تو ہم تیرا شکر ادا کرنے والے بن جائیں گے۔

سمندری طوفانوں اور جہازوں کی غرقابی کے لیے کئی واقعات مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ پندرہ سولہ سال پہلے بحری جہاز ڈارا کو حادثہ پیش آیا تھا۔ اس جہاز میں بارہ سو آدمی سوار تھے۔ جہاز اپنے سفر پر رواں دواں تھا۔ جہاز میں عیش و عشرت کے سارے سامان مہیا تھے، شراب کا دور چل رہا تھا، ڈانس ہو رہا تھا۔ کھانے پینے کی فراوانی تھی۔ اچانک رات کے تین بجے جہاز کا انجن دھماکے سے پھٹ گیا۔ موسم بھی خراب تھا، باہر بارش ہو رہی تھی ان حالات میں جہاز پر جو قیامت بپا ہوئی، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا بارہ سو کی نفری میں سے صرف ڈیڑھ دو سو مسافر بچائے جا سکے باقی جہاز سمیت سمندر میں ڈوب گئے۔ بچ رہنے والے لوگ جس طرح اس حالت کو بیان کرتے تھے اس سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

دو سال پہلے فیصل آباد کے ایک آدمی نے اپنے ساتھ پیش آمدہ واقعہ سنایا۔ وہ شخص اٹلی سے امریکہ جانے والے مال بردار جہاز پر بطور مزدور

سفر کر رہا تھا۔ اس جہاز پر پچھتر ہزار ٹن لوہا لدا ہوا تھا۔ اچانک جہاز طوفان میں گھِر گیا۔ انگریز عملہ نے سوچا کہ اب بچنا مشکل ہے۔ انہوں نے شراب پی کر خود ہی سمندر میں چھلانگ لگا دی، ہم دو مسلمانوں کے علاوہ کچھ دوسرے غیر مسلم بھی تھے۔ ہم کسی طرح جہاز سے کشتی اتار کر اس میں بیٹھنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر اللہ نے مہربانی فرمائی اور ہمیں اس طوفان زدہ علاقے سے نکال باہر کیا۔ جہاز تو ڈوب گیا اور ہم کشتی میں سوار سمندری لہروں کے ہچکولے کھاتے ہوئے کہیں دور نکل گئے۔ اتنے میں امدادی ٹیمیں پہنچیں اور انہوں نے ہمیں زندہ نکال لیا ——————— اور ہمیں سپین کے ساحل پر جا پھینکا۔ ہم پر بیہوشی طاری تھی، کئی ہفتے تک ہسپتال میں رہنے کے بعد ہمارے حواس درست ہوئے۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر سمندری سفر کا ذکر کر کے اس سفر کی مشکلات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ اور بعض مصنفین نے عکرمہؓ ابن ابوجہل کے اسلام لانے کا واقعہ نقل کیا ہے جس کا تعلق بھی بحری سفر کے ساتھ ہے۔ ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو عکرمہؓ وہاں سے بھاگ گیا۔ آگے چل کر کشتی میں سوار ہو گیا یہ کشتی کوئی تیس میل کے قریب گئی ہوگی کہ طوفان میں گھِر گئی۔ کشتی کے مسافر لات اور عزیٰ نامی بتوں کی دہائی دینے لگے۔ مگر ملاحوں نے بتایا کہ اس مشکل موقع پر لات، عزیٰ وغیرہ کام نہیں آئیں گے بلکہ یہ صرف خدا تعالیٰ کو پکارنے کا موقع ہے، اگر اس کی مشیت میں ہو گا تو وہ بچا لے گا۔ یہ سن کر عکرمہؓ کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ دل میں سوچا کہ اسی خدا کو نہ مان کر تو ہم بھاگے ہیں اور اب اُسی کو پکاریں۔ اس کی کایا پلٹ گئی اور اُسے سمجھ آگئی کہ جس خدا کو سمندری طوفان میں پکارنا ہے اُس کو خشکی پر کیوں نہ پکاریں۔ چنانچہ اس نے دل میں عہد کیا کہ اگر اس طوفان سے بچ گیا تو واپس

جا کر محمدؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔

اُدھر عکرمہؓ کی بیوی ام حکیمؓ پہلے ہی اسلام قبول کر چکی تھی۔ جب عکرمہؓ بھاگ گیا، تو ام حکیمؓ نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس کا خاوند تو بھاگ گیا ہے۔ اگر اب بھی وہ آکر تائب ہو جائے تو کیا اُسے معافی مل سکتی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، ہاں معافی مل سکتی ہے۔ ام حکیمؓ نے نشانی طلب کی تو حضور علیہ السلام نے اپنی دستار مبارک عطا کر دی۔ چنانچہ ام حکیمؓ وہ نشانی لے کر عکرمہؓ کی تلاش میں سمندر کی طرف جا نکلی جب عکرمہؓ طوفان سے بچ کر ساحل پر پہنچا تو اُس کی بیوی وہاں موجود تھی۔ اُس نے کہا، تم کہاں ٹھوکریں کھا رہے ہو؟ چلو! حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے کیے پر پشیمان ہو جاؤ اور دین حق قبول کر لو۔ چنانچہ جب حضورؐ نے عکرمہؓ کو دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمُهَاجِرِ سوار ہو کر آنے والے مہاجر کو خوش آمدید۔ گویا آپؐ نے عکرمہؓ کے بھاگنے اور واپس آنے کو ہجرت سے تعبیر فرمایا۔ اس طرح عکرمہؓ ایمان لے آیا۔ جس کا سبب سمندری طوفان بنا۔

نجات کے بعد بغاوت

تو فرمایا انسان کا حال یہ ہے کہ جب مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو خلوص کے ساتھ دعا کرتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ اگر خدا نے مصیبت کو دور کر دیا تو اس کا شکریہ ادا کروں گا۔ فَلَمَّآ أَنجَىٰهُمْ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہم انہیں نجات دے دیتے ہیں اس مصیبت سے إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِى ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ تو اچانک وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ تکلیف رفع ہو گئی تو پھر وہی شرک، وہی نذر لغیر اللہ، وہی بدعات اور وہی نافرمانیاں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سب ناشکری کی باتیں ہیں۔ انسانوں کا فرض تھا کہ وہ تکلیف میں خدا تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتے، اسی سے مشکل کشائی کے طالب

ہوتے اور پھر جب مصیبت راحت میں بدل جاتی تو مالک الملک کا شکر بجا لاتے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر یہی شکوہ بیان کیا ہے کہ جب ہم مصیبت سے نجات دے دیتے ہیں تو یہ پھر سرکشی اختیار کر لیتے ہیں۔

سرکشی کا وبال

ارشاد باری تعالیٰ ہے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اے لوگو! تمہاری سرکشی تمہارے اپنے نفسوں کے خلاف پڑتی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے اَلْبَغْیُ وَالْخِدَاعُ وَنَقْضُ الْعَھْدِ عَلٰی صَاحِبِہٖ یعنی سرکشی، دھوکا اور نقض عہد اُسی کے خلاف واقع ہوتا ہے جو اس کا ارتکاب کرتا ہے نیز یہ بھی آتا ہے وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ یعنی بُری تدبیر خود کرنے والے کا احاطہ کرتی ہے اور اُسی کو گھیر لیتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی موجود ہے مَنْ حَفَرَ بِئْرًا لِاَخِیْہِ وَقَعَ فِیْہِ جو کوئی شخص اپنے بھائی کے لیے گڑھا کھودتا ہے، وہ خود ہی اُس میں گرتا ہے۔ فارسی والے بھی کہتے ہیں "چاہ کن را چاہ در پیش" ایک دوسری روایت میں یوں آتا ہے۔ اَلْمَکْرُ وَالْخَدِیْعَۃُ وَالْخِیَانَۃُ فِی النَّارِ یعنی چال بازی، دھوکا اور خیانت جہنم میں لے جانے کا باعث ہوگی۔

غرضیکہ اللہ نے فرمایا کہ اے لوگو! تمہاری سرکشی اور شرارت تمہارے اپنے نفسوں کے خلاف ہے۔ مَتَاعَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا یہ دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا فائدہ ہے اٹھا لو، تھوڑا عرصہ عیش و راحت میں گزار لو ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُکُمْ پھر تم سب کا ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔ فَنُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ پھر ہم تمہیں جتلا دیں گے جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ہر چیز تمہارے سامنے رکھ دی جائے گی اور تم اپنی کارکردگی خود ملاحظہ کر سکو گے۔ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ تم نے آگے

کیا بھیجا تھا اور پھر تمہیں اس کا بھگتان بھی کرنا پڑے گا۔

بہرحال اللہ نے انسان کی ناشکرگزاری کا گلہ کیا ہے کہ دیکھو! جب تکلیف آتی ہے تو عاجزی کرتا ہے اور جب راحت آتی ہے تو یکدم سرکشی اور بغاوت پر اُتر آتا ہے، کفر، شرک اور نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا یہ سب کچھ خود تمہارے ہی خلاف جائے گا۔ جب تم خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے اور پھر اس کا بدلہ چکا ہوگا۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ
فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ
وَالْاَنْعَامُ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ
وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا
اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ
كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝٢٤ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا
اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ۝٢٥ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ
وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٢٦ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا
السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ
مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ
وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٢٧

ترجمہ۔ بیشک مثال دنیا کی زندگی کی ایسی ہے جیسے پانی، اتارا جسے
ہم نے آسمان سے۔ پھر مل گئیں اس (پانی کی وجہ) سے زمین کی سبزیاں

جس کو کھاتے ہیں لوگ اور مویشی، یہاں تک کہ جب پکڑ لیتی ہے زمین اپنی رونق اور مزین ہو جاتی ہے اور گمان کرتے ہیں اس (زمین) کے بسنے والے کہ وہ قادر ہیں اس پر تو اچانک آتا ہے اُن کے پاس ہمارا حکم رات کے وقت یا دن کے وقت، پس کر دیتے ہیں ہم اس کو کٹے ہوئے کھیت کی طرح گویا کہ کل (گزشتہ دن) وہ آباد ہی نہ تھی۔ اس طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں نشانیاں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں (۲۴) اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف اور راہ دکھاتا ہے جس کو چاہے صراطِ مستقیم کی طرف (۲۵) وہ لوگ جنہوں نے نیکی کی، اُن کے لیے بھلائی اور زیادہ بھی۔ اور نہ چڑھے گی اُن کے چہروں پر سیاہی اور نہ ذلت۔ یہی لوگ ہیں جنت میں داخل ہونے والے۔ وہ اس (جنت) میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (۲۶) اور وہ لوگ جنہوں نے کمائی ہیں برائیاں بدلہ برائی کا اُس جیسا ہی ہوگا۔ اور چڑھے گی اُن پر ذلت۔ نہیں ہوگا اُن کے لیے اللہ کے سامنے کوئی بچانے والا۔ گویا کہ اوڑھا دیئے گئے ہیں ان کے چہروں پر ٹکڑے تاریک رات کے۔ یہی لوگ ہیں دوزخ میں جانے والے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (۲۷)

انسانی زندگی کی مثال

پہلے اللہ نے معاد کا ذکر کیا۔ پھر انسانوں کی غفلت، ناشکری، کفر، شرک، بغاوت اور شرارت کا تذکرہ ہوا۔ فرمایا انسانوں کی بغاوت انہی کے نفسوں پر پڑے گی، اس تھوڑی سی زندگی سے فائدہ اٹھا لو، بالآخر تمہیں خدا تعالیٰ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے جو تمہارے اعمال تمہارے سامنے رکھ دے گا۔ اب آج کی آیات میں اللہ نے انسانی غفلت ہی کے سلسلے میں ایک مثال بیان فرمائی ہے اور نیکی اور بدی کرنے والوں کے انجام کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کی مثال اس طرح بیان فرمائی ہے اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ

الدُّنْيَا بےشک دُنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے۔ كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ جیسے پانی ہو جسے ہم نے آسمان سے اتارا فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ پھر مِل گیا اس کی وجہ سے سبزہ زمین کا جب اللہ نے بارش نازل فرمائی تو سبزیوں، پھلوں، کھیتوں اور درختوں میں روئیدگی آئی۔ انہوں نے نئے نئے پتے اور نئی نئی شاخیں نکالیں اور اس طرح اس پانی کے سبب نباتات آپس میں مِل گئے۔ پانی کی عدم موجودگی میں کھیتیاں گنجان نہیں تھیں بلکہ پودے علیحدہ علیحدہ نظر آتے تھے اللہ نے پانی کے سبب اُن کو گنجان کر دیا اور اس طرح وہ آپس میں مِل گئے زمین کے پودے اور درخت آپس میں مِل گئے اور درختوں کے پتے اور شاخیں آپس میں مِل گئیں اور وہ گھنے نظر آنے لگے۔ نبات الارض کے آپس میں خلط ملط ہونے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ زمین میں روئیدگی کے جو مواد پائے جاتے تھے وہ پانی کے ساتھ مِل گئے اور سبزیاں، گھاس، اناج اور پھل پیدا ہوئے مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اناج پیدا ہوتا ہے تو اس کے دانے تو انسان کھا لیتے ہیں اور بھوسا، چھلکا وغیرہ مویشیوں کی خوراک بن جاتا ہے گندم، مکی، چاول، باجرہ، جو وغیرہ سب کا یہی حال ہے کہ یہ تمام اناج بیک وقت انسانوں اور جانوروں کے کام آتا ہے۔

فرمایا حَتّٰىٓ اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا حتیٰ کہ جب زمین اپنی پوری رونق پکڑ لیتی ہے وَازَّيَّنَتْ اور مزین ہو جاتی ہے دل کو بھلی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کھیتی، سبزی، پھل وغیرہ پکنے کے قریب ہوتے ہیں تو زمین اپنے پھل کی وجہ سے خوب پر رونق ہوتی ہے رنگ برنگے پھولوں اور پھلوں سے زمین مزین ہو جاتی ہے، باغات کی ہریاول اور بھینی بھینی خوشبو اس کے حسن میں اضافہ کر دیتی

ہے۔ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اور اس کے مالک گمان کرتے ہیں کہ اب وہ اس کے پھل، پھول اور اناج سے مکمل استفادہ حاصل کرنے پر قادر ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اب ہماری فصل پک چکی ہے اور اب ہم پر خوشحالی آنے والی ہے تو پھر کیا ہوتا ہے اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا اچانک اُن کے پاس ہمارا حکم آ پہنچتا ہے رات کے وقت یا دن کے وقت فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا پس ہم اُسے کٹی ہوئی فصل کی طرح کر دیتے ہیں۔ وہ پکی پکائی فصل اس طرح ہو جاتی ہے كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ گویا کہ وہ یہاں تھی نہیں۔ ایسی تباہی آتی ہے کہ نہ کوئی پودا بچتا ہے، نہ پھل اور نہ پھول۔ پوری کی پوری فصل تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ طوفان باد و باراں ہو یا سیلاب، بجلی ہو یا اولے، نباتات کو اس طرح ویران کر دیتے ہیں جیسے مدت ہوئی فصل کٹ چکی ہے اور اب زمین بالکل خالی پڑی ہے۔

اس مثال کو اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی پر منطبق کر کے فرمایا ہے کہ دیکھو! انسان پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے تمام قویٰ اپنے پورے عروج پر ہوتے ہیں تو اچانک موت وارد ہو کر اس کا کام تمام کر دیتی ہے اور وہ شخص اپنے قویٰ سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے اس مثال کی نہایت لطیف پیرائے میں انسانی زندگی کے ساتھ مطابقت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح بادلوں سے پانی نازل ہو کر زمین پر چشمے، دریا، نہریں، کنویں اور سمندر وجود میں آتے ہیں اسی طرح روحِ انسانی بھی عالمِ بالا سے آتی ہے اور خاکی جسم کے ساتھ مل کر قوت پکڑتی ہے۔ روح اور جسم کے ملاپ سے انسان معرضِ وجود میں آتا ہے اور پھر یہ انسان بڑے بڑے کام انجام دیتا ہے۔ آدمی تعلیم مکمل کر لیتا ہے، ہنر میں پختہ ہو جاتا ہے، کاروبار اور صنعت و حرفت

میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ سائنس دان اور انجنیئر بن جاتا ہے، اعلیٰ عہدے پہ فائز ہوجاتا ہے تو پھر وہ اور اس کے متعلقین اس کی استعداد پر بھروسا کرنے لگتے ہیں کہ اب ہم کامیابی کے قریب پہنچ گئے اور ہمارے دن پھرنے والے ہیں، خوشحالی آنے والی ہے جس کے نتیجہ میں عیش و آرام کی زندگی ملنے والی ہے تو اچانک اُس شخص کو موت آجاتی ہے اور سارا بنا بنایا کھیل یکدم ختم ہو جاتا ہے۔

قدرتی آفات

دنیا میں قدرتی آفات منجملہ قحط، طوفان، ٹڈی دَل، زلزلے وغیرہ مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے فصلیں اور انسانی جانیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ سورۃ القلم میں باغ والوں کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اُن کی فصل پک چکی تھی اور وہ غربا اور مساکین کو ٹالنے کی خاطر علی الصبح فصل کاٹ لینا چاہتے تھے۔ مگر جب وہ منہ اندھیرے پہنچے تو باغ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پہلے تو سمجھے کہ راستہ بھول گئے ہیں مگر بالآخرہ جان گئے "بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ" کہ وہ باغ اور اس کے پھل سے محروم ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے راتوں رات اُس کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ دنیا کے مختلف خطوں میں زلزلے بھی آتے رہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے اسے قیامت کی نشانیوں میں سے فرمایا ہے۔ ترکی کا زلزلہ بڑا مشہور ہے۔ چند سال قبل ہمارے ملک کے بالائی علاقوں میں زلزلے نے تباہی مچادی تھی۔ جاپان میں ۱۹۲۲ء میں زبردست زلزلہ آیا تھا جس میں تین لاکھ جانیں ضائع ہو گئیں۔ زمین میں ایک ایک ہزار میل لمبی دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ ۱۹۳۵ء کا کوئٹہ کا زلزلہ ہماری زندگی میں آیا جس میں پچیس ہزار آدمی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے اور مجموعی طور پر اس زلزلے سے ڈیڑھ لاکھ افراد متاثر ہوئے۔ زلزلے اللہ کی طرف سے تنبیہ کے طور پر آتے ہیں کہ اے لوگو! اب بھی نیکی کی طرف آجاؤ، ورنہ خدا تعالیٰ تو تمہیں آن واحد میں ملیامیٹ کرنے پر قادر ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب اس قسم کی افتاد پڑ جائے، سورج یا چاند کو گرہن لگ

جانے تو توبہ استغفار کیا کرو، نماز پڑھو اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ مگر اللہ تعالیٰ سے غفلت کا یہ حال ہے کہ گرہن کے وقت گڑگڑانے کی بجائے اس کی تصویریں اتاری جاتی ہیں اور انہیں مشتہر کیا جاتا ہے۔

تباہی رات کے وقت بھی آسکتی ہے اور دن کے وقت بھی کوئٹہ در بدرتہ کے زلزلے رات کے وقت ہی آئے تھے۔ بدرتہ کی بارہ ہزار کی آبادی میں سے ایک فرد بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ یہ تو ابھی بیس سال پرانی بات ہے جب یہ ساحلی شہر پورے کا پورا ملیامیٹ ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرمائے اور ہمیں اپنی گرفت سے بچائے ورنہ ہمارے اعمال تو زلزلوں کے قابل ہی ہیں۔ اللہ نے رات اور دن کا ذکر کرکے انسانوں کی غفلت کی طرف اشارہ کیا ہے ہو سکتا ہے کہ لوگ دن کے وقت کاروبار میں مصروف ہوں تو اچانک افتاد آن پڑے یا رات کو آرام کر رہے ہوں تو اٹھنا نصیب نہ ہو فرمایا کَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ہم اسی طرح تفصیل کے ساتھ نشانیاں بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ جو اللہ کی نشانیاں دیکھ کر سمجھ جائیں گے۔ توبہ کریں گے اور مستقبل کی تیاری کریں گے۔ اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کریں گے وہ بچ جائیں گے۔

دار السلام کی طرف دعوت

فرمایا، یاد رکھو! وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ بیشک اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر یعنی جنت کی طرف بلاتا ہے۔ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ جیسے جابتاہے ایک اثر میں اس طرح آتا ہے کہ طلوع شمس کے وقت اس کے دونوں کناروں پر اللہ کے فرشتے آواز دیتے ہیں کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ تمہیں دار السلام کی طرف بلا رہا ہے۔ اس طرف جانے کی کوشش کرو۔ فرشتے ہیں کہ اس آواز کو انسانوں اور جنات

کے سوا ساری مخلوق سنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان پردہ ڈال رکھا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جنت کی دعوت دیتا ہے کہ میری توحید پر ایمان لا کر اعمال صالحہ بجا لاؤ تو تمہیں دارالسلام حاصل ہو جائے گا جہاں ہر قسم کا امن و امان حاصل ہو گا۔ باقی رہی ہدایت کی بات تو یہ اُس شخص کو حاصل ہو گی جو اس کا خواہشمند ہو گا۔ اعراض کرنے والے کو ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

اصحاب الجنۃ

فرمایا، یاد رکھو! لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ جن لوگوں نے بھلائی کی اُن کو بھلائی کا بدلہ بھلائی ہی ملے گا اور کچھ زیادہ بھی۔ زیادتی کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب جنتی جنت میں چلے جائیں گے، انہیں تمام نعمتیں میسر آجائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے جنتیو! کیا میں تمہیں کچھ مزید دوں؟ وہ حیران ہو کر عرض کریں گے۔ پروردگار! تو نے مہربانی فرمائی، ہمیں جنت میں پہنچا دیا۔ ہمارے چہرے روشن کیے اور تمام نعمتوں سے نوازا، اب مزید کیا ہو سکتا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ اپنا حجاب اٹھا کر اپنی تجلیات سے دیدار نصیب فرمائیں گے۔ یہی زیادتی ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا جنت والے لوگ ایسے ہوں گے وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ انکے چہروں پر نہ سیاہی گرے گی اور نہ ذلت وہ ہشاش بشاش ہونگے اور اپنے رب کی تسبیحات بیان کرنے والے ہونگے

فرمایا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ یہی اہل جنت لوگ ہیں جو دارالسلام میں پہنچیں گے۔ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ گویا نیکی والے لوگوں کے لیے یہ دائمی نعمتیں ہوں گی۔ ان کو وہاں سے نکلنے کا یا نعمتوں کے ضائع ہونے یا ختم ہو جانے کا کوئی خوف و خطرہ نہیں ہو گا۔

اصحاب النار

اب تصویر کا دوسرا رخ ہے وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ

اور جن لوگوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا جَزَآءُ سَیِّئَۃٍۭ بِمِثْلِھَا تو برائی کا بدلہ بھی برائی میں ہوگا۔ برائی کا انجام اچھا نہیں ہوسکتا ایسے لوگوں کی حالت کے متعلق فرمایا وَتَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ ان کے چہروں پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ ان کی سخت رسوائی ہوگی۔ سورۃ عبس میں آتا ہے وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْھَا غَبَرَۃٌ ۝ تَرْھَقُھَا قَتَرَۃٌ اُس دن کتنے مونہوں پر گرد و غبار پڑی ہوگی اور کتنے چہروں پر سیاہی چڑھی ہوگی۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا مَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ خدا کے سامنے ان کو بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ان کے چہروں کی سیاہی کا یہ حال ہوگا۔ کَاَنَّمَآ اُغْشِیَتْ وُجُوْھُھُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا جیسے کہ انہیں تاریک رات کے ٹکڑے پہنا دیے گئے ہوں جس طرح انتہائی تاریک رات میں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح ان لوگوں کے چہرے سخت سیاہ ہوں گے اور یہ اس وجہ سے ہوگا کہ انہوں نے ایمان قبول نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہ لائے۔ فرمایا اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ یہی لوگ دوزخ والے ہیں ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ اس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور وہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہ بن پڑے گی۔

معرفت الٰہی

ظاہر ہے کہ سیاہی کفر، شرک اور معاصی کے نتیجے میں آتی ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے، اُس کی وحدانیت کو مان لیتا ہے۔ اُس کو ایمان کی روشنی نصیب ہوگی اور اس پر کبھی تاریکی نہیں چھائے گی۔ امام رازیؒ اور حضرت شبلیؒ اللہ تعالیٰ کی معرفت کو اس طرح سمجھاتے ہیں۔

کُلُّ بَیْتٍ اَنْتَ سَاکِنُہٗ
غَیْرُ مُحْتَاجٍ اِلَی السُّرُجِ

یعنی جس گھر میں تو رہتا ہے، اس میں چراغ کی ضرورت نہیں ہے جس دل میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نور ہوگا۔ سیاہی اس کے نزدیک نہیں آسکتی وہ ہمیشہ روشن رہیگا۔ مالک ابن دینارؒ بھی فرماتے ہیں کہ دنیا کے اکثر لوگ اس دنیا سے چلے گئے ہیں مگر انہوں نے لذیذ چیز کا مزا نہیں چکھا۔ پوچھا گیا، حضرت! وہ لذیذ چیز کون سی ہے؟ فرمایا وہ اللہ کی پہچان ہے جس کو معرفت الٰہی حاصل ہوگئی، اس کی وحدانیت کا عقیدہ دل میں راسخ ہوگیا۔ وہاں تاریکی نہیں چھائیگی۔ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ لوگ اپنے اپنے دلائل لائیں گے مگر

وَوَجْهُكَ الْمَامُوْلُ حُجَّتُنَا
يَوْمَ يَاْتِي النَّاسُ بِالْحُجَجِ

ہمارے نزدیک تو تیرا پُرامید چہرہ ہی دلیل ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جس دل میں خدا تعالیٰ کی صحیح معرفت ہوگی، نور ایمان ہوگا، وہ چہرے سیاہ نہیں ہوں گے، بلکہ وہ کامیاب و کامران ہوں گے، البتہ سیاہ چہرے والے نامراد ہوں گے اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَجَمِيْعَ الْمُسْلِمِيْنَ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اس ذلت سے محفوظ رکھے۔

لہ حلیۃ الاولیاء: ۳۵۸/۲

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ
أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ
وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ۝ ۲۸ فَكَفَىٰ
بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ
لَغَافِلِينَ ۝ ۲۹ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ
وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا
كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ ۳۰

ترجمہ: اور جس دن ہم جمع کریں گے ان سب کو، پھر ہم
کہیں گے ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا کہ تم اپنی جگہ پر
ٹھہرے رہو تم اور تمہارے شریک بھی۔ پھر ہم جدائی ڈالیں گے
ان کے درمیان اور کہیں گے ان کے شریک کہ تم نہیں تھے
ہماری عبادت کرتے (۲۸) پس کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ ہمارے
درمیان اور تمہارے درمیان۔ بیشک ہم تمہاری عبادت سے بے
خبر تھے (۲۹) اس وقت جانچ لے گا ہر نفس جو اس نے
آگے بھیجا اور لوٹائے جائیں گے وہ اللہ کی طرف جو ان کا
سچا آقا ہے اور گم ہو جائیں گی ان سے وہ چیزیں جن کو وہ
افترا کیا کرتے تھے (۳۰)

[illegible]　ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی ایک دوسری [illegible]

پر تردید فرمائی ہے اور ساتھ ساتھ معاد کا مسئلہ بھی بیان فرمایا ہے۔ قیامت پر یقین رکھنا بھی اہم اجزائے ایمان میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں قیامت اور حشر نشر کے واقعات کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے اس سورۃ میں پہلے شرک کی تردید اور نیکی اور بدی کے انجام کا تذکرہ ہو چکا ہے اور اب حشر نشر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے حشر کا معنی اکٹھا کرنا ہوتا ہے دوسری جگہ فرمایا اُحْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَاَزْوَاجَهُمْ (الصّٰفّٰت) اکٹھا کرو ان کو جنہوں نے ظلم یعنی کفر اور شرک کیا ہے مع ان کی بیویوں کے جو اُن کے ساتھ شریک ہیں۔ بہر حال اکٹھا کرنے والی بات اللہ نے قرآن میں مختلف جگہوں پر تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ اور جو واقعات حشر کے دن پیش آنے والے ہیں ان کی مختلف کیفیتوں کا ذکر فرمایا ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو صرف اللہ کے علم میں ہیں، کوئی مخلوق اُن کو نہیں جانتی۔ اور بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جن سے اللہ نے آگاہ کر دیا ہے اس میں جمیعًا کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ یعنی ہم سب کو اکٹھا کریں گے۔ سورۃ واقعہ میں فرمایا قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ ہم پہلوں اور پچھلوں سب کو اکٹھا کر لیں گے، نیک اور بد، چھوٹے اور بڑے، تابع اور متبوع سب کے سب اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ایک مقررہ وقت پر اکٹھے کیے جائیں گے۔ حشر کا معنیٰ ہی یہ ہے کہ تمام انس و جن بلکہ جانوروں کو بھی اکٹھا کیا جائے گا۔ پھر ان سے بازپرس ہوگی اور سب کو اپنے اعمال کا بھگتان کرنا ہوگا۔ پھر ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی موت کے بعد دوبارہ زندگی بھی برحق ہے اور پھر سب کا ایک جگہ پر اکٹھا کیا جانا اور محاسبہ کا عمل

پیش نا کبھی شک و شبہ سے خالی ہے۔

مشرکین کے لیے پابندی

جب سب لوگ ایک جگہ پر اکٹھے ہو جائیں گے تو فرمایا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا پھر ہم مشرکوں سے کہیں گے مَكَانَكُمْ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو۔ جہاں جہاں کوئی موجود ہوگا، اسی جگہ پر پابند کر دیا جائے گا۔ اَلْزِمُوْا مَكَانَكُمْ یعنی اپنی جگہ کو لازم پکڑو، یہاں سے ادھر اُدھر ہونے کی اجازت نہیں۔ اور یہ پابندی کن کے لیے ہوگی۔ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ تم بھی اور تمہارے معبودانِ باطلہ بھی جن کو تم نے خدا کا شریک بنا رکھا تھا، جن کی تم پرستش کرتے تھے، کسی کو خدا کا بیٹا اور کسی کو بیٹی بنا لیا، کسی نے ابن اللہ کہا اور کسی نے عین اللہ کہہ دیا، کسی نے ملائکہ کی عبادت کی اور کسی نے احبار اور رہبان کی، کسی نے شجر و حجر کو معبود بنا لیا اور کسی نے قبر پرستی شروع کر دی، کسی نے انسانوں کی پوجا کی اور کسی نے جنات کو نافع و ضار سمجھ لیا۔ غرضیکہ تمام مشرک اور ان کے معبود اکٹھے کر کے ایک مقام پر پابند کر دیئے جائیں گے۔

عابد اور معبودوں میں تفراق

فرمایا ہم عابدوں اور معبودوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیں گے فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ پھر ہم اُن کے درمیان تفریق ڈال دیں گے یعنی عابد اور معبود ایک دوسرے کے خلاف ہو جائیں گے۔ انبیاء، ملائکہ یا صالحین کی پرستش کرنے والے تو خود اپنے فعل کی وجہ سے مجرم ہیں، اس میں انبیاء، ملائکہ یا صالحین کا کوئی قصور نہیں ہے۔ انہوں نے کب کہا تھا کہ تم ہماری پوجا شروع کر دو۔ انہوں نے تو ہمیشہ حق کی دعوت دی مگر یہ لوگ ہی تھے جنہوں نے شیطان کے پیچھے لگ کر اللہ کے مقربین کو معبود بنا لیا۔ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ اور وہ شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے بلکہ صحیح معنوں میں تم شیطان کی عبادت کرتے تھے جس نے تمہیں ورغلا کر غیر اللہ کی پرستش

پر آمادہ کیا۔ حالانکہ سورۃ یٰس میں بالکل واضح کیا گیا ہے "اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ" اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پوجا نہ کرنا۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر فرشتوں کے متعلق بھی آتا ہے کہ جب اللہ ان سے پوچھیں گے کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے۔ تو فرشتے جواب دیں گے "سُبْحٰنَكَ" اے اللہ! تیری ذات پاک ہے ہم نے تو تیرے سوا کسی کو ولی نہیں بنایا۔ ہم تو تیری ہی آقائی کے قائل ہیں اور تیری ہی عبادت کرنے والے ہیں ہم ان کو اپنی عبادت کے لیے کیسے کہہ سکتے تھے۔ یہ تو اپنے زعم باطل کے مطابق شیطان کے پیچھے لگنے والے لوگ ہیں۔ یہی جواب انبیا اور صلحا کا ہوگا کہ انہوں نے کبھی کسی کو خدا کے علاوہ اپنی عبادت کرنے کی دعوت نہیں دی۔

سورۃ مائدہ میں اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا جو کہ قیامت کے دن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ اے عیسیٰ علیہ السلام "ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنا لینا۔ عیسیٰ علیہ السلام نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کریں گے "قَالَ سُبْحٰنَكَ" اے مولا کریم! تیری ذات پاک ہے۔ "مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ" میرے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایسی بات کرتا جس کا مجھے حق نہیں پہنچتا۔ میں نے تو ان سے وہی باتیں کہیں جن کا تو نے مجھے حکم دیا اور وہ بات یہی ہے "اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ" کہ عبادت صرف اللہ کی کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے، نہ مالک، نہ مشکل کشا، نہ حاجت روا

نہ علیم کل اور نہ مختارِ مطلق۔ لہٰذا عبادت بھی صرف اُسی کی کرنی چاہیئے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی یہی کہیں گے رَبَّنَا اِنَّكَ
تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ اے پروردگار ہماری پوشیدہ
اور ظاہر باتوں کو تو خوب جانتا ہے۔ عالم الغیب تیری ذات ہے اگر
ہمارے دل کے کسی گوشے میں کوئی شرک والی بات ہوتی تو وہ لازماً تیرے
علم میں ہوتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ
صِدْقُهُمْ آج کا دن وہ ہے کہ جس میں سچوں کو اُن کی سچائی کام
دیگی۔ ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو سچے ہیں اور یہ عیسائی جھوٹے ہیں
جو ان کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں غرضیکہ جن جن کو مشرکین
نے معبود بنا رکھا تھا وہ سارے انکار کر دیں گے کہ ہم نے تو انہیں
نہیں کہا تھا کہ تم ہماری عبادت کیا کرنا۔
وہ اپنی بات کی صداقت کی دلیل کے طور پر کہیں گے۔ فَكَفٰى
بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ہمارے اور تمہارے درمیان
اللہ گواہ ہے۔ ہمیں کیا علم کہ تم ہماری عبادت کرتے تھے۔ اگر یہ جان
چیز پتھر وغیرہ کی عبادت کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ انہیں کیا علم ہو سکتا
ہے کہ کون ان کی عبادت کر رہا ہے۔ اور اگر کسی جاندار کی عبادت
کرتے تھے تو اُن کو بھی جب تک اللہ نہ بتائے، پتہ نہیں چل سکتا۔
لہٰذا شرکاء صاف کہہ دیں گے اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ
ہم تو تمہاری عبادت سے غافل تھے۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ ہم نے
کب کہا تھا کہ ہماری عبادت کرو۔ غرضیکہ معبودین صاف انکار
کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت مشرکین کی کتنی تذلیل ہوگی۔
دوسری روایت میں آتا ہے کہ حکم ہوگا کہ ہر عابد اپنے معبود کے
پیچھے آئے۔ عابد کی باطل عبادت معبود کی شکل میں متشکل ہو کر سامنے

آجائے گی۔ سورج پرست سورج کے پیچھے چلیں گے، چاند پرست اس کے پیچھے جائیں گے، پتھروں اور انیٹوں کے پجاری ان کے پیچھے پیچھے چلتے جائیں گے حتیٰ کہ جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ البتہ نیک لوگوں کی عبادت کرنے والوں کا قانون الگ ہے۔ فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓی اُولٰٓئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ جن کے حق میں ہماری طرف سے پہلے نیکی ثابت ہو چکی ہے، وہ ہمارے علم میں ہیں اور وہ دوزخ سے دور رہیں گے۔ (الانبیاء)

ہر نفس کا محاسبہ

فرمایا هُنَالِکَ تَبْلُوْا کُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ اُس وقت جانچ لے گا ہر نفس جو اُس نے آگے بھیجا۔ ہر شخص کی کارکردگی اُس کے سامنے ہوگی اور وہ خود اُسے دیکھ لے گا اور آزمالیگا۔ تَبْلُوْا کی بجائے تَتْلُوْا بھی پڑھا گیا ہے یعنی اُس وقت پڑھ لے گا جو اُس نے آگے بھیجا۔ اور اگر تَتْلُوْا تلو سے ہو تو اس کا معنی پیچھے لگنا ہوتا ہے یعنی ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے پیچھے لگے گا۔ اچھے اعمال والا اپنے اعمال کے پیچھے لگ کر جنت تک پہنچ جائیگا اور بُرے اعمال والا چلتے چلتے دوزخ میں جا گرے گا۔ اس لفظ کو نَبْلُوْا بھی پڑھا گیا ہے اور اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہم آزمائیں گے، ہر نیک و بد کو ممتاز کر دیں گے بہر حال فرمایا کہ ہر شخص جانچ لے گا جو اُس نے آگے بھیجا، اور اللہ فرماتے گا۔ ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰکَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ یہ تیرے ہاتھوں کی کمائی ہے جو تو نے آگے بھیجی۔ خدا تعالیٰ تو کسی سے ذرہ برابر بھی زیادتی نہیں کرتا۔ حدیث شریف میں اس طرح آتا ہے۔ اِنَّمَا هِیَ اَعْمَالُکُمْ نُحْصِیْهَا عَلَیْکُمْ یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جنہیں ہم نے شمار کر رکھا ہے۔

فرمایا وَرُدُّوْٓا اِلَی اللّٰهِ وہ سب کے سب اللہ کی طرف

لوٹائے جائیں گے مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ جو ان کا آقا ہے۔ یہی وہ معبودِ حقیقی ہے جس کی عبادت سے دنیا میں اعراض کرتے ہیں اور شرک کرتے تھے۔ چونکہ سب اللہ کے سوا غیروں کی عبادت کرتے تھے، کسی نے بت کو لیا، کسی نے قبر کو تعظیم دی، کسی نے نذر و نیاز پیش کی اور کسی نے سلام کیا۔ غیر اللہ کو مشکل کشا اور نافع اور ضار سمجھتے تھے۔ یہ ساری باتیں ختم ہو گئیں کیونکہ ان معبودوں کو تو کوئی اختیار نہیں تھا۔ انہوں نے تو اپنی عبادت کے لیے کہا ہی نہیں تھا۔ وہ تو ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ اے پروردگار! انہوں نے خود غلط کام کیا۔ ہم ان سے بیزار ہیں حتیٰ کہ شیطان بھی بیزاری کا اعلان کر دے گا۔ اگلی سورۃ ابراہیم میں آئے گا کہ میں نے ان پر کوئی جبر تو نہیں کیا تھا۔ میں تو انہیں کفر، شرک اور معاصی کی محض ترغیب دیتا تھا۔ انہوں نے میری بات پر تو یقین کر لیا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر یقین نہ کیا۔ لہٰذا یہ اپنے آپ کو ہی ملامت کریں۔ قصور خود انہی کا ہے۔

مشرکین کی بے بسی

بہرحال فرمایا کہ یہ اپنے برحق آقا کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ" کے ورد میں ایسا ہی آتا ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہی سچا مالک ہے۔ فرمایا یہ لوگ اپنے کیے دھرے کو جانچ لیں گے کہ انہی کا عمل ہے۔ اور پھر کیا ہوگا: وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ اور گم ہو جائیں گی ان سے وہ باتیں جن کو وہ افترا کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے جو شرکیہ اور کفریہ باتیں اپنے عقائد میں جما رکھی تھیں، اور جو اعمال وہ انجام دیتے رہے وہ سارے کے سارے گم ہو جائیں گے۔ کوئی چیز ان کے لیے مفید ثابت نہیں ہوگی بلکہ سب کچھ ان کے خلاف جائیگا اور مضر ثابت ہوگا۔ وہاں نہ کوئی دستگیری کرنے والا ہوگا اور نہ خدا کے غضب سے بچانے والا ہوگا

سب کے سب وہاں عاجز ہوکر رہ جائیں گے اور پھر اس کا نتیجہ خطرناک سزا کی صورت میں نکلیگا اس کا تذکرہ پچھلی آیت میں بھی ہو چکا ہے اللہ نے مشرکوں کی قباحت اور برائی حشر کے عنوان سے بیان فرمائی ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ
يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ
الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ
الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾
فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا
الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ:۔ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کون ہے جو رزق دیتا ہے تمہیں آسمان سے اور زمین سے۔ یا کون ہے وہ جو مالک ہے کانوں کا اور آنکھوں کا۔ اور کون ہے جو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔ اور کون ہے وہ جو تدبیر کرتا ہے تمام معاملے کی۔ یقیناً کہیں گے یہ لوگ کہ اللہ ہی ہے تو آپ کہہ دیجئے پھر کیوں نہیں تم ڈرتے (۳۱) یہی ہے اللہ تمہارا پروردگار سچا۔ پس کیا ہے حق کے بعد سوائے گمراہی کے تم کدھر پھیرے جاتے ہو (۳۲) اسی طریقے سے ثابت ہو چکی ہے بات تیرے پروردگار کی اُن لوگوں پر جنہوں نے فسق کیا۔ بیشک وہ ایمان نہیں لاتے (۳۳)

ربطِ آیات — گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے حشر کے عنوان سے توحید کا مسئلہ بیان

فرمایا تھا یعنی حشر کے میدان میں مشرکین کا شدید محاسبہ ہوگا اور ان کی سخت تذلیل ہوگی۔ اس طرح گویا اللہ نے شرک اور مشرکین کا رد فرمایا۔ اب آج کے درس کا مضمون بھی توحید کے حق میں اور شرک کی تردید میں ہے۔ اس کے بعد پھر اس سورۃ کے مرکزی مضمون قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت کا ذکر آئے گا۔ آج کی آیات میں توحید کے عقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں اور ان کا انداز یہ ہے کہ اس سوال کا جواب طلب کیا گیا ہے کہ تمہیں دلفلی نعمتیں عطا کرنے والی کونسی ذات ہے انسان ذرا بھی غور و فکر کرے گا۔ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ تمام نعمتیں مہیا کرنے والا فقط خدا تعالیٰ ہے جب یہ بات ہے تو پھر مشرکین سے اگلا سوال ہے کہ پھر خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کیوں بناتے ہو، اُن سے کیوں ڈرتے ہو اور اُن کی عبادت کیوں کرتے ہو؟

روزی رساں ذات

ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ ان لوگوں سے دریافت کریں مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ تم کو کون روزی پہنچاتا ہے آسمان سے اور زمین سے۔ جاندار مخلوق کی روزی کا تعلق آسمان سے بھی ہے اور زمین سے بھی۔ آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے اور زمین میں روئیدگی کا مادہ ہوتا ہے اور یہ دونوں چیزیں مل کر اجناس اور پھل کی پیدائش کا سبب بنتی ہیں۔ سورۃ الذاریات میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ تمہاری روزی اور تم سے وعدہ شدہ چیز کا تعلق آسمان سے ہے۔ ان چیزوں کا حکم عالمِ بالا سے آتا ہے۔ رزق کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ تامہ اور حکمتِ بالغہ کے ساتھ سمندروں سے بخارات کو اٹھاتا ہے، پھر وہ بادلوں کی شکل اختیار کرتے ہیں جن میں بڑی مقدار میں پانی ہوتا ہے پھر ہوائیں ان بادلوں کو لے کر چلتی ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ اپنی مصلحت کے

مطابق جہاں چاہتا ہے اور جتنی مقدار میں چاہتا ہے اتنی بارش برسا دیتا ہے اُدھر زمین کو بھی حکم ہوتا ہے " وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ " (الطارق) زمین پھٹ جاتی ہے اور اس کے اندر سے اللہ تعالیٰ انسانوں اور جانوروں کے لیے رزق کو اگاتا ہے۔ گذشتہ آیات میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ جانوروں کا کھانا بھی مقصودی ہوتا ہے۔ سورۃ اعلیٰ میں موجود ہے " وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی " اللہ ہی زمین سے چارہ پیدا کرتا ہے جو جانوروں کی خوراک بنتا ہے اور پھر یہی جانور اللہ کے حکم سے انسان کی خدمت پر مامور ہیں۔ ان کی روزی کا سامان بھی خدا تعالیٰ نے ہی مہیا فرمایا ہے۔

سماعت اور بینائی

رزق کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد آگے اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کے دو نہایت ہی اہم اعضاء کا ذکر فرمایا ہے اور مشرکین سے پوچھا ہے کہ بھلا بتاؤ کہ ان اعضاء کا مالک کون ہے ؟ ارشاد ہوتا ہے۔ اے نبی کریم ! آپ ان سے یہ بھی دریافت کریں اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ کہ کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے ؟ انسانی جسم کے یہ اہم ترین اعضا کس نے پیدا کئے ہیں ؟ سمع کا مطلب ظاہری کان بھی ہو سکتے ہیں اور اس سے قوتِ سامعہ بھی مراد لی جا سکتی ہے۔ اسی طرح آنکھوں سے ظاہری آنکھوں کے علاوہ قوتِ بینائی بھی مراد لی جا سکتی ہے۔ مطلب بہر حال یہی ہے کہ کانوں اور آنکھوں یا قوتِ سامعہ اور قوتِ باصرہ کا مالک کون ہے ؟ انسانی جسم کی یہ دو چیزیں اللہ نے بطور نشانی بیان فرمائی ہیں۔ جس طرح آسمان اور زمین اللہ کی عظیم نشانیاں ہیں، اسی طرح کان اور آنکھ بھی اللہ کی عظیم نعمتیں اور اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ فرمایا، ان کا مالک کون ہے ؟ ان کا صانع کون ہے اور ان میں سماعت اور بصارت کی قوت پیدا کرنے والی کون ذات ہے۔

اعضائے انسانی کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سے اعضاء عطا فرمائے ہیں۔ ان میں

سے بعض ایک ایک ہیں اور بعض دو دو۔ انسانی جسم کے لیے جن اعضا سے زیادہ کام لینا مقصود ہے اُن کو دو کی تعداد میں پیدا کیا گیا ہے اور جن اعضاء سے نسبتاً کم کام مطلوب ہے، ان کی تعداد ایک ایک ہے، مثلاً ہاتھ اور پاؤں سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس لیے یہ دو دو ہیں۔ کان اور آنکھیں بھی انسان کے لیے نسبتاً زیادہ خدمت پر مامور ہیں، لہٰذا ان کی تعداد بھی دو دو ہے برخلاف اس کے اللہ نے انسان کو زبان صرف ایک عطا کی ہے جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسان کو سننے اور دیکھنے کی نسبت بولنا کم چاہیئے۔ زیادہ بولنا اکثر باعثِ وبال ہوتا ہے ہمیشہ تھوڑی بات کرے مگر اچھی کرے، کوئی ایسی لغو بات نہ کرے جو قابلِ مؤاخذہ ہو۔ بہر حال دریافت یہ کیا گیا ہے کہ کان اور آنکھ جیسی عظیم نعمتیں کس نے پیدا کی ہیں؟ کیا یہ کسی ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان یا ماہر صناع کی تیار کردہ ہیں؟ اور پھر ان میں قوتِ سماعت اور قوتِ بصارت کس نے پیدا کی ہے؟ ظاہر ہے یہ قویٰ بھی اللہ ہی کے پیدا کردہ ہیں وہ جب چاہتا ہے ان میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے یا یہ قویٰ بالکل ہی چھین لیتا ہے اور پھر انسان ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور انسانی سوسائٹی میں اپنا مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتے۔ اِن دو نشانیوں پر ہی غور کرے تو انسان اللہ کی معرفت کو پا سکتا ہے۔

کان کی ساخت

کان کی ظاہری ساخت بھی اللہ تعالیٰ نے عجیب و غریب بنائی ہے یہ ٹیڑھی وضع قطع، اندر گڑھے اور ابھار پھر ان میں سوراخ انسانی ضرورت کے عین مطابق ہیں۔ آواز بردار ہوا کان کے ابھاروں سے ٹکرا کر نالیوں میں سے ہوتی ہوئی کان کے سوراخ میں چلی جاتی ہے۔ سوراخ اس ہوا کو آگے نہایت ہی نازک چمڑے کے پردے تک لے جاتا ہے جو آگے سے بند ہے۔ پردے کے آگے حوض ہے جس میں رطوبت بھری ہوئی ہے جب ہوا پردے سے ٹکراتی ہے تو کان کے حوض میں بالکل اسی طرح

لہریں پیدا ہوتی ہیں جس طرح کسی جوہڑ میں پتھر مارنے سے۔ حوض کی دوسری جانب جہاں لہریں ختم ہوتی ہیں وہاں ہر ایک کان میں تین تین ہزار اعصاب ہیں جو ٹیلیفون کا کام دیتے ہیں۔ ہر قسم کی آواز سننے کے لیے ایک ہی ٹیلیفون نہیں بلکہ ہر قسم کی آوازوں کی سماعت کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹیلیفون ہیں مثلاً گانا سننے کیلیے اور ٹیلیفون ہے اور رونے کی آواز کے لیے دوسرا۔ نرم آواز ایک ٹیلیفون سنتا ہے تو کرخت آواز کو دوسرا۔ بہرحال یہ ٹیلیفون آواز کو سن کر اس کی اطلاع مرکزِ سماعت کو دیتے ہیں۔ اور پھر قوتِ عقلیہ اور دماغیہ فیصلہ کرتی ہے کہ یہ کس چیز کی اور کس قسم کی آواز ہے۔ بہرحال اللہ نے سماعت کے لیے کانوں میں حیرت انگیز انتظام قائم کر رکھا ہے

آنکھوں کی ساخت

آنکھوں کی ساخت کان سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس پر بقراط کے زمانے سے تحقیق ہو رہی ہے جو کہ مسلسل جاری ہے۔ آنکھ میں اللہ نے سات طبقے اور تین قسم کی رطوبتیں رکھی ہیں۔ آنکھ کے درمیان میں جو سوراخ نظر آتا ہے اس میں نہایت ہی شفاف قسم کی رطوبت ہوتی ہے۔ جب یہ رطوبت گدلی ہو جاتی ہے تو موتیا بند بن جاتا ہے آدمی اندھا ہو جاتا ہے اور پھر آپریشن کے ذریعے اس کثافت کو دور کر کے آنکھ کو دیکھنے کے قابل بنایا جاتا ہے۔ بقراط کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آنکھ کے سامنے والے حصے میں نہایت ہی باریک اور شفاف جالی نما پردے رکھے ہیں جو کہ دیکھنے میں ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس شیشے کے گرد ایک غلاف بنا رکھا ہے جس کے ذریعے کسی حادثے یا دیگر ضرورت کے وقت آنکھ کو بند کر لیا جاتا ہے۔ یہ قدرت خداوندی کی کمال صناعی کا نمونہ ہے کہ اس نے چہرے پہ ہڈیوں میں گڑھے بنا کر آنکھوں کو ان کے اندر محفوظ کر دیا ہے تاکہ حادثہ کی صورت میں ہڈی اس آنکھ کا دفاع کر سکے جب کوئی چیز آنکھ کے سامنے آتی ہے تو اس کا عکس رطوبت

کی وساطت سے آنکھ کے پچھلے حصے میں چلاجاتا ہے۔ جہاں طوبت ختم ہوتی ہے، وہاں پر اعصاب کا جال بچھا ہوا ہے۔ جب باہر سے آنے والا عکس ان جالیوں پر پڑتا ہے تو سیدھے مجمع نور تک پہنچاتی ہیں۔ مجمع نور اس عکس کو حسِ مشترک تک وہ علاوہ مرکزی قوتِ بصارت پہنچا دیتی ہے۔ اس قوت کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے چنانچہ آخر میں مرکزی قوت فیصلہ کرتی ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ فلاں رنگ یا فلاں قسم کی شکل ہے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے آنکھ میں بھی عجیب وغریب اور نہایت ہی نرم و نازک نظام پیدا کر کے بینائی جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے۔

کان اور آنکھ بلحاظ افضلیت

انسانی کان اور آنکھ میں سے کون سا عضو افضل ہے، اس کے متعلق مختلف حکماء کی مختلف آراء ہیں۔ جو محققین کان کے حق میں ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کی بینائی زائل ہو جائے تو عقل کام کرتی رہتی ہے جب کہ سماعت کے ضیاع سے عقل بھی کام نہیں کرتی۔ لہٰذا کان افضل ہیں۔ اس آیت کریمہ میں کان کا ذکر پہلے ہوا ہے اور آنکھ کا بعد میں، اور یہ چیز بھی کان کی افضلیت کی دلیل ہے۔ کان کے حق میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اللہ کے انبیاء میں سے بعض نابینا تو ہوئے ہیں جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام مگر کسی نبی کی قوتِ سماعت کا ابطال ثابت نہیں چونکہ سماعت سے محرومی تبلیغ دین کے حق میں رکاوٹ بن سکتی ہے اس لیے اللہ نے اپنے کسی نبی کو اس سے محروم نہیں کیا۔ لہٰذا یہ بھی کان کی فضیلت کے حق میں جاتا ہے۔ غرضیکہ بعض لوگ ان دلائل کی بناء پر کان کو آنکھ کی نسبت افضل مانتے ہیں۔

بعض مفکر آنکھ کو افضل تسلیم کرتے ہیں کیونکہ لَیْسَ وَرَآءَ الْعِیَانِ بَیَانٌ جو چیز مشاہدے میں آجاتی ہے وہ آخری ہو جاتی ہے۔ انسان جب کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو پھر اس کے وجود پر مزید کسی

دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ فارسی کا مقولہ بھی یہی ہے "عیاں را چہ بیان" جو چیز نظر آجائے اس پر مزید دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ہزاروں نشانات بکھیر دیے ہیں جنہیں آنکھ کے ذریعے دیکھ کر انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آنکھ آسمان کی طرف دور تک کی چیزوں کو دیکھ سکتی ہے جب کہ کان کی شنوائی زیادہ دور تک نہیں ہوتی۔ یہ بھی آنکھ کی افضلیت پر دلیل ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے اللہ کا کلام اس دنیا میں سُنا مگر ان کو رویت نصیب نہیں ہوئی کیونکہ یہ زیادہ افضل چیز ہے اور دوسرے جہان میں ہی ہوگی اور وہ اس کے نیک بندوں کو۔ باطل پرست وہاں بھی رویت الٰہی سے محروم ہی رہیں گے۔ صرف خاتم الانبیاء حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس زندگی میں رویت الٰہی نصیب ہوئی ہے مگر وہ بھی اس دُنیا میں نہیں بلکہ معراج کے موقع پر عالم بالا میں جا کر یہ چیز بھی آنکھ کی فضیلت کے حق میں جاتی ہے۔

ایک اور بات بھی ہے کہ اگر کسی شخص کے کان ضائع ہوجائیں تو وہ بظاہر اتنا عیب دار معلوم نہیں ہوتا جتنا وہ شخص ہوتا ہے جس کی آنکھیں ضائع ہوجائیں۔ پھر اُسے چلنے پھرنے اور کام کاج میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک[1] ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَنْ سَلَبْتُ كَرِيمَتَيْهِ فَصَبَرَ فَلَنْ أَرْضَى لَهُ دُونَ الْجَنَّةِ جس شخص کی میں نے دو بزرگی والی آنکھیں سلب کرلیں اور پھر اُس نے صبر کیا، تو پھر میں اُسے جنت میں پہنچائے بغیر کسی چیز پر راضی نہیں ہوں گا۔ بہرحال انسانی اعضا کان اور آنکھ کے متعلق یہ بحث امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں کی ہے، مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ دونوں نعمتیں اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہیں اور اس کی قدرت کا عظیم شاہکار۔ ان کے بغیر

[1] ترمذی ص ۳۲۶

خود انسان اُن خصائل سے محروم ہوتا جو اللہ نے اِن کے ذریعے اس میں پیدا فرمائے ہیں۔

زندہ اور مردہ کا خالق

بات کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی کہ اے پیغمبر! آپ ذرا ان کفار و مشرکین سے پوچھیں کہ آسمان و زمین سے روزی کون مہیا کرتا ہے اور کان اور آنکھوں کا مالک کون ہے؟ اسی سلسلۂ سوال کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا، وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ اور زندہ کو مردہ سے کون نکالتا ہے۔ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ اور مردہ کو زندہ سے کون پیدا کرتا ہے؟ اِن دونوں چیزوں کے مشاہدات ہم روزمرہ زندگی میں کرتے ہیں۔ ایک حقیر اور بے جان قطرہ آب سے اللہ تعالیٰ اپنی افضل ترین مخلوق انسان کو پیدا کرتا ہے انڈا ایک بے جان چیز ہے مگر اس سے جیتا جاگتا زندہ چوزا نکل آتا ہے۔ اب مرغی ایک جاندار پرندہ ہے لور اس سے پیدا ہونے والا انڈا مردہ ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ذرا یہ تو بتاؤ کہ مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ کون پیدا کرتا ہے؟ عالم سے جاہل اور جاہل آدمی سے عالم کو کون پیدا کرتا ہے اسی طرح نیک آدمی سے بد اور برے آدمی سے نیک کو پیدا کرنا کس ذات کا کام ہے۔

پھر آگے فرمایا وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ اور معاملے کی تدبیر کون کرتا ہے؟ دوسرے مقام پر آتا ہے کہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں تک تمام امور کی تدبیر کون کرتا ہے؟ ہر ہر کام کا عروج و زوال ترقی و تنزل، امیری غریبی، صحت اور مرض، حوادثات اور انعامات، یہ سب چیزیں کون مہیا کرتا ہے؟ ان چیزوں کو اپنے اپنے وقت اور اللہ کی حکمت اور مصلحت کے مطابق کون لاتا ہے؟ تکلیفیں کون بھیجتا ہے اور راحت کے سامان کون مہیا کرتا ہے؟ زندگی کون عطا کرتا

ہے اور موت کون طاری کرتا ہے؟ غرضیکہ پوچھا گیا ہے کہ تمام معاملات کی تدبیر کون کرتا ہے

ان تمام سوالوں کا جواب اللہ نے فرمایا فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ یقیناً مشرکین یہی جواب دیں گے کہ ان تمام امور کا انجام دینے والا خدا تعالیٰ ہی ہے۔ اس بات کو وہ بھی مانتے ہیں کہ کارسازی کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ فرمایا اگر ان کا یہی جواب ہے۔ فَقُلْ تو آپ اُن سے کہہ دیں اَفَلَا تَتَّقُوْنَ پھر تم ڈرتے کیوں نہیں۔ جب تمام کام اللہ ہی کرتا ہے تو پھر تم اس کی عبادت اور صفات میں غیروں کو کیوں شریک کرتے ہو؟ ان کو نذرانے کیوں پیش کرتے ہو؟ اُن کی دہائی کیوں دیتے ہو؟ اُن کی قبروں پر چڑھاوے کیوں چڑھاتے ہو؟ اور ان سے مرادیں اور حاجتیں کیوں طلب کرتے ہو؟ فرمایا حقیقت یہ ہے فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ تمہارا رب وہی وحدہٗ لاشریک ہے جو برحق ہے۔

فرمایا، اگر یہ بات ہے فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ تو پھر حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد گمراہی کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ کفر اور شرک تو سراسر گمراہی ہے۔ اگر اللہ کی وحدانیت کو پس پشت ڈال دو گے تو باقی صرف گمراہی رہ جائیگی۔ جب ربوبیت کا اقرار کرتے ہو تو پھر الوہیت کا انکار کیوں کرتے ہو؟ پھر اسی وحدہٗ لاشریک کی عبادت پر اکتفا کیوں نہیں کرتے؟ اغیار کے پیچھے کیوں بھاگتے ہو؟ فرمایا جب حق واضح ہو گیا فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ پھر تم کدھر پھرے جاتے ہو؟ اور شیطان نے تمہیں کس رستے پر ڈال دیا ہے؟

فسق ذریعہ محرومی

اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات بھی اشارۃً فرمادی ہے کَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوٓا اسی طرح تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے ان لوگوں پر جو فاسق ہیں۔ یاد رکھو یہ فسق اور نافرمانی ہی انسان کی محرومی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ فلاں شخص نافرمانی پر ڈٹ جانے والا ہے، لہٰذا اسے ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ایسا شخص ایمان سے محروم ہی رہتا ہے۔ یہاں پر فسق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ ظلم کا ذکر بھی آتا ہے یعنی ظالموں پر اللہ کی بات ثابت ہو چکی ہے اور وہ محروم رہیں گے اور انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوگی۔ جب تک فسق اور ظلم کو ترک نہیں کریں گے نیکی سے محروم ہی رہیں گے۔ فرمایا یہ بات نافرمانوں پر ثابت ہو چکی ہے اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ برائی پر اصرار ایسی خصلت ہے جو انسان کو ہر خیر سے محروم کر دیتی ہے اور انسان ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

قُلۡ هَلۡ مِنۡ شُرَكَآٮِٕكُمۡ مَّنۡ يَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ ؕ
قُلِ اللّٰهُ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۳۴﴾
قُلۡ هَلۡ مِنۡ شُرَكَآٮِٕكُمۡ مَّنۡ يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الۡحَـقِّ ؕ
قُلِ اللّٰهُ يَهۡدِىۡ لِلۡحَـقِّ ؕ اَفَمَنۡ يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الۡحَـقِّ اَحَقُّ
اَنۡ يُّتَّبَعَ اَمَّنۡ لَّا يَهِدِّىۡۤ اِلَّاۤ اَنۡ يُّهۡدٰى ۚ فَمَا لَـكُمۡ
كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ اَكۡثَرُهُمۡ اِلَّا ظَنًّا ؕ
اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغۡنِىۡ مِنَ الۡحَـقِّ شَيۡـــًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ
بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیں اے شرک کرنے والو! کیا ہے تمہارے شریکوں میں سے کوئی جو اولاً مخلوق کو پیدا کرتا ہو اور پھر اسے دوبارہ لوٹائے؟ آپ کہہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر اس کو لوٹائے گا۔ پس تم کدھر پلٹائے جاتے ہو ﴿۳۴﴾ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے۔ کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو راہنمائی کرے حق کی طرف؟ آپ کہہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ ہی راہنمائی کرتا ہے حق کی طرف۔ بھلا وہ ہستی جو راہنمائی کرتی ہے حق کی طرف زیادہ حقدار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے یا وہ جو نہیں راہ پاتا مگر یہ کہ اس کو راہ دکھائی جائے۔ پس کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم کیسا فیصلہ کرتے

ہو؟ (۳۵) اور نہیں پیروی کرتے اکثر ان میں سے مگر محض
گمان کی اور بیشک گمان نہیں کام دیتا حق کے سامنے کچھ بھی
بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے اُن تمام باتوں کو جو یہ کرتے
ہیں (۳۶)

ربط آیات

آج کا درس بھی پہلی آیات کے ساتھ مربوط ہے۔ اس میں بھی توحید کے اثبات شرک کی تردید اور مشرکین کی ذہنی پستی کا ذکر ہے۔ گذشتہ درس میں اللہ نے توحید کے مسئل اس انداز میں بیان فرمائے کہ ذرا بتاؤ تو سہی کہ آسمان وزمین سے روزی کون نازل کرتا ہے؟ کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے؟ زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے کون پیدا کرتا ہے؟ اور تمام معاملات کی تدبیر کون کرتا ہے؟ اس کا جواب خود ہی بیان فرمایا کہ سب لوگ یہی کہیں گے کہ مذکورہ تمام امور انجام دینے والا فقط اللہ ہی ہے پھر خود ہی فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر اُس اللہ سے ڈرتے کیوں نہیں اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ یہی اللہ ہر چیز کی پرورش کرنے والا ہے، یہی ہر ایک کے لیے سامان زیست مہیا کرتا ہے۔ اب حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ فرمایا جو لوگ نافرمان ہیں اور اس پر ڈٹے ہوئے ہیں، وہ ایمان نہیں لاتے۔

ابتدائی تخلیق اور اعادہ

گذشتہ درس کی طرح یہ درس بھی دلائل توحید پر ہی مشتمل ہے آج مخلوق کی ابتدائی تخلیق اور پھر دوبارہ لوٹائے جانے کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اے پیغمبر! قُلْ آپ کہہ دیں هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ کوئی ایسا ہے جس نے ابتدائی طور پر کوئی انسان، جن یا کسی اور چیز کو پیدا کیا ہو؟ ظاہر ہے کہ ہر جاندار اور غیر جاندار کو پیدا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی مضمون کو اللہ نے دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا ہے فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (لقمٰن) مجھے دکھاؤ تو سہی جو انہوں نے اللہ کے سوا پیدا کیا ہے۔ کوئی درخت، کوئی جانور، چرند پرند، انسان، جن، ملائکہ، کوئی خطۂ ارضی، کوئی آسمانی

کرو۔ کوئی ہے جس نے ان میں سے کوئی چیز پیدا کی ہو۔ غرضیکہ اللہ نے فرمایا کہ جن شرکا کو تم کبھی عبادت میں اور کبھی صفت میں شریک بناتے ہو۔ کبھی ان کی نذر و نیاز دیتے ہو اور کبھی ان کو پکارتے ہو اور ان کے نام کی دہائی دیتے ہو۔ کبھی انتہائی تعظیم اور کبھی سجدہ کرتے ہو۔ بھلا بتلاؤ تو سہی کہ کسی نے کسی مخلوق کو ابتدائی طور پر پیدا کیا ہو ثُمَّ يُعِيدُهُ اور پھر اس کو لوٹاتا ہو یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا ہو۔

فرمایا۔ اے پیغمبر قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ آپ کہہ دیں کہ وہ تو اللہ کی ذات ہی ہے جس نے مخلوق کو ابتداً پیدا کیا ہے۔ پھر وہی اس کو لوٹانے گا۔ یہ بات تو اللہ نے بتکرار بیان کی ہے کہ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الزمر) یعنی ہر چیز کا خالق اللہ ہے پہلی دفعہ بھی انسان کو وہی پیدا کرتا ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ بھی وہی لوٹائے گا۔ سورۃ لبقرہ میں بھی موجود ہے۔ کہ تم اللہ تعالیٰ کا انکار کیسے کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے تو اس نے تمہیں زندہ کیا ثُمَّ يُمِيتُكُمْ پھر وہ تمہیں موت دیگا ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ پھر تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر محاسبے کی منزل آئیگی جس کے نتیجہ میں یا تو اللہ کی رحمت میں داخل ہو جاؤ گے اور یا پھر سزا پاجاؤ گے۔ غرضیکہ اولاً پیدا کرنا اور پھر اس کا اعادہ کرنا صرف اللہ کا کام ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا یہ کام نہیں کر سکتا فرمایا اگر حقیقت یہی ہے فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ تو تم کدھر پلٹائے جاتے ہو۔ کیا اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جب ابتداء اور انتہاء کا مالک اللہ ہے تو درمیان کی تمام چیزوں کا مالک بھی وہی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام لوازمات اسی کے قبضہ قدرت اور اسی کے تصرف میں ہیں، تو پھر اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے کی کیا تُک رہ جاتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرتِ تامہ کی یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے غور و فکر کے لیے ذکر کی ہے۔

راہنمائی بطرف حق

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی دوسری دلیل ہدایت اور راہنمائی کے اعتبار سے بیان فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ اے پیغمبر! قُلْ آپ ان سے دریافت کریں هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہو؟ لفظِ حق اپنے اندر بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ حق اُس چیز کو کہتے ہیں جو ثابت، ٹھوس، اٹل اور صحیح ہو اور اس کی طرف راہنمائی سے مراد یہ ہے کہ صحیح قانون اور صحیح راستے پر چلنے کی تلقین ہو۔ تو فرمایا، کیا تمہارے معبودانِ باطلہ میں سے کوئی ایسا ہے جو حق بات کی دعوت دے۔؟ پھر اللہ نے اس سوال کا جواب بھی خود ہی اپنے نبی کی زبان سے دلوایا قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ آپ کہہ دیں کہ وہ اللہ ہی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ حق کی طرف راہنمائی کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ آگے پھر دوسرا سوال پیش کیا اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ کیا حق کی طرف راہنمائی کرنے والا اتباع کا زیادہ حقدار ہے اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى یا وہ زیادہ حقدار ہے۔ جو نہیں راہ پاتا بلکہ خود اُسے راہ دکھائی جائے۔ جواب بڑا واضح ہے کہ اتباع کے لائق تو وہی ذات ہو گی جو خود حق پر ہو اور حق ہی کی طرف دعوت دے۔ نہ وہ جو خود ہدایت کا محتاج ہو۔ حق کی طرف راہنمائی کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے لہٰذا وہ قابلِ اتباع ہے اور معبودانِ باطلہ تو خود ہدایت کے محتاج ہیں، لہٰذا ان کا اتباع کیسے ہو سکتا ہے؟

معبودانِ باطلہ میں سے بعض تو مٹی، پتھر یا لکڑی کے بے جان بُت ہیں جو اپنی جگہ سے ہلنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ بااختیار بھی

ہوں تو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور دستگیری کے محتاج ہیں۔ انبیاء ہوں یا ملائکہ، اولیاء ہوں یا شہداء، صالحین ہوں یا مقربین سارے کے سارے ہر لحظہ ہدایت و راہنمائی کے لیے اللہ کے محتاج ہیں۔ اب تم خود ہی فیصلہ کرو کہ اتباع کے لائق کون ہے۔ کیا اُس کی اتباع ہونی چاہیئے جو راہِ حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے یا وہ جو خود راہنمائی کا طالب ہے؟

راہنمائی کی ضرورت

راہنمائی کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ طالب کو منزل مقصود تک پہنچا دیا جائے اور دوسری یہ کہ درست راستے کی نشاندہی کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں کام اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان امور میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اس مقام پر ہدایت کا ذکر ہے جب کہ دوسری جگہ "سُبُلَنَا" کا لفظ آتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ضروریات کے تمام شعبوں میں راہِ حق کی طرف راہنمائی کی ضرورت ہے۔ مثلاً سب سے پہلے فکر اور عقیدے کی طہارت کی ضرورت ہے۔ عقائد کی درستی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی طرف وحی بھیجی ہے۔ جو آپ اپنی امت کو وہ اصول بتاتے ہیں جن کے ذریعے فکر کو پاک کیا جاتا ہے۔ گویا انسان کی سب سے پہلی ضرورت اس کے ذہن، دماغ، فکر اور ذہن کی طہارت ہے۔ اس کے بعد انسان کی دوسری ضرورت یہ ہے کہ وہ عبادت کے طریقے سمجھے اور برائیوں سے بچنے کی تدابیر اختیار کرے۔ امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کی عبادت کے طریقے سکھائیں اور یہ کام بھی اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا۔ اس ضمن میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اور قربانی وغیرہ کی جزئیات معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر معاملات میں راہنمائی کی ضرورت ہے کہ خرید و فروخت میں کون سے اصول پیشِ نظر ہونے چاہئیں یعنی

کا طریقہ کیا ہو۔ پھر اخلاقیات میں بھی راہنمائی کی ضرورت ہے کہ کونسا اخلاق اپنانا چاہیئے اور کس سے بچنا چاہیئے۔ سیاسیات میں بھی اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کی ضرورت ہے اگرچہ آجکل اسے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سیاست کا رخ بھی صحیح نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم منزل مقصود پر پہنچنے سے قاصر ہیں۔ اس معاملہ میں بھی صحیح راہنمائی اللہ کی کتاب اور اُس کے نبی کی زبان مہیا کرتی ہے۔ اگر ہم اُن کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلیں گے تو سیاست میں کامیابی ہوگی ورنہ اندھیرے میں ٹکریں مارتے رہیں گے، خود بھی تباہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی برباد کریں گے معاشرتی معاملات میں بھی حقیقی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ ہماری شریعت اور دین نے آپس میں میل جول اور معاملات کے لیے پاکیزہ اصول بیان کیے ہیں۔ تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں انہی اصولوں کی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح تعلیم اور تبلیغ کے شعبے ہیں کہ ان کو کس طرح انجام دینا ہے۔ ان چیزوں کے لیے بھی ہم صحیح راہنمائی کے محتاج ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سورۃ فاتحہ نہایت ہی اہم سورۃ ہے جسے ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں۔ اس کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی زبان سے کہلوایا ہے کہ اے مولا کریم! اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی سیدھے راستے کی طرف ہماری راہنمائی فرما۔ گویا ہم ہر بات میں اُس کی راہنمائی کے محتاج ہیں۔ چنانچہ اس دعا اور درخواست کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ جس راہنمائی کی تجھے ضرورت ہے "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" وہ اِس کتاب قرآن پاک میں ہے جو شک و شبہ سے بالا ہے۔ قرآن پاک کی یہ صفت اگلی آیات میں بھی آرہی ہے۔ بہر حال اللہ کی کتاب تمام معاملات میں اصول و ضوابط مہیا کرتی ہے جب کہ نبی

کی زبان اس کی شرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی یہ ڈیوٹی لگا دی ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ جو چیز بھی اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے آپ لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت کر دیں۔ گویا نبی کی زبان قرآن کی تفسیر یا بیان (STATEMENT سٹیٹمنٹ) ہے۔ سورۂ نحل میں موجود ہے" وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف اسلیے نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس کی خوب وضاحت کر دیں۔ قرآن پاک صرف عبادات کی تعلیم تک محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام معاملات کے لیے اس میں راہنمائی موجود ہے اور ہم اس کے محتاج ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ نے اپنے نبی کو بھی یہی حکم دیا ہے اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ" (الانعام) آپ بھی اس چیز کی پیروی کریں جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر وحی کی گئی ہے۔ اللہ نے اپنے نبی کی زبان سے بھی کہلوایا إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي (الاعراف) میں تو اسی راہ کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی سے میرے رب کی۔ غرضیکہ فرمایا کہ جو ہستی حق کی طرف راہنمائی کرتی ہے اس کی بات ماننی چاہیئے یا اس کی جس کا کچھ اختیار ہی نہیں ہے، تم خود فیصلہ کر لو۔

اس آیت میں يَهِدِّيٓ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اصل میں يَهْتَدِي ہے اس میں تا کو دال بنا کر پہلے دال کو دوسری دال میں مدغم کر کے ہا پر شد اور پھر اس کو کسرہ دے کر يَهِدِّيٓ بنا دیا گیا ہے۔ اور جملے کا مطلب یہ ہے کہ کیا اتباع کا وہ زیادہ حقدار ہے أَمَّن لَّا يَهِدِّيٓ جو نہیں راہ پاتا۔ مگر یہ کہ اس کو راہ دکھائی جائے۔ فرمایا فَمَا لَكُمْ پس تمہیں کیا ہو گیا ہے كَيْفَ تَحْكُمُونَ تم کیا فیصلہ کرتے ہو۔ دیکھو! یہ کتنی ناانصافی کی بات ہے کہ تم ان کو خدا کا شریک بناتے ہو۔ ان کی پوجا کرتے ہو

جن کا اختیار ہی کچھ نہیں اور جو ذات اتباع کے قابل ہے اس کی بات ہی نہیں مانتے۔

اتباع الظن

اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی ایک قباحت بیان فرمائی ہے وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا اور نہیں پیروی کرتے ان میں سے اکثر مگر محض گمان کی۔ تمام مشرک اور رسومات کے پیروکار محض گمان کے پیچھے ہی چلتے ہیں۔ تمام بدعات گمان کی بنا اور ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کسی سے پوچھا جائے کہ یہ کام کیوں کرتے ہو۔ تو جواب ملتا ہے کہ اس میں کیا خرابی ہے، ہمارے فلاں بزرگ اور فلاں خاندان والے ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ آخر یہ کوئی اچھا کام ہی ہے تو اتنے لوگ انجام دے رہے ہیں۔ عید میلاد کے ایک جلسے میں کسی وزیر نے بھی کہا تھا کہ جہاں اتنے لوگ جمع ہو جائیں بھلا وہ کام باطل ہو سکتا ہے۔ مقصد یہ کہ دلیل کوئی نہیں۔ محض اٹکل پچو باتیں ہیں جن کے پیچھے بلا سوچے سمجھے چلے جا رہے ہیں۔ ہر بدعت کی ابتداء میں کہا جاتا ہے کہ اگر یہ کتاب وسنت سے ثابت نہیں تو اس میں حرج بھی کیا ہے۔ پھر جب وہ بدعت رائج ہو جاتی ہے کہ سب لوگ کر رہے ہیں آخر ہم کیوں نہ کریں۔ اس کا معنیٰ تو یہ ہے کہ اگر کسی کام کے لیے بہت سے گدھے بھی اکٹھے ہو جائیں تو یہ اس کام کے حق میں دلیل بن جاتی ہے۔ اسی کے متعلق فرمایا کہ ان کے اکثر لوگ بلا دلیل محض گمان کی پیروی کرتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ گمان دو طرح کا ہے امام بیضاوی مفسر قرآن فرماتے ہیں کہ فروعات اور اعمال میں گمان پر چلنا جائز ہے جیسے مجتہدین اور فقہائے کرام ظنی باتوں کے ذریعے ہی مسائل کا حل نکالتے ہیں۔ آپ اس پر عمل کر سکتے ہیں مگر عقیدے کے معاملے میں ظن پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں قرآن وسنت سے نص کی ضرورت ہے جب

تک کئی دلیل موجود نہ ہو، محض سُنی سنائی اور قیاسی باتوں سے دلیل قائم نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا عقیدے کے متعلق ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ حق بات کو تلاش کرے اور پھر اُس کے مطابق عمل کرے۔ جب حق معلوم ہو جائے تو پھر اس کے مقابلے میں ظن فائدہ نہیں دے سکتا۔ عقیدے کے معاملے میں کوئی اٹکل پچو بات کام نہیں دے گی۔

اچھے گمان

بعض اچھے گمان بھی ہوتے ہیں جیسے فرمایا ظَنُّ الْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا ایک مومن کو دوسرے مومن کے متعلق اچھا گمان رکھنا چاہیئے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی نہ مرے مگر اس حالت میں کہ اللہ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو کہ وہ غفور اور رحیم ہے اور ضرور مہربانی فرمائے گا۔ کسی شخص کو مایوسی کی حالت میں اللہ کے پاس نہیں جانا چاہیئے۔ اچھے گمان کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک چھوٹا بچہ کوئی ہدیہ لے کر آپ کے پاس آتا ہے کہ اس کے والد نے آپ کے لیے بھیجا ہے ظاہر ہے کہ اس کے متعلق آپ کو یقین تو نہیں ہے کہ یہ تحفہ واقعی فلاں شخص نے بھیجا ہے مگر آپ اس گمان پر چلتے ہوئے اس تحفہ کو قبول کر لیتے ہیں۔ اسی کو اچھا گمان کہا گیا ہے۔ ایسی باتوں میں گمان پر چلنا درست ہے مگر خدا کی ذات۔ اس کی صفات، توحید، نبوت، قیامت، کتب سماویہ، ملائکہ اور تقدیر وغیرہ کے معاملہ میں ظن کچھ فائدہ نہیں دیگا بلکہ ان چیزوں کے لیے قطعی دلیل کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح حلال حرام بھی محض گمان سے ثابت نہیں ہوتا۔ حلال وہی ہے جس کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اور اس کے رسول نے حلال بتلایا ہے۔ محض سُنی سنائی باتوں سے کسی چیز پر حلت و حرمت کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ فرمایا اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا بےشک گمان حق کے مقابلے میں کچھ فائدہ نہیں دیتا۔

إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ بیشک اللہ تعالیٰ ان کے تمام
افعال کو جانتا ہے۔ اس کے علم میں ہے کہ کون حق پر ہے اور کون محض
گمان کی پیروی کر رہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون مخلص ہے۔ اور
کون ضد اور عناد پر ڈٹا ہوا ہے۔ سب کے محاسبہ کا وقت آنے والا
ہے جب ان کو اپنے کئے کا بھگتان کرنا ہوگا۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ
لَارَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ
قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ
يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ
ع مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾

ترجمہ:۔ اور نہیں ہے یہ قرآن گھڑا ہوا اللہ کے سوا لیکن
یہ تصدیق ہے اس کی جو اس کے سامنے ہے۔ اور یہ تفصیل ہے
کتاب کی۔ نہیں شک اس میں کہ یہ رب العالمین کی طرف سے
ہے (۳۷) کیا کہتے ہیں یہ لوگ کہ اس قرآن کو گھڑ لایا ہے یہ اپنے پیغمبر
آپ کہہ دیجئے۔ پس لاؤ ایک سورۃ اس جیسی اور بلاؤ جس کو
بھی طاقت رکھتے ہو تم اللہ کے سوا۔ اگر تم سچے ہو (۳۸) بلکہ
انہوں نے جھٹلایا اس چیز کو کہ جس کے علم کا احاطہ نہیں کیا
انہوں نے اور ابھی تک نہیں آئی ان کے پاس اس کی حقیقت

اسی طرح جھٹلایا اُن لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں
پس دیکھو کیا ہوا انجام ظلم کرنے والوں کا (۳۹) اور بعض ان
میں سے وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس (قرآن) پر، اور
بعض ان میں سے وہ ہیں جو ایمان نہیں لاتے اس پر، اور
تیرا پروردگار خوب جانتا ہے اُن لوگوں کو جو فساد کرنیوالے ہیں (۴۰)

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں شرک اور مشرکین کی تردید ہو چکی ہے اور آج کے درس میں قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا بیان ہے اور اس کے ساتھ رسالت کا ذکر ہے۔ دعوت الی القرآن اس سورۃ کا خاص موضوع ہے۔ اس کے علاوہ توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال بھی خاص طور پر بیان ہوا ہے۔ ساتھ ساتھ قیامت کا وقوع اور اس کے متعلقات زیر بحث آئے ہیں۔ اس سورۃ کی ابتدائی آیت میں قرآنِ کریم کی صداقت کے متعلق بیان ہو چکا ہے ” تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ “ یہ بڑی حکمت والی کتاب ہے اور پھر آگے چل کر آتا ہے ” وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ “ جب ان کو ہماری واضح آئتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو خدا کی ملاقات سے نا اُمید لوگ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اس میں تبدیلی پیدا کر دو جو ہمارے عقائد کے مطابق ہو اور ہمارے معبودوں کا رد نہ ہو، تو پھر ہم اسے تسلیم کریں گے۔ اس کا جواب اللہ نے ارشاد فرما دیا تھا۔

قرآن کی حقانیت

آج کی آیات میں بھی قرآنِ پاک کی صداقت اور حقانیت ہی کا بیان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ گھڑ لیا گیا ہو اللہ کے سوا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے ارادے کے بغیر اس قرآن پاک کو کسی نے نہیں بنایا۔ مشرکین کا یہ اعتراض غلط اور محض بہتان ہے کہ قرآن پاک کسی کی خود ساختہ کتاب ہے۔ گذشتہ درس میں گزر چکا ہے کہ اکثر

مشرکین محض ظن اور تخمین کی بات کرتے ہیں۔ اُن کے پاس کوئی پکی بات نہیں ہوتی۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک ظلمات سے نکال کر صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔ یہ کتاب حقائق پر مبنی ہے اور علوم، معارف، احکام، قوانین اور معجزات کا مجموعہ ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت بے مثال ہے۔ لہٰذا اس کو من گھڑت کتاب کہنا بڑی زیادتی اور بدفہمی کی بات ہے۔ فرمایا وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ بلکہ یہ قرآن تو پہلی کتب سماویہ کی تصدیق کرنے والی کتاب ہے۔ پہلی کتابیں اپنے اپنے وقت پر اپنے اپنے انبیاء پر نازل ہو کر ہدایت کا سامان فراہم کرتی رہیں مگر ان کے مخاطبین اپنی نالائقی، بد دیانتی اور خیانت کی وجہ سے ان سے مستفید نہ ہو سکے، بلکہ انہوں نے ان کتابوں میں تحریف کر کے اللہ کے غضب کو دعوت دی۔ غرضیکہ یہ قرآن پاک زبور، تورات، انجیل اور دیگر صحائف کا مصدق ہے۔

تفصیل احکام

فرمایا ایک تو یہ پہلی کتابوں کی مصدق کتاب ہے اور دوسرا وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ کتاب کی تفصیل بھی ہے۔ کتاب کا لفظی معنی لکھی ہوئی چیز ہوتا ہے اور اس سے مراد تمام احکام کی تفصیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے نازل فرمائے ہیں۔ اور یہ تفصیل اس نوعیت کی ہے کہ اس میں تمام کتب سماویہ اور صحائف سابقہ کا خلاصہ آگیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن کتب کا خلاصہ اس آخری کتاب میں موجود ہے، اگر وہ ساری کتابیں اور صحائف منجانب اللہ اور برحق ہیں تو پھر یہ قرآن بھی برحق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کا تعلق عقیدے سے ہے یا عمل سے۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو نہایت ہی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ عقائد میں سب سے پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی معرفت اور

اُس کی توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کی وضاحت کرتے وقت اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اس کے ہر ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پہچان اور ایمان اور عقائد سے متعلقہ ہزاروں دلائل بیان ہوئے ہیں۔ توحید کا مسئلہ نہایت واضح طریقے سے بیان کر کے شرک کا رد فرمایا گیا ہے۔ کفر و شرک کرنے والوں کے عقائد باطلہ کا پورا پورا رد کیا گیا ہے۔ اسی طرح ملائکہ اور کتب سماویہ پر ایمان، قیامت پر ایمان اور خیر و شر من جانب اللہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا بھی خصوصی تذکرہ ہے۔ ان تمام چیزوں کا تعلق ایمانیات سے ہے۔

جہاں تک اعمال کی بات ہے، ان کا تعلق یا تو انسان کے ظاہر سے ہے یا باطن سے۔ ظاہر سے متعلقہ احکام کی تشریح و تفسیر حضور کے ارشادات میں ہے جن کی مزید وضاحت فقہائے کرام اور مجتہدین نے کی ہے علم فقہ دراصل اُن احکام کی توضیح ہے جن کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے یعنی اُن اعمال و افعال کی تشریح ہے جو انسان کو انجام دینے چاہئیں یا جن سے انسان کو بچنا چاہیئے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کی یہی تعریف بیان کی ہے مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا انسانی ذمہ داریوں کی تکمیل کے لیے مفید اور مضر چیزوں کی پہچان کا نام فقہ ہے

انسان کے باطن سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں اصلاح نیت اور اصلاحِ اخلاق سرفہرست ہیں۔ باطنی قوٰی، ہیئاتِ نفسانیہ اور ملکات کی درستگی بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔ اِن چیزوں کی تفصیل آئمہ مجتہدین اور بزرگانِ دین نے پیش کی ہے۔ انہوں نے انسان کی باطنی اصلاح کے لیے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ملفوظات، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی بلند پایہ تصنیفات اور خواجہ شہاب الدین

سہروردیؒ کی کتاب عوارف المعارف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے یہ کتاب اپنے استاد سے سبقاً سبقاً اور حرفاً حرفاً پڑھی۔ سابقہ بزرگوں کی تالیفات میں سے رسالہ کشادیہ اور کتاب اللمہ بلند پایہ کتب ہیں متقدمین میں حضرت علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب ہے جس کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم کا دعویٰ ہے کہ جب کسی کو مرشد کامل کی سرپرستی حاصل نہ ہو، اس کو یہ کتاب فائدہ دیتی ہے گی۔ اس کتاب میں حقائق بمعارف توحید اور انسانی اصلاح کے جملہ نظائر بیان کئے گئے ہیں۔ اصلاح باطن کی یہ تمام چیزیں بھی اللہ کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ بعض کا ذکر صراحتاً آگیا ہے اور بعض ضمناً مذکور ہیں۔ بعض کی تشریح اللہ کے نبی کی زبان سے ہوئی ہے اور بعض کو فقہاء اور مجتہدین نے اجتہاد و استنباط سے واضح کیا ہے چنانچہ یہ قول امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب ہے۔ ؎

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِنْ
تَقَاصَرَ عَنْہُ اَفْہَامُ الرِّجَالِ

قرآن پاک میں تمام علوم موجود ہیں مگر لوگوں کے فہم ان تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ بہرحال تفصیل الکتاب کا مطلب یہی ہے کہ قرآن پاک میں تمام مطلوبہ احکام کی تفصیل موجود ہے۔

فرمایا یہ تفصیل الکتاب ہے لَا رَیْبَ فِیْہِ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اس کو آپ سورۃ البقرہ کی پہلی آیت سے جوڑ لیں۔ وہاں بھی یہی ہے الٓمّٓ ۝ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ یہ پوری کتاب شک و شبہ سے پاک ہے۔ شک کرنے والوں کے اپنے دماغ ٹیڑھے ہیں، ان کی عقلیں ناقص ہیں۔ ورنہ وہ اللہ کی کتاب میں شک نہ کرتے اور اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہ یہ تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے آئی ہے غرضیکہ یہ قرآن حکیم

شک سے پاک کلام

کی حقانیت کا ذکر ہوگیا۔ لوگ اعتراض کرتے تھے کہ یہ من گھڑت ہے مگر اللہ نے واضح کر دیا کہ یہ رب العلمین کی نازل کردہ ہے جو اس نے اپنے اکمل ترین بندے پر جبرئیل کی معرفت بھیجی۔ یہ نوعِ انسان کی اصلاح اور فلاح کا عظیم پروگرام ہے۔

مثال لانے کا چیلنج

اب آگے قرآن کریم کی صداقت اور حقانیت کے متعلق مشرکین کے ساتھ بحث ہے ارشاد ہوتا ہے۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ کیا مشرکین یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ کا نبی اس کتاب کو خود گھڑ کر لایا ہے۔ اگر بالفرض محال ایسی بات ہے تو اے پیغمبر! قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ آپ ان سے کہہ دیں کہ اس قرآن جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ اور یہ چیلنج صرف تم تک محدود نہیں بلکہ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حسبِ استطاعت اللہ کے سوا جسے چاہتے ہو اپنی مدد کے لیے بلا لو۔ تم سارے کے سارے مل کر ہی اس جیسی ایک سورۃ بنا لاؤ اگر اس کو انسانی کلام سمجھتے ہو تو پھر تم بھی تو انسان ہو ایسا کلام بنا کر دکھا دو۔ تمہارے حکما، فصحا، بلغا اور دانش در پورا زور لگا لیں، تمہارے شاعر اپنے فن کو مکمل طور پر بروئے کار لے آئیں مگر وہ اس خدائی کلام کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ یہاں ایک سورۃ کی بات کی گئی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ "فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ (هود) اس جیسی دس سورتیں لے آؤ۔ اور یہاں آخری بات فرمائی کہ صرف ایک سورۃ ہی لے آؤ۔ فرمایا، تم سارے کے سارے مل کر ایک سورۃ ہی لے آؤ اور پھر اس کا قرآن کے ساتھ مقابلہ کر لو، تمہیں پتہ چل جائے گا کہ قرآن پاک کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ رحمان کا نازل کردہ ہے۔

امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ یہ آیت قرآن حکیم کا معجزہ ہے چودہ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اس چیلنج کو کسی نے قبول نہیں کیا۔ جن لوگوں

نے اس کی مثال پیش کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے منہ کی کھائی۔ مسیلمہ کذاب نے کچھ کلام پیش کیا تو لوگوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور کہا کہ تمہارا کلام فحش اور بکواس محض ہے جب کہ محمد کا پیش کردہ کلام علوم و معارف، دقائق و حقائق اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے۔ لہٰذا قرآن کا مقابلہ کہاں کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ہر لحاظ سے معجز ہے۔ فرمایا اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس چیلنج کو قبول کرو اور اس کی تین آیتوں والی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کی مثال ہی لا کر دکھاؤ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں بھی چیلنج موجود ہے کہ اگر سارے انسان اور سارے جن مل کر بھی قرآن کی مثال لانا چاہیں لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ تو اس کی مثال نہیں لا سکتے۔ مقصد یہ ہے کہ انسانی کلام کا مقابلہ تو دوسرے انسانی کلام کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کتنا بڑا شاعر اور ادیب ہو، مفکر اور دانشور ہو، اس کے کلام کو جانچا جا سکتا ہے اور مصنفین مختلف تخلیقات کی درجہ بندی کر سکتے ہیں مگر جب مقابلہ اللہ کے کلام اور مخلوق کے کلام کے درمیان ہو۔ وہاں کون فیصلہ کریگا؟ اللہ کا کلام تو تمام انسانی علوم سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

بلاوجہ تکذیب

فرمایا، حقیقت یہ ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ کہ مشرکین نے ایسی چیز کو جھٹلایا ہے جس کے علم کا انہیں احاطہ ہی نہیں۔ حق بات یہ ہے کہ کسی بات میں خامی اور کمزوری کی نشاندہی وہ کر سکتا ہے جس کو اس پر مکمل عبور حاصل ہو۔ مگر اللہ کے کلام پر تو کسی کا احاطہ ہی نہیں۔ لہٰذا بغیر مکمل ادراک حاصل کیے کون اس کی تکذیب کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کلام کو جھٹلانا تو نہایت ہی بے عقلی کی بات ہے۔

فرمایا ایک تو انہوں نے اس کلام کا مکمل احاطہ نہیں کیا اور دوسری بات یہ ہے وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ کہ ابھی تک اس کی حقیقت، مآل اور انجام بھی اُن کے سامنے نہیں آیا۔ تاویل سے مراد وہ حقائق ہیں

جن کو اللہ نے قرآن میں بیان کیا اور جن کا ظاہر ہونا ابھی باقی ہے۔ مثلاً فرشتوں اور جنات کا وجود، وقوع قیامت، حساب کتاب کی منزل، اور پھر جزا اور سزا کا فیصلہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں۔ جن کا دعویٰ تو قرآن نے کیا ہے مگر ان کا ظہور مستقبل میں ہونے والا ہے۔ فرمایا جب ان چیزوں کی آزمائش کا ابھی وقت ہی نہیں تو انہوں نے پہلے ہی ان کو کیسے جھٹلانا شروع کر دیا ہے، یہ تو قبل از مرگ واویلے والی بات ہے۔

فرمایا اے پیغمبر آخر الزمان! مکذبین کی یہ تکذیب کوئی نئی بات نہیں ہے کَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ان سے پہلے لوگوں نے بھی اللہ کے احکام کو اسی طرح جھٹلایا۔ سابقہ کافر و مشرک بھی واضح حقیقتوں کا انکار کرتے تھے مگر دیکھ لو کہ کیا وہ کامیاب ہو گئے فرعون، شداد، نمرود، قوم عاد و ثمود، قوم لوط اور دیگر بڑی بڑی تہذیب والوں نے اس بات کو جھٹلایا تو ان کا کیا حشر ہوا۔ دنیا میں بھی ذلیل ہوئے اور آخرت کی ابدی ذلت تو بہر حال ان کے مقدر میں ہے۔ سورۃ شعراء میں اللہ نے تمام مکذب قوموں کا نقشہ کھینچا ہے اور پھر آخر میں فرمایا ہے فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ دیکھو! ظلم کرنے والوں کا کیسا برا انجام ہوا۔

ایماندار اور کافر

اب یہ ہے کہ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ان میں سے بعض ایمان لاتے ہیں۔ جن کی استعداد اور صلاحیت اچھی ہوتی ہے وہ ایمان لا کر فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ قرآن پاک کی تعلیمات سے مستفید ہوتے ہیں۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو قرآن پاک پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس پر اعتراض کر کے لوگوں کو شک و شبہ میں ڈالتے ہیں۔ یہ ان کی سوءِ استعداد اور بدبختی ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ یہ

فسادی لوگ ہیں وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ اور آپ کا پروردگار ان فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے جو لوگ قرآن پاک کو من گھڑت بتاتے ہیں، وہ فسادی ہیں، وہ شرائع الٰہیہ میں خلل ڈالتے ہیں وہ من مرضی کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا، اللہ ایسے شرارتی لوگوں کا خوب واقف ہے اور وہ انہیں ان کے مآل (انجام) تک پہنچائے گا۔

وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنتُمْ
بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٤١﴾
وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ
وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ
أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿٤٣﴾
إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ
يَظْلِمُونَ ﴿٤٤﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا
إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ
خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿٤٥﴾

ترجمہ :- اور (اے پیغمبر) اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں ، پس آپ
کہہ دیجئے کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل
ہے ۔ تم بری ہو اُس چیز سے جو میں کرتا ہوں ، اور میں بری ہوں
اُس چیز سے جو تم کرتے ہو (۴۱) اور بعض اِن میں سے وہ
ہیں جو کان رکھتے ہیں آپ کی طرف ۔ تو کیا آپ سنائیں گے
بہروں کو اگرچہ وہ نہ عقل رکھتے ہوں (۴۲) اور بعض اِن میں
سے وہ ہیں جو نگاہ رکھتے ہیں آپ کی طرف ۔ پس کیا آپ
راہنمائی کریں گے اندھوں کی اگرچہ وہ نہ دیکھتے ہوں (۴۳) بیشک

اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرتا لوگوں پر کچھ بھی ، لیکن لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں (۴۴) اور جس دن اللہ تعالیٰ اُن کو اکٹھا کریگا تو ان کو ایسا معلوم ہو گا گویا کہ وہ نہیں ٹھہرے مگر ایک گھڑی بھر دن میں ۔ ایک دوسرے کو پہچانیں گے ۔ تحقیق نقصان میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی ملاقات کو اور نہیں تھے وہ راہِ راست پر (۴۵)

ربطِ آیات

ابتداء میں قرآن کی حقانیت اور صداقت کا ذکر ہوا ، پھر درمیان میں توحید کا مسئلہ بیان ہوا ۔ اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل دیے اور شرک کا رد فرمایا ۔ اس کے بعد پھر قرآن کی حقانیت کا تذکرہ آیا ، اس کا مُنزّل من اللہ ہونا اور غلطی سے مبرا ہونا بیان کیا گیا ۔ پھر تکذیب کرنے والوں کی مذمت ہوئی ۔ اب آج کے درس میں اور اگلی آیات میں مسئلہ رسالت اور قیامت کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے ۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مکی سورتوں میں بنیادی عقائد ، ایمانیات اور اخلاقیات ہی کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے ۔ اِن سورتوں میں خدا تعالیٰ کی وحدانیت ، اُس کی ذات و صفات اور ایمان کی جملہ جزئیات کا ذکر آتا ہے ۔ عقائد باطلہ اور رسومات باطلہ کی جگہ جگہ تردید آتی ہے ۔

تکذیبِ رسالت

کفار و مشرکین انبیاء کی نبوت و رسالت سے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے تھے اور رسالت کی تکذیب کرتے تھے ۔ تو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ایسے مکذبین کے متعلق فرمایا وَاِنْ كَذَّبُوْكَ اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو آپ اس سے گھبرائیں نہیں کیونکہ تکذیب کا سلسلہ شروع سے آرہا ہے ۔ کفار و مشرکین نے ہمیشہ توحید ، رسالت ، وحی الٰہی اور وقوعِ قیامت کو جھٹلایا ۔ تکذیبِ رسالت کے ضمن میں مشرک کہتے تھے کہ تم تو ہمارے جیسے انسان ہو ، ہم تجھے نبی کیسے مان لیں ؟ تمہاری ظاہری حالت بھی اچھی کوئی نہیں ہے ۔ مالی پوزیشن بھی بہتر نہیں ، تمہارے پاس مال و دولت نہیں ، نوکر چاکر نہیں ، کوئی کوٹھی ، بنگلہ اور باغات نہیں ۔ آخر کس بات پر تمہیں رسُول مان لیں ۔ در اصل

مشرکین ہمیشہ اس باطل زعم میں مبتلا رہے ہیں کہ نبی اور رسول وہ شخص ہو سکتا ہے جو اچھا خاصا کھاتا پیتا، صاحب جائیداد، امیر کبیر، اعلیٰ حیثیت اور بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ کہتے تھے کہ اگر نبی ہوتا تو مکے اور طائف جیسی دو عظیم بستیوں میں سے کوئی بڑا سردار ہوتا۔ کیا اللہ کے پاس نبوت کے لیے ابوطالب کا یتیم بھتیجا ہی رہ گیا تھا؟ اسی بنا پر وہ لوگ حضور خاتم النبیین کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔

فرمایا، اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو اے پیغمبر! فَقُلْ آپ ان سے کہہ دیں لِّي عَمَلِي میرے لیے میرا عمل ہے یعنی میں اپنے عمل کا ذمہ دار ہوں۔ میرے عمل کے بارے میں تم سے باز پرس نہیں ہوگی۔ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے۔ فرمایا، یاد رکھو! أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ تم ان کاموں سے بیزار ہو۔ جو میں انجام دیتا ہوں۔ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ اور میں ان کاموں سے بیزار ہوں جو تم انجام دیتے ہو۔ ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کی ذمہ داری اٹھانا ہوگی۔ میں اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوں۔ اگر میں نے کوئی غلطی کی یا افترا باندھا تو اس کی جواب دہی میں کروں گا اور تم اس کے ذمہ دار نہیں ہو گے لیکن یاد رکھو! اگر تم نے حق و صداقت کی تکذیب کی توحید و رسالت کو جھٹلایا، معاد کا انکار کیا، تو اس کا بھگتان تم کو کرنا ہوگا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب حق ظاہر ہو جاتا ہے تو اس کے مخالفین اس پر طرح طرح کے اعتراضات کیا کرتے ہیں اور اس کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں یہ بات ہمیشہ سے چلی آرہی ہے، لہٰذا طعن و تشنیع کرنے والوں سے زیادہ الجھنا نہیں چاہیئے۔ تکذیب کرنا باطل پرستوں کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے اسی لیے فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو اور میں اپنے عمل کا۔ سب کو اپنے اپنے اعمال کا جلد ہی حساب چکانا پڑے گا۔

ظاہری اور باطنی سماعت

اللہ نے مکذبین کی ایک خصلت یہ بھی بیان فرمائی ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ان میں سے بعض ایسے لوگ ہیں جو آپ کی طرف کان رکھتے ہیں یعنی آپ کی بات سنتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ظاہری کان تو آپ کی طرف کرتے ہیں مگر ان کے دل کے کان متوجہ نہیں ہوتے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا سننا نہ سننا برابر ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا، اے پیغمبر! اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ کیا آپ ان بہروں کو سنائیں گے جن کے دل کے کان بند ہیں وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ اور اگرچہ وہ عقل بھی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کو سنانے کا فائدہ کیا اور یہ لوگ آپ کی نصیحت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ سورۃ انفال میں بھی گزر چکا ہے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ وہ بہرے گونگے اندھے ہیں وہ عقل سے صحیح فائدہ ہی نہیں اٹھاتے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل جیسی عظیم نعمت عطا کی ہے جسے صحیح طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے مگر یہ لوگ ایسا کرنے سے قاصر ہیں غرضیکہ اللہ نے فرمایا کہ مکذبین کی حالت یہ ہے کہ وہ آپ کی بات دل سے سنتے ہی نہیں تو آپ اُن کو زبردستی کیسے سنا سکیں گے۔

دل کے اندھے

سماعت کے بعد بصارت کا ذکر فرمایا وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف نگاہ رکھتے ہیں یعنی بظاہر آپ کی طرف دیکھتے ہیں مگر وہ دل کے اندھے ہیں۔ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ کیا آپ اندھوں کو راہ دکھائیں گے اگرچہ وہ نہ دیکھتے ہوں۔ جو لوگ دل کے بہرے اور اندھے ہیں۔ وہ آپ کی بات کو نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ دل کے اندھاپن کے بارے میں سورۃ حج میں موجود ہے فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ

فِي الصُّدُوْرِ. یاد رکھو! اکثر ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ سینوں میں پڑی ہوئی دِل کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے اِن کے دِل میں اچھی بات جمتی ہی نہیں۔ جو شخص بصیرت سے محروم ہو، وہ کسی اچھی چیز سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ خالی سننا اور خالی دیکھنا مفید نہیں جب تک انسان کے قلب کے کان اور آنکھیں کھلی نہ ہوں۔ جب تک کسی نیکی کی طلب اور شوق نہ ہو، اچھی سے اچھی بات بھی اثر نہیں رکھتی اسی لیے فرمایا کہ ظاہری سُننا اور دیکھنا اُس وقت تک فائدہ نہیں دے سکتا جب تک دل متوجہ نہ ہو۔

مستشرقین کی ریشہ دوانیاں — اِس زمانہ کے مستشرقین پر یہ بات بالکل صادق آتی ہے۔ یہودی، عیسائی اور ہندو اہلِ قلم سیرت پاک پر قلم اٹھاتے ہیں بڑی بڑی اسلامی کتابوں کے دیباچے لکھتے اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ متعصب نہیں ہیں بلکہ اپنے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے بھی اسلامی اصولوں کے معترف ہیں۔ مگر یہ ان کی محض چالاکی ہے۔ اُن کے کان بہرے اور دل کی آنکھیں اندھی ہیں، لہٰذا وہ حق کو دل سے قبول نہیں کرتے بلکہ اسلام کی حمایت کی آڑ میں اس پر شب خون مارتے ہیں۔ بظاہر کسی تصنیف کا دیباچہ پڑھیں تو یہ لوگ بڑے منصف مزاج نظر آئیں گے مگر اس کتاب کے اندر اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام پر رکیک حملے پائیں گے۔ روسیوں کا حال بھی یہی ہے۔ بظاہر وہ قرآن پاک کی عزت کرتے ہیں مگر اسلام کو رجعت پسندانہ مذہب قرار دیتے ہیں اور پیغمبرِ اسلام کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ اُس زمانے کے نبی تھے اُن کی تعلیمات اِس زمانے کی ضروریات پوری نہیں کر سکتیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا بھی یہی حال ہے۔ ظاہر میں وہ سنتے اور دیکھتے بھی ہیں، مگر اندر تعصب اور خباثت بھری ہوئی ہے۔

خود فریبی — مشرکوں کا حال بھی ایسا ہی ہے۔ وہ بھی دِل کے بہرے اور اندھے

ہیں اور اسی لیے حقیقت سے محروم ہیں ۔ ان کے دل کے کان اور دل کی آنکھیں بند ہیں ، اس لیے ان کو کوئی چیز فائدہ نہیں پہنچا سکتی ۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا بے شک اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا وَلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ بلکہ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ وہ خود ایسے اسباب مہیا کرتے ہیں جن کی بنا پر جہنم کے مستحق بن جاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (الحج) یہ تو تیری اپنی کمائی ہے جو تیرے ہاتھوں نے کی ورنہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر کبھی زیادتی نہیں کرتا ، وہ تو نہایت ہی شفیق اور مہربان ہیں ۔ مگر یہ خود انسان ہیں جو اپنی کارکردگی کی وجہ سے جہنم کا ایندھن بنتے ہیں جو فکر اور عقیدہ تم نے اپنایا اور جو اعمال فاسدہ انجام دیے ، یہ انہی کا ثمرہ ہے ۔ اے بدبختو ، فرمایا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ (الطور) تم صبر کرو یا نہ کرو ۔ اب تمہارے لیے برابر ہے ۔ تمہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی ۔ تم نے قرآن اور پیغمبر اسلام کی تکذیب کی آج کے دن کو جھٹلایا ، شرائع الٰہیہ کا انکار کیا ، خدائی قانون کی پرواہ نہ کی ، اب یہ تمام چیزیں جمع ہو کر تمہارے لیے عذاب کا مبنیٰ بنیں گی ۔

فرمایا آج تو تم دندناتے پھرتے ہو ، قرآن اور رسالت کی تکذیب کرتے ہو اور اسی زندگی کو سب کچھ سمجھے بیٹھے ہو ، مگر یاد رکھو ! وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جس دن ہم ان کو اکٹھا کریں گے ۔ دوبارہ زندہ کر کے اپنے سامنے حاضر کریں گے ۔ اس دن انہیں احساس ہوگا ۔ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ کہ ہم تو دنیا میں ایک گھڑی بھر ٹھہرے ۔ ہماری دنیاوی زندگی تو نہایت ہی قلیل تھی ۔ دنیا کی پوری پچاس ، ساٹھ یا سو سالہ زندگی ایسی محسوس ہوگی جیسے کوئی شخص گھنٹہ عرصۂ زندگی

دو گھنٹے خوش گپیوں میں گزار دیتا ہے۔ دوسری جگہ ضحٰی کا لفظ آتا ہے یعنی دنیا کی زندگی کی طوالت اس قدر معلوم ہوگی جیسے کوئی شخص دوپہر کے وقت تھوڑا سا آرام کر لیتا ہے یا جیسے پچھلے پہر کا تھوڑا سا وقت ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کے دردناک عذاب کے پیش نظر زندگی بھر کا عیش و آرام نہایت حقیر نظر آئے گا۔

خدا کے حضور بے بسی

پھر دوسری بات اللہ نے یہ فرمائی یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَهُمْ مکذبین ایک دوسرے کو پہچانیں گے لیکن کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکے گا۔ کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ " (الزخرف) وہ سب ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے البتہ متقی لوگ کسی کے کام آسکیں گے۔ وہ خدا کی بارگاہ میں سفارش کریں گے حدیث شریف میں آتا ہے کہ مومن اپنے بھائیوں کو جہنم سے چھڑانے کے لیے خدا کی بارگاہ میں التجا کریں گے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کے یہودیوں کا ذکر قرآن پاک میں آتا ہے کہ جب وہ خدا کے حکم کے مطابق ہفتے کے دن مچھلی کے شکار سے باز نہ آئے تو اللہ نے ان کو بندر اور خنزیروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا۔ اگرچہ ان کی شکلیں تبدیل ہو چکی تھیں، وہ بول نہیں سکتے تھے مگر اپنے عزیز واقارب کو پہچانتے تھے اور حرکات و سکنات سے مدد کے لیے پکارتے تھے، مگر کوئی ان کی مدد نہ کر سکا۔ قیامت کا حال بھی ایسا ہے۔ مجرمین اپنے عزیزوں کو پہچانیں گے، ان سے تعارف بھی ہوگا مگر چونکہ وہ دنیا میں کفر و شرک کا ارتکاب کرتے ہے ہیں، ظلم و زیادتی کو اپنائے رکھا، بداخلاقی اور بدکرداری کا مظاہرہ کرتے ہے۔ لہٰذا یہ تعارف کچھ مفید نہیں ہو گا۔ اور انہیں اپنے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔

انکار معاد

فرمایا، قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ بیشک خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا۔ گویا تکذیب رسالت

کے ساتھ تکذیب معاد کا ذکر بھی آگیا۔ انہوں نے قیامت کو برحق تسلیم نہ کیا اور محاسبے کے عمل پر یقین نہ کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ محاسبے کے وقت ہر آدمی خود جواب دیگا اور درمیان میں کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ "یَوْمَ تَأْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا" (النحل) ہر نفس کو اپنا جواب خود دینا ہوگا، وہاں پر کوئی وکیل میسر نہیں آئے گا جو کسی مجرم کی طرف سے جواب دعویٰ داخل کرے۔ اُس وقت ہر شخص کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے وہی کچھ ہوگا جو اُس نے اِس دُنیا میں کمایا۔ فرمایا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ یہ لوگ ہدایت یافتہ نہیں تھے۔ اس دنیا میں وہ گمراہی میں پڑے رہے، کج روی اختیار کی، آیات الٰہی کی تکذیب کی، معاد کا انکار کیا لہٰذا آج سخت خسارے میں ہوں گے اور ابدی عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ﴿۴۶﴾
وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ
بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۴۷﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا
الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي
ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ
إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا
يَسْتَقْدِمُونَ ﴿۴۹﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا
أَوْ نَهَارًا مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ﴿۵۰﴾ أَثُمَّ
إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ
تَسْتَعْجِلُونَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا
عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ
تَكْسِبُونَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ قُلْ إِي
وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۵۳﴾

ترجمہ:۔ اور اگر ہم دکھا دیں آپ کو وہ چیزیں جن کا ہم
ان سے وعدہ کرتے ہیں یا پھر ہم آپ کو وفات دے دیں،
پس ہماری طرف ہی ان کا لوٹ کر آنا ہے، پھر اللہ تعالیٰ گواہ

ہے اُن کاموں پر جو یہ کرتے ہیں (۴۶) اور ہر ایک امت کے لیے رسُول ہوتا ہے۔ پس جب آنے اُن کا رسُول تو فیصلہ کیا جاتا ہے اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ اور ان پر زیادتی نہیں کی جاتی (۴۷) اور کہتے ہیں یہ لوگ کب آئیگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو (۴۸) (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے، نہیں ملک میں اپنے نفس کے لیے نقصان کا اور نہ نفع کا، مگر جو اللہ چاہے۔ ہر ایک امت کے لیے وقت مقرر ہے۔ پس جب آجائے مقررہ وقت ان کا، پس نہیں پیچھے ہوتے گھڑی بھر اور نہ آگے (۴۹) آپ کہہ دیجئے، بتلاؤ اگر آجائے تمہارے پاس اس کا عذاب رات کے وقت یا دن کے وقت، مجرم لوگ اس سے کیا جلدی کرتے ہیں (۵۰) پھر کیا جس وقت وہ واقع ہو گیا تو اس پر ایمان لاؤ گے۔ (تو کہا جائے گا) اب، اور تحقیق تم تھے اس کے ساتھ جلدی کرنے والے (۵۱) پھر کہا جائے گا ان لوگوں سے جنہوں نے ظلم کیا۔ چکھو ہمیشہ کا عذاب۔ نہیں بدلہ دیا جائے گا تمہیں مگر اُن باتوں کا جو تم کماتے تھے (۵۲) اور آپ سے خبر پوچھتے ہیں کیا یہ بات سچ ہے؟ آپ کہہ دیجئے، ہاں، اور مجھے میرے رب کی قسم یہ تو حق ہے۔ اور نہیں تم عاجز کر سکنے والے (۵۳)

ربطِ آیات

توحید کے بیان کے بعد قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا ذکر ہوا۔ پھر اللہ نے نبوت و رسالت کے کذبین کا رد کیا، اُن کے شکوک و شبہات کو دور کیا اور ساتھ قیامت کا ذکر بھی کیا، فرمایا، آج یہ لوگ بڑے اعتراض کرتے ہیں مگر جب قیامت کے دن اکٹھے کیے جائیں گے تو خیال کریں گے کہ دنیا میں گھڑی بھر ٹھہرے

پھر آگے عذاب کا لامحدود سلسلہ نظر آئے گا تو اس کے مقابلے میں اس دنیا اور برزخ کی زندگی کو نہایت مختصر عرصہ سمجھیں گے۔ وہاں ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ فرمایا جنہوں نے اللہ کی ملاقات یعنی قیامت کے دن کی تکذیب کی وہ ابدی عذاب میں مبتلا ہو کر بڑے خسارے میں رہیں گے۔ اب آج کے درس میں بھی قیامت اور عذابِ آخرت کا ذکر مختلف انداز سے کیا گیا ہے۔

بعض وعید کا اظہار

ارشاد ہوتا ہے وَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُهُمۡ اور جب ہم دکھا دیں گے آپ کو وہ چیزیں جن کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں۔ یعنی نافرمانوں کی گرفت اور عذاب سے متعلق بعض حصوں کا اظہار ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض حقائق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مبارکہ میں ہی ظاہر ہو جائیں۔ چنانچہ مشرکین مکہ اور عرب کے دوسرے سرغنوں کا غرور و تکبر اللہ نے آپ کی زندگی میں بدر کے مقام پر توڑ کر رکھ دیا۔ فرمایا تم کس شان و شوکت کے ساتھ مٹھی بھر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے ناپید کرنے کے لیے آئے تھے مگر اللہ نے تمہیں ایسی ذلت ناک شکست سے دوچار کیا جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ فرمایا ایک صورت یہ بھی ہے۔ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ یا ہم آپ کو اس دنیا سے اٹھا لیں اور اس کے بعد اللہ کے وہ وعدے پورے ہوں جن سے ان مکذبین کو ڈرایا جاتا ہے چنانچہ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اکثر باتوں کو حضور کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں پورا کیا۔ قیصر و کسریٰ کی شکست اور دنیا کی باقی طاقتوں پر اسلام کا اجتماعی غلبہ خلفائے راشدین کے زمانے میں ہی مکمل ہوا۔ یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے

خلفا کے [illegible]

اللہ نے اپنے نبی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مجرمین کی سزا ہم آپ کو آپ کی حیاتِ مبارکہ میں دکھا دیں یا آپ کے بعد ظاہر کریں ہر صورت میں فَاِلَیۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ اُن سب کو ہمارے ہی پاس لوٹ کر

آنمہے۔ آخری بات یہی ہے کہ دنیا کے معاملات کوئی بھی ڈھنگ اختیار کریں، بالآخر ہر اچھے برے کو ہماری ہی عدالت میں پیش ہونا ہے۔
اگر اس دُنیا میں کوئی چیز ظاہر نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منکرین اور مکذبین ہماری سزا سے بچ جائیں گے بلکہ انہیں ہماری پیشی سے مفر نہیں ہو گا ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ پھر اللہ تعالیٰ اُس چیز پر گواہ ہو گا۔ جو کچھ یہ کرتے ہے۔ خدا تعالیٰ ان کی ہر حرکت کو جانتا ہے اور وہ ملاقات کے وقت سب کچھ ظاہر کر دے گا۔ بہر حال اس جملے میں مجرمین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ یہ خیال کریں کہ وہ اپنی قبیح حرکات کی سزا سے بچ جائیں گے، بلکہ انہیں لازماً اپنے کیے کا بدلہ چکھنا ہو گا۔
آگے اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کے منکرین پر ایک اور انداز سے زجر کیا ہے ارشاد ہوتا ہے وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ہر امت قوم اور گروہ کے لیے رسول مبعوث کیا جاتا ہے۔ اسی اصول کے تحت اللہ تعالیٰ نے آخری امت کے لیے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ فرمایا۔ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ جب کسی قوم کے پاس رسول آ جاتا ہے تو وہ اپنی قوم کو اپنی زبان میں حسن و قبح سے آگاہ کرتا ہے نیکی اور بدی کی تمیز سکھاتا ہے۔ حلال و حرام کے احکام بتاتا ہے اور پھر جب قوم اپنے رسول کی باتوں کو ٹھکرا دیتی ہے قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ تو ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جاتا ہے وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جاتی بلکہ ان کو ان کے کردہ اعمال ہی کی سزا دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اتمام حجت کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے" وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" (ابراھیم) ہم نے ہر نبی کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ اپنی قوم کو اچھی طرح سمجھائے اور پھر ان کے لیے کوئی عذر

ہر امت کے لیے رسول

باقی نہ ہے اگر نبی کسی غیر زبان میں آتا تو قوم اعتراض کر سکتی تھی کہ وہ نبی کی بات پوری طرح سمجھ نہیں سکے تھے اس لیے اس کے اتباع سے محروم ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کو پہلے ہی رفع فرما دیا، اور ہر نبی کو اس کی قومی زبان دے کر مبعوث فرمایا۔ پھر دوسرا اصول اللہ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا" (بنی اسرائیل) ہم کسی قوم کو سزا میں مبتلا نہیں کرتے جب تک وہاں رسول نہ بھیج دیں، جو قوم کے لیے انذار و تبشیر کا فریضہ انجام دیتا ہے اس کے بعد بھی اگر قوم تکذیب کی مرتکب ہوتی ہے تو پھر وہ عذاب کی حقدار بن جاتی ہے۔

اللہ کا عذاب مختلف طریقوں سے آتا ہے۔ کبھی اللہ اس دنیا میں خود مومنوں کے ہاتھوں سے مجرموں کو سزا دے دیتا ہے جیسا کہ سورۃ توبہ میں گزر چکا ہے کہ خدا تعالیٰ تو اس بات پر قادر ہے کہ مجرمین کو خارجی طور پر سزا دے یا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ یا خود مومنوں کے ہاتھوں سے انہیں سزا میں مبتلا کر دے، وہ اپنی حکمت کے مطابق ہر بات کا فیصلہ کرتا ہے۔ تو فرمایا جب کسی قوم کے پاس رسول آ جاتا ہے اور وہ فریضہ تبلیغ ادا کر دیتا ہے تو پھر ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جاتا ہے۔ نہ کسی کے اجر میں کمی کی جاتی ہے اور نہ کسی کے ناکردہ گناہوں کا بوجھ اس پر ڈالا جاتا ہے۔ بلکہ اللہ کی عدالت میں عدل و انصاف کی بالادستی ہوتی ہے۔

عذاب کی فرمائش

مشرکین کی بدنصیبی دیکھو کہ جب انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو بتاؤ کہ عذاب آ جانے کا وعدہ کب پورا ہوگا۔ کہتے تھے ہم تمہاری دھمکیوں کی پروا نہیں کرتے لہٰذا جس عذاب سے ڈراتے ہو اس کو لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دو

طریقوں سے دیا ہے۔ پہلی بات یہ فرمائی قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اے پیغمبر! آپ ان کے سوال کا جواب یہ دیں کہ میں اپنے نفس کے لیے کسی نقصان اور نفع کا مالک نہیں ہوں۔ تم اپنے لیے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو مگر عذاب لانا میرے اختیار میں نہیں ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کے مطابق اپنے وقت پر آئے گا۔ میں تو اپنی ذات کو فائدہ پہنچانے یا نقصان کو دور کرنے پر بھی قادر نہیں ہوں چہ جائیکہ تم پر عذاب لے آؤں اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ بجز اللہ کے حکم کے — اگر اللہ تعالیٰ کسی قوم یا فرد کو سزا دینا چاہے تو وہ مختارِ کل ہے اپنی مشیت کے طور ایسا کرنے پر قادر ہے۔ وہ جب اور جس طرح چاہے سزا دے۔ انسانوں کو تو اس کی سزا کی نوعیت کا بھی علم نہیں ہوتا۔ یہ تمہاری ہٹ دھرمی ہے جو سزا کا مطالبہ کرتے ہو۔

ایک مقررہ وقت

عذاب لانے کے سلسلے میں اللہ نے دوسری بات یہ فرمائی لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ہر قوم کی سزا کے لیے ایک وقت معین ہے اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ جب ان کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی بھر بھی نہ وہ پیچھے ہوتے ہیں اور نہ آگے۔ عین وقت پر ان کا کام ہو جاتا ہے۔ نافرمانوں کی گرفت سیلاب اور طوفان کی طرح اچانک آتی ہے اور وہ پکڑے جاتے ہیں انسان کی انفرادی موت اور قیامت کی مجموعی موت بھی اچانک ہی آئیگی۔ سورۃ اعراف میں ہے لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً یہ تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی کسی کو معلوم نہیں کہ موت کس وقت آجائے۔ لہٰذا ہر صاحب عقل و شعور کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ وہ اس اچانک موت کے لیے ابھی سے فکر کرے بہرحال مشرکین کے جواب میں پہلی بات یہ فرمائی کہ میرا اختیار نہیں ہے۔ عذاب لانا اللہ کے اختیار میں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہر چیز کیلئے

ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو آگے پیچھے نہیں ہوتا بلکہ عین وقت پر وہ بات ہوجاتی ہے۔

عذاب کی اچانک آمد

اللہ نے یہ بھی فرمایا۔ اے پیغمبر! قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا آپ کہہ دیں اگر آجائے اللہ کا عذاب رات کو یا دن کے وقت مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ تو مجرم لوگ اس عذاب میں سے کس چیز کے بارے میں جلدی کرتے ہیں۔ کیا عذاب کوئی اچھی چیز ہے جسے طلب کر رہے ہیں۔ عذاب تو بہرحال عذاب ہے یہ جس وقت بھی آئے گا پھر چھوڑے گا نہیں۔

اس آیت کریمہ میں رات کے لیے لیل کی بجائے بیات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ بیات کے دو معنی آتے ہیں یعنی رات گزارنا اور دشمن پر شب خون مارنا۔ جس طرح دشمن کو سزا دینے کے لیے رات کے آخری حصے میں شب خون مارا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ آیت بھی دھمکی آمیز ہے کہ رات کے وقت اُن پر اچانک عذاب آجائے تو وہ اس میں سے کیا چیز پسند کرتے ہیں؟

فرمایا اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کیا تم اس وقت ایمان لاؤ گے جب وہ عذاب واقع ہوجائے گا۔ اگر تمہارا ارادہ یہی ہے کہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لاؤ گے۔ تو اس وقت ایمان کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا اور کہا جائیگا۔ آٰلْئٰنَ کیا اب ایمان لاتے ہو؟ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ حالانکہ اس رقت تو کہتے تھے کہ عذاب جلدی کیوں نہیں آتا۔ جب عذاب نازل ہونا شروع ہوگیا تو بعض کو اس پر یقین آگیا اور وہ ایمان لے آئے مگر اس وقت کا ایمان لانا کچھ مفید نہیں ہوتا۔ اسی سورۃ میں آگے فرعون کا حال بیان ہو رہا ہے کہ جب فرعون غرق ہونے لگا تو کہنے لگا کہ اب میں ایمان لایا مگر اللہ کا حکم ہوا آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ

قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ فرمایا اب کلمہ پڑھ رہے ہو، تمہاری ساری عمر تو عنٰدہ گردی میں گزری۔ اس وقت کا ایمان لانا مقبول نہیں ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے تَوْبَةُ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول ہوتی ہے جب تک غرغرہ طاری نہ ہو جائے جب اللہ کے فرشتے آجاتے ہیں، جان نکلنے لگتی ہے اور غیب کا پردہ اٹھ جاتا ہے تو اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی۔

ٹھیک ٹھیک بدلہ

فرمایا ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا پھر ظلم کرنے والوں سے کہا جائے گا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ ہمیشگی کا عذاب چکھو۔ تم کفر، شرک اور تخریب کرتے تھے اور جب تک عذاب ظاہر نہ ہوا تم نے ایمان قبول نہ کیا، لہٰذا اب تمہیں ہمیشہ کے لیے عذاب کا مزا چکھنا ہے۔ یہ ٹل نہیں سکتا۔ اور یاد رکھو! هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ تم کو نہیں بدلہ دیا جائے گا مگر اس چیز کا جو تم کماتے تھے یہ عذاب تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہے۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ نُحْصِيهَا عَلَيْكُمْ[1] یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جنہیں میں نے شمار کر رکھا ہے۔ آج تمہیں ان کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دیا جائے گا۔

آگے اللہ نے مجرمین کے تمسخر آمیز لہجے کا ذکر فرمایا، اے پیغمبر! وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا عذاب کا آنا واقعی برحق ہے۔ اللہ نے جواب میں فرمایا، اے پیغمبر! قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ آپ کہہ دیں، ہاں! میرے رب کی قسم یہ عذاب برحق ہے اور واقع ہو کر رہے گا۔ مجرموں کو ضرور سزا ملے گی، قیامت برپا ہوگی اور وہ بچ نہیں سکیں گے۔ فرمایا، یہ نہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی کسی سکیم کو ناکام بنا کر بچ جائیں گے۔ وَمَا أَنْتُمْ

[1] ترمذی ص۵

بِمُعْجِزِيْنَ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں بنا سکتے یعنی اس کی تدبیر کو ناکام نہیں بنا سکتے، تمہیں توحید، رسالت اور معاد کے انکار کی سزا ضرور ملے گی

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِى الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ:۔ اور اگر ہو ہر نفس کے لیے جس نے ظلم کیا ہے جو کچھ زمین میں ہے اور پھر وہ فدیہ دے اس کے ساتھ (تو پھر بھی بچاؤ کا کوئی سامان نہیں ہو گا) اور چھپائیں گے وہ شرمندگی کو جب کہ دیکھیں گے عذاب کو اور فیصلہ کیا جائے گا ان کے درمیان انصاف کے ساتھ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا ﴿۵۴﴾ سنو! بیشک اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ سنو! بیشک اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن اکثر ان میں سے نہیں جانتے ﴿۵۵﴾ وہی زندہ کرتا ہے اور موت طاری کرتا ہے اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے ﴿۵۶﴾

ربطِ آیات پہلے اللہ تعالیٰ نے شرک کرنے والوں کی تردید فرمائی۔ پھر رسالت کے منکرین اور قیامت کے محاسبے کا ذکر کیا۔ عذاب کو جلدی طلب کرنے والے کفار و مشرکین

کے متعلق فرمایا کہ جب سزا آجائیگی تو اُس وقت ان کا ایمان لانا قابلِ قبول نہ ہوگا اور وہ سزا سے بچ نہیں سکیں گے بعض مشرکین پوچھتے تھے کہ کیا قیامت واقعی برحق ہے اور سزا و جزا کا مرحلہ آنے والا ہے؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ تاکید کے ساتھ کہہ دیں ہاں قیامت برپا ہونے والی ہے اور تم اللہ کی کسی تدبیر کو عاجز نہیں کر سکتے۔ سورۃ سبا میں آتا ہے کہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ قیامت نہیں آنے کی مگر اللہ نے فرمایا "قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّکُمْ" اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کیوں نہیں۔ میرے رب کی قسم قیامت ضرور آنے گی۔ سورۃ تغابن میں فرمایا "زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا" کافر لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے جواب میں فرمایا "قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ" آپ کہہ دیں، کیوں نہیں۔ میرے رب کی قسم تم مرنے کے بعد ضرور دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ تمہیں تمہارے تمام اعمال سے آگاہ کر دیا جائیگا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے۔ وہ لوگوں کو دوبارہ زندہ بھی کرے گا اور ان سے حساب بھی لے گا۔

ظلم کا فدیہ

اللہ نے فرمایا کہ اب تو لوگ اکڑ دکھاتے ہیں۔ غرور و تکبر کا اظہار کرتے ہیں، توحید، رسالت اور معاد کا انکار کرتے ہیں مگر جب قیامت برپا ہوگی تو ایسے لوگوں کے لیے کوئی جائے امان نہیں ہوگی اور یہ اپنی جان کے بدلے میں بڑے سے بڑا معاوضہ دے کر بھی گلو خلاصی نہیں کرا سکیں گے۔ ارشاد ہوتا ہے "وَلَوْ اَنَّ لِکُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ" اگر ہر ظالم نفس کے لیے وہ سب کچھ ہو "مَا فِی الْاَرْضِ" جو کہ زمین میں اِس وقت موجود ہے اور وہ یہ سب کچھ ادا کر کے بھی جان بچانا چاہیں گے تو فرمایا "لَافْتَدَتْ بِہٖ" تو اس سے یہ فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ دوسر

مقام پر آیا ہے " مَا تُقُبِّلَ مِنْهُ " یعنی اس سے قبول نہیں کیا جائے گا ظلم بڑا وسیع المعانی لفظ ہے۔ سب سے بڑا ظلم تو کفر اور شرک ہے سورۃ بقرہ میں ہے وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ کفر کرنے والے لوگ بڑے ظالم ہیں۔ شرک کے متعلق سورۃ لقمان میں اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ یاد رکھو! شرک بہت عظیم ظلم ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ کفر اور شرک بہت بڑے ظلم ہیں اس کے بعد اعمال میں ظلم ہوتا ہے۔ کسی کے ساتھ زیادتی کرنا، کسی کی جان و مال پر ہاتھ ڈالنا، بے آبرو کرنا، فرائض کو ترک کرنا، مار پیٹ، غرضیکہ چھوٹی سے چھوٹی لغزش اور بڑے سے بڑے گناہ پر ظلم کا اطلاق ہوتا ہے تاہم اس مقام پر ظلم سے مراد کفر اور شرک کا ارتکاب ہے۔ جو لوگ اللہ کی توحید، رسول کی رسالت، معاد اور حشر نشر کا انکار کرتے ہیں۔ وہ ظالموں کی فہرست میں آتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا جس کسی نے بھی ظلم کیا ہو وہ اگر زمین بھر کی چیزیں بھی فدیہ میں دے کر اپنی جان عذاب الٰہی سے چھڑانا چاہے گا تو ایسا نہیں کر سکے گا۔ اول تو یہ ممکن ہی نہیں کہ پوری زمین کا مال و دولت، اس کے دفینے اور خزینے کسی ایک شخص کی ملکیت میں آجائیں۔ اور اگر بفرض محال اگر ایسا ہو بھی جائے اور وہ شخص یہ سب کچھ اپنی جان کے بدلے قربان کرنا چاہے تو اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ مطلب یہ کہ ہر شخص کو اس دنیا میں کئے اعمال کا خمیازہ ہر حال بھگتنا ہو گا، اور اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ سورۃ مائدہ میں ہے لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ یعنی زمین بھر سے ڈبل مال بھی اُن کے پاس ہو مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ پھر بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ دنیا میں کسی جرم سے بچ نکلنے کے کئی راستے ہیں۔ کہیں سفارش ہے۔ کہیں رشوت ہے۔ کہیں

طاقت کے بل پر چلیں توڑ دی جاتی ہیں مگر خدا تعالیٰ کی عدالت میں ایسا کوئی حربہ کارگر نہیں ہوگا۔ ظلم کرنے والے ضرور پکڑے جائیں گے اور مبتلائے عذاب ہوں گے۔ اگر لوگ اس دائمی عذاب سے بچنا چاہتے ہیں۔ تو انہیں چاہیئے کہ اسی دنیا میں ایمان لے آئیں۔ ظلم و تعدی سے توبہ کر لیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد پر کاربند ہو جائیں، اس طرح وہ آخرت کے عذاب سے بچ سکتے ہیں۔

بعد از وقت ندامت

فرمایا اللہ کے دربار میں ظلم کرنے والوں کی حالت یہ ہوگی وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ جب عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو پھر اپنی ندامت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ اس دنیا میں تو بڑے طمطراق سے رہتے تھے اور ظلم و زیادتی کرتے وقت کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے مگر حشر کے میدان میں جب مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے تو پھر اپنے نوکر چاکروں، ملازموں، ماتحتوں واقف کاروں اور گھر والوں سے شرمسار ہوں گے کہ وہاں تو ہم ان پر حکومت کرتے تھے مگر آج انہی کے سامنے ذلیل ہو رہے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے دل میں نادم ہوں گے اور اس ندامت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ مگر مفسرین فرماتے ہیں کہ جب اللہ کا عذاب شروع ہو جاتا ہے تو پھر ندامت کو چھپانے کا موقع بھی نہیں ملتا، سب کچھ ظاہر ہو جاتا ہے اس وقت پھر لوگ چیخ و پکار بھی کریں گے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں آسَرَّ کا لفظ دو متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کا معنی چھپانا بھی ہے اور ظاہر کرنا بھی۔ تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جب مجرم لوگوں کے سامنے فرد جرم رکھ دی جائے گی تو اس وقت بڑا واویلا کریں گے۔ اپنے کئے پر پچھتائیں گے اور اپنی ندامت کا کھلے عام اظہار کریں گے کہ ہم نے دنیا میں بہت

بُرائی ہو مگر وہاں چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ غرضیکہ ندامت کو چھپانا یا ظاہر کرنا اُن کے کسی کام نہ آئے گا۔ اگر اس دنیا میں توبہ کر لیتے تو معافی مل جاتی، مستقبل روشن ہو جاتا مگر قیامت کے دن صدقِ دل سے معافی بھی کارآمد نہیں ہوگی۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے اَلتَّوْبَةُ اَلنَّدَمُ ندامت توبہ ہی ہے۔ مگر توبہ کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ وہاں اخلاص کے ساتھ کی ہوئی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی، کیونکہ توبہ کا وقت گزر چکا ہوگا۔

حق کا فیصلہ

فرمایا جب عذاب کو دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائیں گے یا ظاہر کریں گے وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اور اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور اُن کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائیگی۔ ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ ضرور ملے گا۔ نہ کسی کا عمل ضائع ہوگا اور نہ کسی کو ناکردہ گناہ میں پکڑا جائے گا۔ اللہ کی بارگاہ میں بالکل حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ ہوگا۔

عارضی اور حقیقی ملکیت

فرمایا اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سنو! جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب کا سب اللہ کا ہے۔ ہر چیز اُس کی پیدا کردہ ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔ تاہم اُس نے اپنی رحمت سے بعض چیزوں کو عارضی طور پر بندوں کی ملکیت میں دیدیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کے استعمال کیلئے اپنا حقِ ملکیت استعمال کر سکیں۔ انہیں حلال حرام اور جائز ناجائز سے مطلع کر دیا گیا ہے اور خبردار کر دیا گیا کہ تم اِن چیزوں کے حقیقی مالک نہیں ہو بلکہ حقیقی مالک خداوند تعالیٰ ہے جس کے احکام کے مطابق تم نے تصرف کرنا ہے۔ جیسا کہ غلاموں کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تمہارے خادم ہیں۔ اللہ نے کسی وجہ سے انہیں تمہارے سپرد کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ان کے حقیقی مالک

ہو اور ان کے معبود بن گئے ہو۔ غرضیکہ دنیا کی ہر چیز کا خالق اور مالک تو اللہ رب العزت ہی ہے مگر اس نے انسانوں کو عارضی مالک بنایا ہے۔ اگر بندے اللہ کے وضع کردہ اصول وضوابط کے مطابق کام کریں گے تو ٹھیک رہیں گے ورنہ اللہ کے باغی بن جائیں گے اور پھر آخرت میں انہیں اپنے اعمال کی سخت جوابدہی کرنا ہوگی۔ جب ہر چیز خدا تعالیٰ کی ملکیت ہے تو عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کی وحدانیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔

فرمایا اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ خوب سن لو، اللہ تعالیٰ کا وعدہ بالکل برحق ہے۔ قیامت ضرور برپا ہوگی اور انسانوں سے باز پرس بھی لازمی ہوگی۔ اور پھر ہر ایک کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ بھی دیا جائے گا۔ لہٰذا لوگوں کا فرض ہے کہ وہ برائی سے بچیں وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ مگر لوگوں کی اکثریت بے سمجھ ہے۔ انہیں اس بات کا شعور ہی نہیں کہ جب مالک الملک خدا تعالیٰ ہے تو پھر غیروں کی پرستش کیسی؟ اسی سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کا کیا معنی؟ مگر لوگ شیطان کے بہکاوے میں آکر کفر، شرک اور معاصی کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔

زندگی اور موت

فرمایا یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے ہُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ زندگی بھی وہی عطا کرتا ہے، کوئی حکیم، ڈاکٹر یا سائنس دان کسی کو زندگی عطا نہیں کر سکتا وہ الحی یعنی حیات کا مالک ہے جس کو جتنی چاہے زندگی عطا کرے اور موت بھی الحی کے اختیار میں ہے جب چاہتا ہے کسی کو موت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ یہ بات تمام انسان تسلیم کر چکے ہیں کہ موت کے اسباب اللہ تعالیٰ ہی پیدا کرتا ہے جن کی وجہ سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ درالصل موت بھی اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اور زندگی بھی وہی دیتا ہے۔

بعض لوگ موت اور زندگی کو دو مختلف ذاتوں کی طرف منسوب

کرتے ہیں۔ ہندو مشرکین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جن کے عقیدے کے مطابق برہما جی پیدا کرتے ہیں اور وشنو جی موت دیتے ہیں۔ یونانی اور بعض دوسرے مشرک بھی اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پیدا کرنے والا، تھامنے والا اور مارنے والا مختلف معبود ہیں، حالانکہ اللہ نے فرمایا "هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ" (البقرہ) زندگی عطا کرنے والا بھی وہی ہے۔ مارنے والا بھی وہی ہے اور ہر چیز کو قائم کرنے والا بھی وہی ہے۔

فرمایا وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ سب اسی خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے اور اپنے اپنے اعمال کے مطابق جواب دہی کریں گے۔ اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں آجائے تو پھر کفر اور شرک کی بجائے اللہ تعالیٰ کی خالص توحید آجائے گی۔ تمہارا عقیدہ درست ہو جائے گا اور پھر تم قیامت کے دن سرخرو ہو جاؤ گے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُورِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ
فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ :- اے لوگو ! تحقیق آچکی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور شفا اس کے لیے جو سینوں میں (روگ) ہے ۔ اور ہدایت اور رحمت ایمان والوں کے لیے ﴿۵۷﴾ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیں ، اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کے ساتھ ، پس اس کے ساتھ چاہیئے کہ وہ خوش ہوں ۔ یہ بہتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اکٹھا کرتے ہیں ﴿۵۸﴾

● اس سے پہلے توحید و رسالت کا ذکر اور قرآن پاک کی حقانیت و صداقت کا بیان ہو چکا ہے ۔ دراصل اس سورۃ کا مرکزی مضمون دعوت الی القرآن ہے ۔ اس بات کا ذکر سورۃ کی ابتدائی آیت میں ہوا ۔ پھر دوسری بار قرآن حکیم کا تذکرہ مشرکین کے اُس مطالبے کے جواب میں ہوا جس میں وہ قرآن کو تبدیل کر دینے کی فرمائش کرتے تھے ۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے یہ دلوایا کہ قرآن پاک کو تبدیل کرنے یا اس میں کسی قسم کی ترمیم کرنے کا اختیار میرے پاس نہیں ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے جو اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق جب چاہے کسی حکم کو تبدیل کر دے یا منسوخ کر دے ۔ اب آج کے درس میں قرآن کریم کا ذکر تیسری مرتبہ آ رہا ہے جس میں اس کی چار صفات بیان کی گئی ہیں یعنی موعظت (نصیحت) بیمار دلوں کیلئے شفا ، ہدایت اور رحمت ۔ ربط آیات

(۱) موعظت ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ اے لوگو! تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت آچکی ہے موعظت وعظ اور نصیحت کو کہا جاتا ہے، گویا قرآن کریم اول تا آخر نصیحت پر مشتمل ہے اور جو شخص اس نصیحت پر عمل پیرا ہوگا، وہ برائی سے بچ جائے گا۔ اس طرح قرآن پاک ناشائستہ باتوں کو چھڑا دیتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ وعظ و نصیحت کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

فَھُوَ الْمُدَاوِیُ الظُّلْمَانِیَۃِ

بِاَنْوَارِ الْمَعَارِفِ الْقُدْسَانِیَۃِ

وعظ انسان کے دل و دماغ سے تاریکی والے تمام مادوں کو دور کرکے اسے پاکیزہ انوار کے ساتھ منور کر دیتا ہے۔ غرضیکہ قرآن کریم کی پہلی صفت یہ فرمائی کہ یہ موعظت ہے۔ تبلیغ دین کے لیے بھی فرمایا اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ اللہ کی طرف حکمت اور اچھی موعظت کے ساتھ دعوت دو۔

(۲) شفا اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی دوسری صفت کے متعلق فرمایا وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ یہ دلوں کی بیماریوں کے لیے بمنزلہ شفا کے ہے پہلی صفت موعظت کا تعلق انسان کے ظاہر سے تھا کہ وہ انسان کے ناجائز افعال کو جائز میں بدل دیتی ہے اور اب اس دوسری صفت شفاء کا تعلق باطن سے ہے۔ انسان کو باطنی بیماریوں سے پاک کرنا قرآن کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ اللہ کی یہ مقدس کتاب کفر، شرک، نفاق، حسد، کینہ، تکبر اور بدعقیدگی جیسی روحانی بیماریوں کو شفا بخشتی ہے۔ انسان کو روحانی بیماریوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ جسمانی بیماریوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ ان بیماریوں کا علاج قرآن پاک میں ہے۔ جو شخص قرآن پاک کے فرمودات پر عمل کریگا وہ اعتقادی اور اخلاقی بیماریوں سے محفوظ ہو

لہ الخیر الکثیر صہ۷۶

جائے گا، اسی لیے فرمایا کہ یہ ان بیماریوں کے لیے شفا ہے جو لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوتی ہیں۔

یہاں پر ظاہری بیماریوں کا ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ بالطبع ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھ کر پھونک ماردی جائے تو اللہ تعالیٰ ظاہری بیماری سے بھی شفا عطا کر دیتا ہے، مگر یہ قرآن کا موضوع نہیں ہے بلکہ ایک زائد چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کی برکت سے ظاہر بیماریوں کو بھی دور کر دیتا ہے۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں آتا ہے علیکم بالشفائین یعنی اپنے اوپر دو شفاؤں کو لازم پکڑو یعنی دو چیزیں باعث شفا ہیں العسل والقرآن ایک شہد اور دوسری قرآن۔ مکھی کے پیٹ سے نکلنے والی شہد کے متعلق سورۃ نحل میں ہے فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اس میں لوگوں کے لیے اللہ نے شفاء رکھی ہے قرآن پاک کے لیے شفا کا لفظ اس آیت میں بھی آیا ہے اور اس کے علاوہ سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ حٰمٓ سجدہ میں بھی آتا ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی سعادت اس بات میں ہے کہ اس کا عقیدہ پاک ہو اور اس کا کمال اس میں ہے کہ اُسے اعمالِ صالحہ حاصل ہوں۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا" (الاحقاف) تمام درجات اعمال کی بدولت ہی نصیب ہوتے ہیں۔ اگر انسان کا عقیدہ پاک نہیں ہوگا تو نہ کوئی عمل مقبول ہوگا اور نہ اسے درجات نصیب ہوں گے۔ ایسا شخص شقی ہوگا، سعادت مند نہیں ہو سکتا۔ تو گویا قرآن انسان کو ناشائستہ افعال سے روکتا ہے اور پاکیزہ عقائد کی تلقین کرتا ہے۔ فاسد اعتقادات کو دل سے نکال دو، یہ روحانی بیماری ہے جس کے لیے قرآن پاک بمنزلہ شفا ہے۔

اللہ نے قرآن کی تیسری صفت وَهُدًى یعنی ہدایت کا ذکر کیا ہے ۱۳ ہدایت

باطنی بیماریوں کو دور کر کے اُن کی جگہ سچے اعتقادات اور پاکیزہ اخلاق کو
جگہ دینا ہدایت میں شامل ہے۔ اسی لیے بزرگانِ دین تخلیہ اور تجلیہ کا درس
دیتے ہیں جس کا مطلب یہی ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ سے گندی چیزوں
کو نکال دے اور پاکیزہ چیزوں کو جمع کر لے۔ پاکیزہ عقائد میں اللہ تعالےٰ
کی توحید، ایمان، اخلاص، اللہ کی کتاب، ملائکہ، معاد، جنت، دوزخ اور
اس کی صفات پر کامل یقین شامل ہیں اور یہی چیز ہدایت کے نام سے موسوم
ہے۔ اسی ہدایت کے حصول کے لیے لوگ دعا کرتے ہیں "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِیْمَ" "اے اللہ! ہمارے لیے ہدایت کے راستے کھول دے"
اور پھر اللہ تعالیٰ بھی جواب میں اپنی پاک کتاب کو پیش کر کے فرماتا ہے
"ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" یہ ہدایت پرہیزگاروں کے لیے ہے زندگی کے
کسی موڑ پر بھی ہدایت کی ضرورت ہو، قرآن پاک راہنمائی کرے گا۔ قرآن
پاک میں تمام بڑے بڑے اصول بیان کر دیے گئے ہیں جن کی روشنی میں
پوری انسانی زندگی کے تمام مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔

۴) رحمت۔ چوتھی صفت وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ کا ذکر کیا گیا ہے جب
انسان اپنے باطن کو تمام رذائل سے پاک کر لیتا ہے اور گندے عقیدوں
کو چھوڑ دیتا ہے۔ کفر، شرک اور نفاق کو چھوڑ کر اپنے اندر اعلیٰ اخلاق کو
جمع کر لیتا ہے۔ اسی طرح اپنے ظاہر کو تمام ناشائستہ افعال سے بچا لیتا ہے
اور اعمال حسنہ کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ ہدایت کے راستے پر چل نکلتا ہے
اور اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شاملِ حال ہو جاتی ہے
گویا موعظت، شفا اور ہدایت کا نتیجہ رحمت کی صورت میں نکلتا ہے
جب تک ان تین چیزوں پر گامزن نہیں ہوتا وہ رحمتِ خداوندی تک
نہیں پہنچ سکتا۔

امام رازیؒ اور بعض دیگر مفسرین کرام اس آیت میں آمدہ چاروں

صفاتِ قرآنی کی تعبیر اس طرح بھی کرتے ہیں کہ موعظت سے مراد شریعت ہے۔ شفا کو طریقت کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، ہدایت کو حقیقت کے معانی میں لیا گیا ہے اور رحمت کو نبوت اور خلافت کا عنوان دیا گیا ہے اس کے بعد بزرگانِ دین کے چار طریقے نقشبندی، سہروردی، قادری اور چشتی ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ یہ چار طریقے ایسے ہی ہیں جیسے ائمہ اربعہ کے چار مسلک۔ اِن چاروں مسلکوں میں تھوڑا بہت اختلاف بھی ہے مگر مقصد سب کا ایک ہی ہے، یہ چاروں برحق ہیں اور فروعات میں کلام کرتے ہیں۔ ان کے متوازی بزرگانِ دین کے یہ چار سلسلے انسان کے باطنی تزکیہ پر کلام کرتے ہیں۔ اگر خود مذہب والے یا مسلک والے کسی چیز کو بگاڑ دیں تو اس سے مذہب کی حقانیت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ تو بہر حال طریقِ کار ہے جو اس پر عمل کریگا۔ کامیاب ہوگا۔ بہرحال مقصد یہی ہے کہ انسان سے رذیل خصائل ختم ہو کر پاکیزہ اعمال و اخلاق پیدا ہو جائیں۔

الغرض! قرآن پاک ایک بہت بڑی حقیقت ہے، اسی لیے ارشاد ہوا ہے کہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت آچکی ہے۔ یہ بیمار دلوں کے لیے شفا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر راہنمائی کے لیے ہدایت ہے اور اہلِ ایمان کے لیے باعثِ رحمت ہے۔

فضل و رحمتِ خداوندی

پھر فرمایا اے پیغمبر! قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کے فضل اور رحمت کے ساتھ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا پس اس کے ساتھ چاہیئے کہ وہ خوش ہو جائیں۔ قرآن کریم اور ہدایت اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے اور اچھا انسان وہی ہے جو فضلِ الٰہی کا طلب گار ہو۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے دعا سکھائی ہے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ اے اللہ میں تیرے

فضل اور تیری رحمت کا طالب ہوں۔ یہ چیزیں قرآن پاک کی معرفت حاصل ہوتی ہیں اور جسے حاصل ہو جائیں اُسے خوش ہونا چاہیئے۔ فرمایا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ یہ بہتر ہے ان چیزوں سے جنہیں انسان زندگی بھر اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ نادان لوگ دنیا کے حقیر مال و دولت پہ دندنا تے پھرتے ہیں حالانکہ یہ چیزیں چند دن کے بعد ختم ہو جانے والی ہیں اور اس کے بعد طالبانِ دنیا سخت تکلیف میں مبتلا ہوں گے۔ مگر قرآن پاک اور ہدایت کی بدولت انسان کو ابدی راحت حاصل ہو جائے گی۔ سو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کے ساتھ انسان کو خوش ہو جانا چاہیئے، قرآن کریم کے ساتھ خوش ہو جانا چاہیئے اور پھر اس کی تعلیم حاصل کر کے نصیحت، شفا، ہدایت اور رحمت کا مصداق بنا چاہیئے ہمارا نظریہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم قرآن پاک سے محبت کریں۔ اس کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر اس کے بتلائے ہوئے طریقے سے تخلیہ اور تجلیہ حاصل کریں ہمارے باطن سے تمام بیماریاں دور ہو جائیں اور ہم میں شائستگی آ جائے اسی لیے فرمایا کہ یہ بہتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ لوگ دنیا میں اکٹھا کرتے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ
مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى
اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى
اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى
النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

ترجمہ: (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے (اے لوگو!) تبلاؤ جو اللہ نے نازل کیا ہے تمہارے لیے رزق۔ پس ٹھہرایا ہے تم نے اس میں سے (کچھ حصہ) حرام اور (کچھ حصہ) حلال۔ آپ کہہ دیجئے کیا اللہ نے حکم دیا ہے تم کو یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو ﴿۵۹﴾ اور کیا گمان ہے اُن لوگوں کا جو افتراء کرتے ہیں اللہ پر جھوٹ قیامت کے دن۔ بیشک اللہ تعالیٰ فضل کرنے والا ہے لوگوں پر، لیکن اکثر ان میں سے شکر ادا نہیں کرتے ﴿۶۰﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں قرآن کی چار صفات بیان ہوئیں۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ اُس کی طرف سے نصیحت ہے، دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ انسانوں کے لیے ذریعہ ہدایت اور اس ہدایت پر عمل کرنے والوں کے لیے رحمت ہے۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے شرک کا رد فرمایا ہے اور وہ اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو منبع رشد و ہدایت بنایا ہے تو پھر لوگوں کا فرض ہے کہ وہ حلت و حرمت

کے مسائل میں قرآن ہی کو سند بکڑیں اور اس سلسلے میں کسی دوسری طرف رجوع نہ کریں اور نہ ہی اپنی ذہنی اختراع کے مطابق کسی چیز پر حلال و حرام ہونے کا فتویٰ لگائیں۔ مشرکوں کا اپنی مرضی سے کسی چیز پر حلت و حرمت کا حکم لگانا دراصل اللہ تعالیٰ کے اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے کے مترادف ہے اور یہی شرک ہے جس کی اللہ نے تردید فرمائی ہے۔

نزولِ رزق

ارشاد ہوتا ہے قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ اے پیغمبر! مجھے بتلاؤ جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے روزی نازل کی ہے۔ یہاں پر روزی کے لیے اَنْزَلَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے حالانکہ روزی نازل نہیں ہوتی بلکہ زمین سے پیدا ہوتی ہے۔ تاہم اس پر اُتارنے کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ زمین سے پیدا ہونے والی تمام چیزوں کا تعلق پانی سے ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ گذشتہ آیات میں گزر چکا ہے كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ یعنی کہ اللہ نے آسمانوں سے پانی نازل فرمایا۔ پھر اس کے ساتھ زمین کے نباتات مل گئے تو زمین سے روئیدگی پیدا ہوئی جو انسانوں اور جانوروں کی خوراک ہیں۔ تو اس لحاظ سے روزی کو آسمانوں سے نازل کرنے پر محمول کیا گیا ہے۔ سورۃ الزمر میں جانوروں کے لیے بھی انزل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ "وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ" اللہ نے تمہارے لیے آٹھ قسم کے جوڑے نازل کیے ہیں یعنی پیدا فرمائے ہیں۔ ان میں اونٹ، گائے بھینس اور بھیڑ بکری ہر دو نر اور مادہ لوگوں کی غذا کے کام آتے ہیں اور ان کا دودھ بھی استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح رزق کے متعلق بھی بیان فرمایا ہے کہ ہم نے اسے تمہارے لیے نازل کیا۔

سورۃ الذاریات میں آتا ہے وَفِى السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا

تُوْعَدُوْنَ" آسمان میں تمہاری روزی اور وہ چیز ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ زندگی اور موت کا حکم بھی آسمانوں ہی سے نازل ہوتا ہے۔ اور اس کے مطابق تمام جانداروں کو روزی میسر آتی ہے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جب عبد مومن فوت ہو جاتا ہے تو آسمان کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ جہاں سے اس کی روزی کا حکم نازل ہوتا تھا اور وہ دروازے بند ہو جاتے ہیں جن سے نیک آدمی کے اعمال صالحہ عالم بالا کی طرف جاتے تھے مومن پر زمین بھی روتی ہے اور آسمان بھی کہ جس شخص کے لیے خیر کے حکم جاری ہوتے تھے وہ چل بسا۔ غرضیکہ روزی آنے کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی پائی جاتی ہے۔

یاد رہے کہ روزی کا اطلاق صرف خوراک پر نہیں ہوتا بلکہ عربی زبان میں رزق کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً رُزِقَ اَوْلَادًا فلاں آدمی کو اولاد دی گئی، رُزِقَ مَالًا فلاں کو مال دیا گیا یا رُزِقَ طَعَامًا یعنی فلاں کو کھانا دیا گیا۔ غرضیکہ رزق میں کھانے پینے کے علاوہ لباس، مکان سواری اور تمام ضروریات زندگی شامل ہے۔ تاہم عام طور پر اس کا اطلاق کھانے پینے کی اشیاء پر ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان سے مشرکین کو کہلوایا ہے کہ ذرا بتلاؤ تو سہی۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو رزق نازل کیا ہے، تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟

خود ساختہ حلت و حرمت

فرمایا۔ اللہ نے تو تمہارے لیے روزی نازل فرمائی فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا پھر تم نے اپنی مرضی سے اس میں سے کچھ حصہ حرام ٹھہرا لیا اور کچھ کو حلال کر لیا۔ فرمایا اللہ نے تو پاکیزہ روزی عطا کی تھی مگر تم نے از خود کیوں بعض چیزوں کو حرام کر لیا۔ سورۃ انعام میں تفصیل موجود ہے کہ مشرک لوگ حلال چیزوں کو کس طرح حرام کر لیتے تھے۔ بعض مادہ جانور جب حاملہ ہو جاتے تو مشرک کہتے کہ پیدا ہونے والا بچہ ہمارے مردوں کے لیے حلال ہے جب کہ عورتوں کے لیے حرام ہے، کہتے تھے "مَا فِیْ بُطُوْنِ

هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا" اور اگر بچہ مردہ پیدا ہوتا فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ تو اس میں مرد و زن سب شامل ہو کر کھاتے۔ اسی طرح کھیت کی پیداوار کا کچھ حصہ بتوں کے نام پر نامزد کر دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کو کوئی نہیں کھا سکتا۔ مشرک لوگ بحیرہ سائبہ نامی بعض جانوروں کو بھی بعض معبودوں کے نام پر کھلا چھوڑ دیتے اور کہتے کہ نہ تو اس پر سواری کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے وہ اس کا دودھ بھی حرام کر لیتے تھے تو فرمایا، اللہ نے تمہارے لیے پاک روزی کا بندوبست کیا مگر تم نے از خود کچھ حصے کو حرام اور کچھ کو حلال ٹھہرا لیا

نعمت کی ناشکری

حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی مالک ابن نضلہؓ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کا لباس بالکل پھٹا پرانا تھا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دریافت کیا۔ کیا تمہارے پاس مال ہے؟ عرض کیا، ہر قسم کا مال موجود ہے جن میں اونٹ، بھیڑ بکریاں، گھوڑے، اور غلام شامل ہیں آپ نے فرمایا، جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنی نعمت عطا کی ہے تو اس کا اثر تمہاری ذات پر دکھائی دینا چاہیئے۔ کم از کم لباس تو صاف ستھرا پہنا کرو۔ یہ حدیث مسند احمد میں ہے۔ اور امام ابن کثیرؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے بہر حال حضور علیہ السلام نے اس شخص سے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں مال دیا ہے تو اسے اپنے آپ پر بھی خرچ کرو اور اس کے باقی حقوق بھی ادا کرو، اللہ تعالیٰ نے بخل کو سخت ناپسند کیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ تمہارے لیے صحیح سلامت جانور پیدا کرتا ہے، پھر تم اس لیے کہ اُس کا تھوڑا سا کان کاٹ ڈالتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ بحیرہ بن گیا ہے اور اب یہ فلاں معبود کی نیاز ہے۔ لہٰذا اب اس پر سواری نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح کسی جانور کی کھال کو تھوڑا سا چیر دیا تو اُسے سواری کے لیے حرام قرار دے دیا۔ حضور نے فرمایا، یاد رکھو! اللہ کا بازو تم سے زیادہ طاقتور

ہے اور اس کا اُسترا تمہارے استرے سے زیادہ قوی ہے۔ وہ تم سے پوچھے گا کہ تمہارے فائدے کے لیے جانور تو میں نے پیدا کیے ہیں مگر تم نے انہیں معبودانِ باطلہ کی نیاز بنا کر خود اپنے اوپر کیوں حرام کر لیے ہے۔

حلت و حرمت کا اختیار

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق، مالک، مربی اور مختار ہے اس نے انسانوں کی روزی کے لیے سب چیزیں پیدا کی ہیں مگر تمہیں حلال و حرام قرار دینے کا اختیار کیسے مل گیا؟ سورۃ نحل میں فرمایا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ محض مشرکانہ نظریات کے مطابق اپنی زبانوں سے کسی چیز کو حلال یا حرام مت بناؤ۔ کسی چیز پر حلت و حرمت کا حکم لگانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس کام کی اتھارٹی اسے حاصل ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے اَلْحَلَالُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ حلال وہ ہے جسے اللہ نے حلال قرار دیا وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے حرام کیا اور اس کا بیان خدا تعالیٰ کی شریعت میں ہے۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں بنا سکتا۔ جو ایسا کریگا وہ شرک کا مرتکب ہوگا۔ کیونکہ حلت و حرمت کی صفت ذاتِ خداوندی کے ساتھ مختص ہے۔

عدیؓ بن حاتم طائی کا واقعہ حدیث میں آتا ہے۔ حاتم خود تو عیسائی مذہب پر ہی مرا مگر اس کا بیٹا عدی اور ایک بیٹی ایمان لائے۔ جب عدیؓ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سورۃ توبہ کی آیت اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا ذکر ہوا۔ کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے اس پر عدیؓ کہنے لگے کہ ہم تو اپنے پیروں اور مولویوں کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم پادریوں کی حلال کردہ چیز کو حلال اور حرام کردہ چیز کو حرام تسلیم نہیں کرتے کہنے لگا، ایسا تو ہم سمجھتے ہیں تو حضور نے فرمایا فَذٰلِكَ اَرْبَابًا مِّنْ

دُوْنِ اللّٰہِ پس یہی اللہ کے سوا رب بنانے والی بات ہے۔ یہاں سجدہ، رکوع وغیرہ مراد نہیں بلکہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حلت وحرمت کا اختیار دینا اس کے ساتھ شریک بنانے کے مترادف ہے۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ تحریم ایک تکوین نافذ کا نام ہے عالم بالا سے حکم نافذ ہوتا ہے کہ فلاں کام کرو گے تو مواخذہ ہوگا اور فلاں کام کرو باز پرس نہیں ہوگی۔ تکوین نافذ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جسے کوئی دوسری ذات استعمال نہیں کر سکتی۔ لہٰذا حلت وحرمت کا حکم لگانا بھی صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ جو کوئی اس میں مداخلت کرے گا۔ وہ شرک کا مرتکب ہوگا۔ ہاں جب حلت وحرمت کو نبی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو یہ اس بات کی قطعی علامت ہوتی ہے کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ نے حلال یا حرام قرار دی ہے۔ یہی بات جب کسی مجتہد کے نام پر منسوب کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجتہد نے فلاں دلیل یا قرینے سے شریعت سے معلوم کر کے بتایا ہے، وگرنہ وہ خود حلت وحرمت کا حکم لگانے کے مجاز نہیں ہوتے، یہ صرف خدا تعالیٰ کا کام ہے۔

وہابی والوں نے بی بی کی صحنک بنا رکھی ہے۔ یہ حضرت فاطمہؓ کی نیاز مشہور ہے جسے صرف عورتیں ہی کھا سکتی ہیں۔ مردوں کے لیے حرام قرار دے دی گئی ہے عورتوں میں سے دو خصمی عورت بھی یہ نیاز کھانے کی مجاز نہیں سمجھی جاتی۔ اسی طرح امام جعفر صادقؒ کے نام کے کونڈے بھرے جاتے ہیں۔ اس نیاز کا علاوہ کھلی جگہ پر کھانا منع ہے بلکہ صرف چھت کے نیچے ہی کھایا جاتا ہے۔

لوگوں نے اپنی طرف سے شریعت بنا رکھی ہے۔ یہی تو تحلیل وتحریم میں شرک ہے۔ بھائی! جب اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو منبع علم، نصیحت اور ہدایت بنانے والی کتاب بنا کر بھیجا ہے تو حلت وحرمت کا قانون بھی اسی کتاب سے دریافت کرو۔ خود اپنی مرضی سے روزی کے بعض حصے

حلال اور بعض حرام نہ بناؤ۔
فرمایا، اے پیغمبر! قُلْ آپ کہہ دیجیے آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ کیا تمہیں اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ یا تم اللہ پر افتراء باندھتے ہو۔ خدا تعالیٰ نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا کہ فلاں چیز صرف چھت تلے ہی کھائی جا سکتی ہے یا فلاں چیز کو صرف عورتیں ہی کھائیں۔ جو کوئی ایسا کرے گا وہ خدا پر جھوٹ باندھے گا کیونکہ خدا نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ شرک کی ہر بات افتراء علی اللہ ہے اور پیچھے گزر چکا ہے "سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" اللہ تعالیٰ تمام شرکیہ باتوں سے پاک ہے۔ جو بات اللہ تعالیٰ نے نہیں کہی، وہ اُس کی طرف منسوب کرنا اُس پر افتراء باندھنا ہے۔ ایسے کام کے لیے مشرکین کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی بلکہ وہ محض اپنے ملک، علاقے یا گاؤں کے رسم و رواج کے پیچھے چلتے ہوئے ایسا کرتے ہیں۔ اللہ پر افتراء
وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں قیامت والے دن۔ یعنی قیامت کے دن ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ کیا یہ اللہ کی گرفت سے بچ جائیں گے؟ مشرکین اور حلت و حرمت کا حکم لگانے والے اللہ کی پکڑ سے کبھی نہیں بچ سکتے۔ قیامت کے دن یہ لوگ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے اور سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ فرمایا، یاد رکھو! اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ اس نے پیدا کیا، عقل و شعور سے نوازا انبیاء بھیجے، کتب نازل فرمائیں توبہ کا دروازہ کھلا رکھا مگر وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ مگر اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے ان کا کیا خیال ہے کہ قیامت کے دن ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا
تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ
تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ
ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ
ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿٦١﴾ أَلَا إِنَّ
أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾
لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا
تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٤﴾
وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ
وَمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ
اللَّهِ شُرَكَاءَ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ:- اور نہیں ہوتے آپ کسی حال میں اور نہیں پڑھتے
آپ اس حال میں قرآن، اور نہیں عمل کرتے آپ کوئی عمل مگر ہم
[illegible] ہوتے ہیں اس کام

میں ۔ اور نہیں غائب تیرے رب سے مقدار ایک ذرے کے زمین میں
اور نہ آسمان میں ، نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز اور نہ بڑی مگر وہ
کتابِ مبین میں ہے (٦١) آگاہ رہو ! بیشک اللہ تعالیٰ کے دوست،
نہیں خوف ہوگا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے (٦٢) وہ جو
ایمان لانے اور تقویٰ اختیار کرتے ہے (٦٣) اُن کے لیے
بشارت ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں ۔ نہیں ہے تبدیلی
اللہ کے کلمات میں یہ بڑی کامیابی ہے (٦٤) اور نہ غم میں ڈالے
آپ کو اُن کی بات ۔ بیشک عزت اللہ کے لیے ہے سب
اور وہی سننے والا اور جاننے والا ہے (٦٥) آگاہ رہو ! بیشک اللہ تعالیٰ
کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے ۔ اور جو پیروی
کرتے ہیں اُن لوگوں کی جو پکارتے ہیں اللہ کے سوا دوسرے
شریکوں کو ، نہیں پیروی کرتے وہ مگر گمان کی ، اور نہیں وہ مگر
اٹکل دوڑاتے (٦٦)

ربطِ آیات

یہ بھی دراصل توحید کے اثبات اور مشرکین کے رد کا بیان ہے ۔ اس سے پہلے اللہ نے قرآنِ کریم کے اوصاف بیان کیے قرآن پاک کے پروگرام کے علاوہ اپنے گمانِ محض اور ناقص عقل سے حلت وحرمت کے حکم لگانے کی مذمت بیان فرمائی ۔ ایسے لوگوں کی سزا کے متعلق اللہ نے اشارۃً فرمایا کہ یہ لوگ کیا خیال کرتے ہیں کہ قیامت والے دن اِن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا ؟ اب آج کے درس میں اللہ نے اپنے اوصاف بیان فرمائے ہیں اور اپنے پیغمبر علیہ السلام کی تعریف بیان کی ہے ۔ آپ کے پیروکاروں کا بھی ضمناً ذکر کیا گیا ہے ۔

نگرِ خداوندی

ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ اور نہیں ہوتے آپ کسی
حال میں وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ اور آپ نہیں پڑھتے اس حال میں قرآن

پاک وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اور نہیں انجام دیتے کوئی عمل اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ مگر یہ کہ ہم آپ کے پاس موجود ہوتے ہیں جب آپ کسی کام میں مصروف ہوتے ہیں اللہ تعالےٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعریف میں فرمایا ہے کہ آپ جس حالت میں بھی ہوں، قرآن پاک کی تلاوت کر کے لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے رہے ہوں یا کوئی دوسرا نیکی کا کام کر رہے ہوں نماز پڑھ رہے ہوں یا غرباء و مساکین کی اعانت کر رہے ہوں، ہم ہر حالت میں حاضر ہوتے ہیں اور آپ کے کاموں کو دیکھتے ہیں۔ تبلیغ دین کے ذریعے لوگوں کی راہنمائی کر رہے ہوں یا خود اپنی وفاداری اور عجز و انکساری اللہ رب العزت کی بارگاہ میں پیش کر رہے ہوں، ہم کسی حالت میں بھی آپ سے جدا نہیں ہوتے بلکہ آپ کا ہر کام ہماری نگاہ میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ تو حاضر و ناظر ہے اور وہ ہر شخص کے اعمال کو دیکھ رہا ہے کہ کوئی شخص کس قسم کا کام، کس نیت اور ارادے سے کر رہا ہے۔ اچھا کام کر رہا ہے یا برائی کی طرف راغب ہے، خلوص کے ساتھ انجام دے رہا ہے یا اس پر ریاکاری کا غلبہ ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ لوگ توحید پر کاربند ہیں یا شرک میں ملوث ہو چکے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو قبول کر رہے ہیں یا ان کی اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کی تکذیب کر رہے ہیں۔ شرائع الٰہی پر عمل پیرا ہیں یا حیلے بہانے سے اس کے احکام کو ٹال رہے ہیں۔ فرمایا جب یہ سب کچھ واضح ہے تو پھر انسان کے لیے کسی طور پر مناسب نہیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے سامنے اپنی حاجات پیش کرے اور مشکل کشائی کے لیے اغیار کے سامنے دست سوال دراز کرے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آیت کی ابتداء میں صیغہ واحد مخاطب

استعمال ہوا ہے (تَکُوْنُ) جب کہ آگے تَعْمَلُوْنَ میں صیغہ جمع مخاطب آیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ دونوں صیغوں میں حضور کی ذات مبارک ہی مراد ہے تاہم بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جمع مخاطب کا صیغہ استعمال کر کے حضور علیہ السلام کے ساتھ آپکی امت کے لوگوں کو بھی شامل کر لیا ہے کہ تم سب لوگ جو بھی کام کرتے ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہوتے ہیں۔

علم خداوندی

آگے اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے انداز میں اس طرح بیان فرمایا وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ اور نہیں غائب ہوتی آپکے پروردگار سے ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز زمین میں ہو یا آسمان میں۔ ذرہ چیونٹی کو بھی کہا جاتا ہے، اور ان باریک حباب کو بھی جو روشندان سے آنیوالی دھوپ میں نظر آتے ہیں مطلب یہی ہے کہ کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی رب العزت سے مخفی نہیں ہے بلکہ سب کچھ اس کے علم میں ہے یہاں پر زمین کا ذکر آسمان سے پہلے کیا گیا ہے حالانکہ اکثر مقامات پر آسمان کا تذکرہ پہلے آتا ہے زمین کا ذکر اس لیے پہلے کیا گیا ہے کہ اللہ نے پہلے ارضی حالات بھی بیان فرمائے ہیں۔ بہر حال آسمان کو زمین پر فوقیت حاصل ہے۔ تو فرمایا کہ اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ یہ اس کی صفتِ کمال ہے۔ توحید کو جھٹلانے والے، قیامت کا انکار کرنے والے، نبوت و رسالت میں شک کرنے والے سب اللہ کی نگاہ میں ہیں۔ اللہ ان سب کے حال کو جانتا ہے، پھر وہ خدا تعالیٰ کی گرفت سے کیسے بچ سکتے ہیں!

زمین و آسمان کی چیزوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْبَرَ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ اور نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی مگر وہ کتاب مبین میں موجود ہے پہلے فرمایا کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور کوئی چیز اس سے

غائب نہیں۔ اب فرمایا کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا اندراج کتاب مبین یعنی لوح محفوظ میں موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اس کا نمونہ لوحِ محفوظ میں بھی درج ہے۔ بہر حال پوری آیت کریمہ کا لبِ لباب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں اور بندوں کا کوئی کردار اس کی نظروں سے اوجھل نہیں اور وہ اسی علم کے مطابق سزا اور جزا کا فیصلہ کریگا۔

اولیاء اللہ کے مناقب

آگے اللہ تعالیٰ نے توحید و رسالت کو ماننے والوں کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ بیشک اللہ تعالیٰ کے دوستوں پر نہ خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوف مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی بناء پر ہوتا ہے۔ جب کہ غم کا تعلق ماضی کے واقعات سے ہوتا ہے۔ قیامت کے دن ساری مخلوق شدت کی گھمی میں مبتلا ہوگی۔ انہیں حساب کتاب اور اس کے نتیجے میں آخری فیصلے پر سخت تشویش اور خوف ہوگا کہ پتہ نہیں اُن کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ مگر جو اللہ کے دوست ہیں اُن پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور وہ اپنے مستقبل کے متعلق پُرامید ہوں گے۔ اللہ کے ایسے بندوں نے اِس زندگی کے لمحات بھی خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کے احکام کی تعمیل میں گزارے ہوں گے، اس لیے سابقہ زندگی پر بھی انہیں کوئی حسرت یا غم نہیں ہوگا۔ ایسے لوگوں کو قیامت کے سخت ترین دِن میں بھی امن حاصل ہوگا جو اُن کی کامیابی کی دلیل ہوگا۔

آگے وضاحت فرمائی کہ اولیاء اللہ کون لوگ ہیں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وہ جو ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، ملائکہ، انبیاء قیامت کو برحق جانا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ اور انہیں نے اِس دنیا

میں تقوے کی راہ اختیار کی، برائی سے بچتے رہے اور نیکی کو اختیار کرتے رہے۔ اللہ کے دوست ایسے ہی لوگ ہیں۔ سورۃ بقرہ میں فرمایا: "اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" اہل ایمان کا ولی، کارساز اور دوست اللہ ہی ہے چنانچہ اس تعریف کے مطابق ہر صاحبِ ایمان آدمی اللہ کا ولی ہے تاہم اصطلاحاً ولی اس شخص کو کہا جاتا ہے جس میں اعلیٰ درجے کی صفات پائی جائیں۔ یعنی وہ نہ صرف ایماندار ہو بلکہ اعلیٰ اخلاق و کردار کا حامل بھی ہو۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ سو پچاس روپے کا مالک بھی مالدار ہی ہوتا ہے مگر اس کو عام طور پر مالدار نہیں سمجھا جاتا بلکہ اصطلاح میں مالدار وہ شخص ہوتا ہے جو لاکھ دو لاکھ روپے کا مالک ہو۔ اسی طرح اہل ایمان اللہ کا ولی ہے مگر اصطلاحاً ولی وہ ہے جس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

ایک حدیث میں اس طرح آتا ہے "لَیْسَ عَلٰی اَھْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْشَۃٌ" یعنی کلمہ طیبہ پر ایمان رکھنے والوں پر قیامت کے دن وحشت طاری نہیں ہوگی، وہ قبروں سے مٹی جھٹکتے ہوئے اٹھیں گے۔ قیامت کی شدید ترین گھڑیوں میں بھی کسی نہ کسی درجے میں سکون حاصل ہوگا۔ بہرحال فرمایا کہ اللہ کے ولی وہ ہیں جو ایمان کی تمام جزئیات پر قائم رہے اور تقوے کی راہ اختیار کی یعنی حدودِ شرع کا احترام کرتے ہوئے کفر، شرک، نفاق، تمام معاصی سے بچتے رہے۔

ولایت کا غلط تصور

عام لوگوں کے ہاں ولی کا غلط تصور پایا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ولی وہ ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ پر کرامات ظاہر ہوں حالانکہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کتاب المریدین میں لکھتے ہیں کہ اللہ کے ولی کا معیار کرامت نہیں بلکہ ایمان اور اتباع سنت ہے۔ اگر کوئی آدمی ہوا میں اڑتا ہوا نظر آئے لیکن سنت کے خلاف کرتا ہو تو سمجھ لینا چاہیے

کہ اللہ کا ولی نہیں بلکہ شیطان کا ساتھی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر ننگا، بھنگ پینے والا، سوکھے لگانے والا بے نماز اور طہارت سے بے نیاز ولی ہوتا ہے یا کرامت دکھانے والا ولی اللہ ہوتا ہے بھائی ایسی بات نہیں ہے۔ بزرگانِ دین تو کہتے ہیں کہ جو شخص کرامت دکھانے کی کوشش کرے، سمجھو کہ اس کو حیض آگیا ہے یعنی ناپاک ہو گیا ہے۔ اس میں غرور و تکبر کا مادہ سرایت کر گیا ہے جس کی وجہ سے وہ کرامت ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور غرور ایسی چیز ہے، جو انسان کی فکر کو ناپاک بنا دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کرامت ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، وہ جب چاہتا ہے کسی ولی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اس میں ولی کا کچھ اختیار نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی خواہش ہوتی ہے۔ ولی کا کام تو ایمان لانا اور نیکی کرنا ہوتا ہے۔ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول کا متبع ہوتا ہے۔ ولایت کی یہی نشانی ہے۔ مرنے کے بعد قبر کا بڑی پختہ ہونا، اس پر گنبد بنانا اور نقش و نگار بنانا، اس پر عرس منانا، ڈھول بجانا یا روشنی کرنا ولایت کی علامت ہرگز نہیں، اللہ کا ولی وہ ہو گا جو روحانی بیماریوں سے پاک ہو گا، اللہ کی اطاعت اور مخلوق کی خدمت کرنے والا ہو گا۔

ولی کی پہچان

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ ولایت کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے اچھے لوگوں کی مجلس نصیب ہو۔ ایسی مجلس سے اللہ کی محبت، عقیدے کی پاکیزگی، دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں، کہ ان کے استاد محترم کی مجلس میں اگر کوئی شخص ہزار مرتبہ بھی آتا تھا تو ہر مرتبہ اپنے آپ کو حقیر تر ہی سمجھتا تھا۔ یہ اس مجلس کا اثر ہوتا تھا کہ ہر وقت اپنی کوتاہیوں پر نظر ہوتی تھی، اس لیے وہ اپنے آپ کو مخلوق کا حقیر ترین

انسان مجھتا تھا۔ حضرت پانی پتی فرماتے ہیں کہ ولایت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے ولی کون ہیں تو آپ نے فرمایا، اِذَا رُأُوْ ذُکِرَ اللّٰہ کہ اللہ کے ولی وہ ہیں کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آجائے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو دیکھ کر دنیا کا مال و دولت بلڈنگز، کارخانے، جاہ و اقتدار اور ٹھاٹ باٹ یاد آئے وہ اللہ کے ولی نہیں ہو سکتے۔ اللہ کے ولی تو وہ ہیں جو غرور تکبر سے پاک ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے لَا تَرٰی نَفْسَکَ خَیْرًا مِّنْ اَحَدٍ اپنے آپ کو کسی سے اچھا نہ سمجھے۔ اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص عارف یا کامل نہیں ہو سکتا جب تک اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی کم تر نہ سمجھے۔ شیخ سعدیؒ کے زمانے سے کر حالات پڑھ لیں، انگریز بڑے سنگدل واقع ہوئے ہیں۔ انگریز برطانوی ہوں یا امریکی، یورپی ہوں یا روسی یہ انسانیت کے دشمن ہیں۔ ان کے ہاتھ میں پراپیگنڈہ کی مشین ہے وہ غلط طور پر استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ لوگوں پر بے انتہا مظالم ڈھاتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنی انکساری کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

زمن دارد سگ نصرانیاں عار
کہ او است بے گناہ و من گنہگار

مجھ سے تو عیسائیوں کا کتا بھی شرم رکھتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے اور میں گنہگار ہوں۔ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں کہ حقیقت میں انسان سے جب تکبر ختم ہو جاتا ہے تو ولایت آجاتی ہے، یعنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب غرور نہ ہو کیونکہ غرور کی وجہ سے لوگ حکم خداوندی کے سامنے اکڑتے ہیں

اور سنت کے اتباع سے اعراض کرتے ہیں۔ سلف صالحین کا اسوہ ہمارے سامنے ہے انہوں نے عجز و انکساری کی بدولت ہی اعلیٰ مراتب پائے۔

اولیاء اللہ کے لیے بشارت

فرمایا اللہ کے ولی وہ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کی راہ اختیار کی۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ اُن کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔ اس دنیا میں جب اُن کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اللہ کے فرشتے ان کو بشارت سناتے ہیں اور ان پر استقامت نازل ہوتی ہے۔ معاملہ تو استقامت سے بنتا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں اُطْلُبُوا الْاِسْتِقَامَةَ فَاِنَّ الْاِسْتِقَامَةَ فَوْقَ الْكَرَامَةِ دین پر استقامت طلب کرو کیونکہ استقامت کرامت سے بھی اعلیٰ چیز ہے جب انسان میں استقامت آتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی دستگیری فرماتا ہے اور نیکی کی مزید توفیق عطا کرتا ہے۔ تو فرمایا اُن کو دنیا اور آخرت میں بشارت ہوگی، اللہ کے وعدے سچے ہیں لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، وہ ضرور پورے ہو کر رہتے ہیں۔ فرمایا جسے استقامت حاصل ہوگئی اسے دنیا اور آخرت کی بشارت اگئی ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ ایسا شخص اللہ کی رحمت کے مقام میں پہنچ گیا۔ اولیاء اللہ کا یہی مقام ہے۔

پیغمبر اسلام کے لیے تسلی

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور دیگر اہل ایمان کو تسلی دی ہے وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ان کافروں، مشرکوں اور نافرمانوں کی بات آپ کو غم میں نہ ڈالے کیونکہ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا عزت تو ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے۔ آپ بددل نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ضرور آپ کا مشن غالب بنائے گا اور آپ کو عزت دے گا۔ کافروں اور مشرکوں کا مشن بالآخر مغلوب ہو کر رہے گا۔ وہ ذلیل و خوار ہوں گے اور آپ کامیاب

وکامران، لوگ سمجھتے ہیں کہ اُن کے پاس مال و دولت، جاہ و اقتدار آجائے تو وہ عزت والے بن جائیں گے۔ نہیں بلکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہے اور جب چاہے عطا کرے، یہ تو اس کے اختیار میں ہے، لہٰذا آپ پریشان نہ ہو هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ اللہ تعالیٰ ہر بات کو سنتا ہے اور ہر چیز اس کی نگاہ میں ہے اور وہ اپنی حکمت کے مطابق ہر چیز کا فیصلہ کرے گا۔

گمان کی پیروی

فرمایا أَلَآ إِنَّ لِلَّهِ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ سنو! بیشک اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے لہٰذا اُسی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور اسی کی وحدانیت کو تسلیم کرنا چاہیے اُسی سے ہدایت طلب کرنی چاہیئے۔ اسی کی کتاب سے پروگرام اخذ کرکے اُس پر عمل کرنا چاہیئے اور اُسی کے نبی کا بسر و چشم اتباع کرنا چاہیئے۔

جب آسمان و زمین کی ہر چیز کا خالق و مالک اللہ ہے اور ہر چیز اسی کے تصرف میں ہے تو فرمایا وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ شُرَكَآءَ جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو شریک بناتے ہیں اور ان کو پکارتے ہیں۔ ان سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی اُمید رکھتے ہیں سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ لوگوں کی مشکلات دور کریں تو فرمایا کہ جو لوگ پکارتے ہیں اللہ کے سوا دوسروں کو شریک إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وہ نہیں اتباع کرتے مگر گمان کا۔ واقع میں تو خدا تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے مگر انہوں نے اپنے گمان سے خدا کے شریک بنا رکھے ہیں۔ ان لوگوں کو شیطان نے بہکا دیا ہے، اور انہوں نے اپنے معبود بنا رکھے ہیں۔ کوئی قبروں سے مدد مانگ رہا ہے اور کوئی شمس و قمر سے۔ کوئی ملائکہ کو پکار رہا ہے تو کوئی جنات سے حاجت طلب کر رہا ہے۔ کوئی زندوں سے حاجت براری کر رہا ہے اور

کوئی مُردوں سے ۔ یہ سب شیطان کا بہکاوا اور محض گمان کی پیروی ہے حقیقت یہ ہے کہ خالق، مالک، متصرف فی الامور، مربی، نافع، ضار، علیم کل اور قادر مطلق تو خدا تعالیٰ ہے ۔ زندگی اور موت، عروج و زوال اور بیماری اور تندرستی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے تو پھر یہ دوسروں کو کیوں شریک بنائے بیٹھے ہیں۔ انہیں تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ہی فدا ہونا چاہیئے ۔

شرک و بدعت کے تمام طریقے گمان کی پیروی ہے، اور پہلے اسی سورۃ میں گزر چکا ہے "اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا" حق کے مقابلے میں گمان کچھ مفید نہیں ہو سکتا، عقیدہ اٹل ہونا چاہیئے، اور اس میں وہم و گمان کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ مشرک لوگ محض گمان کے پیچھے چلتے ہیں، اُن کے عقیدے کی بنیاد سنی سنائی باتیں اور رسم و رواج ہوتے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ فلاں نے قبر پر چڑھاوا چڑھایا تو اس کی فلاں مشکل حل ہو گئی، لہٰذا ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے ۔ فرمایا وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ نہیں ہیں یہ لوگ مگر اٹکل دوڑاتے محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں وگرنہ حقیقت کچھ نہیں۔

یہ شرک کرنے والوں کا رد ہو گیا۔ نبی آخر الزمان کی صفات بیان ہوئیں ۔ اولیاء اللہ کے فضائل ذکر کئے گئے اور شرک کی برائی بیان کر کے اس کی تردید فرمائی گئی۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ
مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾
قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهُ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ
بِهٰذَا ۚ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾ قُلْ إِنَّ
الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾
مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ
نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾ ع

ترجمہ :۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے بنائی تمہارے واسطے رات تاکہ تم اس میں آرام پکڑو اور دن کو روشن ۔ بیشک اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو (کان رکھ کر) سنتے ہیں ﴿٦٧﴾ کہا ان لوگوں نے کہ بنا لیا ہے اللہ تعالیٰ نے بیٹا ۔ پاک ہے اس کی ذات ، وہ بے نیاز ہے اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ۔نہیں ہے تمہارے پاس کوئی سند اس بات کی کیا کہتے ہو تم اللہ پر وہ بات جو تم نہیں جانتے ﴿٦٨﴾ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ بیشک وہ لوگ جو افترا باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ وہ فلاح نہیں پائیں گے ﴿٦٩﴾ تھوڑا سا فائدہ ہے دنیا کی زندگی میں

پھر ہماری طرف ہی ان سب کو لوٹ کر آنا ہے۔ پھر ہم
چکھائیں گے اُن کو سخت عذاب اس وجہ سے کہ وہ کفر کیا
کرتے تھے ﴿۷۰﴾

ربطِ آیات

پہلے قرآن کریم کا ذکر تھا، پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق فرمایا کہ آپ جس حالت میں بھی قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں، اور جو بھی کام کرتے ہیں، ہم ہر حالت میں حاضر ہوتے ہیں اور ہر کام کو دیکھتے ہیں۔ فرمایا خدا تعالیٰ سے ایک ذرہ بھر چیز بھی غائب نہیں ہے خواہ وہ آسمان کی بلندیوں میں ہو یا زمین کی گہرائیوں میں ہر چیز اللہ کے علم میں ہے اور لوحِ محفوظ میں بھی درج ہے۔ پھر فرمایا یاد رکھو! اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ولی اللہ وہ ہوتے ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا راستہ اختیار کیا۔ ان کے لیے دنیا میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ کے وعدے برحق ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔ فرمایا آپ مشرکوں کی باتوں سے غمگین نہ ہوں، کیونکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ ہی کی ملکیت ہے اور جو لوگ معبودانِ باطلہ کو پکارتے ہیں، یہ محض گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور اٹکل دوڑاتے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

اس کے بعد اگلی آیات میں بھی خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل ہی بیان کیے جا رہے ہیں

رات اور دن بطور دلیل

ارشاد ہوتا ہے ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ﴾ خدا کی ذات وہی رحیم و کریم ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی، تاکہ تم اس میں آرام پکڑو ﴿وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا﴾ اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں دیکھ سکو اور کام کر سکو۔ دراصل یہ انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے عقلی دلیل بیان کی ہے کہ اگر تم رات اور دن کے تغیر و تبدل میں غور کرو تو تمہیں اللہ کی وحدانیت آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ رات اور دن خود بخود آگے پیچھے نہیں آتے بلکہ یہ خدا تعالیٰ کے قائم کردہ نظام کا ایک حصہ ہیں اور اسی نظام کے مطابق آتے جاتے ہیں۔ سورۃ فرقان میں ہے ﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ الَّيْلَ﴾

وَالنَّهَارَ خِلْفَةً" اللہ تعالیٰ کی وہی ذات ہے جو رات اور دن کو آگے پیچھے لاتی ہے۔ رات اور دن اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ رات کی نشانی دھیمی ہے اور دن کی روشن ہے۔ ان دونوں کے ساتھ انسان کے مفادات والبتہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے آرام اور سکون کو رات کے ساتھ والبتہ کر دیا ہے۔

رات کے فائدے

نیند عام طور پر رات کے وقت آتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کی وجہ سے انسانوں کو سکون حاصل ہوتا ہے سورۃ نبا میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے" وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا" ہم نے نیند کو تمہارے لیے آرام کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رات کی ساخت ہی ایسی رکھی ہے کہ اس میں ہر چیز صامت ہو جاتی ہے۔ انسان جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے وغیرہ حتیٰ کہ درختوں پر بھی ایک قسم کا سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت تک کام کرنے کے بعد ہر جاندار کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر فرمایا" خُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا" انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ کا یہ بھی ارشاد ہے" لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ" (البلد) ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ ابتداء سے لے کر انتہا تک مہد سے لیکر لحد تک کوئی انسان مشقت سے خالی نہیں۔ یہ مشقت معاش کے لیے بھی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بھی یہ مشقت کمال حاصل کرنے کے لیے بھی کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھی۔ بہر حال انسان جو بھی کام کرتا ہے اس کی وجہ سے اس کی جسمانی قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ انسان ذہنی یا جسمانی طور پر تھک جاتا ہے۔ اس کمزوری کو دور کرنے اور قوئی انسانی کو بحال کرنے کے لیے نیند کو پیدا فرمایا ہے تاکہ لوگ کام کاج کے

بعد کچھ دیر کے لیے سو کر آرام کریں اور پھر صبح تازہ دم اٹھ کر اگلے دن کے کام اور عبادت میں مصروف ہو جائیں۔ گویا رات کی آمد اور پھر اس میں نیند کا آنا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

سکون کی ضرورت

حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ کے متعلق حضور علیہ السلام نے سُنا کہ وہ ساری رات عبادت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ایسا مت کرو کیونکہ ایسا کرنے سے تم کمزور ہو جاؤ گے، تمہاری آنکھیں اندر دھنس جائیں گی اور پھر فرائض سے بھی رہ جاؤ گے۔ ہمیشہ اتنا عمل کرو جسے برداشت کر سکو اور جس سے تمہارے قویٰ بحال رہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس ایک عورت بھی حولا بنت تویت حضور علیہ السلام کے دریافت کرنے پر آپ کو بتایا گیا کہ یہ فلاں خاندان کی عورت ہے اور ساری رات عبادت میں گزار دیتی ہے۔ آپ ناراض ہو گئے اور فرمایا اَکْلَفُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تَسْتَطِیْعُوْنَ اتنے اعمال انجام دو جتنی طاقت ہو۔ طاقت سے زیادہ کام کرنا جسم کی حق تلفی ہے۔ جس طرح تمہارے بیوی بچوں کا تم پر حق ہے اسی طرح تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔ اور حق کی ادائیگی کے متعلق حکم ہے کہ اٰتِ کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔ تب جا کر بات بنے گی۔ یک طرفہ بہ جانا خلاف فطرت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا یہ کمال قدرت ہے کہ اُس نے رات کو بنایا تاکہ نیند کے ذریعے سکون پکڑو۔ سورۃ روم میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کو بھی سکون کا ذریعہ قرار دیا ہے، فرمایا یہ اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے تمہیں میں سے تمہارے لیے جوڑا پیدا فرمایا لِتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا تاکہ تم اُس کی طرف سکون پکڑو بہرحال نیند انسان کا بنیادی حق ہے جو اسے وقفے وقفے سے میسر آنی چاہیئے۔ اگر نیند میں خلل واقع ہو جائے تو خشکی طاری ہو کر بیماریاں لاحق

ہو جاتی ہیں۔ اگر دو چار دن نیند نہ آئے تو انسان کا دماغ فیل ہو جاتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کو انسانی زندگی میں توازن کا ذریعہ بنایا ہے کہ دن کو کام کرو اور رات کو آرام کرو۔ جو لوگ اس فطرت کے خلاف کام کرتے ہیں انہیں سکون حاصل نہیں ہوتا۔ اگر رات بھر کھیل تماشے میں مصروف رہا، سینما دیکھا یا ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا رہا تو اس کے جسمانی قویٰ کمزور پڑ جائیں گے اور وہ اپنے معمول کے کام انجام نہیں دے سکیگا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کی بہتری کے لیے دن اور رات کا یہ نظام قائم کیا ہے۔

آج کل کے مشینی دور میں بعض کام بعض لوگوں کو رات کے وقت بھی انجام دینے پڑتے ہیں۔ مثلاً ریل گاڑی، ہوائی جہاز، بحری جہاز، یا پبلک ٹرانسپورٹ کی سروس ہے جو چوبیس گھنٹے کام کرتی ہے اب بعض کارخانے بھی تین تین شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ ایسے میں جو لوگ رات کی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ انہیں دن کے وقت آرام کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ حسبِ ضرورت دن کے وقت بھی آرام کیا جا سکتا ہے۔ تاہم عام طور پر فرمایا کہ رات کو آرام کے لیے بنایا گیا ہے اور دن کو کام کاج کے لیے۔ تعلیم و تربیت کا کام ہو، معاشں کا یا عبادت کا۔ اللہ نے نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا ہے اور دن کو معاش کا۔ سورۃ نبا میں موجود ہے "وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا" یہاں پر دن کے متعلق فرمایا کہ ہم نے دن کو روشن بنایا جس میں دیکھ کر کام کاج کیا جاتا ہے۔ "مُبْصِرًا مُضِيئًا" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔

نشانات قدرت

فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو کان رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اندھیرے اور لمبے

کا سلسلہ قائم کیا اسی طریقہ سے خیر و شر کا سلسلہ بنایا۔ ایمان و کفر کو پیدا فرما کر یہ بات سمجھا دی ہے کہ حقیقی چیزوں کو اختیار کرو۔ شرک، کفر اور شکوک و اوہام سب اندھیرے ہیں، اللہ نے ان سب کا پردہ چاک کیا ہے اور قرآن پاک کو روشن آفتاب فرمایا ہے کہ اس کی روشنی میں زندگی کے تمام امور انجام دو۔

فرمایا، دن اور رات کا تغیر و تبدل ان لوگوں کے لیے نشانات قدرت ہیں جو سنتے ہیں اور پھر ان چیزوں پر غور کرتے ہیں۔ کسی چیز کی پہلی منزل سننا ہوتی ہے۔ جو سنے گا نہیں۔ وہ غور کیا کریگا اور اس کو کیسے سمجھے گا؟ لہذا ایسا شخص دوسری منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ تیسری منزل کسی چیز کو یاد کرنا ہوتا ہے اور چوتھی منزل اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اس کے بعد آخری منزل یہ ہے کہ جو کچھ خود اخذ کر کے اس پر عمل کیا ہے اُسے دوسروں تک بھی پہنچائے تو یہاں پر لِّقَوۡمٍ يَسۡمَعُوۡنَ کے لفظ سے پہلی منزل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ سارا معاملہ اسی سے آگے چلے گا۔

عقیدہ ابن اللہ

فرمایا، ان ظالم لوگوں کا حال دیکھو قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ پرانے مشرکین بھی اسی طرح ولدیت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یہودی عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہیں اور عیسائی عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ یہ واضح شرک ہے۔ بیٹا دو قسم ہو سکتا ہے یعنی حقیقی اور متبنیٰ۔ چونکہ خدا تعالیٰ کی ذات میں کوئی جنس نہیں اور اس کی کوئی بیوی نہیں ہے لہذا خدا کا حقیقی بیٹا ہونا تو محال ہے باقی رہا متبنیٰ یعنی منہ بولا بیٹا، تو اس کے متعلق بعض لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات دے کر کسی کو بیٹا بنا لیا ہے اور یہ عقیدہ بھی خلاف منشائے الٰہی اور بدترین ہے۔

انسان کو اولاد کی خواہش کئی اعتبار سے ہوتی ہے چونکہ انسان فانی

ہے اس لیے اس کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد اس کا کوئی قائم مقام اور جانشین ہو اور وہ بیٹا ہی ہوتا ہے۔ یا بیٹے کی خواہش اس لیے ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد وہ جائداد کا وارث ہوگا۔ بعض اوقات انسان یہ خیال کرتا ہے کہ جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا تو بیٹا میرے کام کاج میں ہاتھ بٹائے گا یا بڑھاپے میں میری خدمت کرے گا۔ یہ ساری باتیں ذاتِ خداوندی پر محال ہیں لہٰذا فرمایا سُبْحٰنَهٗ اللہ تعالیٰ ان تمام ضروریات سے پاک ہے۔ اس کو نہ بڑھاپا ہے اور نہ فنا۔ لہٰذا نہ اُسے کسی کی خدمت کی ضرورت ہے اور نہ اُسے کسی جانشین کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اُسے بیٹے کی ضرورت بھی نہیں ہے وہ ہر قسم کی کمزوری، عیب اور نقص سے پاک ہے۔ اُسے کسی چیز کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اسی لیے فرمایا هُوَ الْغَنِيُّ وہ بے نیاز ہے لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ آسمان و زمین کی ہر چیز اسی کی ہے اور اسی کے تصرف میں ہے لہٰذا اس کو بیٹا بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ سورۃ مریم میں آتا ہے کہ ابن اللہ کا عقیدہ اتنا گندا ہے کہ آسمان پھٹ جائے اور زمین شق ہو جائے، اس بات سے " اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا " وہ رحمان کے لیے اولاد کا عقیدہ ثابت کریں۔ فرمایا اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا کیا تمہارے پاس اس بات کی کوئی سند یا دلیل ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام یا عزیر علیہ السلام کو بیٹا بنا لیا ہے یا جیسا کہ عرب کے مشرکین کہتے تھے کہ خدا نے فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا ہے؟ فرمایا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ تم خدا تعالیٰ پر ایسی چیز بولتے ہو جس کو خود نہیں جانتے۔ خدا تعالیٰ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا۔ یہ تمہارا محض جھوٹ اور اللہ پر افتراء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ کسی کو اختیار دیا ہے۔ وہ قادرِ مطلق اور علیم کل ہے۔ فرمایا، اے پیغمبر! قُلْ آپ کہہ دیں۔ اِنَّ

اَلَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ
بے شک جو لوگ اللہ پر افترا باندھتے ہیں جھوٹ، وہ کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔ خدا کا بیٹا ماننے والے یا کوئی دوسرا شرکیہ عقیدہ رکھنے والے خدا کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں۔ یہ لوگ چند روزہ زندگی میں تو شور شر کرلیں گے، مال و دولت اور جاہ و اقتدار حاصل کرلیں گے مگر جب یہ جہاں تبدیل ہوگا تو پھر ہوش آئے گا۔ اُس وقت وہ دائمی فلاح نہیں پا سکیں گے۔

خدا کے حضور پیشی

فرمایا مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے۔ جتنی دیر اجازت ہے اس کو استعمال کرلو۔ یہ اس دنیا کی زندگی تک ہی محدود ہے اور اس کے بعد سارا معاملہ بدل جائے گا۔ سورۃ بقرہ میں جہاں آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارنے کا ذکر ہے وہاں بھی فرمایا وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہوگا اور ایک مقررہ مدت تک اس سے مستفید ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق انسانوں کو جس قدر اختیار دے رکھا ہے، اس کو چند روزہ زندگی میں استعمال کرلو۔ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ پھر ان سب کا ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔ تمام نیک و بد انسان خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے اور ہر انسان کو اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ ہر شخص اللہ کے حضور اکیلا حاضر ہوگا اور اس کی بجائے اس کا کوئی نمائندہ یا وکیل پیش نہیں ہو سکے گا اسے ہر بات کا جواب خود دینا ہوگا۔

فرمایا ثُمَّ نُذِیْقُھُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ پھر ہم انہیں سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ ۝ اس وجہ سے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے خدا تعالےٰ

کے بیٹے بیٹے کا عقیدہ وضع کیا یا خدا تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک بنایا۔ نبی کی رسالت کا انکار کیا، وحی الٰہی کو برحق نہ جانا یا جزائے عمل کی تکذیب کی فرمایا وہ سب سخت سزا کے مستحق ہوں گے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ چند دن مزے اڑا لو، تم عنقریب اپنے انجام کو پہنچنے والے ہو۔ کفر و شرک اللہ تعالیٰ کی صریح بغاوت ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے باغیوں اور نافرمانوں کو سخت سزا میں مبتلا کرے گا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ
كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى
اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ
اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾
فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ
اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾
فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ
خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا
اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَاۗءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا
بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي
قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

ترجمہ :- اور (اے پیغمبر!) آپ پڑھ کر سنائیں ان کو نوح علیہ السلام
کی خبر جب کہا انہوں نے اپنی قوم سے ، اے میری قوم کے لوگو!
گراں ہے تم پر میرا کھڑا ہونا اور نصیحت کرنا اللہ کی آیتوں
کے ساتھ تو میں اللہ پر توکل رکھتا ہوں ، پس تم جمع کر لو اپنے
معاملے کو اور اپنے شریکوں کو . پھر نہ ہو تمہارے معاملے میں تم

پر کوئی اشتباہ ۔ پھر فیصلہ کرو میری طرف (جو کچھ تم کر سکتے ہو) اور مہلت بھی نہ دو ﴿۷۱﴾ پس اگر تم نے روگردانی کی تو میں نہیں مانگتا تم سے کوئی بدلہ ، میرا بدلہ تو اللہ کے ذمے ہے ۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ہو جاؤں میں فرمانبرداری کرنے والوں میں ﴿۷۲﴾ پس جھٹلایا ان لوگوں نے نوح علیہ السلام کو ۔ پس ہم نے نجات دی اس کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے کشتی میں اور بنایا ہم نے اُن کو نائب اور غرق کیا ہم نے ان لوگوں کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ۔ پس دیکھو کیسا ہوا انجام ڈرائے ہوئے لوگوں کا ﴿۷۳﴾ پھر بھیجے ہم نے ان کے بعد بہت سے رسُول اُن کی قوموں کی طرف ۔ پس آئے وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر پس نہیں تھے وہ لوگ جو ایمان لاتے اس چیز پر جس کو پہلے ہی انہوں نے جھٹلایا تھا ۔ اسی طرح ہم مہر کر دیتے ہیں ان لوگوں کے دلوں پر جو تعدی کرنے والے ہیں ﴿۷۴﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں قرآن پاک کی حقانیت اور دعوت الی القرآن کا کافی تذکرہ ہو چکا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل اور شرک کا رد فرمایا ہے ۔ رسالت کے منکرین کی بھی تردید ہو چکی ہے ۔ اب یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا تھوڑا سا واقعہ تمثیل کے طور پر بیان کیا ہے ۔ اس کے بعد نام لیے بغیر دوسرے رسولوں کا ذکر بھی کیا ہے اور آگے چل کر حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا تفصیل کے ساتھ بیان آئیگا ۔ اِن دو انبیاء کے واقعات بیان کر کے مشرکین مکہ کو تنبیہ کی گئی ہے ۔ حضرت نوح اور موسیٰ علیہما السلام کی اقوام کے لوگ بھی غرور و تکبر میں مبتلا تھے اور اسی طرح حضور علیہ السلام کے مخاطبین مشرکین بھی بڑی اکڑ دکھاتے تھے اور آپ کی ہر بات کو جھٹلاتے تھے ۔ تو اللہ نے فرمایا کہ مغرور اقوام کا انجام دیکھ لو ۔ اگر تم بھی اکڑ دکھاؤ گے

تو تمہارا انجام بھی سابقہ اقوام سے مختلف نہیں ہوگا۔
عام طور پر دو چیزیں مال اور جاہ ضلالت کا سبب بنتی ہیں اپنی کی وجہ سے لوگ غرور میں مبتلا ہو کر حق بات کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ چنانچہ فرعون کے واقعہ میں مال کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ البتہ حضرت نوح علیہ السلام کے تفصیلی حالات اگلی سورۃ میں آئیں گے۔ وہاں پر پورے دو رکوع میں یہ واقعات بیان کیے گئے ہیں، یہاں پر صرف تنبیہ کے لیے اس تاریخی واقعہ کے کچھ حقائق سمجھائے گئے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا وعظ

ارشاد ہوتا ہے اے پیغمبر! وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ آپ ان کو نوح علیہ السلام کا حال پڑھ کر سنائیں۔ نبا کا لفظی معنی خبر یا حال ہوتا ہے، تاہم یہاں پر نوح علیہ السلام کے وعظ ونصیحت اور ان کے توکل علی اللہ کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا، اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ جب نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں سے فرمایا يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ اے میری قوم! اگر تمہیں میرا کھڑا ہونا گراں گزرتا ہے۔ کھڑا ہونے کا مطلب وعظ کرنا ہے کیونکہ اکثر و بیشتر واعظ و ناصحین کھڑے ہو کر ہی وعظ و نصیحت کا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھے ہوتے تھے اور وہ کھڑے ہو کر ان کو خطاب کیا کرتے تھے۔ بہت سی احادیث سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بھی بسا اوقات کھڑے ہو کر ہی وعظ فرمایا کرتے تھے۔ جیسے احادیث میں آتا ہے قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی حضور علیہ السلام ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور یہ نصیحت فرمائی۔ اسی لیے خطبہ کھڑے ہو کر دینا ہی سنت ہے۔ اس بات کا اشارہ سورۃ جمعہ میں بھی ملتا ہے وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا

اور جب یہ لوگ تجارت یا کھیل تماشہ دیکھتے ہیں تو آپ کو کھڑا چھوڑ کر ادھر چلے جاتے ہیں۔ آپ کھڑے ہو کر لوگوں سے خطاب فرما رہے تھے کہ ایک تجارتی قافلہ آگیا اور سب لوگ ادھر متوجہ ہو گئے جس کی اللہ نے مذمت بیان فرمائی ہے۔ فرمایا نبی کو کھڑا چھوڑ کر بھاگ جانا تمہارے لیے مناسب نہیں تھا کیونکہ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ رزق رساں تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بہرحال کھڑے ہو کر وعظ و نصیحت کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔

توکل علی اللہ

نوح علیہ السلام نے بھی قوم سے یہی فرمایا کہ اگر میرا کھڑا ہونا وَتَذْكِيْرِي بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ وعظ و نصیحت کرنا تمہاری طبائع پر ناگوار گزرتا ہے، تو ہوا کرے۔ میں تو اس سے باز نہیں آؤنگا تمہاری ناگواری مجھے فرضِ منصبی سے ہٹا نہیں سکتی۔ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ میں تو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ یعنی تمہاری ہر قسم کی مخالفت کے جواب میں میں اپنا کام اللہ کے بھروسے پر جاری رکھوں گا۔ وہی مجھے کامیابی عطا کرے گا۔ دوسرے مقام پر حضور علیہ السلام کے متعلق بھی آتا ہے کہ مجرمین کی نافرمانی۔ اکڑ اور غرور کی وجہ سے ہم وعظ و نصیحت کو ترک نہیں کر سکتے بلکہ اللہ کا نبی ہر حال میں اپنا فرض ادا کرتا رہیگا۔ سورہ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کو خطاب ہے۔ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى آپ انکو نصیحت کرتے ہیں خواہ یہ فائدہ دے یا نہ دے، آپ کے لیے تو یہ بہرحال مفید ہی ہے اور آپ کو اس کام کا اجر ملتا رہیگا، حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی یہی کہا تھا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (الاعراف) ہم تو اللہ پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ ہود علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے واقعات میں بھی توکل علی اللہ کی مثالیں موجود ہیں۔ سورۃ ابراہیم میں اللہ نے مختلف انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد ان کا یہی قول نقل فرمایا ہے وَمَا

لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا" کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ کی ذات پر بھروسہ نہ کریں جب کہ اس نے تو ہمیں راستہ دکھایا ہے۔ اسی لیے فرمایا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ" تمام اہل ایمان کو خدا کی ذات پر ہی بھروسہ کرنا چاہیئے اور اپنا کام جاری رکھنا چاہیئے۔ اس میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ مال و دولت یا جاہ و اقتدار پر بھروسہ نہ رکھیں بلکہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا فرض ادا کرتے رہیں کیونکہ نتیجہ مرتب کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ جب اس پر اعتماد کر کے کوئی کام انجام دو گے تو وہ بہتر نتیجہ ظاہر کرے گا۔

کفار کو چیلنج

آگے کفار و مشرکین کو چیلنج کیا گیا ہے فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ تم اپنا معاملہ جمع کر لو اور اپنے تمام شریکوں اور معبودانِ باطلہ کو بھی ساتھ ملا لو۔ جن کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہو۔ جن کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہو اور جن کی پرستش کرتے ہو اُن سب کو اکٹھا کر لو ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً پھر تمہیں اپنے معاملہ میں کسی قسم کا شبہ بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ غمۃ کا معنی تاریکی ہوتا ہے۔ امام بیضاویؒ اس کا معنی مستور یعنی چھپا ہوا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کھلے عام کرو۔ کوئی چیز پوشیدہ یا مشتبہ نہیں رہنی چاہیئے دین میں اشتباہ والی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے تمام اصولِ دین تم پر واضح کر دیئے ہیں اور تمہیں اچھے طریقے سے سمجھا دیئے ہیں۔ اب جو تدبیر تم کرنا چاہتے ہو وہ بھی علی الاعلان کر لو ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ پھر میرے لیے جو فیصلہ کرنا ہے کر لو وَلَا تُنْظِرُوْنِ اور مجھے مہلت بھی نہ دو۔ مجھے خدا کی ذات پر توکل ہے جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ وہی میری دستگیری کرنے والا ہے، میں تم سے خوف نہیں کھاتا، مجھے ہر حالت میں خدا کا پیغام پہنچانا ہے۔ لہٰذا تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہو مجھے

اس کی کچھ پرواہ نہیں۔

بے لوث خدمت

فرمایا فَإِن تَوَلَّيْتُمْ اگر تم روگردانی کرو۔ میرے وعظ و نصیحت سے کچھ اثر قبول نہ کرو اور اپنی من مانی کرتے رہو۔ تو مجھے کچھ پرواہ نہیں کیونکہ فَمَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ میں تم سے کسی اجر، مزدوری یا معاوضے کا طلبگار نہیں ہوں۔ ہر نبی نے اپنے آپ کو ناصح امین کہا ہے یعنی میں تو خیر خواہی کرنے والا اور امانتدار ہوں إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ـــــــ میرا معاوضہ تو پروردگار عالم کے پاس ہے۔ ہر نبی نے یہی بات کہی کہ میں تو تمہاری خیر خواہی کی بات کرتا ہوں۔ میری یہ بے لوث کاوش تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے۔ اس میں میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ دوسری جگہ فرمایا اگر میں تم سے کوئی معاوضہ طلب کروں تو اسے اپنے پاس ہی رکھ لو، مجھے ہرگز نہ دو۔ فرمایا وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداری کرنے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اللہ کی اطاعت اور اس کے دین کی دعوت کو اپنا شعار بنا لوں۔ میں تو صرف اللہ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں اور یہی میرا مشن ہے۔ اس طرح گویا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو وعظ فرمایا۔

مکذبین کی عنقابی

افسوس کہ قوم پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا فَكَذَّبُوهُ لہٰذا انہوں نے نوح علیہ السلام کو جھٹلا دیا۔ اُن کی ایک نہ مانی، کفر پر اصرار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا فَنَجَّيْنَاهُ اللہ نے فرمایا، ہم نے نوح علیہ السلام کو تو بچا لیا۔ وَمَن مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ اور آپ کے ساتھیوں کو بھی بچا لیا جو آپ کے ساتھ کشتی پر سوار تھے اور جن کی جملہ تعداد اسی کے قریب تھی وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ انہیں پہلوں کا جانشین بنایا۔ انہی کو زمین میں بسایا اور انہی سے آگے نسل انسانی چلائی وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا

بِاٰیٰتِنَا اور ہماری آیات کو جھٹلانے والوں کو غرقاب کر دیا۔ گویا نافرمانوں کی جڑ بنیاد ہی سے کاٹ ڈالی۔ کشتی میں سوار نفوس کے علاوہ بستیوں کا ایک فرد بھی زندہ نہ چھوڑا، سب کو ہلاک کر دیا فرمایا۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ پس دیکھ لو۔ ڈرائے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہوا جن لوگوں کو اللہ کا نبی بار بار ڈرا رہا تھا اور اُن کے بُرے انجام سے خبردار کر رہا تھا، اللہ نے دنیا میں ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ یہ واقعہ بیان کر کے مشرکین مکہ اور مشرکین عرب کو تنبیہ کی گئی ہے۔ کہ اگر تم بھی انکار کرتے رہو گے، اللہ کے نبی کی تکذیب کرو گے تو تمہارا حشر بھی قوم نوح کی طرح ہی ہو سکتا ہے۔

مسلسل تکذیب

آگے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے انبیاء اور اُن کی قوموں کا اجمالاً تذکرہ کیا ہے ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ پھر نوح علیہ السلام کے بعد ہم نے ان کی اقوام کی طرف رسول بھیجے۔ اِن میں سے بعض رسولوں کا ذکر قرآنِ پاک میں موجود ہے جیسے ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام، شعیب علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام، اور بعض کا ذکر اللہ نے نہیں فرمایا۔ سورۃ النساء میں ہے وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ اے پیغمبر! ہم نے اس سے پہلے بعض پیغمبروں کا ذکر کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا۔ غرضیکہ فرمایا کہ جو انبیاء ہم نے مختلف اقوام کی طرف بھیجے فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وہ اُن کے پاس واضح دلائل و نشانیاں، معجزات اور احکام لے کر گئے۔ بینات میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ انہوں نے ہر چیز کو واضح طور پر بیان کر دیا اور کوئی ایسی بات نہ چھوڑی جو سمجھ میں نہ آسکے مگر فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ جس چیز کو اس سے پہلے ہی جھٹلا چکے تھے، اُس کو آخر تک تسلیم نہ کیا بلکہ مسلسل

تکذیب ہی کرتے ہیں۔ :-

فرمایا کَذٰلِکَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ ہم اسی طرح تعدی کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ انصاف اور ہدایت کے طالب کا دل تو نیکی اور ایمان کے لیے کھول دیا جاتا ہے مگر تجاوز کرنے والے کے دل پر ٹھپہ لگا کر ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کے دل میں ایمان نہیں اتر سکتا اور وہ اسی طرح دنیا سے نامراد چلا جاتا ہے۔ سورۃ مطففین میں فرمایا ہے "کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" ان کی بُری کمائی کی وجہ سے ان کے دلوں میں زنگ چڑھ جاتا ہے ان میں ہدایت داخل نہیں ہو سکتی اور ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ" (النساء) جس طرف وہ جانا چاہتے ہیں ہم اُدھر ہی جانے کی توفیق دے دیتے ہیں اور بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہوتا ہے۔ سورۃ بقرہ کی ابتدا میں بھی آتا ہے "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ" اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے۔ اب نہ تو اچھی بات ان کے دلوں میں داخل ہو سکتی ہے اور نہ وہ اسے سُن سکتے ہیں۔ سورۃ نساء میں ہے "بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ" ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور ایسا پہلے دن نہیں ہو جاتا بلکہ نافرمانوں کی مسلسل تکذیب۔ ہٹ دھرمی، بغض اور عناد کی وجہ سے ان کے لیے ہدایت کا دروازہ مستقل طور پر بند کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال اس مقام پر بھی فرمایا کہ اسی طرح ہم تعدی کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى
فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا
اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ
لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾
قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ
لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا
بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ
عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى
اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى
مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ
ع بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ :۔ پھر بھیجا ہم نے ان (گذشتہ انبیاء) کے بعد موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی نشانیاں دے کر پس ان لوگوں نے تکبر کیا اور تھے وہ مجرم ﴿۷۵﴾ پس جب آیا اُن کے

پاس حق ہماری طرف سے تو کہنے لگے یہ تو کھلا جادو ہے (۷۶) کہا
موسیٰ علیہ السلام نے ، کیا تم کہتے ہو حق کو جب کہ تمہارے پاس آ
گیا ہے ، کیا یہ سحر ہے ! حالانکہ نہیں فلاح پاتے ساحر لوگ (۷۷)
کہنے لگے کیا تو آیا ہے ہمارے پاس تاکہ تو ہمیں پھیر دے ان چیزوں
سے جن پر ہم نے پایا ہے اپنے باپ داداوں کو ، اور ہو جائے
تم دونوں کے لیے بڑائی زمین میں اور نہیں ہیں ہم تم دونوں کی
بات پر یقین کرنے والے (۷۸) اور کہا فرعون نے لاؤ میرے پاس
ہر علم دار جادوگر کو (۷۹) پس جب آگئے جادوگر تو کہا موسیٰ (علیہ السلام)
نے اُن کے لیے کہ ڈالو جو کچھ تم ڈالنے والے ہو (۸۰) پس جب
ڈالا انہوں نے تو کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے کہ تم جو چیز لائے ہو یہ
تو جادو ہے بیشک اللہ تعالیٰ عنقریب اس کو باطل کر دیگا . بیشک
اللہ تعالیٰ نہیں درست کرتا فسادیوں کے کام (۸۱) اور ثابت کرتا
ہے اللہ تعالیٰ حق کو اپنے کلمات سے اگرچہ مجرم ناپسند کریں (۸۲)

ربط آیات

اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ مکہ اور مشرکینِ عرب کو سمجھانے کے لیے اور بعد میں آنے والے مشرکوں اور نافرمانوں کی عبرت کے لیے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کی قوم کی مثال بیان فرمائی ، درمیان میں اجمالی طور پر دیگر انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا اور پھر فرمایا کہ دیکھ لو ڈرائے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہوا ۔ اِن تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کی معرفت بُرے انجام سے ڈرایا تھا مگر وہ لوگ غرور و تکبر میں مبتلا ہوئے اور انبیاء علیہم السلام کو برداشت نہ کیا مگر اللہ کے نبیوں نے اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے تبلیغی مشن کو جاری رکھا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے منکرین کو مختلف قسم کی سزاؤں میں مبتلا کر کے صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیا ۔

موسیٰ علیہ السلام کی بعثت

پہلے انبیاء میں سے حضرت صالح علیہ السلام ، ہود علیہ السلام ، شعیب علیہ السلام

ابراہیم علیہ السلام اور بعض دیگر اولو العزم انبیاء کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوسَىٰ وَهَارُونَ پھر بھیجا ہم نے ان سابقہ انبیاء کے بعد حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو۔ یہ دونوں اللہ کے جلیل القدر نبی تھے۔ موسیٰ علیہ السلام اگرچہ عمر میں چھوٹے تھے مگر زیادہ شان والے تھے۔ ہارون علیہ السلام آپ کے بڑے بھائی تھے۔ اللہ نے ان کو بھی نبوت عطا فرمائی اور آپ کی دعا سے انہیں موسیٰ علیہ السلام کا معاون بنایا۔ پھر اللہ نے ان دونوں کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا فرمایا پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهٖ بِاٰيٰتِنَا فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی نشانیاں دے کر۔ دونوں انبیاء کی یہ بعثت بنی اسرائیل اور قبطیوں پر مشتمل پوری امت کی طرف تھی۔ آپ کی اپنی قوم بنی اسرائیل کے لوگ تو آپ کو نبی تسلیم کر چکے تھے، یہ بعثت خاص طور پر فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرف تھی۔ یہ لوگ بڑے سرکش، متکبر، جابر اور مکذب تھے اس بات کو اللہ نے سورۃ طٰہٰ میں یوں فرمایا ہے اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى تم دونوں بھائی ہماری نشانیاں لے کر فرعون کی طرف جاؤ، کیونکہ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ اس کو جا کر سمجھاؤ اور اس کے حواریوں کو بھی جو اس کے ہم نشین ہیں، اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور اس کی سکیموں میں اس کے ساتھ موافقت کرتے ہیں

قوم کا تکبر

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو نشانیاں دے کر بھیجا تھا ان کا ذکر سورۃ اعراف اور بعض دوسری سورتوں میں موجود ہے۔ ان میں سے دو معجزات یعنی عصا اور ید بیضا نمایاں تھے۔ جب دونوں بھائی فرعون کے دربار میں پہنچے اور اللہ کا پیغام پہنچایا فَاسْتَكْبَرُوْا

تو ان لوگوں نے تکبر کیا، اکڑ دکھائی وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ
وہ سب مجرم اور گنہگار قوم تھی۔ نہ تو فرعون نے انبیاء کی بات کو تسلیم کیا
اور نہ ہی اس کے سربرآوردہ لوگوں نے۔ اُن میں سے صرف ایک
آدمی ایمان لایا جس کا ذکر سورۃ مومن میں موجود ہے۔ وَقَالَ رَجُلٌ
مُّؤْمِنٌ مِّنْ [illegible] فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ اُن میں سے ایک
آدمی نے کہا جو [illegible] نے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا کہ کیا تم ایسے آدمی کو
قتل کرتے ہو [illegible] تا ہے کہ میرا رب اللہ ہے! بہرحال ایک آدمی کے
سوا فرعون کی [illegible] قوم نے تکبر کیا مکے کے لوگ بھی ایسے ہی تھے جو حضور
علیہ السلام کی [illegible] بے ایمانی کے جواب میں اکڑ دکھانے تھے۔ ولید ابن
مغیرہ، ابو جہل [illegible] سے سرکردہ مشرکین مکہ، طائف کے متکبرین بھی ایسے
ہی [illegible] جرائم پیشہ لوگ تھے۔ سورۃ النمل میں اللہ نے فرمایا
[illegible] وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَ
عُلُوًّا ان [illegible] دل تو یقین کرتے کہ ایسی نشانیاں کوئی عام انسان ظاہر
نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ خدا تعالیٰ کی جانب سے ہی ہیں مگر انہوں نے ظلم اور
اکڑ کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا۔ انہوں نے الٹا موسیٰ علیہ السلام کو طعن کیا
قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ
عُمُرِكَ سِنِينَ (الشعراء) تو ہمارے ہاں بچہ تھا، ہم نے تیری پرورش
کی اور تو ہمارے درمیان کئی سال تک رہا۔ پھر تم نے ہمارے ایک آدمی
کو قتل کر دیا اور بھاگ گئے۔ اب تم نبوت کا دعویٰ کر کے ہمیں نصیحت
کرنے آئے ہو۔ فرعون اپنے حواریوں کے سامنے کہتا تھا کہ اس داعیٔ
نبوت کی زبان میں تو بس لکنت ہے۔ آپ کے لیے مہین یعنی
حقیر کا لفظ استعمال کیا (العیاذ باللہ) یہ سب اکڑ اور غرور کا نتیجہ تھا اور باقی
سب لوگ فرعون کی ہاں میں ہاں ملانے والے تھے وَكَانُوا قَوْمًا

مُجْرِمِیْنَ ساری کی ساری قوم مجرم تھی۔ اسی طرح قوم عاد کے متعلق فرمایا کہ ساری قوم ظالم تھی۔ نوح علیہ السلام کے واقعہ میں قوم کے لیے عمین کا لفظ فرمایا کہ ساری قوم اندھی تھی۔ اور یہاں موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے متعلق فرمایا کہ سب مجرم تھے۔ ان میں انصاف پسند آدمی کوئی نہیں تھا سوائے ایک کے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

حق کا انکار

فرمایا فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا جب اُن کے پاس ہماری طرف سے سچی بات آگئی، اللہ کی توحید کا پیغام آیا، خدا کی عبادت کا پروگرام آیا۔ قیامت کی فکر آئی اور نبی کی نبوت آگئی۔ حق بات وہ ہوتی ہے جو دلائل سے ثابت ہو۔ تو جب۔ اللہ کا نبی یہ سچی باتیں لے کر آگیا تو کہنے لگے قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ یہ تو کھلا جادو ہے حالانکہ اس میں جادو والی کوئی بات نہ تھی بلکہ یہ تو اللہ کا سچا پیغام تھا۔ اس طرح فرعون اور اس کے درباریوں نے حقیقت کو جادو سے تعبیر کر دیا۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا قَالَ مُوْسٰٓی اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ کیا تم حق بات کو جادو کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے پاس آگئی ہے؟ تمہیں کچھ تو حیا کرنی چاہیئے اَسِحْرٌ هٰذَا کیا یہ جادو ہے؟ انبیاء علیہم السلام اور جادوگروں میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انبیاء کے چہروں سے ان کے پاکیزہ اخلاق و اطوار ان کا تقویٰ اور طہارت، ان کی چال ڈھال کی شائستگی سب واضح ہوتے ہیں جب کہ ساحر لوگ خود غرض ہوتے ہیں۔ وہ تو جادو کو ذریعہ معاش بناتے ہیں اور اس کے ذریعے کمائی کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک نبی کا یہ واضح اعلان ہوتا ہے" وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" (الشعراء) میں تم سے کوئی فیس یا اجرت طلب نہیں کرتا بلکہ میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

جب فرعون نے جادوگروں کو اکٹھا کیا تھا تو انہوں نے سب سے پہلے یہی شرطے کی تھی کہ اگر ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے تو ہمیں انعام کیا ملے گا؟ فرعون نے کہا کہ انعام کی کیا بات ہے، میں تمہیں اپنا مقرب بنا لوں گا، تمہیں دربار میں کرسی مل جائیگی، اس سے بڑا انعام کیا ہو سکتا ہے غرضیکہ فرعون اور اس کے حواریوں نے اللہ کے نبیوں کی دعوت کو جادو کہہ کر ٹھکرا دیا۔

جادوگری خباثتیں

جادو ایک ایسی چیز ہے جس میں انسان اکثر ناپاک رہتا ہے بعض اوقات جادوگر کو غسلِ جنابت بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کوئی قبروں سے ہڈیاں اکٹھی کرتا ہے، کوئی زندہ آدمی کو قتل کرنے کے درپے ہوتا ہے کوئی کسی نابالغ بچے کے خون سے ہاتھ رنگتا ہے اور کوئی کسی کے بال حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور پھر یہ کہ جادو کے لیے جو کلام پڑھا جاتا ہے، وہ شرک پر مشتمل ہوتا ہے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ جادو کا ادنیٰ سے ادنیٰ عمل بھی بدعت سے خالی نہیں ہوتا۔ جادو میں غیر اللہ سے استمداد، شرکیہ کلام، فاسد عقیدہ، گندے اور خسیس اعمال کا سہارا لینا پڑتا ہے، اچھے اعمال کی توفیق ہی نہیں ملتی، اسی لیے سحر کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ سورۃ بقرہ میں یہودیوں کی مذمت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال کر سحر سیکھنا شروع کر دیا۔ یہ سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا ذکر ہے جب جنات لوگوں کو جادو کا علم سکھاتے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ جس نے جادو کا علم حاصل کیا، اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں مگر اس کے باوجود اس قبیح علم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

ترمذی شریف کی روایت[1] میں ہے کہ جو شخص جادو کے ذریعے لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کے متعلق فرمایا، حَدُّ السَّاحِرِ

[1] ترمذی صد ۲۳۰

ضَرْبَۃٌ بِالسَّیْفِ یعنی ایسے جادوگر کی سزا سزائے موت ہے وہ کسی رحم کے قابل نہیں۔ ایسا آدمی تمدن کو بگاڑتا ہے۔ لہٰذا واجب التعزیر ہے حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ تمدن کو بگاڑنے والی چیزوں میں جادو بھی شامل ہے۔ جادوگر خفیہ عمل کے ذریعے لوگوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں، جس طرح اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کرنے والے تھوڑے نفع کی خاطر تمدن کے قاتل ہوتے ہیں اسی طرح جادوگر بھی تمدن انسانی کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔

جادوگروں کی ناکامی

فرمایا، یاد رکھو! وَلَا يُفْلِحُ السَّحِرُونَ ساحر لوگ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مولانا تھانوی نے یہ اشکال پیش کیا ہے کہ بعض اوقات جادوگر اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر اس آیت میں اس بات کی بالکل نفی کی گئی ہے۔ پھر آپ اس کا جواب بھی دیتے ہیں کہ یہاں جس کامیابی کی نفی کی گئی ہے وہ نبی کے ساتھ مقابلے کی صورت کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جادوگر جب بھی اللہ کے نبی کے مقابلے میں جادو جگانا چاہیگا، وہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ جادو ایک فن ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی ہے تو اس کے ذریعے بعض اوقات نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ مگر جب یہی جادو نبی کے معجزے کے مقابلہ میں آئے گا تو ناکام ہو جائے گا۔ اس مقام پر ناکامی کا یہی مطلب ہے۔

حصول اقتدار کا طعن

اہل باطل کا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا ہے کہ جب بھی اللہ کے کسی نبی نے انہیں حق کی طرف دعوت دی تو انہوں نے اس پر حصول اقتدار کا جھوٹا الزام لگایا۔ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کو طعن دیا گیا کہ تم یہ وعظ و نصیحت اس لیے کرتے ہو کہ لوگ تم سے متاثر ہو کر تمہاری سیادت کو تسلیم کر لیں یہاں بھی ایسا ہی ذکر آ رہا ہے۔ جب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے جادو اور معجزے میں فرق کو بیان فرمایا تو فرعون اور اس کی قوم کے لوگ

کہنے لگے قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا
اے موسیٰ علیہ السلام، کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس چیز سے
پھیر دے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ ہم تیری ایسی کسی بات کو
ماننے کے لیے تیار نہیں جس کی وجہ سے ہمیں اپنے آباؤ اجداد کا دین ترک
کرنا پڑے کہنے لگے تم دونوں بھائیوں کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے وَتَكُوْنَ
لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ کہ تم دونوں کو زمین میں بڑائی حاصل
ہو جائے، تم ملک و قوم میں اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہو اور ہمیں اقتدار
سے ہٹانا چاہتے ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اقتدار اور جاہ تو نیک و بد
سب کو حاصل ہو جاتا ہے مگر انبیاء کا غرض محض اقتدار حاصل کرنا نہیں ہوتا
بلکہ ان کا مقصد بندے کا تعلق اللہ سے جوڑنا ہے۔ اور وہ ساری تگ
و دو اسی مقصد کے حصول کے لیے کرتے ہیں۔

غرضیکہ قوم فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو دو وجوہات
کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ پہلی وجہ یہ کہ تو ہمیں ہمارے بڑوں کی رسوم اور ان کے
عقیدے سے ہٹانا چاہتا ہے اور دوسری یہ کہ تو ہم میں بڑائی حاصل کرنا چاہتا
ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کا مشن محض حق کی تبلیغ ہوتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ اسلام کی دعوت دو دھاری ہے
اگر منکرین اسلام قبول کر لیں تو ہماری لڑائی ختم ہو گئی، یہ ہمارے بھائی بن گئے
مگر موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی دعوت کو فرعون اور اس کی قوم نے قبول
نہ کیا اور کہا وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ کہ ہم تمہاری باتوں پر
یقین کرنے والے نہیں۔ ایمان کا لفظی معنی یقین ہی ہوتا ہے اور یہاں یہی
معنیٰ مراد ہے کہ فرعون اور اس کی قوم نے کہا کہ ہمیں تمہاری باتوں پر یقین
نہیں آتا۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور تم خدا تعالےٰ
کے فرستادہ نبی ہو، تم ہمیں قیامت اور جزائے عمل کی بات بتاتے

ہو مگر ہم تمہاری کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

آباؤ اجداد کی تقلید

آباؤ اجداد کی تقلید دینِ حق کے راستے میں ہمیشہ سے رکاوٹ رہی ہے جب بھی اللہ کے نبیوں نے لوگوں کو توحید کی طرف بلایا تو انہوں نے آباؤ اجداد کے قائم کردہ رسم و رواج اور باطل عقائد کا سہارا لیا قرآنِ پاک نے مکذبین کی اس روش کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ خود حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہؓ کو صابی کا لقب دیا گیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ ہمیں آباؤ اجداد کے پُرانے دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ مشرک لوگ باپ دادا کے دین پر قائم رہنے پر مصر ہیں "اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ" (البقرۃ) اگرچہ ان کے باپ دادا بے عقل اور غیر ہدایت یافتہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں اگر آباؤ اجداد راہِ راست پر ہوں تو ان کا اتباع کرنا کمال درجے کی بات ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا کہ میں باطل پرستوں کا اتباع چھوڑ کر "وَاتَّبَعْتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ" (یوسف) میں نے اپنے آباؤ اجداد ابراہیم علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی ملت کا اتباع کر لیا ہے اور انہی کے طریقے پر چل رہا ہوں، اور یہ قابلِ فخر بات ہے مگر کفر، شرک، بدعات اور باطل رسوم پر چلنا تو بے عقلی کی بات ہے اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو لوگ اپنی نسبت کفر و شرک اور باطل رسوم پر مرنے والے آباؤ اجداد کی طرف کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، وہ لوگ اللہ کے نزدیک اس کیڑے سے زیادہ ذلیل ہیں جو گندگی کی گولیاں بنا بنا کر اپنے منہ اور ناک سے کھاتا رہتا ہے۔

جادوگروں کا اجتماع

بہرحال فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا انکار کر دیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی حکم دیا "وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِیْ بِکُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ" میرے پاس بڑے بڑے جادوگر لے کر آؤ۔ اس زمانے میں جادوگروں

بہت قدر و منزلت تھی۔ ان میں سے بعض کو فرعونی حکومت کی طرف سے وظائف ملتے تھے اور یہ لوگ امور مملکت میں اسی طرح دخیل تھے جس طرح آجکل حکومت کے مشیروں میں ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، ماہرین معاشیات اور قانون دان شامل ہیں۔ اس زمانے میں حکومت کے منصوبے بیکٹو کریٹ بناتے ہیں جب کہ فرعون کے زمانے میں یہ کام ساحروں کاہنوں، اور نجومیوں کے سپرد تھا۔ بہرحال فرعون نے تمام چیدہ چیدہ ساحروں کو جمع کرنے کا حکم دیا تاکہ موسیٰ علیہ السلام کے خلاف منصوبہ بندی کی جاسکے مفسر قرآن امام بغویؒ کے مطابق ایسے جادوگروں کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ جب جادوگر آ گئے۔ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ تو موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ جو کچھ تم ڈالنا چاہتے ہو، ڈال دو۔ مطلب یہ تھا کہ تم جو بھی اپنا کرتب دکھانا چاہتے ہو، دکھاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کا مکالمہ اللہ نے مختلف سورتوں میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ اُن سے مقابلہ شروع کرنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے تقریر فرمائی کہ دیکھو! تم دُنیا کی خاطر حق وصداقت کے مقابلے پر آ گئے ہو، یاد رکھو! خدا کے ہاں تمہاری اس حرکت کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر اب بھی تم اپنی حرکت سے باز نہیں آتے تو لاؤ پھر اپنا کرتب دکھاؤ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے سب سامنے ظاہر کرو۔ بہرحال انہوں نے اپنے فن کا اظہار کر دیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کے کرتب کو دیکھا تو فرمایا فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ کہ جو چیز تم لائے ہو۔ یہ تو جادو ہے۔ یہ جو سانپ نظر آ رہے ہیں۔ یہ سانپ نہیں بلکہ رسیاں ہیں۔ اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ بیشک عنقریب

اللہ تعالیٰ اس کو باطل کر دیگا یعنی مٹا دیگا کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ بیشک اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کے کام کو نہیں سنوارا کرتا تمہارا مقصد فرعون کی مدد اور باطل کی تائید ہے مگر یہ چیز حق کے مقابلہ میں نہیں چل سکتی۔ کفر، شرک، استبداد اور ظلم سے بڑھ کر کونسا فساد ہو سکتا ہے تم ان قبیح حرکات کے مرتکب ہو رہے ہو، لہٰذا تم فسادی ہو اور اللہ تعالیٰ فسادیوں کے کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچاتا۔

حق کا بول بالا

فرمایا وَیُحِقُّ اللّٰہُ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ اللہ تعالیٰ حق کو اپنے کلام سے ثابت کرتا ہے وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ اگرچہ مجرم لوگ اس کو ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔ خدا تعالیٰ کا یہ دستور اور طریقہ ہے کہ وہ حق کی حمایت کرتا ہے اور باطل کو مٹا دیتا ہے۔ خصوصاً جب انبیاء کے مقابلے میں باطل کو پیش کیا جائے تو اللہ تعالیٰ یقیناً اس کو مٹا دیتا ہے اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فسادیوں کے عمل کو کبھی نہیں سنوارے گا۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ
مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ
لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَقَالَ
مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا
اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا
لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ
مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ
اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ
قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ :- پس نہیں ایمان لائے موسیٰ (علیہ السلام) پر مگر کچھ نوجوان
ان کی قوم سے ڈرتے ہوئے فرعون سے اور اُن کے سرداروں
سے کہ کہیں وہ اُن کو فتنے میں مبتلا نہ کر دے ۔ اور بیشک فرعون
البتہ مغرور تھا زمین میں ۔ اور بیشک وہ حد سے بڑھنے والا تھا ﴿۸۳﴾
اور کہا موسیٰ علیہ السلام نے اے میری قوم کے لوگو ! اگر تم ایمان
رکھتے ہو اللہ پر ۔ پس اسی کی ذات پر بھروسہ کرو ، اگر تم فرمانبرداری
کرنے والے ہو ﴿۸۴﴾ تو کہا انہوں نے ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا
ہے ۔ اے ہمارے پروردگار ! نہ بنا ہم کو آزمائش ظالم قوم کیلئے ﴿۸۵﴾

اور نجات دی ... اپنی رحمت کے ساتھ کافر قوم سے (۸۶) اور
ہم نے وحی بھیجی ... السلام اور اُن کے بھائی کی طرف کہ مقرر
کرو اپنی قوم کے لیے مصر کے اندر گھر، اور بناؤ اپنے گھروں
میں قبلہ اور قائم کرو نماز، اور خوشخبری دو ایمان والوں کو (۸۷)

ربطِ آیات — سرکش لوگوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا حال بیان کیا۔ پھر موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور ان کے مخالفین اور متکبرین فرعون اور اسکی قوم کا ذکر کیا۔ دراصل یہ مشرکین عرب اور اُن کے بعد آنے والوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اگر وہ بھی سابقہ اقوام کی طرح غرور اور تکبر کو اختیار کریں گے اور حق کے خلاف بغاوت کریں گے تو اُن کا انجام بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے مختلف نہیں ہوگا۔ فرعون کا واقعہ مختصراً پہلے بیان ہو چکا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے خدا تعالیٰ کا پیغام پیش کیا تو اُس نے اور اس کے ساتھیوں نے اسے سحر کہہ کر رد کر دیا۔ اور کہنے لگے کہ تم ہمیں ہمارے آباؤ اجداد کے طریقے سے ہٹانا چاہتے ہو اور ہم سے ہمارا دین چھڑانا چاہتے ہو —————— اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہم اپنے جادوگروں کو تمہارے مقابلے کے لیے لے آئیں گے۔ چنانچہ بڑے بڑے جادوگروں کو اکٹھا کر لیا گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اپنا کرتب پیش کرنے کی دعوت دی۔ جب انہوں نے اپنا کرتب دکھایا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو جادو ہے اور اللہ تعالیٰ جادو کو ضرور باطل کر دیگا اور یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ فسادیوں کے کام کو کبھی نہیں سنوارتا اور حق کو اپنے حکم سے ثابت کرتا ہے اگرچہ مجرم لوگ کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کریں۔

چند اہلِ ایمان افراد — اب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کی کچھ کیفیت بیان فرمائی ہے۔ جس سے فرعون اور اس کی قوم کے مظالم کا نقشہ بھی کسی حد تک سامنے آتا ہے ارشاد ہوتا ہے فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اور نہ ایمان لائے موسیٰ علیہ السلام پر اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ مگر آپ کی قوم کے کچھ نوجوان۔ ذریت کا معنی ...

خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ سورۃ آل عمران میں حضرت مریمؑ کے واقعہ میں آتا ہے "ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ" یعنی اولاد کے بعض افراد بعض سے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں ذریت کے لفظ کو مفسرین کرام نے دو مختلف معانی پر محمول کیا ہے۔ اور اس کا ایک معنیٰ افراد کی قلیل تعداد ہے۔ جب قَوْمِهٖ کی ضمیر فرعون کی طرف لوٹائی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ قوم فرعون کے تھوڑے سے افراد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے جن کا ذکر قرآن و احادیث میں ملتا ہے۔ ان میں فرعون کی بیوی آسیہ، فرعون کا ایک خزانچی، فرعون کی بیٹی کو کنگھی وغیرہ کرنے والی خادمہ کا خاندان، اور آل فرعون کا ایک مومن شامل ہیں۔ فرعون کی بیوی آسیہ کا ذکر سورۃ تحریم میں موجود ہے۔ اُس نے بڑی تکالیف برداشت کیں اور بالآخر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اُسے قوم فرعون کے ظالموں سے نجات دے۔ اسی طرح فرعون کی بیٹی کی خادمہ کے خاندان کو بھی فرعون نے بڑی سخت سزا دی۔ تانبے سے بنے ہوئے گھوڑے کے مجسمہ میں آگ جلا کر پورے خاندان کو اس میں جھونک دیا اور جلا ڈالا۔ آل فرعون کے ایک مومن کا ذکر سورۃ مومن میں موجود ہے۔ بلکہ سورۃ کا نام مومن اسی مومن کے نام پر ہے۔ پہلے وہ شخص اپنے ایمان کو ظاہر نہیں کرتا تھا مگر کسی موقع پر اُس نے اپنے ایمان کا اظہار کیا تو سخت آزمائش میں مبتلا ہوگیا۔ بہرحال ذریت سے مراد یہی تھوڑے سے لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔

چند بنی اسرائیلی نوجوان

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ قَوْمِهٖ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے اور ذریت سے مراد نوجوان ہیں اور اس طرح مطلب یہ ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام پر اُن کی قوم کے چند نوجوان ہی ایمان لائے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی تعداد تو چھ لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی جب انہوں نے بحر قلزم کو عبور کیا مگر یہاں صرف چند نوجوانوں کے ایمان کا ذکر آیا ہے۔ بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنی کثیر تعداد کے باوجود فرعون کے مظالم سے سہمے ہوئے تھے

وہ اگرچہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے مگر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ کہیں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ فرعون قوم بنی اسرائیل کے خلاف ابتدا ہی سے تھا۔ [۹] اسے نجومیوں نے بتا دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو تیری سلطنت کے زوال کا باعث بنے گا۔ لہٰذا اس نے بنی اسرائیل کے نومولود بچوں کے قتل کا حکم دے دیا اور اسی طرح وہ نوے ہزار بچوں کے قتل کا مرتکب ہوا۔ چنانچہ بنی اسرائیل فرعون کی طرف سے سخت سزا کے خوف سے اپنے ایمان کا اظہار نہ کرتے تھے حالانکہ اُن میں یہ تصور پایا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی شخصیت کو بھیجے گا جو انہیں فرعون کے ظلم سے نجات دلائے گا۔

تاہم وہ چند لوگ ہی تھے جنہوں نے اپنے ایمان کا برملا اظہار کیا اور پھر سخت ترین تکالیف برداشت کیں حتیٰ کہ فرعون کی بیوی نے جام شہادت نوش کیا۔ اس لیے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے مگر اُس کی قوم کے چند نوجوان۔

فرعون کے مظالم

اور اس کی وجہ یہ تھی عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ انہیں فرعون اور اس کے سرداروں کے مظالم کا خوف تھا اس لیے وہ کھل کر اپنے ایمان کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ تھے اَنْ يَّفْتِنَهُمْ کہیں وہ انہیں کسی فتنہ میں مبتلا نہ کر دے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ کہ فرعون زمین پر مغرور تھا، لہٰذا وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ اور بیشک وہ حد سے بڑھنے والا تھا۔ فرعون کی سرکشی، اُس کی من مانی کاروائی اور بنی اسرائیل کو ایذا رسانی سب کے سامنے تھی، لہٰذا وہ اس ڈر سے ایمان کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ کہیں فرعون کے مظالم کا شکار نہ ہو جائیں۔

چند نوجوانوں کے ایمان لانے میں اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے

کہ نوجوانوں میں نیا خون، نیا ولولہ اور نیا جوش ہوتا ہے اس لیے کسی انقلابی اقدام کی توقع انہی سے کی جاسکتی ہے۔ اس کے برخلاف عمر رسیدہ لوگ مصلحت کوش ہوتے ہیں۔ کم و بیش چالیس سال میں بن جانے والی ذہنیت کو بدلنا نہایت مشکل ہوتا ہے، لہٰذا بوڑھے لوگوں میں سے شاذ و نادر ہی ایسے ہوتے ہیں جو اپنی پرانی ڈگر کو ترک کرسکیں۔ چنانچہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں میں نوجوان طبقہ ہی پیش پیش تھا جب کہ بوڑھے آدمیوں کی تعداد نہایت قلیل تھی۔

فرعون اور اس کے حواریوں کے مظالم کے پیش نظر وَقَالَ مُوسٰی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ اے میری قوم کے لوگو! اگر تم حقیقت میں اللہ پر ایمان لائے ہو فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا تو پھر بھروسہ بھی اسی پر کرو اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ اگر تم فرمانبرداری کرنے والے ہو۔ ظاہری اسباب کو اختیار کرنا بھی ضروری ہے مگر ان اسباب کو ہی اول و آخر نہیں سمجھ لینا چاہیے بلکہ اسباب کو بروئے کار لاتے ہوئے بھروسہ اللہ پر ہی کرنا چاہیے کیونکہ اسباب کا پیدا کرنے والا اور ہر چیز کا متصرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اگر وہ چاہے تو بے سروسامانی کی حالت میں بھی ایسے اسباب پیدا فرمادے گا جس سے تمہیں کامیابی نصیب ہو جائیگی اور وہ اس چیز پر بھی قادر ہے کہ تمام اسباب کی موجودگی میں بھی کسی چیز کو ناکام بنادے، لہٰذا بھروسہ اسی پر ہونا چاہیے۔ تو اس کے جواب میں معدودے چند اہل ایمان نے کہا فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا تو کہا انہوں نے ہم اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ اور ساتھ اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا بھی کی رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم قوم کے لیے آزمائش نہ بنا کہ ہم ہر وقت ان کے تختہ مشق بنے رہیں۔

اہل ایمان کی آزمائش

فرعون جیسے ظالم لوگ ہمیشہ کمزوروں پر دست درازی کرتے رہتے ہیں اور دین میں اختلاف رکھنے والے تو خاص طور پر ان کے مظالم کا نشانہ بنتے ہیں۔ قریش مکہ نے بھی غریب مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ اہل ایمان اور خود حضور علیہ السلام کو سخت اذیت پہنچاتے تھے حتیٰ کہ جب ابوجہل جہنم واصل ہوا تو حضور علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں سجدہ شکر بجا لائے اور فرمایا، آج اس امت کا فرعون ہلاک ہو گیا ہے۔ تو بنی اسرائیل نے اللہ کے حضور دعا کی کہ مولا کریم! ہمیں ظالم قوم کا تختہ مشق نہ بنا وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ اور اپنی خاص رحمت سے ہمیں کافر قوم سے نجات دے۔

کافر ہمیشہ سے اہل ایمان پر ظلم و ستم کرتے آئے ہیں۔ ہماری امت کے مسلمانوں کا بھی آجکل یہی حال ہے ساری دنیا کے مسلمان کافر قوموں کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں کہیں امریکہ ظلم ڈھا رہا ہے، کہیں روس اور کہیں دوسرے اغیار۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرتے ہیں مگر کوئی کسی کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور یہ آزمائش اس لیے آئی ہوئی ہے کہ مسلمان قوم اپنے مرکز سے ہٹ چکی ہے۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کے قتل اور لوٹ مار کی داستانیں سنی جاتی ہیں۔ فلسطین ہو یا لبنان، قبرص ہو یا افریقہ۔ فلپائن ہو یا افغانستان ہر جگہ مسلمان ہی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ لہٰذا اہل ایمان کو نہایت خلوص کے ساتھ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کرنی چاہیئے کہ وہ انہیں کفار کے مظالم کی آزمائش میں نہ ڈالے۔

ہندوستان کے ہندوؤں کی تنگ نظری بھی آپ کے سامنے ہے تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں چھبیس ہزار سے زیادہ ہندو مسلم فساد برپا کیے جا چکے ہیں۔ جن میں لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ یہ سب کچھ ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے خلاف ہو رہا ہے

جہاں بھی کسی کافر یا مشرک کو موقع ملتا ہے وہ مسلمانوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہرحال اس زمانہ میں دنیا کے تمام خطوں میں مسلمان کڑی آزمائش میں مبتلا ہیں۔ صرف افغانستان میں تین لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں مگر کوئی پرسانِ حال نہیں۔

قوم موسیٰ کو علیحدگی کا حکم

بنی اسرائیل کے ساتھ بھی یہی سلوک ہو رہا تھا جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ ہمیں ظالموں کا تختۂ مشق نہ بنا اور اپنی خاص رحمت سے ان ظالموں سے نجات دے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا کہ اپنی قوم کے لیے مصر کے اندر گھر مقرر کرو۔ شاہ عبدالقادرؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ جب فرعون کے مظالم بہت بڑھ گئے تو بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھر قبطی قوم سے علیحدہ کر لیں۔ فرعونی قوم میں خلط ملط ہونے کی بجائے اپنی علیحدہ بستیاں آباد کریں اور وہاں سارے بنی اسرائیلی مل جل کر رہیں تاکہ فرعون کے مظالم سے کسی حد تک محفوظ رہ سکیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ فرعونی قوم تو کسی کا زبانی ایمان لانا بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ چہ جائیکہ اہلِ ایمان اپنے عبادت خانے تعمیر کر کے ان کے اندر نماز ادا کرتے اس زمانے میں عبادت صرف عبادت کے لیے مخصوص مقامات پر ہی ادا ہو سکتی تھی، لہٰذا بنی اسرائیل کی قوم فرعون سے علیحدگی کی ایک وجہ یہ بھی کہ وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کے لیے مناسب جگہ بھی مخصوص کر سکیں۔

گھروں میں نماز کا حکم

فرمایا مصر میں اپنے ٹھکانے بناؤ وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً اور اپنے گھروں کے اندر ہی قبلہ بناؤ۔ بعض فرماتے ہیں کہ اپنے گھروں میں ہی مسجدیں بناؤ جن کا رُخ قبلہ کی طرف ہو۔ اور پھر وہاں چھپ کر

نمازیں ادا کرو۔ تاکہ فرعونیوں کو تمہارے ایمان کا پتہ نہ چل سکے۔ بہر حال اگر نماز کے لیے گھر میں بھی کوئی جگہ مخصوص کر لی جائے تو اس کا قبلہ رُخ ہونا ضروری ہے تاکہ نماز ادا کرنے میں دقت نہ ہو اور پھر ایسی جگہ کو پاک صاف رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ یہ جگہ مسجد ہی کے حکم میں آتی ہے۔ ہماری امت کے لیے بھی حضور علیہ السلام کا فرمان ابوداؤد شریف میں موجود ہے کہ گھر میں جس جگہ کو نماز کے لیے مخصوص کرو اس کو پاک صاف رکھا کرو۔ سورۃ نور میں خدا تعالیٰ کا حکم بھی موجود ہے "فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَ یُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ" ایسے ہی گھروں کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ اُن کو بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے، وہاں کوئی کوڑا کرکٹ یا ظاہری گرد و غبار نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی باطنی گندگی یعنی کفر، شرک، بدعات اور شعر و شاعری ہونی چاہیے۔

مسجد کے آداب

ہمارے ملک میں مساجد کے آداب کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھا جا رہا۔ اللہ کی مسجدوں میں شرکیہ باتیں ہوتی ہیں۔ بدعات کو رواج دیا جاتا ہے شعر شاعری اور شور و شر برپا کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ لوگ مساجد میں شور برپا کریں گے اب تو لاؤڈ سپیکر ایک مصیبت بن کر آ گیا ہے۔ اس کے فائدے سے اس کا نقصان زیادہ ہے۔ مسجد میں کوئی سننے والا موجود ہو یا نہ ہو، سپیکر چل رہا ہے اور سارے محلے میں خلفشار برپا ہے۔ نہ کوئی سکون کے ساتھ نماز ادا کر سکتا ہے، نہ تلاوت کر سکتا ہے، بیمار کو آرام میسر نہیں، طالب علم اپنی تیاری سے محروم ہے۔ کبھی صلوٰۃ و سلام ہو رہا ہے، کبھی تلاوت ہو رہی ہے، کبھی سپیکر پر بچوں کی درس و تدریس ہو رہی ہے، نعت خوانی اور غزل گوئی چل رہی ہے، یہ سب زیادتی اور غلط طریقہ ہے۔ اگر لاؤڈ سپیکر کا استعمال واقعی ضروری ہے تو پھر اسے سامعین تک محدود رکھو، ساری

دنیا کو کیوں پریشان کرتے ہو۔ اگر مسجد میں کچھ لوگ بیٹھے ہیں اور وعظ و تبلیغ کے لیے سپیکر کی واقعی ضرورت ہے تو پھر اُسے مسجد تک محدود رکھو۔ باقی لوگوں کو پریشان کرنا کہاں کا انصاف ہے اور کونسا دین ہے ؟ اس قباحت میں کوئی ایک گروہ نہیں بلکہ سارے کے سارے فرقے شامل ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھ کر شور کرنے میں مصروف ہیں۔

نماز کی تلقین

الغرض! فرمایا، اپنے گھروں کے اندر ہی مسجدیں بناؤ اور ان کا رُخ قبلہ کی طرف رکھو وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ اور پھر ان میں نماز بھی ادا کرو کیونکہ نماز کسی حالت میں بھی ترک نہیں کی جا سکتی۔ نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمہاری مشکلات کو آسان فرمائے گا اور تمہارا تعلق بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست رہے گا، لہٰذا نماز پڑھا کرو۔ اور اس کے صلے کے طور ارشاد ہُوا وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ایمان والوں کو خوشخبری سُنا دو کہ خواہ ان پر کتنے بھی مصائب آئیں، بالآخر اللہ تعالیٰ انہیں ابدی راحتوں سے نوازے گا اور انہیں ابدی کامیابی نصیب ہو گی۔

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَآ إِنَّكَ ءَاتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُۥ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا۟ عَن سَبِيلِكَ ۖ رَبَّنَا ٱطْمِسْ عَلَىٰٓ أَمْوَالِهِمْ وَٱشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا۟ حَتَّىٰ يَرَوُا۟ ٱلْعَذَابَ ٱلْأَلِيمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا فَٱسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِيلَ ٱلَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۸۹﴾

ترجمہ :- اور کہا موسیٰ علیہ السلام نے ، اے ہمارے پروردگار ! بیشک تو نے دی ہے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو زینت اور مال دنیا کی زندگی میں ۔ اے ہمارے پروردگار ! تاکہ وہ گمراہ کریں تیرے راستے سے ۔ اے ہمارے پروردگار ! مٹا دے ان کے مالوں کو اور سخت کر دے ان کے دلوں کو ۔ پس نہ ایمان لائیں یہاں تک کہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو ﴿۸۸﴾ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) تحقیق قبول کر لی گئی ہے تم دونوں کی دعا ۔ پس تم دونوں سیدھے رہو اور نہ پیروی کرنا تم ان لوگوں کے راستے کی جو نہیں جانتے ﴿۸۹﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں قریش مکہ ، مشرکین عرب اور بعد میں آنے والے کفار و مشرکین کو کفر و شرک سے باز رہنے کی تنبیہ کی گئی اور مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے قوم نوح علیہ السلام کی سرکشی کا ذکر فرمایا ۔ پھر فرعون ، اس کے سرداروں اور قوم کے غرور و تکبر کا ذکر فرمایا ۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا حال بھی بیان کیا ۔ گذشتہ درس میں فرمایا کہ نوجوان طبقہ سے

تعداد ماننے والے بہت تھوڑے افراد تھے جو آپ پر ایمان لائے۔ وہ فرعون کی طرف سے فتنے میں مبتلا ہونے کے خوف سے اپنے ایمان کا برملا اظہار نہیں کرتے تھے۔ تاہم موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تسلی دی کہ اگر تم خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی کی ذات پر بھروسہ رکھو۔ قوم نے جواب میں توکل علی اللہ کا اعادہ کیا اور ساتھ دعا بھی کی کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں ظالم قوم کا تختہ مشق نہ بنا اور ہمیں کافروں کی قوم سے نجات دے۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو وحی کی کہ اپنی قوم کے لوگوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے گھروں کے اندر ہی مسجدیں بنائیں، ان کا رخ قبلہ کی طرف کریں اور نماز کا التزام کریں۔ اب آج کے درس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے اور آخر میں اللہ نے فرعون اور اس کے لشکر کی تباہی کا حال ذکر کیا ہے۔

گمراہی کا سبب زینت اور مال

موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں دعا کی وَقَالَ مُوسٰی رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور کہا موسیٰ نے اے ہمارے پروردگار! بیشک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور مال عطا کیے ہیں۔ زینت کا معنی رونق ہوتا ہے اور اس سے مراد جسمانی صحت، حسن صورت، لباس، خوبصورت گھر اور زندگی کے دیگر لوازمات ہیں۔ مال میں سونے چاندی کے ڈھیر، ہر قسم کے مویشی اور جانور۔ بہترین سواریاں، اناج کے ذخائر وغیرہ شامل ہیں۔ خاص طور پر سونے، چاندی اور جواہرات کی کانیں جو مصر سے لے کر حبشہ تک پھیلی ہوئی تھیں، سب فرعون کے قبضہ میں تھیں اور سلطنت کی آمدنی اس کے علاوہ تھی۔ اسی چیز کے پیش نظر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے مولا! تو نے ہر قسم کے مال و دولت اور زندگی کی تمام آسائشیں اور رونقیں فرعون اور اس کے حواریوں کو عطا کر رکھی ہیں۔ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ

تا کہ وہ لوگوں کو تیرے راستے سے گمراہ کر سکیں. مقصد یہ کہ تیرے عطا کردہ اسباب کو کسی کارِ خیر میں صرف کرنے کی بجائے تیرے ہی راستہ سے گمراہ کرنے پر خرچ کر رہے ہیں گویا تو نے ان لوگوں کو مال و دولت اس لیے بخشی ہے. تا کہ یہ گمراہ کر سکیں. لِيُضِلُّوا میں لام علت کے لیے بھی ہو سکتا ہے یعنی باوجود اس کے کہ یہ لوگ راہ راست سے ہٹے ہوئے ہیں. حق کی مخالفت کرتے ہیں، بڑے ظالم ہیں. اس کے باوجود تو نے انہیں مال و دولت، اور دُنیا کی آسائش کے تمام سامان مہیا کیے ہیں تا کہ یہ لوگوں کو گمراہ کریں.

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ لام علت کے لیے نہیں بلکہ لام عاقبت ہے. اگر ایسا ہے تو مطلب یہ ہو گا کہ اے پروردگار! تو نے ان کو مال و دولت دیا مگر ان کا انجام یہ ہُوا کہ انہوں نے لوگوں کو تیرے راستے سے گمراہ کیا. اس قسم کی مثال سورۃ قصص میں حضرت موسیٰ کے واقعہ میں بھی ملتی ہے. فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو پانی سے نکال لیا. لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا تا کہ ان کے لیے دشمن اور باعث غم ہو جائے. یہاں بھی انجام کو ظاہر کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کا انجام یہ ہُوا کہ وہ فرعون اور اس کی قوم کا دشمن اور اُن کے لیے باعث غم و اندوہ ہو گیا، ورنہ ان کی پرورش کا اصل مقصد جیسا کہ اگلی آیت میں بیان ہوا، یہ تھا عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا کہ ہم اسے بیٹا بنا لیں گے اور یہ ہمیں فائدہ دے دیگا.

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر لِيُضِلُّوا سے پہلے لا محذوف ہے اور یہ اصل میں اس طرح ہے لِأَنْ لَا يُضِلُّوا یعنی اے پروردگار! تو نے ان کو مال و دولت اس لیے تو نہیں دیا تھا کہ یہ دوسرں کو گمراہ کرتے پھریں. اس کی مثال قرآن پاک میں دوسری جگہ بھی ملتی ہے

وہاں الفاظ ہیں یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا اللہ تعالیٰ تمہارے لیے یہ باتیں اس لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو۔ یہاں پر بھی صحیح مفہوم جبھی ادا ہوتا ہے جب اَنْ تَضِلُّوْا کے درمیان لَا محذوف مانا جائے۔

دراصل مال و دولت، جاہ و حشمت اللہ تعالیٰ اس لیے عطا کرتے ہیں تاکہ اس کی نعمت کا شکر ادا کیا جائے، نہ کہ کفرانِ نعمت کیا جائے۔ مال و دولت کو غلط راستے پر استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کی ناشکری کے مترادف ہے۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ "قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ" اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ کس نے حرام کی ہے وہ زینت جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا ہے اور پاکیزہ رزق بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرو۔ یہ زینت اور مال و دولت ______ ______ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ سورۃ نحل میں اللہ نے فرمایا ہے وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِیْنَةً اللہ تعالیٰ نے اونٹ خچر اور گدھے تمہاری سواری کے لیے پیدا کیے ہیں اور یہ چیزیں تمہارے لیے باعثِ زینت بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس گھر میں مال مویشی اور جانور موجود ہوں، وہاں خوب رونق ہوتی ہے یہ اللہ کی نعمت ہے۔ اس سے فائدہ بھی اٹھاؤ اور اس نعمت کا شکریہ بھی ادا کرو۔ یہ بڑے کارآمد جانور ہیں، اللہ نے انہیں زینت سے تعبیر فرمایا ہے۔

جائز اور ناجائز زینت

ہر جائز زینت کو استعمال کرنا اور اس سے مستفید ہونا درست ہے، البتہ مصنوعی، بناوٹی اور غیر طبعی زینت کی ممانعت آئی ہے۔ مگر دنیا میں اکثر زینت اور مال کو ملوک و سلاطین اور صاحبِ اقتدار

لوگوں نے غلط طور پر استعمال کیا ہے۔ بہت قلیل تعداد میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنے وسائل کو جائز طور پر استعمال کیا ہے، مال و دولت کے حقوق ادا کیے ہیں ہزار میں سے ایک آدمی بھی بمشکل ملیگا جو اس معیار پر پورا اترا ہو، وگرنہ اکثریت نے من مانی ہی کی۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار آیا اس نے اپنی مرضی سے قانون چلایا، اپنی مرضی سے عہدے تقسیم کیے، اور اپنی مرضی سے مال خرچ کیا اور اس طرح سیاسی رشوت دینے کا مرتکب ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں مال و جاہ کا عام طور پہ غلط استعمال ہوا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ مومن کے لیے مال ایک بہت اچھا صاحب (ساتھی) ہے بشرطیکہ وہ اس کا حق ادا کرے۔ غرباء و مساکین کا خیال رکھے، رفاہ عامہ کے امور انجام دے اور معصیت، رسوم باطلہ اور بدعات کے کاموں سے پرہیز کرے۔ اگر اس نے مال کے حقوق ادا نہیں کیے تو یہی مال اس کے لیے خسارے کا باعث بنے گا۔

موسیٰ علیہ السلام کی بددعا

الغرض! موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو زینت اور مال و دولت اس لیے تو نہیں بخشا کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرتے پھریں مگر یہ لوگ ان چیزوں کو غلط طور پہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے عرض کیا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ اے ہمارے پروردگار! ان کے مالوں کو مٹا دے طمس کا معنی مٹا دینا، تبدیل کر دینا یا نیست و نابود کر دینا ہے۔ عرض کیا، اے مولا کریم! یہ ایسے بدعم لوگ ہیں کہ ان کی اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہیں رہی۔ لہٰذا ان کے مال و دولت کو اس طرح تبدیل کر دے کہ یہ اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ طمس کا لفظ قوم لوط کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ سورۃ القمر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ ہم نے ان کی آنکھوں

کو مٹا دیا اور وہ اندھے ہو گئے۔ تو یہاں بھی فرمایا کہ اے اللہ! ان کے مالوں کو مٹا دے اور اس کے ساتھ ساتھ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِن کے دلوں کو سخت کر دے فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ کہ جب تک دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں، ایمان ہی نہ لائیں۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ فرعونی جب کوئی معجزہ دیکھتے تو ایمان کا اظہار بھی کر دیتے۔ جب کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کرتے اور ایمان لانے کا وعدہ کرتے مگر جب وہ تکلیف دُور ہو جاتی تو پھر اپنی پرانی ڈگر پر چل نکلتے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، مولا کریم! ان لوگوں سے سچے ایمان کی امید باقی نہیں رہی لہٰذا ان کے دلوں کو مزید سخت کر دے تاکہ عذاب آنے سے پہلے یہ جھوٹے ایمان کا اظہار بھی نہ کر سکیں اور بالآخر دردناک عذاب کے مستحق بن جائیں۔

دُعا کی قبولیت

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کے متعلق فرمایا قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا تحقیق میں نے تم دونوں کی دعا کو قبول کر لیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں کو تبدیل کر دیا۔ زیادہ تفصیلات تو معلوم نہیں تاہم مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان کے اناج کے ذخیرے میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو گئیں اور وہ اناج کی بجائے سنگریزے بن گئے۔ اس کی مثال حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں بھی ملتی ہے۔ آپ وقت کے مجدد اور خلفائے راشدین کا نمونہ تھے اگرچہ پہلی صدی کے آخر تک خلافت مکمل طور پر ملوکیت میں تبدیل ہو چکی تھی مگر آپ نے دو اڑھائی سالہ دورِ حکومت میں بنو امیہ کی خاندانی ملوکیت کو خلافت راشدہ کا نمونہ بنا کر دکھا دیا۔ آپ کے زمانے میں مصر کی ایک پرانی تھیلی دریافت ہوئی جس میں فرعون کے زمانے میں چنے اور انڈے رکھے گئے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

نے اپنے غلام سے وہ تھیلی لانے کو کہا، جب وہ کھولی گئی تو اس میں موجود چنے اور انڈے پتھر بن چکے تھے گویا موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے اللہ تعالیٰ نے نافرمانوں کے اموال کو اس طرح تبدیل کر دیا تھا کہ وہ قابلِ استعمال نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ پتھر تو خوراک کے طور پر استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ گویا طمسِ اموال کی دعا اس طرح قبول ہوئی بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے مطابق بعض پھلوں اور اناج کو ناقابلِ استعمال بنا دیا۔

انبیاء کی بددعا

یہاں پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو ہمیشہ دعا ہی کرتے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کے حق میں بددعا کیسے کی؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عام طور پر اللہ کے نبی کسی کے حق میں بددعا نہیں کرتے مگر جب وہ قوم کی زیادتیوں سے تنگ آ جاتے ہیں اور اُن کے راہِ راست پر آنے سے بالکل مایوس ہو جاتے ہیں تو پھر بددعا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ نے وحی کے ذریعے آپ کو بتا دیا تھا کہ اِن میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لائے گا اور اِن کی نسلوں میں ڈھیٹ کافر ہی ہوں گے۔ اس کے بعد انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (سورۃ نوح) اے اللہ! روئے زمین پر ایک بھی کافر زندہ نہ چھوڑ۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو بھی علم ہو گیا تھا کہ فرعونی کسی صورت میں بھی ایمان لانے والے نہیں سوائے چند افراد کے جن کا ذکر ہو چکا ہے، تو انہوں نے اُن کے حق میں بددعا فرمائی معلوم ہوا کہ ایک ۶
خاص نہج پر پہنچ کر کافروں کے حق میں بددعا کرنا درست ہے۔

آج کی دنیا میں بھی مال و دولت رکھنے والی طاقتیں غریب ممالک کو گمراہ کر رہی ہیں۔ دنیا کی متمول قومیں فضول کاموں پر بے دریغ روپیہ صرف کر رہی ہیں اور دنیا کو گمراہ کر رہی ہیں۔ اعداد و شمار والے بتاتے ہیں کہ اس وقت

دنیا کی سپر طاقتیں ہلاکت خیز اسلحہ پر جس قدر رقم صرف کر رہی ہیں اس کا ایک فیصد بھی اگر پوری دنیا کے غریبوں پر تقسیم کر دیا جائے تو کوئی ایک بھی غریب آدمی نہ رہے۔ آج صاحب مال لوگ زیب و زینت، سامانِ آسائش، کوٹھیوں اور کاروں پر بے تحاشا خرچ کر رہے ہیں مگر انسانی قدریں بالکل تباہ ہو چکی ہیں۔ دو سو سال تک دنیا میں برطانیہ کا طوطی بولتا رہا۔ اس کی وسیع و عریض سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ پھر اللہ نے اس کو کمزور کر دیا۔ جرمنی اور فرانس کا حال بھی ایسا ہی ہوا۔ اب امریکہ اور روس کا دور دورہ ہے یہ سب عیسائی یا دہریے ہیں جو غریب ممالک خصوصاً مسلمانوں کو ہر طریقے سے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لہٰذا ان کے خلاف بھی بدوجہد کرنی درست ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خود مسلمانوں کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اپنی کم علمی، نادانی اور کاہلی کے جال سے نکلنا چاہیئے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہونے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنی چاہیئے، محنت کو شعار بنانا چاہیئے اور اپنے وسائل کو جائز امور پر صرف کرنا چاہیئے، عیاشی، فحاشی اور کھیل تماشے میں اپنے قویٰ اور دولت کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ لہٰذا انہیں بھی چاہیئے کہ وہ اپنی استعداد اور وسائل کو بروئے کار لائیں، ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور گمراہ کرنے والی طاقتوں سے چھٹکارا حاصل کریں۔

دعا اور آمین

مفسرِ قرآن ابوالعالیہ، عکرمہ اور بعض دوسرے فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے جاتے تھے گویا دعا کرنے والا اور آمین کہنے والا ایک جیسے ہوتے ہیں۔ امام ابوبکر جصاص اور بعض دیگر لوگوں نے اسی بات سے استدلال کیا ہے کہ سورۃ فاتحہ پڑھے بغیر صرف آمین کہنے والا بھی ایسا ہی ہے جیسے اس نے خود سورۃ فاتحہ پڑھی

ہو۔ پھر دعا کے آداب میں یہ بھی ہے کہ آہستہ دعا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اللہ نے سورۃ اعراف میں فرمایا ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔ اگرچہ آمین بلند آواز سے کہنا بھی جائز ہے مگر افضلیت آہستہ کو حاصل ہے۔ حضرت عطاؒ نے یہی بات فرمائی ہے۔ لوگ خواہ مخواہ اس بات پر جھگڑتے ہیں۔ یہ فروعی باتیں ہیں۔ ایک امام نے ایک طریقہ اختیار کیا ہے تو دوسرے نے دوسرے کو ترجیح دی ہے بعض غیر مقلد حضرات کہتے ہیں کہ احناف یہودیوں کی طرح آمین سے چڑ رکھتے ہیں۔ بھائی! ایسی بات نہیں ہے بلکہ مسئلہ صرف افضلیت کا ہے کہ کونسا عمل زیادہ بہتر ہے۔

استقامت کا حکم

بہرحال اللہ نے فرمایا کہ تم دونوں بھائیوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے فَاسْتَقِيْمَا پس تم دونوں استقامت رکھو کیونکہ صحیح بات پر قائم رہنا ضروری ہے۔ حضور کو بھی یہی حکم ہوا فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (ھود) آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اُس پر ثابت قدم رہیں۔ اگر آپ ڈانواں ڈول ہوں گے تو بہتر نتائج نہیں نکل سکیں گے اکام ٹھیک طریقے سے کرتے رہیں اور اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس دعا کی قبولیت کے بعد فرعون چالیس سال تک زندہ رہا اور اس کے بعد مع اپنی قوم کے غرق ہوا، بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت کے تحت مناسب وقت پر کاروائی کی۔

فرمایا تم دونوں ثابت قدم رہنا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اور ان لوگوں کی راہ پر نہ چلنا جو ناواقف ہیں نادان اور بے علم لوگوں کا اتباع نہ کرنا بلکہ حقیقت اور علم پر مستقیم رہنا حقیقت اور علم وہی ہے جو وحی کے ذریعے انبیاء پر نازل ہوتا ہے باقی سب ظنی باتیں ہیں۔ اکثر و بیشتر کافر، مشرک اور بدعتی بے علموں کی بات پر چلتے ہیں۔ تمام رسومات

باطلہ جہالت کی پیداوار ہیں جو اصولِ دین کے خلاف ہوتی ہیں، اسی لیے فرمایا کہ دین اور شریعت پر چلو گے تو اللہ تعالیٰ اچھے نتائج پیدا کرے گا، اس کی مثالیں حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک، خلفائے راشدین اور خیر القرون کے زمانوں میں سامنے آچکی ہیں، لہٰذا حقیقت کا اتباع کریں اور جاہلوں کے پیچھے نہ چلیں کیونکہ حقیقت سے دور ہو جانے کی وجہ سے ہی خرابی آتی ہے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ
وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ
اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ
وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۹۰) اٰۗلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ
كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۹۱) فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ
لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ
عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۹۲)

ترجمہ:۔ اور گزار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے۔ پس پیچھا کیا ان کا فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی کرتے ہوئے اور تعدی کرتے ہوئے، یہاں تک کہ جب اُس کو پایا غرق ہونے نے تو کہنے لگا، ایمان لایا ہوں میں کہ بیشک نہیں کوئی معبود مگر وہی جس پر بنواسرائیل ایمان لائے اور میں بھی فرمانبرداروں میں ہوں (۹۰) (اُدھر سے ارشاد ہوا) اب (تم یہ کہتے ہو) اور تحقیق تم نافرمانی کرتے تھے اس سے پہلے، اور تھے تم فسادیوں میں سے (۹۱) پس آج کے دن ہم بچا لیں گے تمہارے جسم کو تاکہ ہو جائے وہ ان لوگوں کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں نشانی۔ اور بیشک بہت سے لوگوں میں سے ایسے ہیں جو ہماری آیتوں میں غفلت برتنے والے ہیں (۹۲)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل پر ہونے والے مظالم کا بیان تھا۔ آخر میں مایوس ہو کر موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کے خلاف بددعا کی کہ پروردگار! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو اس قدر سخت کر دے کہ یہ عذاب الیم دیکھے بغیر یقین نہ کریں۔ اللہ نے ارشاد فرمایا تمہاری دعا قبول ہوگئی ہے، لہٰذا تم اپنے طریقے پر قائم رہو اور بے علم اور ناواقفوں کے راستے کا اتباع نہ کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ دعا کی قبولیت کے بعد چالیس سال تک موسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں رہ کر اپنا کام کرتے رہے گویا چالیس سال تک اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو مزید مہلت دی اور پھر آخر کار فرعون کے پورے لشکر کو بحرِ قلزم میں غرق کر دیا۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ اور عرب اور ان کے بعد آنے والوں کے لیے عبرت کے طور پر صرف دو انبیاء حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ دونوں انبیاء کے مخاطبین سرکش اور مغرور تھے سو اللہ تعالیٰ نے دونوں اقوام کو پانی میں غرق کرنے کی سزا دی۔

بنی اسرائیل کی روانگی

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب کسی قوم کی سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت بھی آجاتی ہے۔ پھر وہ انبیاء کو کامیاب کرتا ہے اور مخالفین کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ فرعون کی گرفت کا وقت بھی آچکا تھا۔ فرعون کی قوم کی تفصیلات قرآن پاک میں بہت سی جگہوں پر ذکر ہوئی ہیں اس سورۃ کے علاوہ اگلی سورۃ ہود میں بھی ذکر آرہا ہے۔ سورۃ شعراء میں بھی یہ واقعہ تفصیل سے آیا ہے۔ غرضیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں چھیالیس (۴۶) مرتبہ بیان ہوا ہے بنی اسرائیل کی مصر سے روانگی کے حالات کئی سورتوں میں آئے ہیں مثلاً یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں اس مقصد کے لیے مذہبی رسومات کی ادائیگی کا حیلہ کیا گیا۔ فرعونی بھی یہی سمجھے کہ یہ لوگ معمول کے مطابق

مذہبی رسوم ادا کر کے واپس آجائیں گے لہٰذا انہوں نے بنی اسرائیل کی روانگی پر کوئی تعرض نہ کیا۔ بہر حال بنی اسرائیل قوم مصر سے نکل کھڑی ہوئی۔ ان کے مردوں کی تعداد سات لاکھ کے قریب تھی۔ عورتیں اور بچے ان کے علاوہ تھے۔ بہر حال یہاں پر تفصیلات نہیں بتائی گئیں بلکہ صرف فرعون کا ذلت ناک انجام بیان فرمایا ہے تاکہ اس سے عبرت حاصل کی جائے۔

فرعون کی طرف سے تعاقب

جیسا کہ عرض کیا ہے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعات قرآن پاک میں کثرت سے بیان ہوئے ہیں۔ بعض تفصیلات احادیث میں بھی ملتی ہیں جنہیں امام ترمذیؒ، صاحب مستدرک حاکم اور بعض دوسرے محدثین نے بیان کیا ہے کچھ باتیں بائیبل میں بھی ملتی ہیں مگر اُن پر کلیتاً اعتماد نہیں کیا جا سکتا ان میں بعض باتیں صحیح بھی ہیں اور بعض غلط بھی۔ اس کے علاوہ بعض بالکل تاریخی واقعات ہیں جنہیں مؤرخین اور مفسرین نے بیان کیا ہے۔ بہر حال بنی اسرائیل کے اس سفر اور فرعون کی طرف سے اُن کے تعاقب کے متعلق جو حالات ملتے ہیں ان کے مطابق جب بنی اسرائیل کو مصر سے روانہ ہوئے ایک دو دن گزر گئے تو فرعونیوں کو تشویش ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر کہیں سمندر سے اُس پار ہی نہ چلے جائیں۔ یہ پوری قوم ہماری غلام ہے۔ ہم ان سے من مانا کام لیتے ہیں۔ اگر یہ چلے گئے تو ہمارا سارا کام کاج ٹھپ ہو کر رہ جائیگا۔ فرعون بنی اسرائیل کا بحیثیت قوم دیرینہ دشمن تھا اور پھر موسیٰ علیہ السلام کے منظر عام پر آنے کی وجہ سے اس کی نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ یہ سب مل کر میری سلطنت کے زوال کا باعث نہ بن جائیں۔ چنانچہ جب فرعون کو بنی اسرائیل کے بھاگ نکلنے کا عندیہ ملا تو اس نے اپنے تمام لشکریوں کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کا تعاقب کیا جائے تفسیری روایات میں آتا ہے فرعون کم و بیش بارہ لاکھ مسلح فوجی ہمراہ لے کر موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔

بنی اسرائیل کی پریشانی

اَب آگے آگے بنی اسرائیل جا رہے تھے اور پیچھے پیچھے فرعون اور اس کی فوجیں تھیں۔ جب بنی اسرائیل بحرِ قلزم کے کنارے پر پہنچے تو سخت پریشان ہو گئے۔ سورۃ شعراء میں اس کا کچھ حال مذکور ہے۔ پریشانی کے عالم میں بنی اسرائیل کہنے لگے اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ کہ ہم تو فرعون کے ہاتھوں پکڑے گئے۔ آگے سمندر تھا اور پیچھے سے فرعون کا جمِ غفیر آ رہا تھا۔ کہنے لگے اَب ہماری خیر نہیں، فرعون ہمیں سخت سزائیں دے گا، مگر جیسا کہ سورۃ اعراف اور سورۃ شعراء میں بھی موجود ہے، موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ "اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ" (الشعراء) بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ خود راہنمائی کرے گا۔ ہم اسی کے حکم کے مطابق تو مصر سے نکلے ہیں، وہ ہمیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ جب پوری قوم بنی اسرائیل بحرِ قلزم پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی فرمائی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (الشعراء) اپنی لاٹھی کو سمندر پر مارو۔ یہ وہی لاٹھی تھی جو موسیٰ علیہ السلام کو معجزہ کے طور پر ملی ہوئی تھی اور اسے ہمیشہ آپ ساتھ رکھتے تھے۔ یہی لاٹھی جادوگروں کے مقابلے میں اژدہا بن گئی تھی۔ تو اس لاٹھی کے متعلق حکم ہوا کہ اسے سمندر پر مارو۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی تو سمندر میں فوراً بارہ راستے بن گئے۔ ہر سڑک کے دائیں بائیں پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ جنہیں سورۃ شعراء میں "كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ" کہا گیا ہے۔ درمیان میں بارہ خشک راستے بن گئے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے، ہر ایک کو ایک ایک سڑک پر چلنے کا حکم ہوا۔ وہ چل رہے تھے اور سمندر کے بیچوں بیچ ایک دوسرے کو دیکھ بھی رہے تھے جس کی وجہ سے مطمئن تھے کہ وہ سمندر کو بخیریت پار کر رہے ہیں

فرعونیوں کی غرقابی

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار اتار دیا۔ پیچھے فرعون کی فوج آرہی تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بنی اسرائیل ان راستوں سے گذر کر سمندر کے اس پار چلے گئے ہیں تو فرعون نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ انہی راستوں سے بنی اسرائیل کا تعاقب کریں اور پھر خود بھی اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا۔ پھر فرعونیوں کا کیا حشر ہوا؟ سورۃ طٰہٰ میں ہے فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ پھر پانی کی موجوں نے انہیں خوب گھیرا، حتی کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا، سب کے سب غرق ہوگئے۔ حکومت کا سربراہ، فرعون اس کے وزیر، امیر، عہدے دار اور فوجی سب غرق ہوگئے اور پیچھے صرف عام پبلک کے لوگ رہ گئے۔ اللہ نے فرمایا، نہ پوچھو پھر ان کا کیا حشر ہوا۔ کر اس مقام پر بھی ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار اتار دیا فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا تعاقب کیا سرکشی اور تعدی کرتے ہوئے۔ یہ فرعون کی تعدی اور ظلم تھا کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کے لیے ان کا سمندر میں پیچھا کیا۔

فرعون کا ایمان لانا

فرمایا حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ یہاں تک کہ جب پالیا اس کو ڈوبنے نے۔ جب فرعون ڈوبنے لگا قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ تو کہنے لگا میں ایمان لایا کہ بیشک نہیں کوئی معبود مگر وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں۔ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اور میں بھی فرمانبردار ہوں یعنی اسی خدا پہ ایمان لایا ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح ڈوبنے سے بچ جاؤں۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جب فرعون ایمان کا اقرار کر رہا تھا تو جبرائیل علیہ السلام سمندر کی تہ سے گارا نکال کر اس کے منہ میں دے رہا تھا۔ گویا کہ رہا تھا کہ اس منہ کو بند

دکھو۔ اب ایمان لانے کا وقت نہیں رہا۔

جب فرعون نے یہ بات کی تو ادھر سے ارشاد ہوا آٰلْئٰنَ اب کلمہ پڑھتے ہو جب کہ ایمان لانے کا وقت گزر چکا ہے اور اللہ کی گرفت آچکی ہے۔ اللہ نے فرمایا، تیری حالت یہ ہے وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ کہ اس سے پہلے تم نافرمانی ہی کرتے رہے ہو وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ تم غنڈے تھے۔ تم نے فساد برپا کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا۔ تم نے بنی اسرائیل کے ساتھ ظلم و تعدی کی انتہا کر دی۔ اب عذاب کو آنکھوں سے دیکھ کر کلمہ پڑھتے ہو، اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے اَلتَّوْبَةُ مَالَمْ يُغَرْغِرْ بندے کی توبہ اور ایمان اس وقت تک مقبول ہے جب تک کہ غرغرہ طاری نہ ہو جائے یعنی انسان پر نزع کی حالت طاری نہ ہو جائے۔ جب موت کے فرشتے نظر آنے لگیں اور غیب کا پردہ اٹھ جائے تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب تمہاری توبہ قبول نہیں ہے۔ اس واقعہ سے اہل مکہ اور دیگر مشرکین عرب کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ دیکھو فرعون تم سے کتنا بڑا طاقتور اور جابر تھا جس نے الوہیت کا دعویٰ کیا، بڑا آسودہ حال تھا، ملک کے تمام وسائل اس کے قبضہ میں تھے مگر توحید و رسالت کا انکار کر کے اس کا حشر بہت برا ہوا۔ اگر تم نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تو اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکو گے۔

نعشِ فرعون کی حفاظت

اللہ نے پورے فرعونی لشکر کو غرق کرنے کے بعد فرعون سے خطاب کیا فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ آج ہم تیرے بدن کو باہر نکال دیں گے اللہ تعالیٰ کو فرعون کی نعش کی حفاظت بھی منظور تھی لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً تاکہ تو بعد میں آنے والوں کے لیے نشانِ عبرت بن جائے بعض کمزور دل لوگ فرعون کی غرقابی کے بعد بھی متفکر تھے کہ پتہ نہیں وہ غرق ہوا ہے یا نہیں۔ تو اللہ نے ان لوگوں کی تسلی کے لیے اور پیچھے

ؔ ترمذی صفحہ ۵۰۰

آنے والے لوگوں کی عبرت کے لیے فرعون کی لاش کو پانی سے باہر ایک ٹیلے پر پھینک دیا جب کہ باقی سب لشکری سمندر میں غرق ہو گئے اور ان میں سے کسی ایک کی لاش بھی برآمد نہ ہوئی۔ بعض مؤرخین اور مفسرین کہتے ہیں کہ فرعون کی لاش کی ناک کا تھوڑا سا حصہ کسی مچھلی نے کاٹا تھا، باقی سارا جسم صحیح سلامت تھا۔ اس وقت بحیرہ احمر کے کنارے البزنیمہ نامی بستی سے چند میل دُور مقامی لوگ اُس ٹیلے کی نشاندھی کرتے ہیں جہاں فرعون کی لاش پائی گئی تھی بعض علماء ناک کٹ جانے سے یہ مراد لیتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ دیکھو اونچی ناک والا آدمی کس قدر ذلیل و خوار ہوا۔ تاہم یہ سب تاریخی اور ظنی باتیں ہیں، یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

فراعین مصر

یہ کونسا فرعون تھا جو غرق ہوا، اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ رعمسیس ثانی تھا۔ اور بعض اس کا نام منفتہ بتاتے ہیں۔ مؤرخین بتلاتے ہیں کہ فراعینِ مصر کی دو لائنیں گزری ہیں اور یہ غرق ہونے والا فرعون دوسری لائن کے فراعین میں سے بتیسویں ۳۲ یا چھتیسویں ۳۶ نمبر پر آتا ہے۔ اُس زمانے میں نعش کو حنوط کرنے کے ماہرین موجود تھے۔ مصر کے لوگ اس سے پہلے بھی فراعین کی لاشوں کو حنوط کرتے رہے تھے۔ لاش کو خاص قسم کا مسالہ لگا کر پٹیاں باندھ دی جاتی تھیں جس سے لاش گلنے سڑنے سے محفوظ ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اس دستور کے مطابق مصر کے لوگ اِس فرعون کی لاش کو بھی اٹھا کر لے گئے اور اسے حنوط کر کے مقبرے میں رکھ دیا۔ اٹھارھویں یا انیسویں صدی میں جب انگریزوں نے آثارِ قدیمہ کی کھدائی کی۔ تو ایسی کئی حنوط شدہ (PRESERVED پریسرو ڈ) لاشیں برآمد ہوئیں جنہیں مختلف عجائب گھروں میں رکھ دیا گیا۔ اس فرعون کی لاش بھی ۱۹۰۷ء تک مصر میں تھی۔ وہاں سے انگریز اسے برٹش میوزیم لندن میں لے گئے۔ اب پتہ نہیں کہاں ہے ؟ وہیں ہے یا مصریوں نے واپس

منگوالی ہے۔

نشانِ عبرت

بہرحال قرآن پاک میں صرف دو باتوں کا ذکر ہے، ایک یہ کہ فرعون کی لاش کو پانی سے باہر پھینک دیا گیا جب کہ باقی سارے فرعونی ڈبو دیے گئے اللہ کا فرمان ہے کہ ایک طرف تو پانی میں ڈبوئے گئے اور دوسری طرف اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا " (المومن) صبح شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں۔ برزخ میں جہنم کی آگ پر پیش کیا جاتا رہیگا اور پھر آخرت میں تو سخت ترین عذاب ہوگا۔ بہرحال یہ لاش ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور آئندہ آنے والوں کے لیے نشانِ عبرت بن گئی۔ جس طرح نوح علیہ السلام کی کشتی رہتی دنیا تک یادگار کے طور پر قائم ہے، اسی طرح فرعون کی لاش کو بھی اللہ تعالیٰ نے یادگار اور عبرت کے لیے محفوظ کر دیا۔ بعض لوگ لِمَنْ خَلْفَكَ کو لِمَنْ خَلَقَكَ پڑھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تو اپنے پیدا کرنے والے کی نشانی بن جائے۔ یہ شخص اپنے خالق کا سخت نافرمان تھا۔ الوہیت کا دعویدار تھا۔ اب اس کا حشر دیکھ لو کہ کس طرح اللہ نے اسے نشانِ عبرت کے طور پر باقی رکھا۔

بدن بمعنی زرہ

اس آیت میں بدن کا لفظ آیا ہے جس کا عام فہم معنی جسم ہوتا ہے اسی لیے آیت کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ آج ہم تمہارے جسم کو شکست و ریخت سے بچالیں گے۔ البتہ امام ترمذیؒ، امام بیضاویؒ اور امام مبردؒ نے اپنی کتاب کامل میں لکھا ہے کہ یہاں پر بدن سے مراد جسم نہیں بلکہ زرہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اے فرعون! ہم تیرے جسم کو مع زرہ باہر نکال دیں گے۔ زرہ عام طور پر لوہے کی ہوتی ہے مگر فرعون کی زرہ سونے کی بنی ہوئی تھی اور بڑی مشہور تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی بدن سے مراد زرہ ہی ہے یعنی ہم تمہیں مردہ حالت میں مع زرہ باہر نکالیں گے تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ قمیص کے نیچے سونے کی زرہ پہننے والا فرعون ہلاک ہو چکا ہے۔ بدن

اُس چھوٹی زرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس کے اوپر بڑی زرہ پہنی جائے، بدن کا یہ معنی عربی ادب میں ملتا ہے۔ دیوان حماسہ کا ایک شعر ہے جس میں ایک شخص اپنے ممدوح کی مدح میں کہتا ہے حَقِيبَةٌ رَحْلِهَا بَدَنٌ وَ سَرَجٌ "اس کے کجاوے کی گٹھڑی میں دو ہی چیزیں ہیں ایک زرہ اور دوسری کاٹھی۔ بہرحال بدن سے مراد چھوٹی زرہ بھی ہو سکتی ہے۔

فرمایا وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ بہت سے لوگ ہماری آیتوں سے غفلت برتنے والے ہیں۔ جس طرح عذاب کے وقت فرعون کا ایمان لانا کچھ مفید نہ ہوا، اسی طرح اس کے محفوظ جسم سے بھی کسی کو کچھ فائدہ نہیں سوائے اس کے کہ پچھلوں کو عبرت حاصل ہو۔ مگر افسوس کہ لوگوں کی اکثریت ہماری نشانیوں میں غور و فکر نہیں کرتی۔ اگر ذرا بھی غور کریں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت تامہ اور حکمت بالغہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ انسان اچھی طرح جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے یہی عبرت کا مقام ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَٰهُم
مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ فَمَا ٱخْتَلَفُوا۟ حَتَّىٰ جَآءَهُمُ ٱلْعِلْمُ
إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِى بَيْنَهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ فِيمَا كَانُوا۟
فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٩٣﴾ فَإِن كُنتَ فِى شَكٍّ مِّمَّآ أَنزَلْنَآ
إِلَيْكَ فَسْـَٔلِ ٱلَّذِينَ يَقْرَءُونَ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكَ لَقَدْ
جَآءَكَ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُمْتَرِينَ ﴿٩٤﴾
وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلَّذِينَ كَذَّبُوا۟ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ فَتَكُونَ
مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٩٥﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ ءَايَةٍ حَتَّىٰ
يَرَوُا۟ ٱلْعَذَابَ ٱلْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾

ترجمہ :- اور تحقیق ہم نے جگہ دی بنی اسرائیل کو بڑی اچھی جگہ
اور روزی دی ہم نے ان کو پاکیزہ چیزوں سے ۔ پس نہیں اختلاف
کیا انہوں نے یہاں تک کہ ان کے پاس علم آگیا۔ بیشک تیرا
پروردگار فیصلہ کریگا اُن کے درمیان قیامت کے دن اُن باتوں
میں جن میں وہ اختلاف کرتے تھے ﴿۹۳﴾ پس اگر تمہیں شک
ہو اُس چیز میں جس کو ہم نے اُتارا ہے آپ کی طرف ، پس آپ
پوچھ لیں اُن لوگوں سے جو پڑھتے ہیں کتاب اس سے پہلے ۔

البتہ تحقیق آیا ہے تیرے پاس حق تیرے پروردگار کی طرف سے
پس نہ ہوں آپ شک کرنے والوں میں سے (۹۴) اور نہ ہوں
آپ اُن لوگوں میں سے جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی آیتوں کو ، پس
ہو جائیں گے آپ نقصان اٹھانے والوں میں (۹۵) بیشک وہ لوگ
کہ ثابت ہو چکی ہے اُن پر تیرے پروردگار کی بات ، وہ نہیں
ایمان لائیں گے (۹۶) اور اگرچہ آجائے اُن کے پاس ہر قسم کی
نشانی یہاں تک کہ وہ دیکھ لیں دردناک عذاب (۹۷)

ربطِ آیات

گزشتہ دروس میں اللہ تعالیٰ نے دو نافرمان قوموں کا حال بطور مثال ذکر کیا ہے تاکہ مشرکین مکہ، مشرکین عرب اور بعد میں آنے والے لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ ان میں سے ایک قوم نوح ہے جس کو اللہ کے نبی علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک وعظ کیا اور قوم فرعون ہے جس کی طرف اللہ نے دو جلیل القدر انبیاء حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو مبعوث فرمایا۔ وہ مجرم قوم ایمان نہ لائی۔ انہوں نے ظلم و تعدی کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم نوح کو اللہ نے بذریعہ طوفان پانی میں ڈبو دیا جب کہ فرعون اور اس کے لشکر کو بحر قلزم کی موجوں میں لقمۂ اجل بنایا۔ اللہ نے فرعون کی لاش کو عبرت کے لیے سمندر سے باہر پھینک دیا۔ اُس زمانے کے لوگوں نے اس واقعہ کو بچشم خود دیکھا جب کہ بعد میں آنے والوں نے یہ حالات تاریخ میں پڑھے۔ اس طرح گویا یہ واقعہ تمام موجود اور آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے نصیحت اور عبرت کا باعث بن گیا۔

بنی اسرائیل کا عروج و زوال

قوم نوح اور قوم فرعون کا حال ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کا تذکرہ فرمایا ہے۔ تاریخ میں اس قوم پر بڑے اُتار چڑھاؤ آئے ہیں۔ اس عظیم قوم نے عروج و زوال کے بہت سے ادوار دیکھے ہیں۔ بعد میں یہ لوگ نافرمانی کرتے رہے اور طرح طرح کی مشکلات اور سزاؤں میں گرفتار رہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات دی تو پھر اس قوم پر بڑے انعامات کئے مگر اس قوم

کی استعداد اور صلاحیت کمزور پڑ چکی تھی فرعون کی مسلسل غلامی کی وجہ سے وہ انعاماتِ الٰہی سے کما حقہٗ استفادہ نہ کر سکے۔ پھر کافی عرصہ بعد جب نئی نسل آئی تو اللہ نے انہیں سرزمینِ شام و فلسطین میں اقتدار دیا۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ہم نے اپنی بابرکت زمین کے مشرق و مغرب کا مالک اُن کمزور لوگوں کو بنا دیا جن پر فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بے انتہا ظلم و ستم ڈھا رہے تھے۔ اللہ نے اسی بات کا اشارہ آج کی آیات میں بھی کیا ہے۔ پھر جو لوگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت اور قرآن کے برحق ہونے پر شک کرتے تھے، اُن کو تنبیہ فرمائی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ تحقیق ہم نے بنی اسرائیل کو جگہ دی بہت ہی پسندیدہ جگہ۔ اس سے شام و فلسطین کے زرخیز خطے مراد ہیں مگر فرعون کی غرقابی کے فوراً بعد بنی اسرائیل یہ سرزمین حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ سورۃ مائدہ میں گزر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ تم سرزمینِ شام و فلسطین میں داخل ہو جاؤ، وہاں پر آباد قوم عمالقہ سے جہاد کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں آسانی سے یہ ملک عطا کرے گا مگر غلامی کی وجہ سے ذہنی پستی میں مبتلا یہ قوم جہاد پر آمادہ نہ ہوئی بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے کہا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ اے موسیٰ علیہ السلام تم اور تمہارا خدا جا کر جہاد کرو، ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔ قوم عمالقہ اگرچہ بڑی طاقتور قوم تھی لیکن اِدھر اللہ کا وعدہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو غلبہ عطا کرے گا مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ اللہ تعالیٰ نے وہ سرزمین ان پر

حرام کردی اور وہ چالیس سال تک میدان تیہ میں سرگردان پھرتے رہے۔
اس طرح گویا چالیس برس تک انہوں نے قید اور نظر بندی کی زندگی گزاری
پھر جب پرانی نسل کے لوگ ختم ہو گئے پہلے حضرت ہارون علیہ السلام
اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی وفات پا گئے تو نئی نسل میں شعور پیدا ہوا۔
نئی نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع بن نون
علیہ السلام کی قیادت میں جہاد کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں شام، فلسطین
اور اردن وغیرہ میں تسلط عطا کیا۔ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل دوبارہ
مصر کی طرف نہ گئے لہٰذا وہ شام و فلسطین کی سلطنت تک ہی محدود رہے
البتہ بعد میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں اللہ نے مصر کی سلطنت
بھی بنی اسرائیل کو عطا کر دی۔

بہرحال اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو شام و فلسطین جیسی
بہت اچھی اور پسندیدہ جگہ عطا فرمائی۔ اس زمین میں اللہ نے ظاہری اور
باطنی برکات رکھی ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی سرزمین ہے۔ حضرت
ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء نے اس سرزمین کے لیے بابرکت ہونے
کی دعائیں کیں جن کو اللہ نے مستجاب فرمایا اور وہاں پر پانی، زرخیزی اور
سرسبزی کا وافر انتظام فرمایا جس کی وجہ سے وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ
ہم نے انہیں پاکیزہ روزی عطا کی۔ اس سلسلے میں بنی اسرائیل کے
لیے اشیائے خورد و نوش اور دیگر انعامات کا ذکر مختلف سورتوں
میں بیان ہوا ہے۔

بنی اسرائیل کی علمی خیانت

آگے بنی اسرائیل کی نافرمانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا،
فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ انہیں اختلاف کیا انہوں
نے یہاں تک کہ ان کے پاس علم آگیا۔ مطلب یہ ہے کہ علم آنے اور
حقیقت واضح ہو جانے کے بعد انہوں نے پھوٹ ڈالی جس کی وجہ

سے کئی قسم کی مشکلات پیدا ہوگئیں۔ بنی اسرائیل نے سب کچھ جانتے ہوئے
اللہ کے نبیوں کی مخالفت کی، اس لیے اللہ نے دو مرتبہ ان پر دشمن کو مسلط
کیا۔ پہلی دفعہ بخت نصر ان پر غالب آیا جس کی غلامی میں وہ سو سال تک
پستے رہے اور بڑی ذلت اٹھائی۔ پھر دوسری دفعہ وہ رومیوں کے زیر تسلط
آئے اور بڑی تکالیف برداشت کیں۔ جب حضور علیہ السلام کا زمانہ آیا، تو
پھر بھی انہوں نے نبی آخر الزمان کی نبوت کو تسلیم نہ کیا۔ اس وقت مدینے
کے اطراف میں یہودیوں کے دس بڑے عالم تھے۔ حضور علیہ السلام نے
فرمایا، اگر یہ سارے کے سارے دین حق کو قبول کرلیں تو روئے زمین
کے یہودی صحیح ہو جائیں۔ مگر ان دس علما میں سے صرف عبداللہ ابن
سلامؓ نے ایمان قبول کیا جب کہ باقی نو باطل پر ہی اڑے رہے۔ اب
اس بات کو بھی چودہ سو سال گزر چکے ہیں مگر یہ بے نصیب اپنی ضد پر
قائم ہیں۔ کفر و شرک کی بدترین قسم میں مبتلا ہیں، مشرک تو ختم ہو گئے بعض
نے ایمان قبول کر لیا مگر اہل کتاب کہلانے والے یہود و نصاریٰ ابھی
تک گمراہی میں مبتلا ہیں۔ سو اللہ نے فرمایا کہ انہوں نے علم آنے کے
بعد اختلاف کیا۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
بیشک تیرا پروردگار فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ان باتوں میں جن میں وہ
اختلاف کرتے تھے۔ غرضیکہ ان کے کارناموں کا حتمی فیصلہ اللہ
رب العزت کی بارگاہ میں جا کر ہوگا۔

قرآن کریم کی حقانیت

فرمایا فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اگر
آپ کو اس چیز میں شک ہو جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے
فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ پس آپ ان لوگوں
سے پوچھ لیں جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خطاب

حضور علیہ السلام کو ہے جن کی طرف قرآن پاک نازل ہوا اگر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس شک کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا تو کسی طرح درست نہیں کیونکہ اللہ کی نازل کردہ شریعت، دین اور آخری کتاب میں آپ کو تو کسی قسم کا شک ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اس خطاب کی مخاطب حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو حضور کے زمانے میں قرآن پاک کی حقانیت میں شک کرتے تھے ـــــــــ ان میں کافر، مشرک اور منافق تھے اور یہود و نصاریٰ بھی شامل تھے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی حقانیت کے متعلق آپ ان اہل کتاب سے پوچھیں جو اللہ کی آخری کتاب پر ایمان لاچکے ہیں۔ قرآن پاک کی صداقت کی گواہی یہ لوگ دیں گے، اور جو لوگ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، وہ اس کی تصدیق نہیں کریں گے۔ ایمان لانے والوں میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ آپ کو بتائیں گے کہ قرآن مجید اللہ کی سچی کتاب ہے جس کے متعلق تورات میں بھی ہے کہ "میں تیرے بھائی بندوں میں سے تیرے جیسا ایک عظیم رسول برپا کروں گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا" مطلب یہ ہے کہ حق پرست آپ کو ٹھیک ٹھیک بتائیں گے کہ آپ اللہ کے برحق رسول اور یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جن کی پیشین گوئی ہزاروں سال پہلے ہو چکی ہے۔

اہل کتاب کے باطل پرست لوگوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ" (البقرۃ) یہ لوگ اللہ کے نبی کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولادوں کو۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے متعلق سورۃ اعراف میں ہے

الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ
یہ وہی نبی آخر الزمان ہیں جن کا اسم گرامی اور صفات تورات اور انجیل میں لکھی ہوئی پاتے ہیں۔ آپ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں مگر ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں۔ مگر جو ماننے والے لوگ ہیں وہ صحیح صحیح بتا دیں گے کہ یہ وہی رسول ہیں جن کی پیشین گوئی پہلی کتابوں میں ہو چکی ہے۔

امام عبدالرزاقؒ نے اپنی مصنف میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت قتادہؓ نے کہا کہ ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ الۗا اَشُکُّ وَلَآ اَسْئَلُ کہ مجھے قرآن کی حقانیت میں نہ تو کوئی شک ہے اور نہ ہی میں کسی سے دریافت کروں گا۔ لہٰذا فَسْئَلِ الَّذِيْنَ کا خطاب حضور علیہ السلام سے نہیں ہے بلکہ یہ اُن لوگوں سے خطاب ہے جو کسی قسم کا شک رکھتے ہیں کہ یہ نہیں یہ واقعی اللہ کی کتاب ہے یا نہیں ہے۔ وہ لوگ اپنی تصدیق کے لیے اہلِ کتاب میں سے ایمان لانے والوں سے دریافت کریں۔ خاص خطاب کے ذریعے عام بات کرنے کی مثال سورۃ احزاب کی پہلی آیت کریمہ میں بھی ہے يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اے نبی کریم! اللہ سے ڈریں اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا نبی تو اللہ کو سب سے زیادہ جاننے اور سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوتا ہے اور وہ کافروں اور منافقوں کی بات نہیں مان سکتا۔ آپ کا ارشاد ہے اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَاَتْقٰكُمْ تو مراد یہ ہے کہ یہاں بھی خطاب تو نبی علیہ السلام کو ہے مگر بات عام لوگوں کو سمجھائی جا رہی ہے کہ اگر کسی کو شک ہو تو وہ اہلِ علم سے اس کی صداقت کی تصدیق کر سکتا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی علم کی بات یا دینی مسئلہ میں شک اور تردد ہو تو اہل علم کی طرف رجوع

کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں اللہ کا واضح حکم بھی ہے " فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ " (النحل) اگر تم کسی چیز سے بے بہرہ ہو تو اس کے متعلق جاننے والوں اور یاد رکھنے والوں سے دریافت کر لو۔ تو فرمایا لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ بیشک البتہ آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس حق آچکا ہے۔ قرآن کریم بالکل حق ہے۔ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جس میں آخری دین ہے فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ پس آپ شک کرنے والوں میں نہ ہوں۔ یہ بات دوسرے لوگوں کو سمجھائی جا رہی ہے کہ اس بات کے متعلق دل میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ پھر فرمایا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ آپ اُن لوگوں میں بھی نہ ہوں جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ اگر ایسا ہو گا۔ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ تو آپ خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے۔ اللہ کی آیات کی تکذیب بھی بہت بڑا جرم ہے۔ ایسا کرنے والوں کی عبرت کے لیے پہلی قوموں کا حال اللہ نے بار بار بیان فرمایا ہے کہ جس نے بھی آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی اُس نے سخت نقصان اٹھایا اس دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوئے اور آخرت کی رسوائی تو دائمی ہے لہٰذا فرمایا کہ قرآنِ حکیم کی حقانیت کو تسلیم کر لو اور اس کی آیتوں کی تکذیب نہ کرو کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔

حضور کے لیے تشفی

آگے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ مخالفین کی طرف سے ایک حد تک مطمئن رہیں، اس لیے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ بیشک وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے۔ خدا کے علم اور نوشتے میں جن لوگوں کے بارے میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ یہ لوگ صلاحیت سے محروم ہیں اور یہ حق کو قبول نہیں کریں گے۔ سو آپ زیادہ متفکر نہ ہوں لَا يُؤْمِنُوْنَ

کیونکہ وہ ایمان قبول نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی استعداد سے واقف ہے اور وہ جانتا ہے کہ ان کی قسمت میں ایمان نہیں ہے، لہٰذا آپ اِن کے متعلق زیادہ فکر نہ کریں بلکہ تسلی رکھیں۔ اس سے پہلے فرعون اور اس کی قوم کا حال بیان ہو چکا ہے کہ وہ بھی ایمان نہ لائے حتیٰ کہ وقت گزر گیا۔ قوم نوح بھی بڑی سرکش قوم تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ساڑھے نو سو سالہ وعظ کے جواب میں صرف ستر بہتر یا اسّی آدمی ایمان لائے جو کشتی میں سوار ہو گئے، باقی سب نافرمان ہی رہے۔ انہوں نے حق کو قبول نہ کیا۔ لہٰذا آپ بھی اپنا فریضہ ادا کرتے رہیں اور ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے زیادہ فکرمند نہ ہوں۔

منکرین کی ہٹ دھرمی

فرمایا یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ اگرچہ ان کے پاس ہر قسم کی نشانی آجائے۔ آپ نے دیکھا کہ مکے والوں نے شق القمر کی نشانی مانگی۔ اللہ نے اُن کی یہ فرمائش قبول کر لی۔ چاند کے دو ٹکڑے پہاڑ کی دونوں طرف دیکھ کر کہنے لگے سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (القمر) یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ پہلے بھی ہوتا تھا، آج بھی ہو رہا ہے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اسی طرح فرعون اور اُس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر بیشمار نشانیاں دیکھیں مگر نہیں مانے "وَجَحَدُوْا بِهَا" (النمل) اور انہوں نے انکار ہی کیا۔ تو فرمایا اگر ان کے پاس ہر قسم کی نشانی بھی آجائیں تو پھر بھی تسلیم نہیں کریں گے حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ یہاں تک کہ وہ عذاب الیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ جب فرعون ڈوبنے لگا تو ایمان کا اقرار کیا مگر اُس وقت کا ایمان لانا کچھ مفید نہ ہوا۔ فرمایا یہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی انتہا ہے کہ جب تک یہ لوگ دردناک عذاب کا بچشم خود ملاحظہ نہیں کریں گے، یہ ایمان نہیں لائیں گے مگر اس وقت کا ایمان مفید نہیں ہوگا، لہٰذا آپ ان کی طرف سے تسلی رکھیں۔ آگے حضرت

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٩٨﴾

ترجمہ:- پس کیوں نہ ہوئی کوئی بستی ایسی جو ایمان لاتی پھر اس کا ایمان اُس کو فائدہ پہنچاتا مگر یونس علیہ السلام کی قوم۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے کھول دیا اُن سے ذلت والا عذاب دنیا کی زندگی میں اور ہم نے اُن کو فائدہ پہنچایا ایک وقت تک ﴿٩٨﴾

ربطِ آیات

بطورِ عبرت اس سے پہلے قومِ نوح اور قومِ فرعون کے واقعات بیان ہوچکے ہیں۔ اب یہ تیسرا واقعہ قومِ یونس کا آرہا ہے۔ ان تینوں واقعات میں ربط یہ ہے کہ اللہ کے تینوں انبیا علیہم السلام حضرات نوح، موسیٰ اور یونس علیہم السلام اپنی اپنی قوم کو لمبے عرصہ تک تبلیغ کرتے رہے مگر وہ ایمان نہ لائے اور آخر کار اللہ تعالیٰ کا عذاب آگیا۔ قومِ نوح طوفان میں غرق ہوئی اور قومِ فرعون بحرِ قلزم کی موجوں کی نذر ہوگئی۔ البتہ اس تیسری قوم یونس پر بھی عذاب آیا مگر اس کی توبہ قبول ہوئی اور یہ عذابِ الٰہی سے بچ گئی۔ اس لحاظ سے پوری تاریخِ کائنات میں یہ واحد قوم ہے جس کی توبہ عذاب کے نظر آجانے کے بعد قبول ہوئی، وگرنہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ جب کسی فرد یا قوم پر نزع کی حالت طاری ہوجاتی ہے تو اُس وقت اُس کا ایمان لانا کچھ مفید نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک[1] بھی ہے تَوْبَةُ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ بندے کی توبہ اُس وقت تک قبول ہوتی ہے۔ جب تک اُس پر غرغرہ کی حالت طاری نہ ہوجائے اور غرغرہ

[1] ترمذی ص۵

کی حالت ——————— وہ ہوتی ہے جب سانس حلق میں اٹک جاتی ہے، حجاب اٹھ جاتے ہیں اور موت کے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ کی روایت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ الفاظ بھی آتے ہیں تَوبَۃُ العَبدِ مَالَم یَقَعِ الحِجَابُ یعنی بندے کی توبہ اس وقت تک قابل قبول ہوتی ہے جب تک کہ حجاب واقع نہ ہو جائے، حجاب کی تعریف حضور علیہ السلام نے خود فرمائی ہے کہ انسان کی جان جسم سے اس حالت میں نکل جائے کہ وہ کفر یا شرک میں مبتلا ہو۔ یہ حجاب ہے اور ایسی حالت میں توبہ قبول نہیں ہوتی۔ الغرض! عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد کسی قوم کی توبہ قبول نہیں ہوتی، یہ صرف قوم یونس کو استثناء حاصل ہے کہ عذاب الٰہی کے آثار نظر آنے کے بعد بھی اللہ نے ان کی توبہ قبول فرما لی اور انہیں اس عذاب سے نجات دے دی۔ ان واقعات کو بیان کر کے بنی نوع انسان کو نصیحت اور تنبیہ کی جا رہی ہے کہ وہ عذاب کے نزع کا وقت طاری ہونے سے پہلے پہلے ایمان قبول کر لیں اور اگر گناہوں میں مبتلا ہیں تو توبہ کر لیں اور آخرت کے دائمی عذاب سے بچ جائیں۔

حضرت یونس کی بعثت

آیت زیر درس میں حضرت یونس علیہ السلام اور آپ کی قوم کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس سورۃ کا نام اسی نسبت سے سورۃ یونس ہے یہاں پر محض اشارۃً بات کی گئی ہے جب کہ قوم یونس کے مفصل حالات سورۃ انبیاء، سورۃ صٰفٰت اور بعض دیگر سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام اصلاً بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے تھے مگر آپ کی بعثت آشوری قوم کی طرف ہوئی، اس زمانے میں اور اس علاقے میں بیک وقت اللہ کے پانچ نبی موجود تھے۔ جن میں سے حضرت یونس علیہ السلام کو تبلیغ کے لیے آشوریوں کی طرف بھیجا گیا۔ آشوریوں کا پایۂ تخت نینویٰ

تھا جو عراق کے صوبہ موصل میں دریائے دجلہ کے کنارے ساٹھ میل کے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ شہر حضرت یونس علیہ السلام سے ہزاروں سال پہلے آباد تھا اور آپ کے زمانے میں اس کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب تھی۔ چونکہ آشوری قوم کفر، شرک اور معاصی میں مبتلا تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو اس قوم کو تبلیغ کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔ آپ نے وہاں پر کتنا عرصہ تبلیغ کی، اس کی تصریح قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ البتہ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ آپ نے ستر سال تک فریضہ تبلیغ ادا کیا مگر لوگوں نے آپ کی دعوت قبول نہ کی۔ آخر کار آپ نے اللہ کے حکم سے انہیں عذاب کی وعید سنائی اور تفسیری روایات کے مطابق تین دن یا چالیس دن کی مہلت کا ذکر بھی کیا جس کے بعد ان پر عذاب نازل ہونے والا تھا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی لغزش

حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو عذاب کی وعید تو سنا دی مگر اس موقع پر آپ سے ایک لغزش سرزد ہو گئی۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ عام انسانوں کی نسبت زیادہ بلند مرتبت ہوتے ہیں، اللہ کے مقربین میں شامل ہوتے ہیں، اس لیے کسی معمولی لغزش پر بھی ان کی سخت گرفت ہو جاتی ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام سے لغزش یہ ہوئی کہ عذاب کی وعید سنانے کے بعد اللہ کے حکم کے بغیر اس بستی سے نکل گئے۔ سورۃ انبیاء میں اس طرح بیان کیا گیا ہے اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا جب وہ قوم سے ناراض ہو کر غصے میں نکل گئے۔ غصہ یہ کہ ان لوگوں کو اتنا لمبا عرصہ تبلیغ کی ہے مگر یہ مانتے ہی نہیں۔ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ اللہ تعالیٰ ان پر تنگی نہیں ڈالے گا۔ یہ حضرت یونس علیہ السلام کی اجتہادی خطا تھی۔ انہیں اللہ کے حکم کے بغیر بستی کو نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اس کے متعلق مولانا مودودی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یونس علیہ السلام

سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں۔ یہ بات درست نہیں ہے اور اس میں رائی کے دانے کے برابر بھی کوتاہی نہیں ہوئی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اس بات کی تردید کرتے ہوئے اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اگر نبی فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبوت کے منصب عالیہ کے لائق ہی نہیں۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ کوئی نبی فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں ذرہ بھر بھی کوتاہی نہیں کرتا۔ یونس علیہ السلام سے معمولی لغزش ہوئی تھی کہ وہ اللہ کے حکم کا انتظار کیے بغیر بستی سے نکل گئے۔

جب یونس علیہ السلام بستی سے نکل کھڑے ہوئے۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آپ دریا کے کنارے پر پہنچے آپ کا ارادہ یافہ سے ترسیس جانے کا تھا۔ یہ دونوں بستیاں دریائے دجلہ کے کنارے پر تھیں یہ سفر دجلہ میں تھا یا بحر روم میں، اس کے متعلق بھی مختلف روایات ملتی ہیں مگر قرآن پاک میں تفصیل نہیں ہے

حضرت یونس پر ابتلاء

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی تفسیر عزیزی میں اور بعض دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سفر میں حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ ان کی بیوی اور دو بچے تھے۔ راستے میں کہیں چھوٹی ندی عبور کر رہے تھے کہ ایک بچہ ندی میں گر گیا، اس کو پکڑنے کی کوشش کی تو پیچھے سے دوسرے بچے کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔ اسی اثنا میں دوسری طرف کچھ آدمی آئے جو آپ کی بیوی کو پکڑ کر لے گئے۔ اس حادثہ کے بعد آپ کشتی میں سوار ہوئے جس کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے "اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ" (الصّٰفّٰت) جب آپ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ کر گئے اور اس میں سوار ہو گئے۔ جب کشتی پانی کے درمیان میں پہنچی تو بھنور میں پھنس کر ہچکولے کھانے لگی جس کی وجہ سے اس کے غرق ہونے کا خطرہ

پیدا ہوگیا، ملاحوں نے اس زمانے کے دستور کے مطابق کہا کہ کوئی نافرمان آدمی ہماری کشتی میں سوار ہوگیا ہے جس کی نحوست کی وجہ سے تمام مسافروں کی زندگیاں خطرے میں پڑگئی ہیں۔ یا پھر کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگ کر آگیا ہے جس کی وجہ سے سب لوگ مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ اس پر یونس علیہ السلام نے اقرار کیا کہ اپنے آقا سے بھاگا ہوا غلام تو میں ہی ہوں، لہٰذا مجھے کشتی سے اتار دیا جائے تاکہ باقی مسافروں کی جانیں بچ جائیں لوگوں نے آپ کی نورانی وضع قطع اور چہرے کو دیکھ کر یقین نہ کیا کہ آپ کسی کے بھاگے ہوئے غلام ہو سکتے ہیں یا آپ کوئی گنہگار آدمی ہو سکتے ہیں۔ قرآن پاک میں موجود ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ کشتی والوں نے قرعہ نکالا تو وہ آپ ہی کے نام نکلا تین دفعہ قرعہ اندازی ہوئی اور ہر دفعہ یونس علیہ السلام کا نام آیا بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ نے خود ہی پانی میں چھلانگ لگادی تھی تاکہ ان کی وجہ سے سب لوگ ہلاک نہ ہوں۔ بہر حال آپ نے خود چھلانگ لگادی یا کشتی والوں نے آپ کو پانی میں پھینک دیا۔ آگے مچھلی خدا کے حکم سے آپ کی منتظر تھی آپ سیدھے مچھلی کے منہ میں گرے اور اس کے پیٹ میں چلے گئے۔ اس پریشانی اور تکلیف کا حال قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں موجود ہے مچھلی کے پیٹ میں پہنچ کر آپ کو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی، سانس گھٹ رہا ہوگا اور آپ پانی کی تہوں میں مچھلی کے پیٹ میں کیسے محسوس کرتے ہوں گے۔

سورۃ انبیاء میں آتا ہے کہ اس تہ در تہ اندھیروں میں " فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ " یونس علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو پکارا کہ اے مولا کریم! تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو پاک ہے اور خطاکار تو میں ہی تھا اللہ تعالیٰ

مصیبت سے نجات

نے آپ پر رحم فرمایا۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ اگر آپ یہ تسبیح نہ کرتے لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِہٖٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ تو آپ کو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رکھا جاتا۔ اسی تسبیح کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قید خانہ سے نجات دی۔ آپ نے کتنا عرصہ مچھلی کے پیٹ میں رہے، اس کی تصریح نہیں، تاہم تفسیری روایات میں تین دن یا چالیس دن کا ذکر ملتا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت[1] میں ہے دَعْوَۃُ الْمَکْرُوْبِ دَعْوَۃُ ذِی النُّوْنِ یعنی مصیبت زدہ آدمی کے لیے یہی دعا ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ اللہ تعالیٰ اس دعا کی برکت سے مصیبت زدہ آدمی کی پریشانی دور کر دے گا۔ یہ ایسی بابرکت دعا ہے جو یونس علیہ السلام کی زبان سے جاری ہوئی۔ اس کے بعد مچھلی کو حکم ہوا کہ انہیں پانی سے باہر پھینک دیا جائے۔ سورۃ القلم میں اللہ نے یہ احسان جتلایا ہے لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَکَہٗ نِعْمَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَھُوَ مَذْمُوْمٌ اگر اللہ تعالیٰ کی نعمت اور مہربانی ان کا تدارک نہ کرتی تو آپ کو چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا اس حالت میں کہ آپ مارے ہوئے ہوتے۔ پھر سورۃ الصّٰفّٰت میں فرمایا فَنَبَذْنٰہُ بِالْعَرَآءِ وَھُوَ سَقِیْمٌ ہم نے انہیں چٹیل میدان میں ڈال دیا اس حالت میں کہ وہ بیمار تھے، البتہ اللہ نے مچھلی کے پیٹ کو وحی کی تھی کہ یونس علیہ السلام تیری خوراک نہیں ہیں بلکہ یہ ان کے لیے قید خانہ ہے۔ چنانچہ اس دوران آپ کے تمام اعضاء صحیح سلامت رہے مگر مچھلی کے پیٹ کی گرمی کی وجہ سے کھال نہایت نرم ہو گئی۔

صحرا میں سامان زیست

صحرا میں آپ کو ریت پر پھینک دیا گیا جہاں سایہ کے لیے کوئی درخت بھی نہ تھا مگر اللہ نے فرمایا وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْہِ شَجَرَۃً مِّنْ

[1] ترمذی صفحہ

يَقْطِيْنٍ (الصّٰفّٰت) ہم نے آپ پر کدو کی بیل اگا دی۔ کدو کے پتے بڑے نرم اور ملائم ہوتے ہیں اور اس پر مکھی بھی نہیں بیٹھتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کے لیے سایہ کا بندوبست کدو کی بیل کے ذریعے کر دیا حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کدو بہت پسند فرمایا کرتے تھے ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ کدو میرے بھائی یونس علیہ السلام کا درخت ہے، اللہ نے یہ اُن کے لیے لگایا تھا یہ مرطوب سبزی ہے مگر اطباء کہتے ہیں کہ مرطوب ہونے کی وجہ سے یہ مقوی حافظہ ہے حالانکہ اکثر مرطوب چیزیں حافظہ کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم ممکن حد تک کدو کا بکثرت استعمال کرتے تھے کیونکہ حضور علیہ السلام کو یہ سبزی بڑی مرغوب تھی۔

اُدھر آپ کی خوراک کا بندوبست اللہ نے یہ کیا کہ ایک جنگلی بکری کا بچہ گم ہو گیا تھا، اس کی تلاش میں اُدھر آنکلی۔ حضرت یونس علیہ السلام کے قریب آئی تو آپ نے اس کا دودھ پیا۔ جب تک آپ اس مقام پر مقیم رہے بکری آکر آپ کو دودھ پلاتی رہی۔ اس اثنا میں آپ کے جسم کی کھال بھی اصل حالت پر آگئی اور آپ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے پھر اللہ کا حکم ہوا فَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (الصّٰفّٰت) پھر ہم نے آپ کو ایک لاکھ یا زائد لوگوں کی طرف بھیجا اس سے مراد وہی نینوا کی بستی ہے جہاں سے آپ نکلے تھے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب تھی۔

قوم یونس کی توبہ

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر اشارۃً یہ بات بتلائی ہے۔ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ پس کیوں نہ ہوئی کوئی ایسی بستی جو ایمان لاتی۔ پھر اُس کا ایمان اُس کو فائدہ پہنچاتا مگر

قوم یونس۔ یعنی یہ تاریخ عالم میں واحد قوم ہے کہ عذاب آجانے کے بعد جس کی توبہ قبول ہوئی۔ اِس سلسلے میں مفسرین کی دو رائیں ہیں۔ امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ قوم یونس کے واقعہ کو قانون قدرت میں استثناء حاصل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عذاب وارد کرنے کے بعد اس قوم کے سوا کسی قوم کی توبہ قبول نہیں کی۔ البتہ بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے اور یہ جو قوم یونس سے بظاہر عذاب ٹل گیا تھا، یہ اصل میں عذاب آیا ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس کی ایک معمولی سی جھلک ظاہر کی گئی تھی تاکہ یونس علیہ السلام کی نبوت کی صداقت واضح ہو جائے۔ آسمان پر دھوئیں کی شکل میں سیاہ بادل نظر آئے تھے جن کی وجہ سے مکانوں کی چھتیں بھی سیاہ ہو گئی تھیں مگر فی الواقع عذاب نازل نہیں ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آسمان پر سیاہ بادل دیکھ کر نینوی کی بستی والوں کو احساس ہوا کہ اللہ کا نبی ٹھیک ہی کہتا تھا اور اب ہم پر عذاب نازل ہونے والا ہے تو وہ نبی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے مگر یونس علیہ السلام تو حادثہ کا شکار ہو چکے تھے، وہ کہاں ملتے۔ بالآخر قوم کے سارے لوگ بڑے، چھوٹے، بچے عورتیں حتیٰ کہ ان کے جانور بھی بستی سے باہر نکل گئے اور آہ وزاری شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے جرم کی معافی طلب کی تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور عذاب کے جو آثار نظر آ رہے تھے وہ ہٹ گئے۔ اللہ نے فرمایا لَمَّآ اٰمَنُوْا جب وہ صدقِ دل سے ایمان لے آئے كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی میں ذلت والا عذاب کھول دیا اور وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ اور انہیں ایک خاص وقت تک فائدہ پہنچایا۔ مطلب یہ کہ ان سے فوری طور پر تو عذاب ٹل گیا پھر وہ کافی مدت تک ایمان کی حالت پر قائم رہے۔ پھر وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ ان کے حالات بگڑنے شروع ہوگئے، وہ پھر کفر و شرک اور معاصی میں مبتلا ہوگئے اور اس طرح ہم نے ایک خاص مدت تک ان کو زندگی دی اور سزا سے بچائے رکھا۔ ایک خاص وقت تک فائدہ اٹھانے کا یہی مطلب ہے۔

حضرت یونس کا ازالۂ فقدان

اُدھر یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ سے باہر آنے اور کچھ دن چٹیل میدان میں رہنے کے بعد جب اپنی بستی کی طرف واپس آ رہے تھے تو اُن کا ایک بچہ بکریاں چرانے والے ایک گڈریے کے ہاں مل گیا اس شخص نے دریافت کرنے پر بتایا کہ یہ بچہ انہوں نے پانی سے نکالا تھا۔ اس گڈریے نے بتایا کہ ایسا ہی ایک لاوارث بچہ فلاں لوگوں کے پاس بھی ہے یونس علیہ السلام وہاں پہنچے تو اسے بھی اپنا بچہ پایا۔ اُن لوگوں نے بتایا کہ یہ بچہ انہوں نے ایک بھیڑیے کے منہ سے چھڑایا تھا۔ آپ کی بیوی کے متعلق شاہ عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں کہ کوئی گھوڑے پر سوار شہزادہ اُدھر سے گزرا تھا جو آپ کی بیوی کو ہمراہ لے گیا۔ وہ شہزادہ اچانک پیٹ کے شدید درد میں مبتلا ہوگیا مگر پورے علاج کے باوجود افاقے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کسی درویش منش آدمی نے شہزادے سے کہا کہ تم کسی شخص کی بیوی کو بدنیتی سے لے آئے ہو، جب تک اسے واپس نہ کرو۔ اور اس سے معافی نہ مانگو، تم صحت یاب نہیں ہو سکتے۔ اس طرح آپ کی بیوی بھی آپ کو واپس مل گئی۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنْتَ
تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٩٩﴾ وَمَا
كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَجْعَلُ
الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٠٠﴾ قُلِ انْظُرُوا مَاذَا
فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ
عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠١﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ
أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي
مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ
آمَنُوا ۚ كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٣﴾ ع

ترجمہ:۔ اور اگر چاہتا تیرا پروردگار تو البتہ ایمان لاتے جو بھی
زمین میں ہیں سب کے سب. پس کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں
گے یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں (۹۹) اور نہیں ہے کسی نفس
کے لیے کہ وہ ایمان لانے مگر اللہ کے حکم سے . اور ڈالتا ہے
اللہ تعالیٰ نجاست اُن لوگوں پر جو سمجھ نہیں رکھتے (۱۰۰) آپ
کہہ دیجئے کہ دیکھو جو کچھ بھی ہے آسمانوں میں اور زمین میں
اور نہیں فائدہ دیتیں نشانیاں اور ڈرانے والے اُن لوگوں کو جو
ایمان نہیں لاتے (۱۰۱) پس نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر مثل

ان لوگوں کے دنوں کی جو ان سے پہلے گزرے ہیں. آپ کہہ دیجئے
اے پیغمبر! پس تم انتظار کرو. بیشک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار
کرنے والوں میں سے ہوں (۱۰۲) پھر ہم نجات دیتے ہیں اپنے
رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے، اسی طرح ثابت ہے
ہمارے اُوپر کہ ہم نجات دیتے ہیں ایمان والوں کو (۱۰۳)

ربط آیات

گزشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کا حال بیان فرمایا، نیز آپ کی قوم کی منفرد حیثیت کا تذکرہ فرمایا کہ یہ واحد قوم ہے جس کی توبہ اللہ تعالیٰ نے عذاب کی نشانیاں ظاہر ہو جانے کے بعد قبول کی. اس سلسلے میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عذاب کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کی تصدیق کے لیے عذاب کی کچھ علامات ظاہر فرمائی تھیں. اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور آپ پر ایمان لانے والوں کو تسلی دی ہے کہ لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپ دل برداشتہ نہ ہوں کیونکہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے. اور آپ کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کر سکتے.

ہدایت اور گمراہی کا قانون

سو اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور گمراہی کا وہ قانون بیان فرمایا ہے جس کے تحت بعض لوگوں کو ہدایت نصیب ہوتی ہے اور بعض گمراہی میں بھٹکتے رہتے ہیں. ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں بسنے والے سارے کے سارے افراد ایمان لے آتے اور کوئی بھی کافر اور مشرک باقی نہ رہتا. یہاں پر شَآءَ سے مراد محض چاہنا نہیں بلکہ مجبور کرنا ہے. کہ تمام لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دیا جاتا. تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سامنے کون دم مار سکتا ہے، لہٰذا سب ایماندار ہو جاتے. سورۃ نحل میں ہے وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ اگر ہم چاہتے تو سب کو ایک ہی لائن پر ڈال کر ہدایت دے دیتے. اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے. وہ کسی پر جبراً ہدایت ٹھونس سکتا ہے مگر ایسی

مصلحت کے خلاف ہے۔ سورۃ ہود میں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا "لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً" تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا" وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ" مگر وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انھیں جبراً کسی چیز پر جمع نہیں کرنا چاہتا، ایمان وہی قبول ہوتا ہے جو اللہ کے دیے ہوئے اختیار کے مطابق اپنی مرضی سے شرح صدر کے ساتھ قبول کیا جائے "اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ" کیا آپ لوگوں کو مجبور کرینگے کہ وہ مومن بن جائیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ واضح قانون دیا ہے "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (البقرہ) یاد رکھو! دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اللہ نے ہدایت اور گمراہی دونوں باتوں کو واضح کر دیا ہے، لہٰذا جو کوئی اپنی مرضی سے ایمان قبول کریگا وہی بہتر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے تمام ذرائع عقل، سمجھ، اختیار اور ارادہ وغیرہ انسان کو دیا کیے ہیں، لہٰذا اب یہ ذمہ داری ہر انسان کی ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ سورۃ کہف میں ہے "فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ" جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے انکار کردے، یہ اُس کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس پر کسی قسم کا جبر نہیں ہے البتہ ہر شخص کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اگر وہ ایمان لائے تو خدا تعالیٰ اُس پر راضی ہو کر اپنی رحمت کے مقام میں داخل کریگا اور اگر اُس نے کفر کا راستہ اختیار کیا تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ خسارے میں رہے گا۔

دین میں جبر نہیں

اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو بھی فرمایا کہ آپ کا کام کسی کو زبردستی منوانا نہیں ہے بلکہ "فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ" (الرعد) آپ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اس کے بعد کسی شخص کے اعمال کا حساب لینا ہمارے ذمے ہے، اس سلسلے میں آپ سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی۔ اسی طرح سورۃ غاشیہ میں فرمایا "لَسْتَ عَلَيْهِمْ

بِمُصَیْطِرٍ آپ اُن پر کوئی داروغہ نہیں ہیں کہ اُن سے زبردستی منوالیں۔ آپ اللہ کے رسول ہیں اور کسی کو مجبور کرنا رسول کا کام نہیں ہوتا۔ غرضیکہ ایمان قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال براہِ راست ہر شخص سے ہوگا اور کسی نبی یا مبلغ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہ لائے۔

پھر اللہ نے ہدایت کا یہ قانون بھی بیان فرما دیا وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کسی نفس کے لیے یہ بات نہیں ہے کہ وہ ایمان لائے جب تک کہ اللہ کا حکم نہ ہو۔ خدا تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے ہی انسان ہدایت حاصل کرتے ہیں کیونکہ اللہ کی مشیت اور ارادہ ہی غالب ہے، لہٰذا اُس کے حکم کے بغیر ایمان اور ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی لیکن یہ بات یاد رکھو وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ اللہ تعالیٰ نجاست اور گندگی انہی پر ڈالتا ہے جو عقل کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتے۔ کفر، شرک اور معاصی میں ملوث رہنے والے لوگوں پر گندگی پڑتی ہے

عقیدے کی نجاست

یہاں پر رجس سے مراد عقیدے کی گندگی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج) بت پرستی کی نجاست سے بچو۔ سورۃ مدثر میں ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ہر قسم کی گندگی کو اپنے آپ سے دور رکھیں، خاص طور پر عقیدے کی نجاست کو بہت بری نجاست ہے۔ سورۃ توبہ میں بھی آپ منافقین کے متعلق سن چکے ہیں اِنَّهُمْ رِجْسٌ اِن کے دل و دماغ اور قلب و روح میں نفاق کی نجاست ہے آپ اِن کو چھوڑ دیں۔

عقل کا استعمال

اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق سورۃ انفال میں فرمایا ہے اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ایسے لوگ اللہ کے نزدیک بدترین جانور ہیں جو اندھے اور بہرے ہیں اور عقل کو صحیح استعمال نہیں کرتے۔ اللہ نے انسان کو عقل جیسا عظیم جوہر

عطا کو کے لئے مکلف بنایا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا آگے آؤ، وہ آگے آگئی، پھر فرمایا پیچھے ہٹ جاؤ، تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر فرمایا کہ تیری وجہ سے ہی میں مؤاخذہ کروں گا، تیری وجہ سے ہی عطا کروں گا اور تیری وجہ سے ہی منع کروں گا۔ پاگل آدمی یا چھوٹے بچے سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی کیونکہ وہ عقل نہیں رکھتا۔ جوابدہی کا مدار اللہ نے عقل پر رکھا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اپنی عقل کو صحیح استعمال نہیں کرتے گندگی اُن پر پڑتی ہے۔ وہ ہمیشہ ضد، عناد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو دیکھ لیں بظاہر بڑے دانا سمجھے جاتے ہیں مگر عقل کے غلط استعمال کی وجہ سے ان پر گندگی پڑی ہوئی ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ عقل دو قسم کی ہوتی ہے یعنی عقلِ معاش اور عقلِ معاد۔ بعض لوگ عقلِ معاش میں بڑے کامل ہوتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے ڈاکٹر، انجینئر، فلاسفر اور ماہرینِ تعلیم شامل ہیں مگر ان کی عقل عقلِ معاش تک محدود ہے۔ انہوں نے دنیوی ترقی کے لیے بڑی ایجادات کی ہیں، علم و فن کو عروج کی بلندیوں تک پہنچایا ہے مگر عقلِ معاد کے لحاظ سے بالکل صفر ہیں۔ وہ آخرت کی بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ دین اسلام، قرآن، انبیاء، کتب سماویہ اور معاد پر اعتراض کرنے والے بے عقل لوگ ہیں۔ انہوں نے عقلِ سلیم کو ٹھیک طور سے استعمال نہیں کیا۔ ایسے شخص کی اپنی عقل ٹیڑھی ہوتی ہے لیکن وہ دوسری چیز کو ٹیڑھا سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال بھینگے آدمی کی ہے جس کی اپنی آنکھ میں نقص ہوتا ہے اور اس کو ایک کے دو دو نظر آتے ہیں۔ یرقان کا مریض بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ ہر چیز اپنے قدرتی رنگ پر ہوتی ہے مگر بیماری کی وجہ سے اُسے ہر چیز زرد نظر آتی ہے اسی طرح معاد کا انکار بھی کسی شخص کی اپنی عقل کی خرابی اور اس کے غلط استعمال کی وجہ سے ہوتا ہے اسی

لیے فرمایا کہ ہر نفس اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایمان لاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نجاست اُس پر ڈالتا ہے جو عقل کو صحیح طریقے سے استعمال نہیں کرتا۔

مشاہدہ نشانات قدرت

فرمایا قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اے پیغمبر! آپ ان سے کہ دیں کہ دیکھو جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور زمین میں ہے۔ دیکھو! اللہ نے اپنی قدرت کی کتنی نشانیاں پھیلا رکھی ہیں انہی نشانیوں کو دیکھ کر لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچانتے ہیں۔ وسیع آسمان پر پھیلے ہوئے سیارے اور ستارے شمس و قمر، فضائیں اور ہوائیں، ابر و باراں، شجر و حجر، پہاڑ، سمندر، دریا، پھول اور پھل سارے کے سارے نشانات قدرت ہیں اگر انسان تھوڑا سا غور کرے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت تامہ اور حکمت بالغہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ سورۃ یوسف میں فرمایا کتنے لوگ ہیں يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ جو ان نشانیوں پر گزر جاتے ہیں مگر ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، عقل کو صحیح طور پر استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں کرتے۔

فرمایا، دیکھو آسمان و زمین میں کیا کچھ ہے وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ مگر یہ نشانات اور ڈرانے والے ان لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں دیتے جو ایمان ہی نہیں لاتے۔ جو لوگ ضد، عناد، اور ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہیں ان کے لیے نہ کوئی معجزہ کارگر ہوتا ہے اور نہ کوئی دیگر نشانی۔ ڈرانے والی نشانیاں بھی ہو سکتی ہیں اور وہ ہادی اور راہنما بھی جو انذار کا کام کرتے ہیں۔ وہ سمجھانے کی بڑی کوشش کرتے ہیں مگر ان کے دل میں کوئی بات نہیں بیٹھتی اُن کے ذہنوں میں تعصب اور عناد بھرا ہوا ہے، لہٰذا ان پر کوئی چیز اثر نہیں کرتی۔ ان نشانات سے وہ لوگ مستفید ہوتے ہیں جو اعتدال پسند ہوں اور حق میں سمجھنے کا جذبہ موجود ہو۔

ایام اللہ کا انتظار

فرمایا، اے پیغمبر! فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ

خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ کیا یہ لوگ نہیں انتظار کرتے ہیں. مگر
مثل اُن دنوں کی جو ان سے پہلے لوگوں پر گزرے ہیں۔ ایام دو قسم کے ہیں
جن کا ذکر قرآن میں ایام اللہ کے عنوان سے آیا ہے. یہ ایام وہ ہیں کہ بعض
لوگوں کے لیے انعام کا باعث ہوتے ہیں اور بعض کے لیے تعذیب کا
تو فرمایا کیا یہ بھی ایسے ایام کے انتظار میں ہیں جو قوم نوح، قوم لوط، عاد اور
ثمود پر گزرے ان اقوام کو اللہ نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے عذاب
میں مبتلا کیا تو کیا یہ بھی کسی عذاب کے انتظار میں ہیں۔

یہی دن بعض لوگوں کے لیے بابرکت ہوتے ہیں جیسا کہ یونس علیہ السلام
کی قوم کے حق میں عاشورے کا دن بابرکت دن ہے جب کہ ان کی توبہ قبول
ہوئی. یہ دن بنی اسرائیل کے لیے بھی بابرکت ہے کہ اللہ نے انہیں اسی
دن فرعونیوں سے نجات دی. مگر یہی دن فرعون اور اس کے لاؤ لشکر
کے لیے سختی کا دن ثابت ہوا کہ وہ ہلاک ہو گئے. تو فرمایا پس نہیں انتظار
کرتے یہ لوگ مگر مثل اُن لوگوں کے دنوں کے جو ان سے پہلے گزرے
ہیں۔ اور جن پر سزائیں نازل ہوئیں۔ فرمایا گرفت کرنا یا سزا دینا میرا کام نہیں
قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ
اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ اُس دن کا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے
ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا حکم اور اُس
کی مشیت سامنے آجائے گی، پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ تمہاری نافرمانی
اور ہٹ دھرمی کا کیا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔

اہل ایمان کا تحفظ

فرمایا خدا تعالیٰ کا قانون یہ رہا ہے ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا پھر ہم بچاتے ہیں اپنے رسولوں کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے
دُنیا میں جب بھی اللہ کے رسولوں نے حق کا پیغام سنایا اور ہدایت کا سلسلہ
واضح کیا تو قوم نے مخالفت کی اور رسولوں کو اور اہل ایمان کو ختم کرنے کی

کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ وہ ان کی حفاظت کرتا ہے نوح علیہ السلام کی قوم نے انکار کیا تو ان سب کو غرق کر دیا گیا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام اور اہلِ ایمان کو بچا لیا گیا۔ اسی طرح فرعون اور اس کے لشکری ہلاک ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل بچا لیے گئے۔ باقی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی ایسے ہی واقعات پیش آئے۔ حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہم کی اللہ نے خود حفاظت فرمائی اور ان پر ایمان لانے والوں کو بھی کفار کی دست برد سے محفوظ رکھا۔ سورۃ المومن میں بھی آتا ہے "اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ" ہم اپنے رسولوں اور ان کے ماننے والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی اُن کو غلبہ حاصل ہوگا جس دن گواہ کھڑے ہوں گے یعنی قیامت کے دن اس کے برخلاف کفار ومشرکین ذلیل ہو کر جہنم کے مستحق ہوں گے۔ نتیجہ کے اعتبار سے دنیا اور آخرت میں انبیاء اور اہلِ ایمان ہی کو کامیابی حاصل ہوگی۔ اگرچہ اللہ والوں کو بعض تکالیف بھی پہنچتی ہیں اور انہیں بعض آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے مگر بالآخر وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر عذاب آ بھی جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو بچا لیتا ہے۔ فرمایا كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ اسی طرح ہم پر ثابت ہے کہ ہم ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔

اللہ پر حق کا قیام

حق کا معنی ثابت ہونا یا پختہ ہونا ہے۔ حق کو حق اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پختہ اور اٹل چیز ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف باطل مٹنے والی چیز ہوتی ہے کیونکہ بطلان کا معنی کسی چیز کا مٹ جانا ہے۔ امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر حق سے مراد رحمت ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت اور شفقت

سے ایمان والوں کو محفوظ رکھتا ہے ، ورگرنہ خدا تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ اسی لیے فقہ اور عقیدے کی کتابوں میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ "بحق فلاں" کہنا مکروہ ہے کیونکہ لَاحَقَّ لِلْمَخْلُوْقِ عَلَی الْخَالِقِ مخلوق کا کوئی حق خالق پر ثابت نہیں ہوتا۔ معتزلہ جیسے قدیم فرقوں میں سے بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ جو چیز بندے کے لیے اچھی ہے وہ اللہ پر واجب ہے۔ یہ بالکل غلط عقیدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں، وہ بے نیاز ہے البتہ اس نے اپنی رحمت سے کوئی چیز اپنے ذمہ لے لی ہو تو یہ اس کی مہربانی ہے۔ تو یہاں پر بھی حَقًّا عَلَیْنَا کا مطلب یہی ہے کہ ہماری مہربانی سے ہم پر یہ ثابت ہے کہ ہم اہل ایمان کو نجات دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سورۃ انعام میں فرمان ہے کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ اس نے اپنی مہربانی سے اپنے اوپر اپنی رحمت کو لکھ رکھا ہے۔

حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ حضرت معاذؓ حضور علیہ السلام کے ردیف تھے۔ آپ نے فرمایا معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ بندے صرف اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔ پھر فرمایا، معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے۔ عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا جب بندے اپنے حقوق کو پورا کریں تو پھر ان کا حق اللہ پر یہ ہے کہ وہ ان کو سزا نہیں دے گا بلکہ جنت تک پہنچائے گا۔ لیکن یہ حق بھی اللہ پر واجب نہیں بلکہ اس کی مہربانی کا حق ہے، اس نے اپنی مہربانی کے ساتھ یہ بات اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ تو اس حق کے مطابق آدمی دعا بھی کر سکتا ہے جیسے سہ

---

[1] مشکوٰۃ ص ۱۴

الٰہی بحق بنی فاطمہ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ بر قولِ ایماں کنم خاتمہ

اے اللہ! اہل بیت کا جو حق اپنی مہربانی سے تو نے اپنے ذمے لے رکھا ہے، اس حق کے ساتھ یہ سوال کرتا ہوں۔ مطلب یہ کہ بندوں کا حق اللہ پر واجبی نہیں ہو سکتا۔

حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے مَنْ ذَبَّ عَنْ عِرْضِهٖ جو آدمی اس دنیا میں اپنے بھائی کی آبرو کو بچائے گا، اللہ تعالیٰ اُسے جہنم سے بچائے گا، یہ اللہ پر اس کی مہربانی کا حق ہے۔ مقصد یہ کہ اللہ کا حق بندوں پر تو ضرور ہے کیونکہ وہ مخلوق ہیں مگر بندوں کا اللہ پر کوئی حق نہیں کیونکہ وہ خالق ہے۔ ہاں! اپنی مہربانی سے جو چیز اس نے اپنے ذمے رکھی ہے، وہ اس کو پورا کرتا ہے۔

غرضیکہ فرمایا کہ اسی طرح ہماری مہربانی سے ہم پر ثابت ہے کہ ہم اہل ایمان کو ضرور نجات دیں گے۔ دنیا میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی قوم پر کوئی سزا آتی ہے تو ایمان والوں کو الگ کر لیا جاتا ہے۔ یہ تو دنیا کا حال ہے کہ اپنے اپنے زمانے میں انبیاء کے ساتھ واقعات پیش آتے رہے اور آخرت کے متعلق تو اللہ نے خود ہی فرما دیا ہے کہ قیامت کے دن جب گواہ کھڑے ہوں گے تو اس دن ہم ایمان والوں کو بچا لیں گے اور مخالفین کو ذلیل و رسوا کریں گے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ
فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ
اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ
وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ
اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا
كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ
يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ
الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ :- اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ، اے لوگو ! اگر تمہیں شک ہو میرے دین کے بارے میں تو میں نہیں عبادت کرتا اُن کی جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا ۔ لیکن میں تو عبادت کرتا ہوں اُس اللہ کی جو تمہاری جانوں کو کھینچتا ہے اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ ہو جاؤں میں ایمان والوں میں سے ﴿۱۰۴﴾ اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ قائم رکھیں آپ اپنے رُخ کو دین کے لیے حنیف (سیدھے) ہو کر ، اور نہ ہوں آپ شرک کرنیوالوں میں

سے (۱۰۵) اور نہ پکاریں آپ اللہ کے سوا ان چیزوں کو جو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان ۔ پس اگر بالفرض آپ نے ایسا کیا تو بیشک آپ بھی اُس وقت البتہ ظلم کرنے والوں میں سے ہوں گے (۱۰۶) اور اگر پہنچائے اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی تکلیف ، پس نہیں کھولنے والا اس کو اس کے سوا کوئی ۔ اور اگر وہ ارادہ کرے آپ کے ساتھ بھلائی کا ، پس کوئی نہیں رَدّ کرتا اُس کے فضل کو ۔ پہنچاتا ہے وہ اپنا فضل جس کو چاہے اپنے بندوں میں سے اور وہ بے انتہا بخشش کرنے والا اور انتہا مہربان ہے (۱۰۷)

ربط آیات

گذشتہ دروس میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کا رَدّ کیا اور اس سلسلے میں قوم نوح قوم فرعون اور قوم یونس کی مثال بیان فرمائی ۔ اللہ نے یہ بات بھی سمجھادی ہے کہ جو لوگ تعصب عناد اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں اُن پر کفر و شرک کی گندگی پڑتی رہتی ہے کیونکہ وہ انصاف سے کام نہیں لیتے اور نہ خدا تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں غور و فکر کرتے ہیں ۔ ایسے لوگ نہ تو انبیاء علیہم السلام کی بات سنتے ہیں ، نہ اُسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ عقل کو صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں ، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر کفر و شرک کی گندگی پڑتی رہتی ہے ۔

اس سورۃ کی ابتداء میں بھی یہ بات بیان کی گئی تھی کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ عبادت صرف اُسی کی کی جائے ۔ اس کے ساتھ دعوت الی القرآن کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ۔ اب سورۃ کے آخر میں بھی اللہ تعالیٰ نے اعتقاد کی پختگی کی بات کی ہے ۔ البتہ درمیان میں دیگر مضامین مثلاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ، شرک کا رد ، قرآن پاک کی صداقت و حقانیت ، منکرین رسالت انبیاء پر ایمان اور اُن کے فرمودات پر عمل وغیرہ بیان ہوئے ہیں ۔ اب آخر میں بھی انہی تین بنیادی مسائل کے علاوہ چوتھی بات قیامت کا ذکر بھی فرمایا ہے ۔

خدائے واحد کی عبادت

سب سے پہلے ایمان کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اے پیغمبر! قُلْ آپ کہہ دیں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اے لوگو! اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ اگر تمہیں میرے دین کے بارے میں کوئی شک ہو، تم میرے دین کے متعلق جاننا چاہو کہ یہ سچا ہے یا نہیں اور یہ بھی کہ میرے دین کا اصول کیا ہے، تو میں تمہیں واضح طریقے سے بتلا دینا چاہتا ہوں فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ پس میں نہیں عبادت کرتا اُن کی جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا۔ تم نے تو اللہ کے علاوہ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں جنہیں تم اپنی حاجتوں میں پکارتے ہو جن کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہو مگر یاد رکھو! میرے لیے اُن کی عبادت کرنا قطعی ناممکن ہے وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ لیکن میں تو اس خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے، یعنی جو تمہاری جانوں کو قبض کرتا ہے میرا دین توحید کامل ہے یعنی عبادت صرف اللہ کی کرنا، اس کی وحدانیت پر ایمان لانا اور اپنی حاجتوں میں صرف اسی کو پکارنا۔

وفات بطور دلیل

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی وفات کو اپنی وحدانیت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ موت ایک ایسی یقینی بات ہے جس پر تمام بنی نوع انسان کا اتفاق ہے۔ پوری مخلوق میں کوئی فرد واحد بھی ایسا نہیں ہوگا جسے موت کے واقع میں اختلاف ہو۔ موت کے مشاہدات روزمرہ زندگی میں ہوتے رہتے ہیں، ہر زندہ انسان، جانور، پرندہ، درندہ، کیڑا مکوڑا موت کا ذائقہ چکھے بغیر نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب فرمایا وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (الحجر) آپ اپنے رب کی عبادت کرتے چلے جائیں۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس یقینی بات یعنی موت آجائے

مطلب یہ ہے کہ موت ایک یقینی بات ہے جو آکر رہے گی۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے اور اپنے نبی سے کہلوایا ہے کہ میں تو اُس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تم سب کو وفات دیتا ہے۔ متنبی بھی کہتا ہے کہ لوگ ہر چیز میں اختلاف کرتے ہیں اِلَّا عَلٰی شَجَبٍ مگر موت کے معاملہ میں اختلاف نہیں کرتے، اس کے وارد ہونے پر سب متفق ہیں مطلب یہ کہ عبادت کے لائق صرف وہی ذات ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی بھی ہے اور موت بھی۔ بعض لوگوں نے جہالت کی بناء پر یہ تصرف غیروں میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ قطعاً غلط ہے بعض نے تین خدا تسلیم کیے ہیں، ایک پیدا کرنے والا، دوسرا پالنے والا اور تیسرا موت دینے والا۔ یہ سب مشرکیہ عقائد ہیں۔ کیونکہ حَیُّ الْقَیُّوْمُ بھی وہی ہے اور یُحْیٖ وَیُمِیْتُ بھی وہی ذات باری تعالیٰ ہے اللہ ہی زندہ کرتا، وہی موت دیتا اور وہی اٹھاتا ہے۔ بہرحال موت ایک قطعی اور یقینی امر ہے جسے بطورِ دلیل پیش کیا گیا ہے۔

ایمان پر استقامت

اللہ نے فرمایا کہ آپ کہہ دیں کہ میں تو اُس خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں جو تم پر موت طاری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وَاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اہل ایمان میں سے ہو جاؤں۔ اور ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا ہے وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا کہ آپ اپنے رُخ کو دین کے لیے قائم رکھیں حنیف بن کر۔ حنیف اُس شخص کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے ہٹ کر صرف ایک طرف لگنے والا ہو یعنی توحید کا قائل ہو اور یکسو ہو کر صرف ایک خدا کی عبادت کرنے والا ہو، نماز کے وقت اپنا رُخ بیت اللہ شریف کی طرف کرتا ہو، حج کرے اور ختنہ کرے شاہ ولی اللہؒ

نے حنیف کی یہی صفات بیان کی ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حنیف بننے کا حکم دیا تھا اسی طرح حضور علیہ السلام کو بھی یہی حکم دیا حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (الحج) تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کے سامنے حنیف بن جاؤ، اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ، اسی لیے فرمایا کہ آپ اپنے چہرے کو دین کے لیے قائم رکھیں حنیف بن کر۔ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اور نہ ہوں آپ شرک کرنے والوں میں۔

شرک کی بیماری

شرک ایک مہلک بیماری ہے جو انسان میں شروع سے ہی پائی جاتی ہے۔ کبھی عبادت میں شرک ہوتا ہے اور کبھی صفاتِ خداوندی میں شرک کیا جاتا ہے۔ لوگ غیروں کے تقرب کے لیے جانور ذبح کرتے ہیں جو شرک کی مکروہ قسم ہے۔ کبھی نام رکھنے میں شرک کیا جاتا ہے اور کبھی جنات کو خدا تعالیٰ کے شریک بناتے ہیں۔ مکان بناتے وقت اُس کی بنیادوں میں خون گرایا جاتا ہے تاکہ جنات نقصان نہ پہنچائیں۔ کوئی جبرائیل اور میکائیل فرشتوں کو مصیبت میں پکارتا ہے، کوئی اولیاء اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اُن کی قبروں کی ہی پوجا کرتا ہے۔ کوئی غیر اللہ کو سجدہ کر کے مشرک بنتا ہے تو کوئی انتہائی تعظیم کی کسی دوسری صورت میں شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح نذر لغیر اللہ بھی شرک ہی کی قسم ہے، جس نے غیر اللہ کے نام پر جانور نامزد کیا، وہ بھی مشرک ٹھہرا۔ اور جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی، وہ بھی شرک کا مرتکب ہوا۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شرک کی کوئی بات گوارا نہیں، اسی لیے فرمایا کہ آپ شرک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

اپنی ضروریات میں اللہ کے علاوہ دوسروں کو پکارنا بھی شرک کی ایک قسم ہے۔ اسی لیے فرمایا وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا

يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ آپ اللہ کے سوا ان کو نہ پکاریں جو نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، نافع اور ضار تو صرف اللہ کی ذات ہے قادرِ مطلق، علیم کل، مختار کل اور حاضر و ناظر صرف وہی ہے۔ جو شخص یہ صفات غیروں میں ماننے گا۔ اپنی حاجات میں انہیں پکاریگا، وہ لازماً مشرک بنے گا۔ لہٰذا آپ کو بھی اس سے منع فرمایا گیا۔ اور ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے فَاِنْ فَعَلْتَ اگر آپ نے بھی دوسروں کو پکارا، اُن سے حاجت روائی کی درخواست کی فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ تو آپ بھی ظلم کرنے والوں میں سے ہوں گے۔ ظلم کا معنی کسی چیز کو بے محل کرنا ہے اور اس کے متعلق سورۃ لقمان میں ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے لہٰذا اس سے ہمیشہ بچتے رہنا چاہیئے۔

مافوق الاسباب استعانت

اس آیت کریمہ میں جس پکارنے سے منع کیا گیا ہے، وہ مافوق الاسباب مدد کے لیے پکارنا ہے۔ یہاں پر لوگ دو چیزوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں اسباب کے دائرے میں رہتے ہوئے تو پکارنا بالکل جائز بلکہ اولیٰ ہے ظاہری اسباب میں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ بیمار ہو تو ڈاکٹر سے رجوع کرو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اللہ کے بندو! جب بیمار پڑ جاؤ تو علاج معالجہ کیا کرو۔ کوئی ضرورت مند مسکین آدمی کسی دوسرے شخص سے اشیائے خورد و نوش کا سوال کرتا ہے یا مالی امداد کی درخواست کرتا ہے تو اس کی مدد کرنا نیکی کا کام ہے۔ البتہ ڈاکٹر یا دوائی کو مؤثر بالذات سمجھنا شرک کی تعریف میں آئے گا۔ علاج ضرور کرو مگر شفا اللہ سے طلب کرو۔ اُس کی مشیت ہوگی تو دوائی سے فائدہ ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا اسی طرح عام نیکی کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اللہ کے حکم کی تعمیل کرنا ہے جیسے فرمایا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدۃ) نیکی اور تقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ کوئی شخص مصیبت

میں گرفتار ہے تو اس کی اسباب کے دائرہ میں رہ کر امداد کرو۔

جہاں ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں وہاں پھر نہ کوئی پیغمبر مدد کر سکتا ہے، نہ فرشتہ، نہ کوئی جن اور نہ کوئی انسان۔ جو کوئی اللہ کے سوا غیر اللہ سے مافوق الاسباب مدد طلب کرے گا، وہ مشرک بن جائے گا۔ مثلاً کشتی ڈوب رہی ہے اور ظاہری اسباب ختم ہو چکے ہیں تو پھر خدائے وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارا جائے گا۔ اگر کوئی خواجہ معین الدین چشتیؒ یا خواجہ بہاؤ الحقؒ سے فریاد رسی چاہے گا، تو اس کے مشرک ہونے میں کوئی شک نہیں ہو گا۔ اسی لیے فرمایا کہ مافوق الاسباب اللہ کے سوا کسی کو نہ پکاریں جو نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یقیناً آپ ظلم کرنے والوں میں ہوں گے۔ یہ خطاب نبی علیہ السلام سے ہے مگر بات دوسروں کو سمجھائی جا رہی ہے۔

شرک کا وبال

سورۃ الزمر میں فرمایا "لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ" اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اگر آپ بھی شرک کریں گے تو آپ کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آپ نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے۔ شرک ایسی بری چیز ہے جو تمام اعمال کو برباد کر دیتی ہے۔ مشرک پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت برستی ہے، اس لیے شرک سے بار بار نفرت دلائی گئی ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے "فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" (سورۃ المومن) صرف اللہ ہی کو پکارو۔ اس کے علاوہ نہ کوئی صحت دے سکتا ہے نہ مشکل کو حل کر سکتا ہے نہ تکلیف کو دور کر سکتا ہے۔ سارا اختیار اسی کا ہے لہٰذا خالص اسی کو پکارو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

خیر و شر کا اختیار

فرمایا "وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ" اگر اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف، بیماری، دکھ، شکست پہنچا دے تو اللہ

کے سوا کوئی کھولنے والا نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اول وآخر کے سارے لوگ جمع ہو جائیں تو جو چیز اللہ کے علم اور ارادے میں نہیں ہے اس میں ایک تنکے کے برابر بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، اور نہ ہی اس میں ایک تنکا بھر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ فرمایا وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ اور اگر اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنا فضل پہنچاتا ہے سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی مافوق الاسباب حاجات میں صرف خدا کو ہی پکارے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے کیونکہ شرک بہت بڑی بیماری ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے اعلان کروا دیا کہ اگر میرے دین کے بارے میں تمہیں کوئی تردد ہو تو میں تو توحید خالص کا حامل اور شرک سے بیزار ہوں۔

فرمایا، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اپنا فضل اور مہربانی پہنچاتا ہے وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ اور وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی وہ نہایت بخشنے والا ہے مگر اس شخص کو جو اس کی طرف رجوع کرے اپنے گناہوں سے توبہ کرے اور معافی مانگے۔ مہربانی اس کے شامل حال ہوتی ہے جس کا عقیدہ درست اور فکر پاک ہو، جو ایمان پر مستقیم اور توحید کا حامل ہو۔ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور مہربانی ایسے ہی لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ
اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ
مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ
خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

ترجمہ:- اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے، اے لوگو! تحقیق آچکا ہے تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے۔ پس جس نے ہدایت پائی، بیشک وہ ہدایت پاتا ہے اپنے نفس کے فائدے کے لیے اور جو گمراہ ہوا، پس بیشک وہ گمراہ ہوتا ہے اپنے نفس کے بُرے کے لیے۔ اور نہیں ہوں میں تم پر کوئی مختار ﴿۱۰۸﴾ اور اتباع کرو اُس چیز کا جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف اور صبر کریں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۱۰۹﴾

حق کی آمد

سورۃ یونس میں اللہ تعالیٰ نے چار اہم مضامین توحید، رسالت، قیامت اور قرآن پاک کی صداقت وحقانیت بیان فرمائے ہیں۔ سورۃ کی ابتداء میں بھی یہی مضامین بیان ہوئے تھے اور اب آخر میں بھی انہی مضامین کا خلاصہ بیان ہو رہا ہے۔ درمیان میں یہی حقائق مختلف مثالوں کے ذریعے اور مختلف طریقوں سے سمجھائے گئے ہیں۔ اِن چاروں مضامین میں سے قرآن پاک کے وحی الٰہی

ہونے، اس کے اتباع اور اس کی صداقت وحقانیت کا حصہ زیادہ ہے چنانچہ اب آخر سورۃ میں قرآن پاک ہی سے متعلق ارشاد ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اے لوگو! قَدْ جَآءَکُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ تحقیق آچکا ہے تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ خطاب عام لوگوں سے ہے صرف عربوں یا صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کو خطاب کیا گیا ہے۔ اے دنیا جہان کے لوگو! اور خطاب یہ ہے کہ تمہارے پاس حق آچکا ہے۔ حق سے مراد قرآن پاک ہے یا دوسرے لفظوں میں یہی حق عقیدۂ توحید، عملِ حق اور اخلاقِ حق ہے۔ اس میں عقائد حقہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ حق کا معنی ثابت چیز ہوتا ہے۔ توحید، رسالت، معاد اور نیکی وغیرہ ثابت شدہ چیزیں ہیں لہٰذا ان کو حق سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے برخلاف بدعقیدگی اور بدعملی بری چیزیں ہیں جن کا خمیازہ ہر شخص کو بھگتنا ہوگا۔ مکی زندگی میں زیادہ تر اصلاحِ عقیدہ کی طرف توجہ دی گئی کیونکہ سب سے پہلے انسان کے عقیدے کی درستگی ضروری ہے۔ عمل اور اخلاق عقیدے کی فرع ہے۔ عقیدے کی اصلاح کے بغیر عمل بے سود ہے۔ اور عقیدے کی درستگی خدا تعالیٰ کی وحدانیت، انبیاء کی رسالت، کتبِ سماویہ اور معاد پر ایمان لانے سے ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ حق یعنی سچا دین جس میں عقائد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، تمہارے پاس آچکا ہے، اب اس سے فائدہ اٹھانا تمہارا کام ہے۔

ہدایت کا فائدہ

فرمایا، تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس حق آچکا ہے۔ فَمَنِ اھْتَدٰی پس جس شخص نے اس حق سے ہدایت پالی فَاِنَّمَا یَھْتَدِیْ لِنَفْسِہٖ پس بے شک وہ ہدایت پاتا ہے اپنے نفس کے فائدے کے لیے۔ حق کو نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے حجت تمام کر دی ہے

اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا، کتابیں نازل فرمائیں اور مبلغین کے ذریعے سے تمام لوگوں تک پہنچا دیا، اس کی وضاحت بھی کر دی، صحیح اور غلط باتیں ساری بیان کر دیں، لہٰذا اب جو شخص اس ہدایت کو قبول کرے گا تو اس کا اپنا ہی فائدہ ہے۔ اپنے نفع و نقصان کے متعلق سوچنا ہر شخص کا اپنا کام ہے۔ اگر وہ حق کو قبول نہیں کرے گا تو اپنا ہی نقصان کریگا، "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" (البقرۃ) انسان نے جو اچھی چیز کمائی وہ اسی کے فائدے کے لیے ہے اور جو بری چیز کمائی اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔

گمراہی کا نقصان

فرمایا وَمَنْ ضَلَّ جس نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا تو اس کا وبال اسی کے نفس پر پڑے گا۔ ملتِ ابراہیمی کا یہ مسلمہ اصول ہے "اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" (النجم) کسی ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا۔ بلکہ اپنے اپنے عقیدے، عمل اور اخلاق کے مطابق ہر شخص کو بدلہ دیا جائے گا۔ اللہ نے اپنے پیغمبر کی زبان سے اعلان کروا دیا وَمَا اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ میں تم پر کوئی وکیل نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں وکیل کا لفظ ذکر کیا ہے، کہیں جبار کا اور کہیں مصیطر کا۔ مفہوم سب کا ایک ہی ہے، مطلب یہ ہے کہ میں تم پر کوئی داروغہ نہیں ہوں جو تمہیں زبردستی کوئی چیز منوالوں۔ سورۃ غاشیہ میں ہے لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ آپ ان پر کوئی داروغہ تو نہیں ہیں۔ سورۃ قٓ میں ہے وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ آپ کوئی جبار تو نہیں ہیں جو گردن سے پکڑ کر ان کو منوالیں گے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ قرآن پاک کے ذریعے نصیحت کر دیں۔ دینِ حق کو واضح طور پر پیش کر دیا گیا ہے اور اب اس کو قبول کرنا ہر فرد کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہے۔ جو شخص اس کو اختیار کرے گا وہ کامیاب ہو جائیگا اور جو اختیار نہیں کرے گا وہ

اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو واضح کر دیا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد) آپ کا کام ہمارا پیغام پہنچا دینا ہے جب کہ حساب لینا ہمارا کام ہے۔ بہرحال قرآن کہتا ہے کہ ہدایت اور گمراہی کا معاملہ بالکل واضح ہے اور اللہ کا نبی بھی صاف صاف کہتا ہے کہ میرا کام تبلیغ کرنا ہے، کسی کو زبردستی منوانا نہیں۔

اسلام میں جبر نہیں

یہ اسلام کا طے شدہ اصول ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرۃ) یعنی دین میں جبر نہیں۔ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ حق واضح ہو جانے کے باوجود اگر کوئی دین حق کو قبول نہیں کرتا تو اس کے متعلق آپ سے سوال نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (البقرۃ) آپ سے اہل دوزخ کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ بلکہ یہ سوال خود دوزخ والوں سے ہوگا کہ وہ یہاں کیوں آئے۔ آپ کا کام صرف تبلیغ کا فریضہ ادا کرنا ہے اور آگے معاملہ اسی پر چھوڑ دینا ہے، وہ خود اپنے عقیدے اور عمل کا ذمہ دار ہوگا۔

دوسرے ادیان کے مقابلے میں اسلام کی پوزیشن بالکل واضح ہے مسلمانوں نے کبھی کسی پر جبر نہیں کیا، البتہ غیر مذاہب والے اپنے مذہب کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں مشرکوں نے ہمیشہ ایسا ہی کیا ہے چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں گزر چکا ہے کہ آپ کی قوم کے لوگوں نے اہل ایمان سے کہا کہ اے شعیب علیہ السلام آپ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والے ہماری بستی سے نکل جائیں اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (الاعراف) اگر تم یہاں رہنا چاہتے ہو تو ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جواب میں فرمایا اَوَلَوْ كُنَّا

کٰرِھِیْنَ" اگرچہ ہم تمہارے عقائد کو ناپسند کرتے ہوں۔ یعنی اگر ہم تمہارا دین قبول نہ کرنا چاہیں تو کیا تم زبردستی ہمیں منوا لو گے؟ مکہ کے مشرکین بھی یہی چاہتے تھے کہ اُن کا باطل دین قبول کر لیا جائے۔ مگر اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کو زبردستی دین میں داخل کیا جائے۔ تبلیغ دین کا فریضہ احسن طریقے سے انجام دینے کے باوجود اگر کوئی قبول نہیں کرتا تو پھر اسلام کا فیصلہ یہ ہے "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (الکفرون) تم اپنے دین پر چلو، ہم اپنے دین پر چلتے ہیں۔ کوئی فریق دوسرے پر اپنا دین ٹھونسنے کی کوشش نہ کرے۔ پیچھے اسی سورۃ میں یہ بھی گزر چکا ہے کہ اگر منکرین دینِ حق کو کسی طرح تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو پھر بالآخر یہی فیصلہ ہوگا "فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ" تم بھی اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ کرے گا جسے بہر صورت ماننا پڑے گا۔

جبر فساد کی جڑ ہے

مشرکین اور دیگر باطل پرستوں نے ہمیشہ حق پرستوں پر جبر کیا ہے اور دنیا میں فساد کی جڑ یہی چیز ہے جب بھی اغیار نے اپنا عقیدہ اہل ایمان پر ٹھونسنے کی کوشش کی تو فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوا اور پھر اس فتنے کو مٹانے کے لیے اللہ نے جہاد کا حکم دیا "وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ" (البقرۃ) اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے۔ مشرکین شرک کے پروگرام کو غالب کرنا چاہتے ہیں اور عیسائیت کا پروگرام ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اندلس اور سپین میں کیا کیا؟ لاکھوں مسلمانوں کو یا تو قتل کر دیا یا زبردستی عیسائی بنا لیا۔ یونانی عیسائیوں نے قبرصی ترکوں کے ساتھ یہی سلوک کیا اشتراکیت والے اپنا اعتقاد منوانا چاہتے ہیں۔ یہ سب لوگ متشدد ہیں اور اپنی بات زبردستی

منوانا چاہتے ہیں اور یہی چیز فساد کا سبب بنتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کسی غیر مذہب والے پر زیادتی کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر کوئی بخوشی اسلام قبول کرتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ اپنے دین پر قائم رہ سکتا ہے اگرچہ دینِ متین جبر کی اجازت نہیں دیتا مگر مسلمانوں کی باہمی فرقہ بندی کی وجہ سے یہ چیز ان میں بھی عود کر آئی ہے۔ اسلام تو کسی غیر مسلم کو بھی زبردستی مسلمان نہیں بناتا مگر مسلمانوں کا ایک فرقہ اپنے عقائد دوسرے پر ٹھونسنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ ہر فرقے کے پیروکار چاہتے ہیں کہ انہی کے عقیدہ کو غلبہ حاصل ہو اور پھر اس مقصد کے حصول کے لیے گالی گلوچ اور قتل و غارت گری سے بھی دریغ نہیں کرتے دین کا اصول تو واضح ہے کہ اپنی بات دوسرے تک پہنچا دو، پھر اگر وہ نہیں مانتا تو تم اس پر داروغہ بننے کی کوشش نہ کرو۔ ایک دوسرے کو زبردستی منانے کی وجہ سے ہی ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر جبر کا عنصر نہ ہوتا تو فرقہ بندی اتنے عروج تک نہ پہنچتی۔ اختلاف ہو سکتا ہے مگر اسے فتنہ و فساد کی بنیاد نہیں بنانا چاہیئے۔

مسلمانوں میں فرقہ بندی

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ جبر اور تعزیر میں فرق ہے کسی شخص کو جبراً دین میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ جب کوئی شخص دین میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اسے دین کے قوانین کی پابندی کرنا ہوگی اگر کوئی شخص قانون شکنی کرے گا تو پھر اس پر تعزیر بھی لگے گی۔ اگر قتل کرے گا تو اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا، اگر چوری کرے گا تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ زنا کا ارتکاب کرے گا تو سنگسار ہوگا، کسی کا حق دبائے گا تو اس کا تاوان دینا ہوگا۔ یہ بات الگ ہے۔ ان قوانین کی پابندی لازمی ہے۔ اس کو جبر نہیں کہہ سکتے۔

اتباعِ وحی

فرمایا آپ کہہ دیں کہ میں تم پر مختار نہیں ہوں کہ تم سے کوئی

بات جبراً منوالوں بلکہ میرا کام تو راستہ واضح کرنا ہے آگے تمہاری جی چاہے تو مان لو یا انکار کر دو۔ دینِ حق، توحید، رسالت اور معاد کے متعلق یہ تمام باتیں وحی الٰہی کے ذریعے حاصل ہوئیں لہٰذا اب آخر میں وحی الٰہی کے اتباع کا حکم دیا جا رہا ہے وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ اے پیغمبر آپ پیروی کریں اس چیز کی جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے۔ کسی رسم، رواج یا کسی دوسرے قانون و دستور کے اتباع کی ضرورت نہیں بلکہ صرف وحی الٰہی کا اتباع کریں، اور وحی الٰہی سے مراد قرآن پاک ہے کہ دین کی اساس قرآن ہی ہے اور حدیث اسکی شرح ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے بھی فرمائی ہے۔ اِتَّبِعُوا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ تم سب اسی چیز کا اتباع کرو جو اللہ کی جانب سے وحی الٰہی کے ذریعے نازل کی گئی ہے۔ اعتقاد کی پاکیزگی، صحیح فکر، صحیح عمل اور صحیح اخلاق وحی الٰہی کے اتباع سے ہی پیدا ہوتے ہیں کیونکہ یہی چیز حق ہے جس کے متعلق ابتداء میں فرمایا کہ تحقیق تمہارے پاس حق آ گیا ہے

صبر کی تلقین

فرمایا تبلیغ حق کے سلسلہ میں آپ کو تکلیف پہنچے گی، مخالفین آپ کو طرح طرح کی اذیت دیں گے مگر آپ کے لیے حکم یہ ہے وَاصْبِرْ آپ صبر کریں، راہِ حق میں صبر کا دامن تھامے رکھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت صابروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ آخری دور اس قدر فتنوں کا دور ہوگا کہ دین پر چلنا اتنا مشکل ہو جائے گا جیسے جلتے ہوئے کوئلوں کو ہاتھ میں پکڑنا۔ اب کوئی آدمی دین پر چلنا چاہے تو چل نہیں سکتا کبھی بھائی بہن کی طرف سے مخالفت ہوتی ہے، کبھی برادری والے باطل رسومات پر چلنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ شرک و بدعت کا چرچا ہے سنت پر چلنا سخت مشکل ہو رہا ہے ایسے دور میں جو شخص صبر سے کام لے گا اس کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ "اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (الزمر

صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بلاحساب اجر عطا فرمائیگا۔ صبر بہت بڑی حقیقت ہے۔ اپنے آپ کو حق پہ قائم رکھنا، مشکل کو برداشت کرنا، برائی سے رُک جانا، اطاعت پر جمے رہنا سب صبر کی جزئیات ہیں۔

فرمایا آپ صبر کریں حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے۔ یہاں اشارۃً قیامت کا ذکر بھی ہوگیا۔ دنیا میں بھی اللہ ہی نے کامیابی عطا کرنی ہے اور آخرت میں بھی اُسی نے قطعی فیصلہ کرنا ہے اسی لیے فرمایا کہ اللہ کے فیصلے تک آپ صبر کریں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں ہوگا بلکہ اس کا فیصلہ بہترین فیصلہ ہوگا کیونکہ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے اس کا فیصلہ تمام فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہوگا۔ آپ وحی الٰہی کا اتباع کریں اور اس سلسلے میں آنے والی تکالیف پر صبر کریں اور خدا تعالیٰ کے فیصلے کے منتظر رہیں کیونکہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا وہی ہے۔

سُورَةُ هُودٍ

مكية

سُورَةُ هُودٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَثَلٰثٌ وَعِشْرُونَ آيَةً وَفِيهَا عَشْرُ رُكُوعَاتٍ

سورۂ ہود مکی ہے اور یہ ایک سو تیئس "۱۲۳" آیات اور اس میں دس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ
خَبِيْرٍ ① اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ
نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ② وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ
تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ③
اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ④

ترجمہ:۔ الٓر ۔ یہ کتاب ہے ۔ اس کی آیات کو محکم کیا گیا ہے پھر تفصیل کی گئی ہے حکیم اور خبیر کی طرف سے ① (یہ حکم دیا گیا ہے کہ) نہ عبادت کرو تم سوائے اللہ کے کسی کی ۔ بیشک میں تمہارے لیے اُس کی جانب سے ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ② اور یہ کہ بخشش طلب کرو اپنے پروردگار سے ۔ پھر توبہ کرو اس کے سامنے ۔ وہ فائدہ پہنچائے گا تم کو اچھا فائدہ ایک مقررہ مدت تک اور دے گا ہر فضیلت والے

کو اُس کی فضیلت۔ اور اگر تم روگردانی کروگے تو بیشک میں خوف کھاتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے (۳) اللہ ہی کی طرف تمہارا لوٹنا ہے۔ اور وہ ہر ایک چیز پر قدرت رکھنے والا ہے (۴)

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ ہود ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم رسول تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کے بعد قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے، اس سورۃ میں آپ کی تبلیغ کے حالات بیان ہوئے ہیں، اس لحاظ سے اس سورۃ کا نام آپ کے نام پر سورۃ ہود رکھا گیا ہے۔

گذشتہ سورۃ یونس کی طرح یہ بھی مکی سورۃ ہے۔ سورۃ یونس اور سورۃ ہود ہجرت سے پہلے مکی زندگی کی آخری سورتیں ہیں اور ان کا زمانہ نزول قریب قریب ہی ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کی ایک سو تیئس ۱۲۳ آیات اور دس رکوع ہیں۔ اس میں ایک ہزار چھ سو پچیس ۱۶۲۵ کلمات اور چھ ہزار نو سو پانچ ۶۹۰۵ حروف ہیں۔

مضامین سورۃ

اس سورۃ کا مرکزی مضمون دعوت الی التوحید ہے۔ اس کے علاوہ وحی الٰہی اور قرآن پاک کی صداقت، رسالت اور قیامت جیسے بنیادی مسائل بیان کئے گئے ہیں اور پھر بعض ضمنی مسائل بھی آگئے ہیں۔ تبلیغ دین کے سلسلے میں رغبت بھی دلائی گئی ہے اور تبلیغ کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے۔ جس طرح اللہ کے انبیاء علیہم السلام اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے، اسی طرح ہمارا بھی فرض ہے کہ اللہ کے اس آخری دین کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں۔ تبلیغ دین کے ضمن میں حضور علیہ السلام اور آپ کے متبعین کو جو ناخوشگوار واقعات پیش آئے اور جو مصائب برداشت کرنے پڑے ان پر اللہ نے صبر کی تلقین بھی کی ہے۔ جس طرح سورۃ اعراف میں بعض انبیاء کی تمسخ بیان کرکے عالمی دعوت اسلام کا ذکر کیا گیا تھا، اسی طرح اس سورۃ میں بھی بعض انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کرکے ان کی قوموں کے بُرے انجام سے عبرت دلائی گئی ہے، گذشتہ

سورۃ یونس میں حضور علیہ السلام کے علاوہ جلیل القدر انبیاء حضرت نوح علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام اور اُن کی اقوام کا ذکر تھا مگر اس سورۃ مبارکہ میں دیگر بہت سے رسولوں کا تذکرہ آ رہا ہے۔ گزشتہ سورۃ میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر اجمالاً کیا گیا تھا مگر اس سورۃ میں تفصیل کے ساتھ واقعات آئیں گے اسی طرح حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا نصیحت اور عبرت پر مشتمل اہم حصہ بیان ہوگا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر ہوگا، اور پھر خود حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ تبلیغ اور اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر بھی آئے گا۔

سورۃ اعراف میں حضرت نوح علیہ السلام کا یہ قول گزر چکا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اسی طرح یہی بات یہاں حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوائی جا رہی ہے اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اللہ نے نوح علیہ السلام، شعیب علیہ السلام اور صالح علیہ السلام کی بھی یہی تبلیغ بیان فرمائی ہے کہ اللہ کی وحدانیت کو مانو، اس کے علاوہ کسی کو معبود نہ بناؤ۔ غرضیکہ اس سورۃ مبارکہ کا مرکزی مضمون بھی دعوت الی التوحید ہی ہے اور سورۃ کی ابتداء بھی اسی مضمون سے کی گئی ہے قرآن پاک کی حقانیت، اللہ کی توحید، انبیاء کی رسالت اور معاد کے ذکر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی خطاؤں پر توبہ اور استغفار کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔

حروف مقطعات

سورۃ کی ابتداء الٓرٰ کے حروف مقطعات سے ہوتی ہے ان حروف کی تفسیر مفسرین کرام مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ حروف مقطعات کے متعلق

جلالین والے بزرگ اس نتیجے پر پہنچے ہیں اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ اَمَّا بِذٰلِكَ[1]
اس کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے
کہ ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ برحق ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے
یہ ضروری نہیں کہ ہمیں ہر چیز کا علم حاصل ہو۔ روزمرہ زندگی میں ہمیں بے شمار
چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے جن کی حقیقت سے ہم واقف نہیں ہوتے
یا بہت کم علم رکھتے ہیں۔ علیم کل صرف ذات خداوندی ہے لہٰذا سلف
صالحین نے حروفِ مقطعات کے بارے میں زیادہ بحث نہیں کی۔
امام شعبیؒ امام ابوحنیفہؒ کے استاد اور تابعین میں سے ہیں۔ آپ نے پانچسو صحابہؓ
سے فیض حاصل کیا ہے، کوفے میں رہتے تھے۔ آپ عظیم محدث تھے
کسی نے آپ سے حروفِ مقطعات کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا
سِرُّ اللّٰهِ فَلَا تَطْلُبُوْا یہ اللہ کے راز ہیں، ان کے پیچھے مت پڑو
کرید کرو گے تو حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ بلکہ گمراہ ہونے کا خطرہ ہے۔ سلامتی
اسی میں ہے کہ اس معاملے کو اللہ کی طرف سونپ دو۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام
نے فرمایا کہ جس چیز کو تم جانتے ہو، اس کو کہو اور جس کو نہیں جانتے وَكِلُوْهُ
اِلٰى عَالِمِهٖ اس کو جاننے والے کی طرف سونپ دو۔ تم خواہ مخواہ اس میں
دخل اندازی نہ کرو، ورنہ متشابہات میں پڑ کر گمراہ ہونے کا خطرہ ہے۔
اسی وجہ سے کئی لوگ گمراہ ہوئے اور پھر علیحدہ علیحدہ فرقے بنے۔ فرقہ
مشبہ اور معطلہ وغیرہ ایسی آیات میں زیادہ کرید کی وجہ سے ہی پیدا ہوئے
مثلاً کوئی یہ سوچنے لگ جائے کہ رحمان عرش پر کیسے مستوی ہے، یا اللہ
کے ہاتھ، اس کے چہرہ اور پنڈلی کیسی ہے۔ قرآنِ پاک میں ان چیزوں
کا ذکر موجود ہے مگر ان کی کیفیت معلوم نہیں، لہٰذا ایسے معاملات میں
کرید نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت علیؓ

[1] جلالین ص۴

اور بعض مفسرین نے لوگوں کے ذہنوں کو قرآن پاک سے قریب تر لانے کے لیے اِن الفاظ کے کچھ معانی بھی بتائے ہیں مگر یہ محض احتمال اور ظن غالب ہے، قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ الہامی طریقے پر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذوق میں یہ چیز ڈال دی ہے کہ عالمِ غیب سے حقائقِ غیبیہ یعنی دین کی تعلیم اور اس کے بڑے بڑے اصول انبیاء کی معرفت اِس عالمِ تخلیط میں متعین ہوتے ہیں جو کہ اس مادی جہان کے عقائدِ فاسدہ، رسوماتِ بد، اخلاقِ بد، شرور اور قبائح کے ساتھ ہر وقت ٹکراتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی وضاحت آگے آ رہی ہے کہ مختلف انبیاء نے فریضہ تبلیغ کس طرح ادا کیا اور ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ تو شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ خیر و شر کے اس ٹکراؤ سے معالمِ انبیاء کی طرف اشارہ ملتا ہے اور اِن حروفِ مقطعات سے یہی مراد ہے

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ا کا اشارہ اَنَا کی طرف ہے۔ ل سے اللہ مراد ہے اور را سے مقصود رؤیت ہے اور اس طرح الٓرٰ کا مفہوم بنتا ہے اَنَا اللّٰہُ اَرٰی یعنی میں اللہ ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ گویا تم میں سے اطاعت گزاروں کی اطاعت اور نافرمانوں کی نافرمانی سب کو دیکھ رہا ہوں اور ہر ایک کو اس کے مطابق بدلہ دوں گا۔ بہر حال میں نے عرض کر دیا کہ عوام کو یہی ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ اِن حروف کی حقیقی اور اصل مراد اللہ ہی جانتا ہے۔ ہمارا اس پر ایمان ہے کہ یہ برحق ہے۔

محکم آیات

اب ابتدائے سورۃ میں قرآن پاک کی صداقت اور حقانیت کو ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ یہ کتاب ہے جس کی آیات کو محکم کیا گیا ہے۔ محکم کا معنیٰ مضبوط اور اٹل ہوتا ہے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب کی آیات میں قطعیت پائی جاتی ہے

یہ ناقابلِ تنسیخ اور اس کے اصول وضوابط ہر دَور کے لیے واجب العمل ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر انسانوں کو فلاح نصیب ہوگی۔ تو فرمایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن پاک کی آیتیں محکم ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ پھر خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے اِن آیات کی تفصیل بھی کی گئی ہے۔ اب اس تفصیل کا مطلب کئی طریقے سے بیان کیا جاتا ہے تفصیل کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے اس کے اصول وقواعد کو پڑھ لو، سُن لو اور اچھی طرح یاد کر لو اور اس کے بعد اس کی تفصیل میں جاؤ۔ اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب میں دین کے تمام عقائد، احکام اور مسائل کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور یہ تفصیل بھی خدا تعالیٰ کی جانب سے ہوئی ہے۔ موقع اور محل کے مطابق کہیں عقیدے کا ذکر ہے تو کہیں اعمال کی تفصیلات ہیں اور کہیں اخلاقیات کی تعلیمات کا ذکر ہے۔ تاہم اگر ایک جگہ پر کسی چیز کا اجمالاً بیان کیا گیا ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیلات آگئی ہیں اور اس کی تمام ضروری جزئیات کو واضح کر دیا ہے اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اِن آیات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے

اصولِ تفسیر قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلے میں اصول یہ ہے کہ کسی آیت کی تفسیر یا تشریح سب سے پہلے خود قرآن پاک میں تلاش کرو۔ اگر کسی مقام پر بات واضح نہیں ہوئی تو دوسرے مقام پر ہو جائے گی۔ اور اگر کسی مسئلہ کی تفسیر وتشریح قرآن پاک میں نہ ملے تو پھر تفسیر کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اللہ کے نبی کی طرف رجوع کرو کہ انہوں نے مطلوبہ تشریح فرما دی ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس بات کا پابند کیا ہے "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ" (النحل) کہ جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے، لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت کر دیں تاکہ کسی قسم کا اشکال باقی نہ رہے۔ سورۃ آلِ عمران میں

آمیے "هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ" یہ لوگوں کے لیے وضاحت ہے جو کہ نبی کی زبان سے کرائی گئی ہے۔ اگر بفرض محال کسی بات کی تشریح نبی کی زبان میں بھی نہ ملے تو پھر حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفائے راشدینؓ اور آپ کے اہل بیت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور وہاں سے تشریح معلوم کی جائے گی۔ ہر دور میں حوادثات پیش آتے رہتے ہیں اور مکان و زمان کے لحاظ سے نئے نئے مسائل بھی جنم لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حل صحابہ کرامؓ کے اقوال میں بھی نہ ہو تو قرآن میں یہ عام اصول بیان کر دیا گیا ہے "لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ" (النساء) تو پھر اُن لوگوں کی طرف رجوع کیا جائے جنہیں اللہ نے اجتہاد و استنباط کا ملکہ عطا کیا ہے۔ وہ بتا دیں گے کہ فلاں مسئلہ فلاں آیت یا اس کے ضمن سے ثابت ہو رہا ہے اور اس طرح قرآن پاک کی کسی بھی آیت کی مطلوبہ تشریح و تفسیر حاصل ہو جائے گی۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ تفصیل مذکورہ کسی بھی ذریعے سے حاصل ہو خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے ہی متصور ہوگی۔ بغرضیکہ نبی کا بیان، صحابہ کی تشریح یا مجتہد کا استنباط سب اللہ کی طرف سے ہوگا کیونکہ مجتہد کا اجتہاد بھی اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم و فہم کی بنا پر ہی ہوگا۔ تفسیر کے یہ اصول امام ابوبکر جصاصؒ نے اپنی تفسیر میں بیان کیے ہیں۔

قرآن پاک کی تعلیم کے سلسلے میں آجکل اصول تفسیر کی پابندی نہیں کی جا رہی ہے۔ پرویز جیسے بعض نے مفسرین در اصل جاہل ہیں جو قرآن پاک کی من مانی تفسیریں کر رہے ہیں۔ امام شافعیؒ، امام ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ صحیح سند سے ثابت ہونے والی ہر حدیث قرآن پاک کی شرح ہے۔ اگر کوئی شخص حدیث سے بے نیاز ہو کر قرآن پاک کی تفسیر کرے گا تو گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

ایا مفسر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دے گا، لہٰذا قرآن پاک کی تشریح و تفسیر کے لیے مسلمہ اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہوگا۔

عبادت خداوندی

فرمایا یہ کتاب ہے جس کی آیتوں کو محکم کیا گیا ہے اور خدا تعالیٰ کی جانب سے اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کرو، یعنی اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ عبادت کا معنیٰ انتہائی درجے کی تعظیم ہوتا ہے۔ یہ تعظیم قول، فعل، مال، جسم، قالب اور جان سے بھی ہوتی ہے۔ انتہائی تعظیم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جس ذات کی تعظیم کی جا رہی ہے۔ وہ قادرِ مطلق، علیم کل، مختار کل، نافع اور ضار ہے۔ وہ ذات ہماری غائبانہ پکار کو سنتی اور ہماری حاجت روائی کرتی ہے، ہمہ دان، ہمہ بین اور ہمہ توان ہے اس کے سوا کوئی با اختیار ذات نہیں جو ہر چیز کو جانتی اور سب کچھ کر سکتی ہو یہ صفات چونکہ صرف اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں لہٰذا فرمایا کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کرو۔ کیونکہ عبادت کے لائق صرف وہی ذات ہے۔

توحید کے بعد دوسری اہم بات رسالت ہے جس کے متعلق ارشاد ہے إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ بیشک میں خدا تعالیٰ کی جانب سے تمہارے لیے ڈرانے والا اور بشارت سنانے والا ہوں میں تمہیں افعالِ بد سے ڈرا رہا ہوں کہ اِن کا انجام بہت بُرا ہوگا تمہیں ان افعال کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ اور بشیر اس لحاظ سے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرے گا، نیک اعمال انجام دے گا، اس کو خوشخبری دیتا ہوں کہ اُسے فلاح نصیب ہوگی اور اُسے جنت میں اعلیٰ درجات عطا ہوں گے۔

استغفار کی برکات

فرمایا اس کتاب کی محکم آیات میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، ہر شخص سے کوئی نہ کوئی غلطی سرزد ہوتی رہتی ہے جس کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

سے ہمیشہ معافی مانگتے رہو ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ اور ہر طرح خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ توبہ پہلے ہوتی ہے اور استغفار بعد میں، مگر بعض دوسرے اصحاب فرماتے ہیں کہ پہلے کفر، شرک، بدعات اور معاصی سے معافی طلب کرنی چاہیئے اور اس کے بعد فرمانبرداری کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔ بہر حال فرمایا کہ اگر استغفار کرتے رہو گے اور خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک مقررہ مدت تک اچھا فائدہ پہنچائے گا۔ جب تک اس دنیا میں زندگی حاصل رہے گی۔ اتنی مدت تک اللہ تعالیٰ بہتر فائدہ دیتا رہے گا وَيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ اور فضیلت والے کو اپنے فضل سے خاص طور پر زیادہ عطا کریگا گویا استغفار کرنے اور توبہ کرنے والے کو یہ دو فوائد حاصل ہوں گے۔

متاعِ حسن

امام محمد بن ابوبکر عبدالقادر رازیؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں متاعِ حسن تو نافرمانوں کو بھی مل رہا ہے بلکہ ہر دور میں نافرمان زیادہ آسودہ حال نظر آتے ہیں تو یہاں پر توحید کو مان کر استغفار کرتے اور توبہ کرنے والوں کو کیا خصوصیت حاصل ہے؟ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہاں پر متاعِ حسن سے مراد دنیا کا مال و دولت اور جاہ و اقتدار نہیں بلکہ اس سے پاک زندگی مراد ہے۔ جس کے متعلق سورۃ نحل میں آتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد جو کوئی نیک اعمال انجام دے گا خواہ مرد ہو یا عورت "فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً" ہم اُسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور یہ زندگی اس شخص کو حاصل ہوگی جو نیکی کرنے والا، اللہ کی رضا پر چلنے والا، اعمال صالحہ انجام دینے والا، برائی سے بچنے والا اور توبہ و استغفار کرنے والا ہوگا ایسے شخص کو مدتِ حیات تک پاکیزہ زندگی نصیب ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ فضیلت والا آدمی وہ

ہے جن کی نیکیاں برائیوں پر غالب ہوں۔ امام قشیریؒ اور بعض دوسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ صاحبِ فضیلت وہ شخص ہے جسے اللہ نے نوشتۂ ازلی میں فضیلت والوں پر درج کر رکھا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ فضیلت والے کام انجام دیتا رہے گا۔ بعض فرماتے ہیں کہ صاحبِ فضیلت وہ آدمی ہے جس کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ دوسروں کے کام پورے کراتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا شخص وہی ہوگا جو صاحبِ ایمان ہوگا اور اس کے ہاتھوں سے مخلوقِ خدا کا بھلا ہو رہا ہوگا۔ بنی نوعِ انسان میں انبیاء علیہم السلام سب کے سب اس فہرست میں آتے ہیں اور ان کے بعد ان کو صحیح طریقے سے ماننے والے اور شریعت پر عمل کرنے والے لوگ صاحبِ فضیلت ہیں۔ یہ لوگ دنیا کے پیشوا تھے اور ان کے ہاتھ سے اللہ نے دنیا کو فیض پہنچایا۔

خوفِ خدا

فرمایا وَاِنْ تَوَلَّوْا اگر تم روگردانی کرو گے، توحید کا انکار کرو گے توبہ اور استغفار نہیں کرو گے تو سن لو فَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ کَبِیْرٍ کہ میں خوف کھاتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے بڑے دن سے مراد قیامت ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم اُس دن کے عذاب کا شکار نہ بن جاؤ۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق سورۃ مطففین میں ہے اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّہُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کیا یہ خیال نہیں کرتے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ ایک بڑے دن میں۔ جس دن تمام لوگ رب العلمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ فرمایا تم دنیا میں جو کچھ بھی کرو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو یا اس کی نافرمانی کرو، ہر حالت میں اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ تمہیں خدا تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ہر شخص کو خدا کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے۔ اس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور وہ اللہ تعالےٰ

ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ تمہارے شرک اور معصیت کو معاف نہیں کرے گا بلکہ یقیناً بدعقائد اور بداعمالی کی سزا دے گا۔ لہٰذا ابھی سے سوچ لو اور اس کے پیغام کو قبول کرلو۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اس کی توحید میں شرک کی ملاوٹ نہ کرو اور ہر وقت اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے رہو اور خدا تعالیٰ کی طرف رجوع رکھو ورنہ حالات خراب ہو جائیں گے۔ خدا تعالیٰ قادر مطلق ہے، اسی کے سامنے لوٹ کر جانا ہے اگر تم روگردانی کرو گے تو وہ یقیناً سزا دے گا۔

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ۭ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑤ وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ⑥

ترجمہ:- خبردار رہو! بیشک وہ لوگ موڑتے ہیں اپنے سینوں کو تاکہ چھپ جائیں اس سے۔ خبردار! جس وقت کہ وہ اوڑھتے ہیں اپنے اوپر کپڑے، وہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ بیشک وہ (اللہ تعالیٰ) جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کو ⑤ اور نہیں ہے کوئی چلنے پھرنے والا جانور زمین میں مگر اللہ کے ذمے ہے اس کی روزی۔ اور وہ جانتا ہے اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو۔ یہ سب کا سب کتاب مبین میں لکھا ہوا ہے ⑥

ربطِ آیات

سورۃ کی پہلی آیت کریمہ میں قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کے بعد سورۃ کے مرکزی مضمون توحید کا بیان ہوا اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اس کے بعد رسالت کا تذکرہ ہوا اور نبی علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا گیا کہ میں نذیر اور بشیر ہوں۔ پھر دوسری اہم بات یہ ذکر کی انسانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے رہیں اور اسی کی طرف رجوع کریں جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ انہیں اطاعت اور

خوشنودی والی بہتر زندگی عطا کریگا۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے احکام سے اعراض کریں گے تو بڑے دن یعنی قیامت کے عذاب میں مبتلا ہوں گے خدا تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے لہٰذا منکرین خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکیں گے

شانِ نزول

آج کی پہلی آیت اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ کا تعلق بھی گزشتہ مضمون کے ساتھ مربوط ہے تاہم اس کے شانِ نزول کے متعلق مفسرین کرام کی دو متضاد رائیں ہیں۔ امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ بعض اوقات قضائے حاجت یا بیویوں سے علیٰحدگی کے موقع پر برہنگی کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ انہیں پردے کا بڑا خیال ہوتا اور برہنگی سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ صحابہ کرام ایسے مواقع پر اپنے کپڑوں کو اچھی طرح سمیٹ لیتے تھے کہ بے پردگی نہ ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر یہ بات سمجھا دی کہ انسان کا مؤاخذہ اسی حد تک ہوگا جس قدر وہ طاقت رکھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر تکلیف مالا یطاق نہیں ڈالی۔ تاہم ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ برہنگی سے بچنے کی کوشش کرے اور اپنے اعضائے مستورہ کو ظاہر نہ ہونے دے۔ امام بغویؒ اور بعض دوسرے مفسرین ان آیات کے شانِ نزول کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کے باغیوں اور نافرمانوں کے متعلق نازل ہوئیں جیسا کہ امام بیضاویؒ نے لکھا ہے کافر اور مشرک لوگ خیال کرتے تھے کہ اگر ہم دین اسلام پیغمبر اسلام یا قرآن پاک کے متعلق پوشیدہ طور پر کوئی منصوبہ بندی کریں گے تو مسلمانوں کو پتہ نہیں چل سکے گا۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کفار کی خفیہ سازش کو بذریعہ وحی حضور علیہ السلام پر ظاہر کر دیتے تھے۔ جب حضور علیہ السلام ایسی بات کو بیان کرتے تو کفار و مشرکین پریشان ہو جاتے۔ بعض سمجھتے تھے کہ ان کی مخفی تدابیر کو کوئی مسلمان

چھپ کر سن لیتا ہے اور پھر اسے حضور علیہ السلام تک پہنچا دیتا ہے جسے آپ ظاہر فرما دیتے ہیں۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ علیم کل ہے، وہ ہر چیز کو جانتا ہے، وہ تمہاری تمام حرکتوں اور سازشوں سے واقف ہے اور اپنے نبی کو اس پر مطلع کر دیتا ہے۔

آج کے درس کی دوسری آیت بھی اسی مضمون کے ساتھ مربوط ہے جب اللہ تعالیٰ ذرے ذرے کو جانتا ہے تو اپنی تمام مخلوق کے حالات سے بھی واقف ہے اور پھر ہر جاندار کو روزی پہنچانے پر قادر بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے ہر عمل سے بھی واقف ہے اور وہ ہر عمل کا بدلہ دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے تو اس سے جزائے عمل کا برحق ہونا بھی ثابت ہوتا ہے غرضیکہ ان سب باتوں کا سورۃ کے مرکزی مضمون توحید کے ساتھ ربط ہے۔ جب قادرِ مطلق، علیم کل اور رزاق صرف اللہ تعالیٰ ہے تو پھر عبادت بھی صرف اسی کی کرو، اپنی حاجتوں میں غائبانہ طور پر صرف اسی کو پکارو اور اسی سے مدد چاہو۔

اللہ کا علم محیط

ارشاد ہوتا ہے اَلَآ اِنَّهُمْ سنو، آگاہ رہو اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ بیشک یہ لوگ (کفار و مشرکین) موڑتے ہیں اپنے سینوں کو لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ تاکہ اس سے چھپ جائیں اور ان کا ستر ظاہر نہ ہو۔ سینے کا موڑنا دو متضاد وجوہات کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ اہل ایمان تو حیاداری کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں تاکہ برہنہ نہ ہوں۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ اتنے تکلف کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مجبوری ہے اور اس پر مؤاخذہ نہیں، البتہ ادب کو حتی الامکان ملحوظ خاطر رکھو اور زیادہ پریشان نہ ہو۔ شریعت نے جس حد تک پابندی لگائی ہے صرف اسی کو پورا کرو۔ اور اگر سینہ موڑنے کے مصداق کافر و مشرک ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین کے خلاف خفیہ سازشیں کرتے ہیں اور پھر اپنے منصوبوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا

اَلَآ اِنَّھُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْہُ ۔ اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَھُمْ جس وقت وہ اپنے کپڑوں کو سمیٹتے ہیں۔ یعنی مومن حیاداری کی وجہ سے کپڑوں کو سمیٹتے ہیں اور کافر اپنی سازش کے ظاہر ہو جانے کے ڈر سے کپڑے سمیٹتے ہیں تو اللہ نے فرمایا یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ کہ وہ جانتا ہے اس چیز کو جس کو وہ چھپاتے ہیں اور جس کو ظاہر کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ کتنے بھی حیلے بہانے کریں، کسی چیز کو مخفی رکھنے کی کوشش کریں اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ بول و براز، غسل یا بیوی سے خلوت کے وقت برہنہ ہونا پڑتا ہے مگر یہ طبعی امر ہے اور اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ فرمایا اِنَّہٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ وہ اللہ تو سینوں کے رازوں کو بھی جاننے والا ہے، اس سے کوئی چیز کیسے مخفی رہ سکتی ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ سینوں کے موڑنے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ لوگ اپنے اندر باطل فکر رکھتے ہیں، غلط طریقے پر سوچتے ہیں اور فضول شکوک و شبہات کے ذریعے وحی الٰہی کو ٹھکرانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر یہ لوگ خدا تعالیٰ سے تو نہیں چھپ سکتے۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے رازوں کو جانتا ہے، لہٰذا یہ لوگ غلط عقائد اختیار کر کے اور غلط اعمال انجام دے کر خدا کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔

رزق کی ذمہ داری

اب اگلی آیت بھی اسی آیت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے ارشاد ہے وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اور نہیں ہے کوئی بھی زمین پر چلنے پھرنے والا جانور اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا مگر اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ عربی زبان میں دابہ گھوڑے کو بھی کہتے ہیں مگر عام اصطلاح میں زمین پر پاؤں سے چلنے پھرنے والے جانور اور رینگنے والے کیڑوں

کو دابہ کہا جاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ سب کو خوراک مہیا کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ زمین پر چلنے پھرنے والے جانداروں کا ذکر تو آگیا ہے مگر ہوا میں اڑنے والے پرندوں کو بھی اللہ تعالیٰ ہی روزی پہنچاتا ہے، اُن کا ذکر کیوں نہیں آیا۔ اس ضمن میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پرندوں کی نسبت زمین میں رہنے والے جانداروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے محض دابہ کا لفظ استعمال کیا ہے، وگرنہ بلاشبہ ہوا میں اڑنے والے پرندوں اور پانی میں رہنے والی ساری مخلوق کا روزی رساں وہی اللہ تعالیٰ ہے۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اے لوگو! دیکھو! صبح کے وقت پرندے خالی پیٹ اپنے گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور پیٹ بھر کر واپس لوٹ آتے ہیں۔ وہ اللہ کے توکل پر نکلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں روزی پہنچاتا ہے۔ اگر تم بھی اللہ پر ایسا ہی توکل کرو تو وہ تمہیں بھی ایسا ہی رزق پہنچائے گا۔ اللہ نے اپنے فضل سے تمام جانداروں کی روزی اپنے ذمے رکھی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اَلَا وَاِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰی تَسْتَکْمِلَ رِزْقَھَا کوئی جاندار اپنی روزی پوری کیے بغیر نہیں مرتا۔ جب تک اللہ کو اس کی زندگی مقصود ہوتی ہے اسے رزق ملتا رہتا ہے۔ جو روزی اللہ کے علم میں کسی شخص یا کسی جاندار کے لیے مقدر ہے وہ اسے کھائے بغیر نہیں مر سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی عینِ حیات روزی کے لیے ایسے سامان پیدا کرتا ہے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے، لہٰذا انسان و حیوان اپنی روزی کی جگہ پر لازماً پہنچ جاتا ہے ؎

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب و دانہ دگر خاکِ گور

یعنی دو چیزیں آدمی کو زبردستی اپنی طرف کھینچ کر لے جاتی ہیں۔ ایک اُس

کی خوراک اور پانی اور دوسری اُس کی قبر کی مٹی۔ آب و دانہ بھی انسان کو کھینچ کر کسی نہ کسی بہانے سے لے جاتا ہے اور اسی طرح انسان اپنی موت کے مقام پر کسی نہ کسی طریقے سے ضرور پہنچ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقررہ وقت تک ہر جاندار کو روزی پہنچانا اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

امام رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہو رہی تھی اور آپ کو اپنے گھر والوں کی روزی کا خیال آ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ آئی تو فرمایا اے موسیٰ! اس سامنے والے پتھر پر اپنی لاٹھی مارو۔ جب لاٹھی ماری گئی تو پتھر دو ٹکڑے ہوگیا اور اس کے اندر سے ایک اور پتھر برآمد ہوا۔ اللہ نے فرمایا، اس پتھر کو بھی ضرب لگاؤ۔ جب ایسا کیا تو اس کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے اور اس میں سے ایک تیسرا پتھر نکلا۔ پھر حکم ہوا کہ اس تیسرے پتھر کو بھی توڑ دو۔ جب وہ بھی توڑا گیا تو اس پتھر میں سے ایک چیونٹی جیسا چھوٹا سا کیڑا برآمد ہوا جس کے منہ میں اس کی خوراک بنر پتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے حجاب اٹھا دیا تو آپ نے دیکھا کہ وہ چھوٹا سا کیڑا زبانِ حال سے یہ تسبیح بیان کر رہا تھا۔ سُبْحَانَ مَنْ یَرَانِیْ وَیَسْمَعُ كَلَامِیْ وَیَعْلَمُ مَكَانِیْ وَیَذْكُرُنِیْ وَلَا یَنْسَانِیْ

پاک ہے وہ ذات جو مجھے دیکھ رہی ہے، میرے کلام کو سُن رہی ہے میری قیام کی جگہ کو جانتی ہے۔ مجھے یاد رکھتی ہے اور بھولتی نہیں اس سے موسیٰ علیہ السلام کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ جو اللہ تعالیٰ پتھر در پتھر میں بنے والے کیڑے کو اس کی روزی پہنچا رہا ہے وہ اس کے گھر والوں سے کیسے غافل ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ کوئی پرندہ خوراک کے لیے دانہ دور سے چونچ میں پکڑ کر لاتا ہے تاکہ گھونسلے میں جا کر خود

کھانے یا اپنے بچوں کے منہ میں ڈال دے مگر وہ دانہ اُن کی خوراک نہیں ہوتا بلکہ کسی دوسرے جاندار کے مقدر میں ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دانہ اس کی چونچ سے گرتا ہے اور نیچے گندی نالی کے کنارے موجود کیڑے کی خوراک بن جاتا ہے۔ یہ اُس کیڑے کا رزق تھا جو اللہ نے پرندے کے ذریعے اُس کے مقام تک پہنچایا۔

امام قرطبیؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ قبیلہ اشعر کے لوگ یمن سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف بذریعہ بحری سفر آ رہے تھے کہ راستے میں جہاز کو حادثہ پیش آیا اور وہ حجاز کی بجائے حبشہ کے ساحل پر پہنچ گئے اور پھر یہ لوگ حبشہ سے ڈبل ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے قبیلے کے یہ لوگ مدینے میں بے سروسامانی کی حالت میں پہنچے۔ ایک موقع پر انہوں نے اپنا ایک آدمی حضور علیہ السلام کی خدمت میں یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہمارا راشن ختم ہو گیا ہے، اس کے لیے کوئی انتظام فرمائیں۔ وہ شخص جب حضور علیہ السلام کے گھر پہنچا تو اندر سے حضور کی زبان مبارک سے اسی آیت کی تلاوت آ رہی ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ جب اُس شخص نے یہ الفاظ سنے تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہم بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ جب وہ ہر جاندار کی روزی کا ذمہ دار ہے تو ضرور ہمارے لیے بندوبست کرے گا، ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اُس شخص نے حضور علیہ السلام سے کوئی بات نہ کی اور اسی طرح واپس اپنے قبیلے کے لوگوں کے پاس آ گیا اور کہنے لگا تمہیں خوشخبری ہو کہ اللہ کی مدد آ رہی ہے ساتھی مطمئن ہو گئے کہ حضور علیہ السلام نے مدد کا وعدہ کیا ہو گا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ اُن کے پاس دو آدمی آئے جن کے پاس ایک بہت بڑا برتن تھا، جس میں گوشت اور روٹیاں تھیں، سب نے کھانا کھایا مگر پھر بھی بچ گیا

انہوں نے وہ کھانا دو آدمیوں کے سپرد کیا کہ اسے حضور علیہ السلام کی خدمت میں لے جاؤ، کھانا بھیجنے کا شکر ادا کرو اور ساتھ یہ بھی کہو کہ یہ بچ گیا ہے کسی اور ضرورت مند کو دے دیں۔ جب وہ آدمی کھانا لے کر پہنچے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے تو تمہارے لیے کوئی کھانا نہیں بھیجا تھا۔ پھر جب پورے معاملے کی وضاحت ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور وہ جس کے لیے چاہے اسی طرح روزی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ جب تک کسی کی زندگی مقصود ہوتی ہے، رزق پہنچتا رہتا ہے، جب اُس کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو روزی کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے۔

مستقر اور مستودع

فرمایا اللہ تعالیٰ زمین کے ہر جاندار کو روزی پہنچانے کا ذمہ دار ہے وَيَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَمُسۡتَوۡدَعَهَا اور وہ اس کے مستقر (ٹھہرنے کی جگہ) اور مستودع (سونپے جانے کی جگہ) کو بھی جانتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مستقر اس جگہ کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے ارادے سے اختیار کرتا ہے جیسے عام رہائش گاہ مکان وغیرہ اور مستودع وہ جگہ ہوتی ہے جہاں انسان بغیر اختیار کے پڑا رہے۔ مثلاً انسان زمین پر خود اپنا گھر بناتا ہے، یہ اس کا مستقر ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ انسان اپنے باپ کی پشت اور ماں کے رحم میں بلا اختیار پڑا رہتا ہے، یہ اُس کے لیے مستودع ہے۔ ماں کے پیٹ سے جب اس دنیا میں آتا ہے تو یہ اس کے لیے مستقر ہوتا ہے۔ پھر جب مر کر قبر میں چلا جاتا ہے تو یہ اس کے لیے سونپے جانے یا امانت کی جگہ ہوتی ہے۔ کسی بھی انسان کے لیے قبر بحیثیت مستودع ہوتی ہے جہاں اُسے بلا اختیار داخل کر دیا جاتا ہے یہ غلط العام بات ہے کہ قبر انسان کی آخری آرام گاہ ہے۔ نہیں بلکہ یہ تو حشر تک کے لیے عارضی ٹھکانا ہے جب حساب کتاب ہوگا تو

پھر ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق جنت یا دوزخ میں جائے گا۔ اور یہ جگہ اس کے لیے مستقر ہوگی۔

کتاب مبین

یہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ یہ سب باتیں یعنی روزی، مستقر اور مستودع وغیرہ کتاب مبین میں درج ہیں کتاب مبین کو علم الٰہی کا نمونہ سمجھ لیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ اسے علم الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ اور فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے قرآن کریم کی ان آیات اور حضور علیہ السلام کے فرمان کی رو سے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات سے پہلے ہر چیز کو لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔ جو کچھ وہاں لکھا ہوا موجود ہے قیامت تک وہی کچھ کائنات میں پیش آئے گا اور ذرہ بھر بھی اس کے خلاف نہیں ہوگا۔ چنانچہ اہل سنت کا ایمان ہے کہ تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، ان کا ارادہ بھی وہی کرتا ہے اور ان کو لکھ بھی رکھا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس کے علم میں ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ
وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ
عَمَلًا ۭ وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ
لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ⑦
وَلَىِٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ
لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۭ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا
ع عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑧ ع

ترجمہ:- اور وہ وہی ذات ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن کے وقفے میں، اور اُس کا عرش پانی پر تھا تاکہ آزمائے وہ تم کو کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے۔ اور اگر آپ ان سے کہتے ہیں کہ بیشک تم اٹھائے جاؤ گے مرنے کے بعد، تو وہ لوگ کہتے ہیں جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہے یہ مگر کھلا جادو ⑦ اور اگر ہم مؤخر کر دیں ان سے عذاب کو ایک مدت معلوم تک، تو یقیناً یہ کہیں گے کہ کیا چیز روکتی ہے اس عذاب کو۔ سنو! جس دن آئے گا وہ ان کے پاس تو نہیں پھیرا جائے گا ان سے اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس کے ساتھ وہ ٹھٹھا کیا کرتے تھے ⑧

ربطِ آیات گذشتہ آیات میں قرآن کریم کی آیات کے محکم اور مفصل ہونے کا بیان تھا۔

پھر دعوت الی التوحید اور بندے کی توبہ اور استغفار کا ذکر ہوا۔ نافرمانوں کی سازش اور اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور قدرتِ تامہ کو بیان کیا گیا اور ساتھ یہ بھی کہ ہر جاندار کی روزی کا ضامن وہ خود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کی جائے قرار اور سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔ فرمایا یہ سب چیزیں خدا کی کتاب میں درج ہیں۔ اب آج کی آیات میں تخلیق کائنات کا تذکرہ ہے جو کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرتِ تامہ کی دلیل اور اس کے کمال حکمت کی نشانی ہے۔

تخلیق ارض و سما

ارشاد ہوتا ہے وَهُوَ الَّذِي خدا کی ذات وہ ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن کے وقفہ میں۔ کائنات کی چھ دن میں تخلیق کا ذکر قرآنِ پاک کے دوسرے مقامات پر بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ یعنی بیشک تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے ارض و سما کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا۔ سورۃ الٓمٓ سجدہ میں ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان والی اشیاء کو چھ دن میں پیدا کیا۔ ایسا ہی ذکر بعض دوسری سورتوں میں بھی آتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تخلیق کائنات کے لیے چھ دن کا عرصہ ضروری نہیں تھا کیونکہ وہ تو قادرِ مطلق ذات ہے جو آنِ واحد میں بھی کسی چیز کو پیدا کرنے پر قدرت رکھتا ہے تاہم چھ دن کا وقفہ بنی نوع انسان کی تعلیم کے لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے اَلتَّؤَدَةُ مِنَ الرَّحْمٰنِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطٰنِ یعنی آہستگی رحمان کا کام ہے جب کہ جلد بازی شیطان کی

خصلت ہے۔ مقصد یہ کہ ہر کام کو احسن طریقے سے انجام دینا چاہیئے اور جلد بازی اچھی چیز نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ چھ دن سے کون سے دن مراد ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے کرہ ارضی کے چوبیس گھنٹے کے دن تو مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کا تعلق سورج کے ساتھ ہے جس کے طلوع و غروب سے لیل و نہار کا نظام وابستہ ہے۔ سورج اور دیگر سیاروں کی تخلیق تو آسمانوں کی تخلیق کے بعد ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا تو اس وقت تو دن رات کا تصور ہی نہیں تھا لہذا ان چھ ایام سے ہمارے چھ ایام مراد نہیں ہو سکتے۔ آیئے قرآن پاک سے پوچھیں کہ ان چھ دنوں سے کون سے دن مراد ہیں۔ سورۃ الم سجدہ میں ہے "ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ" پھر وہ ایک روز اس کی طرف رجوع کریگا جسکی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہوگی۔ سورۃ معارج میں قیامت والے دن کی مقدار کے متعلق فرمایا "تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ" ملائکہ اور جبرائیل علیہ السلام اُس کی طرف چڑھتے ہیں ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے حساب سے پچاس ہزار سال ہے۔ مقصد کہ اللہ کے ہاں ایک دن کم از کم ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اور چھ دن میں ارض و سما کی تخلیق کا مطلب یہ ہے کہ یہ تخلیق چھ ہزار سال میں مکمل ہوئی کائنات کی تخلیق کے متعلق سورۃ حٰم سجدہ میں تخلیق کا حال اس طرح آیا ہے "قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ" کہہ دیجئے، کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا۔ "وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن

فَوْقِهَا "پھر اس کے اوپر پہاڑ رکھے" وَبٰرَكَ فِيْهَا "اور اس میں برکت رکھی" وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا "اور اس میں سامانِ معیشت مقرر کیا اور یہ سب کچھ کتنے عرصہ میں کیا؟ فرمایا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ "چار دنوں میں"۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ "پھر اس نے آسمان کا ارادہ کیا" وَهِيَ دُخَانٌ "اور وہ دھواں سا تھا" فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا "پھر آسمان اور زمین دونوں سے فرمایا، آؤ میرا حکم مانو خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اس پر اُن دونوں نے کہا" قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ "ہم خوشی سے تیرا حکم مانیں گے" اللہ نے فرمایا فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ "پھر دو دن میں سات آسمان بنا دیے" وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا "اور ہر آسمان میں اُس کا حکم جاری کر دیا" وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ "اور آسمانِ دنیا کو ستاروں کے ساتھ زینت بخشی۔"

بہرحال اللہ کے ہاں چھ دن سے اس دنیا کے چھ ہزار سال مراد ہیں البتہ دن کے دورانیہ میں تفاوت کی مثال اس دُنیا میں بھی موجود ہے کرۂ ارض کے لیل ونہار عام طور پر چوبیس گھنٹے کے ہوتے ہیں مگر زمین کے کناروں پر یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی میں دن کی مقدار بدل جاتی ہے چنانچہ انتہائی شمال اور انتہائی جنوب میں بعض خطے ایسے بھی ہیں جہاں چھ ماہ کی رات اور چھ ماہ کا دن ہوتا ہے ایسے مقامات پر ایک دن کی مقدار ایک سال کے برابر ہوتی ہے۔ اسی طرح اس نظامِ شمسی سے باہر اللہ کے ہاں ایک دن کی مقدار اس دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔

عرش بر آب — فرمایا اللہ وہی ذات ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ دن کے عرصے میں پیدا فرمایا وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ "اور اس کا عرش پانی پر

تھا۔ اب پانی کی کیفیت کے متعلق مفسرین کرام کا اختلاف ہے۔ کعب احبار جو پہلے یہودی عالم تھا، پھر اسلام لانے ان کی بیان کردہ روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سبز رنگ کا ایک یاقوت پیدا فرمایا۔ پھر جب اس پر قہری تجلی ڈالی تو وہ پگھل کر پانی بن گیا اور اس طرح پانی وجود میں آیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پانی کے نیچے ہوا کو پیدا فرمایا اور اس طرح گویا پانی ہوا کے اوپر ٹکا ہوا ہے اور پانی کے اوپر خدا تعالیٰ کا عرش تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عرش بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ صحیح بخاری میں عمران بن حصین رضی سے روایت ہے كَانَ اللّٰهُ قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں سے پہلے موجود تھا۔ پھر اس نے ہوا کو پیدا کر کے اس کی پشت پر پانی کو ٹکایا اور اس کا عرش اس پانی پر تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا قَدَّرَ مَقَادِيْرَ الْخَلْقِ قَبْلَ خَلْقٍ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے تمام چیزوں کا اندازہ مقرر فرمایا اور اس وقت اللہ تعالیٰ کا عرش پانی کے اوپر تھا۔

بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مذکورہ پانی سے یہ ہمارے استعمال والا پانی نہیں ہے اور عرش کے پانی پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عرش اور پانی کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ یعنی ہر چیز پر اللہ تعالیٰ ہی کا تصرف ہے گویا یہاں پر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ اور اس کے تصرف کو بیان کرنا مقصود ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ موجودِ کل۔ انسانِ اکبر ہے جس کو روحِ اعظم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سارا مجموعہ انسانیت کا ایک نمونہ ہے جو عرش الٰہی کے نیچے واقع ہے اور اس کے ذریعے تمام انسانوں کا تعلق خدا تعالیٰ کی تجلیٔ عظم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور فعلیت یعنی کام کرنے کی قدرت اور صلاحیت کا نام عرش ہے اور قوت کا معنیٰ پانی ہے۔

تاہم عام فہم تفسیر یہی ہے کہ اس پانی سے مراد یہی پانی ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ "(الانبیاء) ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کم از کم اتنی بات واضح ہے کہ موالید ثلاثہ یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات کی تخلیق پانی سے ہوئی۔ تو فرمایا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ اور حکمت بالغہ کو بیان کرنا مقصود ہے کہ خدا تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے کہ خالق صرف اللہ ہے اور تخلیق میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

مقصد تخلیق کائنات

بعض فرماتے ہیں کہ عرش کے اوپر عالم امر ہے اور اس کے نیچے عالم خلق ہے۔ ان دونوں عالموں میں اللہ تعالیٰ ہی کا تصرف ہے اوپر کی چیزوں کا مخلوق کو علم نہیں مگر نیچے کی چیزوں کا علم ہے۔ ساری کائنات عرش کے نیچے ہے۔ چنانچہ تخلیق کائنات کے مقصد کے متعلق شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ دیکھو! اللہ نے ساری کائنات کو انسان کی مصلحت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ ملائکہ مقربین کو بھی محض نوعِ انسانی کی مصلحت کی خاطر پیدا کیا ہے حالانکہ فرشتوں کی تخلیق انسان کی تخلیق سے اربوں کھربوں سال پہلے ہوئی تھی۔ پہلے اللہ نے ملاءِ اعلیٰ کو پیدا کیا۔ اور پھر باقی چیزوں کو اور سب سے آخر میں انسان کو پیدا کیا اور اس کا منتہائے مقصود یہ بیان فرمایا لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۔ تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال انجام دیتا ہے۔ گویا تمام کائنات کو انسان کی مصلحت کے لیے پیدا کیا اور اس کو امتیازی حیثیت دی تاکہ وہ اچھے اور بُرے عمل کا امتحان کر سکے انسان کی آزمائش کے لیے ساری کائنات کو وجود بخشا۔ پھر اللہ نے نیکی اور برائی کا انجام بھی بیان فرمایا ظاہر ہے کہ جب انسان کی عقل تام ہوگی اور وہ جرم سے بچنے والا ہوگا اور اللہ کی اطاعت کی طرف جلدی پیش قدمی کرنے والا ہوگا۔ وہی حسن کمال ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجر عظیم

اور اُن کے درمیان والی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

بعث بعد الموت

اور باقی کفر، شرک اور معاصی کا ارتکاب کرنے والوں کے متعلق فرمایا وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ اگر آپ اُن سے کہیں کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور اس کی حکمت ہے کہ ہر انسان کو موت کے بعد دوبارہ اپنے سامنے کھڑا کر کے اس کی زندگی کے کارناموں کا حساب لے گا لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا تو کفر کرنے والے کہیں گے اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ یہ تو کھلا جادو ہے۔ مشرک لوگ قرآن پاک کے اثر کا انکار نہیں کر سکتے تھے مگر وہ اس کو حق نہیں مانتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ جادو کے زیر اثر ہے۔ گویا قرآن پاک کی تاثیر کو بھی جادو تصور کرتے تھے جادو کا بھی یہی تصور ہے کہ وہ مؤثر ضرور ہوتا ہے مگر باطل ہے اور کافر و مشرک قرآن حکیم کو بھی اسی بات پر محمول کرتے تھے۔ فرمایا یہ کہتے ظالم لوگ ہیں۔ کہتے تھے کہ اگر قرآن پاک کی پیش گوئی سچی ثابت ہو گئی اور مرنے کے بعد لوگ دوبارہ زندہ ہو گئے تو اس میں خدا تعالیٰ اور حساب کتاب کا کوئی دخل نہیں ہو گا بلکہ یہ محض جادو کے ذریعے ہو گا۔ یہ تو آنے والی بات تھی۔ ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے معجزات دیکھ کر بھی انکار کر دیا۔ خود اپنی فرمائش پر جب شق القمر کا معجزہ واقع ہوا تو کہنے لگے۔ "سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ" یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ پہلے بھی لوگ جادو کرتے تھے اور آج محمد بھی ایسا ہی کر رہے ہیں (العیاذ باللہ)

عیسائی اور یہودی مستشرقین بھی اسی قبیل سے ہیں۔ مغربی تعلیم کے دلدادہ بعض نام نہاد مسلمان بھی اُن سے متاثر ہیں۔ یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے کارہائے نمایاں کا انکار تو نہیں کر سکتے۔ ان کے لائے ہوئے عظیم انقلاب کو تسلیم کرتے ہیں مگر آپ کو خدا کا سچا رسول

ماننے کے لیے تیار نہیں کہتے ہیں کہ آپ بڑے ذہین، عقلمند اور عظیم آدمی تھے۔ جو انقلاب آپ نے برپا کیا وہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام بھی نہ کر سکے مگر آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔ یہی ان کی ہٹ دھرمی اور آخرت سے محرومی کی نشانی ہے۔

عذاب الٰہی

فرمایا وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ اگر ہم ان سے ایک خاص مدت تک کے لیے عذاب کو مؤخر کر دیں، لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ تو کافر لوگ کہتے ہیں کہ عذاب کو کس چیز نے روک لیا ہے۔ یہ بات وہ ازراہ تمسخر کہتے تھے کہ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو، وہ آ کیوں نہیں جاتا۔ مشرکین مکہ بھی ایسے ہی کہتے تھے اللہ نے اُن کو مہلت دی ایک خاص وقت تک اور پھر میدان بدر میں اُن پر عذاب الٰہی نازل ہو گیا۔ امت کا معنیٰ عام طور پر جماعت یا گروہ ہوتا ہے جیسے سورۃ آل عمران میں ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ تم ایک بہترین جماعت ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔ سورۃ نحل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا حضرت ابراہیم علیہ السلام پیشوا، اللہ کے فرمانبردار اور ایک طرف لگنے والے تھے۔ یہاں امت کا معنیٰ پیشوا ہے۔ مگر اس آیت کریمہ میں امت کا معنیٰ مدت ہے کہ اگر ہم ایک خاص مدت تک عذاب کو ٹلائے رکھیں تو کہتے ہیں کہ وہ عذاب کہاں گیا جس سے تم ڈراتے ہو۔ اللہ نے جواب میں فرمایا اَلَا سنو! يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ جس دن وہ عذاب آجائے گا تو پھر ہٹایا نہیں جائے گا۔ فرعون کے پاس عذاب آیا تو اسے غرق کر کے چھوڑا، قوم عاد و ثمود کو نیست و نابود کیا۔ قوم لوط اور دوسری قوموں کو ہلاک کیا۔ اسی طرح ان کے پاس بھی عذاب آجائے گا تو پھر یہ بچ نہیں سکیں گے۔ وَحَاقَ

بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُوْنَ اور گھیرلے گی ان کو وہ چیز جس کے ساتھ وہ ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جس کو تم مذاق کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ غرضیکہ اگر فی الوقت عذاب سے مہلت مِل رہی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے قانون امہال و تدریج کے مطابق مِل رہی ہے۔ وہ نافرمانوں کو موقع دیتا ہے پھر جب نافرمانی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس کی گرفت آجاتی ہے اور وہ پکڑ لیتا ہے۔ تو فرمایا، اِن کا بھی یہی حال ہے کہ ٹھٹھا اور تمسخر کی بنا پر کہتے ہیں کہ عذاب کو کس چیز نے روک رکھا ہے۔ فرمایا جب عذاب آجائے گا تو وہ اِن کو گھیرے گا اور اِن سے ہٹایا نہیں جا سکے گا۔

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ
إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ﴿٩﴾ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ
مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي ۚ إِنَّهُ لَفَرِحٌ
فَخُورٌ ﴿١٠﴾ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿١١﴾ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ
بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَنْ
يَقُولُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۚ
إِنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿١٢﴾

ترجمہ:- اور اگر ہم چکھائیں انسان کو اپنی طرف سے مہربانی، پھر ہم اُس سے چھین لیں، بیشک وہ انسان البتہ مایوس ہونے والا اور ناشکر گزار ہوتا ہے (۹) اور اگر ہم اُس کو چکھائیں نعمت کا مزا تکلیف کے بعد جو اُس کو پہنچی تھی تو وہ کہتا ہے کہ دُور ہو گئیں مجھ سے برائیاں۔ بیشک وہ اترانے والا اور شیخی بگھارنے والا ہوتا ہے (۱۰) مگر وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور اچھے اعمال انجام دیے، یہی لوگ ہیں کہ اِن کے لیے بخشش ہے اور بڑا اجر ہے (۱۱) پس اے پیغمبر! شاید کہ آپ چھوڑنے والے ہوں بعض اُن چیزوں کو جو آپ کی طرف

دی کی جاتی ہیں اور تنگ ہوتا ہے اس کے ساتھ آپ کا سینہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ کہتے ہیں ، کیوں نہیں اتارا جاتا اس پر خزانہ یا کیوں نہیں آتا اُس کے ساتھ فرشتہ ۔ بیشک آپ تو ڈر سنانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا ذمہ دار ہے (۱۲)

ربط آیات
دعوت الیٰ التوحید کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے علم محیط اور قدرت تامہ کا ذکر فرمایا ۔ اس سے پہلے تمام جاندار کی روزی کا ذمہ اٹھایا اور ہر ایک کے مستقر اور متودع کے علم کا ذکر کیا ۔ پھر تخلیق کائنات کا ذکر کیا جو کہ اُس کی وحدانیت اور قدرت تامہ کی دلیل ہے آسمان و زمین کی پیدائش اور عرش الٰہی کا ذکر ہوا تخلیق کائنات کا مقصد انسانوں کی مصلحت بیان فرمایا اور انسانوں کی تخلیق کا اصل آزمائش کا مقصود بتایا کہ ان میں سے کون اچھے اعمال انجام دیتا ہے اور کون برائیوں کا ارتکاب کرتا ہے ۔ فرمایا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے برحق ہے ۔ فرمایا اگر نافرمانوں پر خدا کی گرفت مؤخر ہو جائے تو وہ ٹھٹھا کرتے ہیں مگر اللہ نے فرمایا کہ جب اس کی طرف سے عذاب آئیگا تو پھر وہ ہٹایا نہیں جائیگا اور جس چیز کے ساتھ یہ مذاق کرتے ہیں ، وہی چیز ان کو گھیر لے گی ۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی ناشکر گزاری کا ذکر فرمایا ہے ۔ لوگ عام طور پر نہ تو راحت کے وقت اپنا فرض صحیح طور پر انجام دیتے ہیں اور نہ ہی تکلیف کے وقت ۔ آج اسی بات کا تذکرہ ہوگا ۔

عروج کے بعد زوال
ارشاد ہوتا ہے وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً اور اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت کا مزا چکھائیں ، کوئی مہربانی کریں ، صحت ، مال ، اولاد ، جاہ ، حکومت ترقی عطا کریں ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ پھر وہ نعمت اُس سے چھین لیں ۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق جب چاہے کسی کو کوئی نعمت عطا کرے اور جب چاہے واپس لے لے ۔ تندرستی دے کر بیماری میں مبتلا کر دے یا کسی کو بام عروج پر پہنچا کر زوال پذیر کر دے یا آسائش دے کر تنگدستی میں مبتلا کر دے ، یہ سب اس کی حکمت اور مصلحت کے کرشمے ہیں ۔ تو فرمایا جب ہم کسی کو راحت کے بعد تکلیف میں مبتلا کر دیں ، تو انسان کی حالت

یہ ہوتی ہے اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ کہ وہ مایوس ہونے والا اور ناشکر گزار بن جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب میرے لیے بھلائی کا کوئی موقع باقی نہیں رہا اور ایسی حالت میں صبر و شکر کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا گلہ شکوہ کرنے لگتا ہے کہ اُس نے اُسے تنگی میں ڈال دیا ہے۔ یہ انسان کی ناشکری کی دلیل ہے۔ عام طور پر انسان راحت اور تکلیف دونوں حالتوں میں ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ وہ نہ تو تکلیف میں صبر کرتے ہیں اور نہ راحت میں شکر ادا کرتے ہیں۔ البتہ بہت تھوڑے ایمان والے لوگ ایسے ہیں جو اس امتحان میں پورے اترتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، جب کسی مومن کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بھی اُس کے لیے بہتری کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مومن تکلیف کے وقت اللہ سے معافی مانگتا ہے، اس کے سامنے گڑگڑاتا ہے، تو یہی تکلیف اُس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا تکلیف کی حالت بھی اُس کے لیے باعثِ رحمت ہوتی ہے۔ گویا مومن آدمی کو تکلیف اور راحت دونوں حالتوں میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

تکلیف کے بعد راحت

آگے ارشاد ہوتا ہے وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ اور اگر ہم اس کو نعمت کا مزا چکھائیں تکلیف کے بعد جو اُس کو پہنچی تھی۔ ضَرَّآءَ عام طور پر جسمانی تکلیف پر بولا جاتا ہے تاہم اس سے دیگر تکالیف بھی مراد لی جا سکتی ہیں۔ تو فرمایا اگر بیماری کے بعد کسی انسان کو صحت عطا کر دیں یا کسی دوسری تکلیف کو راحت میں بدل دیں۔ تو پھر کیا کہتا ہے؟ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّىْ کہتا ہے کہ مجھ سے تکالیف دور ہو گئیں اور اب میں بالکل آرام و آسائش میں ہوں اور پھر ایسی حالت میں اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ انسان اتراتا ہے اور شیخی بگھارتا ہے۔ کہتا ہے

میں نے فلاں تدبیر کی تو مجھے کامیابی حاصل ہوگئی۔ ایسا شخص اپنی دولت حکومت اور ٹیکنالوجی کو ہی کامیابی کی دلیل سمجھتا ہے۔ کہتا ہے اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (القصص) مجھے یہ نعمتیں میرے علم کی وجہ سے ملی ہیں اور وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ تکلیف کو دُور کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے برخلاف جب اُسے تنگی آتی ہے تو شکوہ کرتا ہے۔ سورۃ الفجر میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو آزمائش میں مبتلا کردیتا ہے اور اس کا رزق تنگ کر دیتا ہے فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔ میں تباہ ہوگیا ہوں، اس کام کے لیے خدا تعالیٰ کو کوئی اور آدمی نہ ملا، ایسے ایسے ناشکری کے کلمات زبان سے ادا کرتا ہے اور جب کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس میں سارا اپنا کمال سمجھتا ہے۔ اور اصل عطا کرنے والے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیتا ہے۔ یہ انسان کی عام ذہنیت ہے۔ ورنہ اس کا فرض ہے کہ راحت اور آرام و آسائش کی حالت میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اس کی نعمت کی قدر کرے، اس کا صحیح استعمال کرے اور اس کا حق بھی ادا کرے۔ اور جب تکلیف آجائے تو اسے خدا کی جانب سے سمجھے اور اس پر صبر کرے اور جزع فزع نہ کرے۔

صبر اور عمل صالح

فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا مگر وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک اعمال انجام دیے اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ ان کے لیے خدا کی جانب سے معافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی تمام کوتاہیاں معاف فرمائے گا۔ اور اس کے علاوہ ان کے لیے خدا کے ہاں بہت بڑا اجر بھی ہوگا۔ وہ کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے ان دو انعامات کا وعدہ فرمایا ہے۔

صبر ملتِ ابراہیمی کا بہت بڑا اصول اور حقیقت ہے۔ صبر، شکر

اللہ کا ذکر، تعظیم شعائر اللہ اور نماز بہت بڑی حقیقتیں ہیں خاص طور پر صبر مومن کا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ کامیابی حاصل کرتا ہے اور نیک اعمال وہ ہیں جنہیں عقل اور شریعت دونوں صحیح تسلیم کرتی ہیں۔ ان میں نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ خیرات، صلہ رحمی، مخلوق کے ساتھ احسان، قیام عدل، طہارت، سماحت اور ظلم و زیادتی سے اجتناب وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب نیک اعمال ہیں جن پر مغفرت اور اجر کبیر کی بشارت دی گئی ہے۔

اہل ایمان کے لیے تسلی

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور اُن کے ماننے والوں کو تسلی دی ہے۔ قرآن پاک میں یہ مضمون متعدد مقامات پر موجود ہے جب بھی نافرمانوں، کافروں اور مشرکوں کی ہٹ دھرمی اور ضد یا ناانصافی کی وجہ سے نبی علیہ السلام کے قلب مبارک پر صدمہ گزرتا ہے تو اللہ تعالےٰ کی جانب سے تسلی دی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ آپ کو اپنا فریضہ جاری رکھنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ پس شاید کہ آپ چھوڑ دیں بعض اُن چیزوں کو جن کو آپ کی طرف وحی کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے اَنْ يَّقُوْلُوْا اس وجہ سے کہ یہ لوگ اعتراض کرتے ہیں لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ کہ آپ علیہ السلام پر خزانہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اُن کے زعم میں نبوت کے دعویدار کے پاس مال و دولت کا ہونا ضروری ہے تاکہ معاشرے میں امتیازی حیثیت ہو تاکہ دوسرے لوگ اس سے مرعوب ہو سکیں اور وہ یقین کر لیں کہ یہ واقعی اللہ کا رسول ہے۔ فرمایا۔ اگر خزانہ نہیں ہے اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ تو اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہی آئے یہ فرشتہ نبی کے ساتھ رہے اور اس کی نبوت کی تصدیق کرے۔ فرمایا ایسے بیہودہ اعتراضات کی وجہ سے

اپنا سینہ تنگ نہ کریں۔ نا انصاف لوگ ایسی باتیں ہمیشہ کیا کرتے ہیں۔ اُن کا کیا ہے؟ وہ تو نبی کو مافوق الانسان کوئی مخلوق سمجھتے ہیں اور اسی لیے عام لوگوں میں اس کے میل جول، کام کاج اور دیگر معاشرتی معمولات کو نبوت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ سورۃ فرقان میں ہے کہ کفار مکہ کہتے تھے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں۔ یہ کاروبار کرتا ہے، اللہ نے فرمایا ایسے اعتراضات پہلے بھی ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے رہتے ہیں آپ ان سے پریشان نہ ہوں بلکہ اپنا کام کرتے جائیں یہ آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ کہ آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں کیونکہ وہ تو آپ کو آپ کے مشن سے ہٹانا چاہتے ہیں۔" وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ" (القلم) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ ڈھیلے پڑ جائیں تو یہ بھی مخالفت چھوڑ دیں گے۔ فرمایا، ایسا نہیں بلکہ آپ اِن کے عقائد باطلہ کا پورے طریقے سے رد کریں۔ لوگوں پر کفر و شرک کی قباحت کو واضح کریں۔ یہ لوگ کتنا بھی بُرا منائیں آپ اپنا کام کرتے جائیں اور اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کریں۔

نبی بحیثیت نذیر

فرمایا اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ آپ تو ڈر سنانے والے ہیں۔ آپ کا فرض یہ ہے کہ مشرکین کی تمام تر رکاوٹوں کے باوجود لوگوں کو اُن کے بُرے عقائد اور بُرے اعمال سے ڈراتے رہیں۔ انہیں صاف صاف بتا دیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم نہیں کریں گے، شرک پر اڑے رہیں گے اور نیک اعمال کی بجائے بُرے اعمال انجام دیتے رہیں گے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہو جائیں گے۔ اسی لیے فرمایا کہ آپ ان کو خطرناک انجام سے آگاہ کرنے والے ہیں۔

آگے فرمایا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ہر چیز کا ذمہ دار

تو خدا تعالیٰ ہے۔ خزانوں کا مالک بھی وہی ہے اور فرشتوں کا مالک بھی۔ معجزات کا پیش کرنا آپ کا کام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت میں جب اس کا ظاہر کرنا ضروری ہوتا ہے تو وہ ایسا کر دیتا ہے۔ لہٰذا آپ کسی ایسی چیز کو ترک کرنے کا خیال دل میں نہ لائیں جو آپ پر وحی کے ذریعے نازل کی جاتی ہے۔ آپ کفار کے طعن سے دل برداشتہ نہ ہوں آپ بحیثیت نذیر اپنے منصب پر فائز ہیں۔ آپ کفر، شرک اور برائی کا ارتکاب کرنے والوں کو ان کے انجام سے خبردار کر دیں باقی ہر چیز کا نگران خود اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ خود ان سے حساب لے لے گا۔ اور پھر ان کے برے عقائد و اعمال کی سزا بھی دے گا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ
مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ⑬ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا
اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ⑭ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا
نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ⑮
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ
مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑯

ترجمہ:۔ کیا کہتے ہیں یہ لوگ کہ یہ قرآن اس نے گھڑ لیا ہے
آپ کہہ دیجئے اے پیغمبر! لاؤ دس سورتیں اس جیسی گھڑی ہوئی
اور بلا لو جس کو تم طاقت رکھتے ہو اللہ کے سوا، اگر تم
سچے ہو ⑬ پس اگر یہ جواب نہ دے سکیں تم کو پس
جان لو کہ بے شک یہ قرآن کریم نازل کیا گیا ہے اللہ کے
علم کے ساتھ اور یہ بات بھی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں
ہے۔ پس کیا تم فرمانبرداری کرو گے ⑭ جو شخص ارادہ کرتا ہے
دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا، ہم پورا پورا دیتے ہیں اُنکو
اُن کے اعمال اس میں اور اُنکے ساتھ اس دُنیا میں کمی نہیں کی
جاتی ⑮ یہی لوگ ہیں کہ نہیں ہے اُن کے لیے آخرت

میں مگر دوزخ کی آگ ۔ اور ضائع ہو گیا جو کچھ انہوں نے اِس دنیا میں کیا ۔ اور باطل ہے وہ جو کچھ وہ کیا کرتے تھے (۱۶)

ربطِ آیات

گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو تسلی دی کہ مشرکوں اور کافروں کے اعتراضات کی وجہ سے آپ اپنے مشن کو نہ چھوڑیں ۔ یہ لوگ تو بیہودہ اعتراض کرتے ہی رہتے ہیں ۔ لہذا آپ کو دل میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہیں کرنی چاہیئے کہتے ہیں کہ آپ کے پاس خزانہ کیوں نہیں نازل ہوتا یا آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں ہوتا تو فرمایا آپ کہہ دیں کہ خزانوں اور فرشتوں کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہے ، میرا کام تو خبردار کرنا اور برے انجام سے ڈرانا ہے ۔

اب آج کی آیات میں قرآن پاک کی صداقت وحقانیت کی دلیل پیش کی گئی ہے ۔ کفار ومشرکین اللہ کی کتاب کے متعلق شکوک وشبہات کا اظہار کرتے تھے ، اللہ نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ اگر تم قرآن پاک کو وحی الٰہی تصور نہیں کرتے تو پھر اس جیسی دس سورتیں لاؤ ۔ اگر یہ انسانی کلام ہے تو تم بھی انسان ہی ہو ، لہذا اس جیسا کلام بنا کر پیش کرو ۔ یہ بھی مکی سورۃ ہے اور مکی سورتوں میں عام طور پر توحید ، رسالت ، قیامت اور قرآن پاک کی حقانیت کے مضامین ہی بیان کئے گئے ہیں ۔ اس سورۃ مبارکہ میں بھی یہی مضامین بتکرار آ رہے ہیں ۔ چنانچہ آج کے درس میں قرآن کی صداقت ، توحید باری تعالیٰ اور معاد کا تذکرہ ہو رہا ہے ۔

قرآن بطور چیلنج

ارشاد ہوتا ہے اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے خود قرآن گھڑ لیا ہے ۔ یہ کلام الٰہی نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ساختہ ہے اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا قُلْ اے پیغمبر ! آپ کہہ دیں کہ اگر یہ قرآن پاک من گھڑت ہے فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ تو پھر تم بھی اس جیسی دس گھڑی ہوئی سورتیں لے آؤ ۔ آخر تم اہل زبان ہو ، عربی پر تمہیں دسترس حاصل ہے فصاحت وبلاغت کے ماہر ہو ۔ تم بھی ایسا کلام پیش کرو ۔ اور اگر تم اکیلے یہ کام نہیں کر سکتے ۔

وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو اللہ کے سوا جس کو چاہو اپنی مدد کے لیے بلالو اور سارے مل کر قرآن جیسی چھوٹی سے چھوٹی دس سورتیں ہی بنالاؤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔

اس سورۃ میں دس سورتیں پیش کرنے کا چیلنج دیا گیا ہے جبکہ سابقہ سورۃ میں صرف ایک سورۃ لانے کا مطالبہ کیا گیا تھا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ (یونس) اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ سورۃ بقرہ میں بھی ایک ہی سورۃ لانے کا چیلنج دیا گیا ہے۔ وہاں یہ الفاظ آئے ہیں فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جہاں ایک سورۃ لانے کے لیے کہا گیا ہے۔ وہاں کلام الٰہی کا تقابل ہے مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا جو کچھ بھی ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے۔ اور اس مقام پر جہاں دس سورتوں کا ذکر ہے، یہاں قرآن پاک کی بات ہے اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا اگر تمام انسان اور جن مل کر بھی قرآن کی مثل لانا چاہیں تو نہیں لاسکیں گے خواہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں وہاں بھی پورے قرآن پاک کا ذکر ہے۔

سورۃ یونس میں ایک سورۃ لانے کا چیلنج ہے جب کہ اس سورۃ ہود میں دس سورتوں کا ذکر ہے۔ یہ دونوں سورتیں مکی ہیں اور ان کا زمانہ نزول بھی قریب قریب ہی ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ ترتیب نزول کے لحاظ سے سورۃ ہود پہلے ہے اور سورۃ یونس بعد میں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دس سورتوں کا مطالبہ کیا۔ جب کفار و مشرکین اس چیلنج کو قبول نہ کرسکے

تو پھر اللہ نے ایک ہی سورۃ لانے کا اعلان فرما دیا۔ سورۃ بقرہ تو مدنی ہے اور اس کا زمانہ بہرحال ان دونوں سورتوں سے بعد کا ہے۔ لہٰذا اس میں بھی ایک ہی سورۃ بنا کر لانے کا چیلنج دیا گیا ہے

چیلنج کی بنیاد

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس بنیاد پر قرآن پاک کی نظیر لانے کو چیلنج کیا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے مخلوق میں سے کوئی بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا اور اس لحاظ سے قرآن حکیم معجز ہے تاہم امام ابوبکر جصاصؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ محض فصاحت و بلاغت ہی قرآن کے معجز ہونے کی بنیاد نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا تعلق عربی زبان سے ہے جس کا دائرہ عمل صرف عربوں تک محدود ہے۔ یہ چیلنج پوری دنیا کے انسانوں اور جنوں تک پھیلا ہوا ہے اس کلام الٰہی کا معجز ہونا فصاحت و بلاغت کے علاوہ بعض دوسری چیزوں میں بھی ہے۔ مثلاً علوم و معارف جو اللہ نے قرآن کریم میں رکھے ہیں وہ کسی دوسرے کلام میں نہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جو حکمتیں اور مصلحتیں قرآن حکیم کی آیات اور سورتوں میں پائی جاتی ہیں، ساری مخلوق مل کر اس کا عشر عشیر بھی پیش نہیں کر سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک فصاحت و بلاغت، علوم و معارف، مصلحت اور حکمت اور دلائل و علل کے اعتبار سے معجز ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان تمام کمالات کے پیش نظر چیلنج کیا ہے کہ اس کی مثال لا کر دکھاؤ۔

قرآن حکیم کا ایک بڑا کمال اس کا قانون ہے۔ قرآن کریم جس قسم کا قانون دستور اور نظام پیش کرتا ہے۔ ایسا کوئی قانون اور نظام کسی انسانی کلام میں نہیں مل سکتا۔ نہ تو سرمایہ دارانہ نظام، اسلامی نظام کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ سوشلزم اور کمیونزم۔ نہ امریکہ کا دستور اس کا ہم پلہ ہے اور نہ فرانس، جرمنی اور برطانیہ کا۔ قرآن پاک کا پیش کردہ نظام ہمیشہ کے لیے اٹل ہے۔ جبکہ

انسانوں کے بنائے ہوئے دساتیر ہر روز بدلتے رہتے ہیں۔ جونہی کوئی حکومت کوئی قانون وضع کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں ترامیم بھی شروع ہو جاتی ہیں اور بسا اوقات اُسے منسوخ کر کے دوسرا قانون لانا پڑتا ہے یہ صرف قرآن پاک کے قانون کو شرف حاصل ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہے۔ سورۃ بینہ میں ہے ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ کہا گیا ہے یعنی یہ اٹل قانون ہے جو تا قیام قیامت کارآمد ہے۔" امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کی حقانیت اور صداقت کی ایک سب سے بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اس کے نزول کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ جیسے اہل علم لوگ بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکے بلکہ اگر کسی نے اس کی نظیر لانے کی کوشش کی تو اُسے منہ کی کھانا پڑی۔ مسیلمہ کذاب نے قرآن کے مقابلے میں کلام پیش کیا مگر عربوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور لعنت بھیجی، کہنے لگے کہ علوم و معارف سے لبریز خدائی کلام اور کہاں تمہاری یہ بیہودہ کوشش، اُس زمانے میں عربوں میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب تھے، بڑے بڑے منصف تھے جو مختلف کلاموں کا موازنہ کر کے ان کے متعلق فیصلہ دیتے تھے۔ مگر وہ سارے کے سارے مِل کر بھی قرآن پاک کی نظیر نہ لا سکے۔ اور قرآن کا یہ چیلنج چودہ صدیوں سے اسی طرح موجود ہے مگر کسی نے اس کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی۔

نزول بعلم اللہ

فرمایا ان کو قرآن پاک کی نظیر لانے کا چیلنج دو۔ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ پس اگر یہ تمہارے چیلنج کا جواب نہ دے سکیں فَاعْلَمُوْٓا تو یقین کے ساتھ جان لینا چاہیے اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ کہ بیشک یہ قرآن پاک اللہ کے علم کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہ اُس کے حکم سے نازل ہوا ہے اور کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ نہ کسی پیغمبر کا کلام ہے نہ کسی فرشتے یا جن کا بلکہ یقیناً یہ اللہ کے علم سے نازل ہوا ہے۔ مخلوق میں

سے کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی زبان انتہائی بلندیوں پر تھی۔ عرب لوگ شعر و شاعری، خطابت، کلام اور محاورے میں فصیح و بلیغ اور اپنی مثال آپ تھے مگر کوئی بھی قرآن کا چیلنج قبول نہ کر سکا۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ کے بھائی انیسؓ بڑے پائے کے شاعر تھے کہنے لگے میں نے بڑے بڑے شاعروں کا کلام سنا ہے کاہنوں اور ساحروں کی بات سنی ہے مگر اللہ کا کلام ان سب سے بلند ہے، کوئی کلام بھی اس کا ہم پلہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے ؎

این کتاب نیست چیزے دیگر است

یعنی یہ خالی کتاب ہی نہیں بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے۔

معبود برحق — فرمایا ایک بات تو یہ جان لو کہ قرآن پاک اللہ کے علم سے نازل کیا گیا اور دوسری یہ کہ وَاَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس مالک الملک کے سوا معبود برحق بھی کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری ذات نہیں جو ایسا کلام نازل کر سکے۔ وہی مشکل کشا اور حاجت روا ہے، وہ حاکم، مختارِ کل اور قادرِ مطلق ہے، وہی علیم کل ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ پس کیا تم فرمانبرداری کرو گے؟ تمہارا فرض ہے کہ اسی وحدہٗ لاشریک کی اطاعت قبول کر لو اس کی وحدانیت کو تسلیم کر لو اور اس کے کلام کو بھی برحق مان لو۔

آگے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے طالبوں اور نافرمانوں کا ذکر فرمایا ہے۔

دنیا کی خواہش — مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کا طلب گار ہے نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا ہم اسی دنیا میں ان کے اعمال ان کو پورا پورا دیتے ہیں وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ جس شخص کا مقصد صرف دنیا کے حصول تک محدود ہے۔ وہ اسی دنیا میں ہر قسم کا آرام د

و آسائش چاہتا ہے اور آخرت کی اُسے کوئی فکر نہیں۔ فرمایا اس کے اعمال کا بدلہ ہم اسی دنیا میں مکمل طور پر دے دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یاد رکھو! کفار و مشرکین میں بعض اچھے اعمال انجام دیتے ہیں، رفاہِ عامہ کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، سڑکیں، سرائیں اور ہسپتال بناتے ہیں غرباء کی اعانت کرتے ہیں، مظلوم کی دل جوئی کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی عطا کر دیتا ہے۔ رزق میں وسعت ملتی ہے۔ عزت، شہرت، حکومت اور طاقت میسر آتی ہے، مگر جب وہ آخرت میں جائیں گے تو ایمان سے خالی ہونے کی وجہ سے وہاں ان کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَّصِيبٍ (الشوریٰ) جو کوئی دنیا کی کھیتی (مال و دولت) کا طالب ہوگا، ہم اُسے یہیں دے دیں گے اور اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک موقع پر چٹائی پر آرام فرما رہے تھے اور آپ کے جسم پر چٹائی کے نشانات نمودار ہو گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہ حالت دیکھی تو عرض کیا حضور! قیصر و کسریٰ اور دنیا کے دیگر ملوک کو بڑے آرام و آسائش حاصل ہیں، مگر آپ اللہ کے برحق رسول ہو کر اتنی تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ آپ اپنے لیے اور امت کی وسعت کے لیے دعا فرمائیں۔ حضور علیہ السلام یہ سن کر اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا اَفِي هٰذَا يَا ابْنَ الْخَطَّابِ اے خطاب کے بیٹے! کیا میں اس چیز کی خواہش کروں؟ یہ تو ایسے لوگ ہیں جنہیں ان کی اچھائیوں کا بدلہ اسی دنیا میں دے دیا گیا ہے۔ کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ ان کو دنیا میں ملے اور ہمیں آخرت میں اچھا بدلہ ملے؟ اس پر حضرت عمرؓ کو حقیقت معلوم ہو گئی۔

تو اللہ نے فرمایا کہ وہ ایسے لوگوں کو یعنی ہر کافر و مشرک کو ان کے

اچھے اعمال کا بدلہ اسی دنیا میں دے دیتا ہے اور ایمان والوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ انہیں دنیا میں کھانے پینے کے لیے بھی دیتا ہے مگر جب وہ آخرت میں پہنچیں گے تو انہیں مکمل بدلہ ملے گا، اور ایک ایک عمل کے بدلے میں اجرِ عظیم حاصل ہوگا۔ گویا اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو دنیا میں بھی دیتا ہے۔ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ، مگر کافروں کی نیکیوں کا سارا بدلہ انہیں اسی دنیا میں مل جاتا ہے، اور وہ آخرت سے محروم رہتے ہیں کیونکہ آخرت کا دارو مدار ایمان پر ہے۔

آخرت میں محرومی

فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ایسے نافرمانوں، کافروں اور مشرکوں کے لیے آخرت میں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا اور انہوں نے دنیا میں جو کچھ کیا وہ ضائع ہوگیا۔ یعنی دنیا کے تمام اچھے کام آخرت کے اعتبار سے ضائع ہوگئے۔ آخرت میں ان کا کچھ صلہ حاصل نہ ہوگا کفر، شرک، نفاق اور بدعقیدگی انسان کے نیک اعمال کو ضائع کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ایمان لانے کے بعد مرتد ہو جائے تو اس کی ساری عمر کی نمازیں، روزے، حج اور زکوٰۃ سب بیکار گئے۔ اسی لیے فرمایا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اُن کے تمام اعمال ضائع ہوگئے، ان کا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا" جس نے آخرت کے حصول کا ارادہ کیا اور پھر اس کے لیے کوشش اور محنت بھی کی اور ایمان کی دولت اس کے پاس ہے تو پھر ان کی محنت کی قدر دانی کی جائے گی۔ اُن کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور جو شخص ایمان سے خالی ہے، وہ کتنا بڑا نیکی کا کام کرے، اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ تو فرمایا کہ کفار و مشرکین کے پاس چونکہ ایمان نہیں ہے، اس

٢٣٦

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ:- بھلا وہ شخص جو واضح راستے پر ہو اپنے رب کی طرف سے اور آتا ہے اُس کے ساتھ ایک گواہ اُس (اللہ) کی طرف سے اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی، یہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو شخص کفر کرے گا اس کے ساتھ مختلف گروہوں سے، پس (دوزخ کی) آگ اُس کا ٹھکانا ہے۔ پس نہ ہوں آپ شک میں اس کی طرف سے۔ بیشک یہ برحق ہے تیرے پروردگار کی طرف سے لیکن اکثر لوگ ایسے ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ ﴿۱۷﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا ذکر تھا۔ اللہ نے معترضین کو چیلنج کیا کہ اگر قرآن انسانی تخلیق ہے تو پھر تم بھی اس جیسی دس سورتیں ہی بنا کر لے آؤ اور اس کام کے لیے دوسروں کو بھی شامل کر لو۔ پھر پتہ چل جائے گا کہ کیا کوئی انسان ایسا کلام بنا سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اگر تم اس چیلنج کو قبول نہ کر سکو تو اچھی طرح جان لو کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے علم کے ساتھ اتاری گئی ہے

فرمایا اس کتاب کا مرکزی مضمون توحید خداوندی ہے یعنی اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ ہی کوئی قرآن جیسی کتاب لا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی بسر و چشم اطاعت کرو۔

واضح راستہ

اب آج کی آیت میں قرآن کریم پر ایمان لانے والوں کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ منکرین کا انجام بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ بھلا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح راستے پر ہو، وہ اس شخص کی طرح کیسے ہو سکتا ہے جو قرآن پاک کا منکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ بینہ کا عام فہم معنی واضح چیز ہے جب کہ یہ لفظ قرآن پاک میں بعض دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ بینہ میں یہ لفظ دو دفعہ آیا ہے اور وہاں اس سے پیغمبر علیہ السلام کی ذات مراد لی گئی ہے۔ بینہ کا لفظ معجزات کے لیے بھی آتا ہے اور ایسے دلائل پر بھی محمول کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرامین کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اس مقام پر بینہ کے معانی میں مفسرین فرماتے ہیں یہاں پر بینہ سے مراد وہ عقلی دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً عطا فرمائے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ ہر بچے کی پیدائش فطرتِ سلیمہ پر ہوتی ہے اور فطرتِ سلیمہ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرے اور کفر و شرک سے باز رہے۔ چنانچہ بعض حضرات فطرت سلیمہ کو عقل سلیم پر اور بعض اسے واضح دین پر محمول کرتے ہیں۔ غرضیکہ جو شخص فطرتِ سلیمہ پر ہے، وہی عقل سلیم، واضح دین اور واضح راستے پر ہے اور اسی کے متعلق کہا گیا ہے کہ ایسا شخص اُس شخص کے برابر کیسے ہو سکتا ہے جو اللہ کی کتاب کو من گھڑت کتاب کہتا ہے اور اس پر ایمان نہیں لاتا۔ شاہ عبد القادرؒ فرماتے

ہیں کہ بینہ سے مراد خود قرآن اور وہ دین ہے جسے قرآن اور نبی کی زبان نے پیش کیا ہے۔

فطرتِ سلیمہ کی تشریح میں امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ اگر اللہ نے اپنے رسولوں کو نہ بھیجا تو انسان سے شرک کا مؤاخذہ پھر بھی ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا عقلاً بھی فرض ہے۔ مثال کے طور پر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے دور دراز مقام پر رہتا ہو، جہاں کوئی نبی، رسول، ہادی یا مبلغ خدا کا پیغام لے کر نہ پہنچے تو پھر بھی ایسا شخص شرک کی پاداش میں پکڑا جائیگا۔ اللہ فرمائے گا کہ اپنی وحدانیت کے لاکھوں دلائل میں نے تیرے اردگرد بکھیر رکھے تھے پھر تو نے اپنی عقل سلیم سے کام لیتے ہوئے اس کا کیوں نہ اقرار کیا اور شرک کا کیوں مرتکب ہوا؟ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے احکام کے متعلق تو باز پرس نہیں ہوگی کیونکہ ان کی تفصیلات اُس تک نہیں پہنچیں مگر شرک کا مؤاخذہ ضرور ہوگا کیونکہ توحید کو تسلیم کرنے کے لیے اس کے اردگرد بیشمار دلائل موجود تھے مگر اُس نے اپنی عقل سلیم سے کام نہ لیا اور پکڑا گیا۔

لفظ شاہد کی ترجمانی

ایک تو اُس شخص کا ذکر کیا جو اپنے رب کی طرف سے واضح راستے پر ہے اور دوسری بات یہ کہ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ اُس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک گواہ بھی آتا ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس شاہد سے مراد قرآن کریم ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور فطرتِ سلیمہ کی شہادت دیتا ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ گواہ سے مراد نبی کے معجزات ہیں جو خدا کی توحید کی گواہی دیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نبی کا وجود مبارک اور آپ کا چہرہ انور گواہ ہے کہ اس کو دیکھ کر اللہ کی وحدانیت کی سمجھ آجاتی ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے حضور علیہ السلام کے چہرہ انور کی نورانیت

اور رونق کو پہلی نظر میں دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا لَيْسَ هٰذَا الْوَجْهُ بِوَجْهِ الْكَذَّابِ (بخاری شریف) یعنی یہ چہرہ انور کسی جھوٹے شخص کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ نبی کی ذات، اس کی آواز، اس کے معجزات اور آپ کی حیات سارے کے سارے خدا کی وحدانیت کے گواہ ہیں۔ مولانا روم بھی کہتے ہیں ؎ روئے او آواز پیغمبر معجز است

یعنی نبی کا چہرہ انور اور آواز بھی ایک معجزہ ہے۔ حق پرست لوگ ایک ہی ملاقات میں حقیقت کو پا لیتے ہیں۔

بعض فرماتے ہیں کہ شاہد سے مراد دین کا وہ مزا اور نور ہے جو مومن اپنے اندر پاتا ہے۔ مومن اس دین حق پر ہوتا ہے جو قرآن و سنت میں مذکور ہے، وہ اس پر یقین رکھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ یہ خدا کی جانب سے مزید تائید ہے کہ مومن اپنے اندر قرآن پاک کی حلاوت محسوس کرتا ہے اور یہی اس کے لیے بطور گواہ ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ گواہ سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں جو کلام الٰہی کو پیغمبر خدا تک لانے پر مامور ہیں اور اسی مناسبت سے "يَتْلُوْهُ" کا ترجمہ "تلاوت کرتا ہے" کرتے ہیں۔ یعنی جبرائیل علیہ السلام یہ قرآن پاک اللہ کی جانب سے نبی کے پاس لا کر تلاوت کرتے ہیں۔ چنانچہ بینہ کا اصل مصداق قرآن پاک ہے اور اس کو لانے والا جبرائیل علیہ السلام اس کے ساتھ گواہ ہے۔

توحید کا بیج

مسلم شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا فرمان موجود ہے اِنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِيْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے دلوں کی اصل میں امانت کو نازل فرمایا ہے امانت سے انسان کی وہ صلاحیت مراد ہے جس کی وجہ سے وہ مکلف بنتا ہے اور ایمان قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توحید کا بیج ہر انسان کی فطرت

میں بو دیا ہے۔ اسی لیے امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے اندر ۱۹ مرکز ہیں۔ جب ایک مرکز کا پردہ اٹھایا جائے تو دوسرا مرکز سامنے آجاتا ہے، جب دوسرے پردے کو اٹھائیں تو تیسرا مرکز آجاتا ہے اور اسی طرح کل انیس مرکز بن جاتے ہیں اور پھر آخری مرکز کو حجر بحجر کہا جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی تجلی اعظم کا عکس پڑتا رہتا ہے، گویا ہر انسان کے دل میں تجلی اعظم کا عکس پڑ رہا ہے۔ پھر جب انسان کا یہ مادی خول اتر جائیگا تو سارے پردے کھل جائیں گے اور تجلی اعظم کی کشش انسان کو اوپر کی طرف کھینچے گی اور اگر انسان نے اس دنیا میں رہ کر کوئی کمال حاصل نہیں کیا۔ تو اس کی مادیت، کفر، شرک اور برائی اس کو نیچے کی طرف کھینچے گی اور اس کھینچا تانی میں انسان کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ فرمایا ہر انسان کے قلب میں اللہ نے توحید کا بیج بویا ہے عَلِمُوْا مِنَ الْكِتٰبِ وَالسُّنَّةِ جس کی تفصیل لوگوں نے دنیا میں آکر کتاب و سنت سے معلوم کی اور یہی وہ واضح راستہ ہے جس کے متعلق فرمایا کہ کیا وہ شخص جو واضح راستے پر ہے اور پھر اس کے ساتھ ایک گواہ بھی ہے، ایسے شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو خدا کی توحید، قرآن، اور سنت کا منکر ہے۔

تورات بطور پیشوا اور رحمت

فرمایا اس قرآن پاک سے پہلے وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات بھی اِمَامًا وَّرَحْمَةً جو کہ دنیا میں پیشوائی کرنے والی اور رحمت تھی۔ ظاہر ہے کہ آخری کتاب قرآن پاک سے پہلے دیگر کتب سماویہ ہی اپنے اپنے دور میں لوگوں کی پیشوائی کرتی تھیں اور انہیں ہدایت کا راستہ دکھاتی تھیں یہاں پر تورات کا ذکر ہے جسے آسمانی کتابوں میں بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ اب اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید ہے۔ جس کے احکام قیامت تک کے لیے قابلِ عمل ہیں۔ سورۃ انعام، اعراف اور دیگر سورتوں میں اسے بھی رحمت کا لقب دیا گیا ہے۔ اس کی امامت اور

پیشوائی کے متعلق حضور علیہ السلام نے دُعا میں سکھایا ہے وَاجْعَلْہُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً اے اللہ! قرآن پاک کو میرے لیے پیشوائی کرنے والا، نور، ہدایت اور رحمت بنادے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ان دونوں کتابوں یعنی تورات اور قرآن مجید کے متعلق آتا ہے "قُلْ فَأْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ (القصص) اگر تمہیں اس بات پر یقین نہیں ہے کہ کتب سماویہ اللہ نے انسانی راہنمائی کے لیے نازل فرمائی ہیں تو پھر کوئی ایسی الہامی کتاب لے آؤ جوان سے زیادہ راہنمائی کرنے والی ہو۔ بہرحال فرمایا جو کوئی ان کتب پر ایمان لا کر ان پر عمل پیرا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ فرمایا اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ یہی لوگ ہیں جو اس کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب کو پیشوا اور مقتدا مانتے ہیں اور پھر عقل سلیم اور فطرت سلیمہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

منکرین کا انجام

اس کے برخلاف وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ جو کوئی کفر کرے گا اس کے ساتھ مختلف گروہوں سے کسی بھی پارٹی، گروہ فرقہ یا مسلک سے تعلق رکھتا ہو جو انکار کرتا ہو۔ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ تو اس کے وعدے کی جگہ جہنم ہوگی، ایسے شخص کے لیے دوزخ کا وعدہ کیا گیا ہے اور وہ وہیں پہنچے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص میرے بارے میں سن لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لے آئے ہیں اور آپ نے ہدایت کا پروگرام پیش کر دیا ہے۔ ایمان کی دعوت عام دے دی ہے۔ وہ خواہ یہودی ہو یا نصرانی یا کوئی مذہب رکھتا ہو، پھر اگر وہ مجھ پر ایمان نہ لائے تو فرمایا اِلَّا دَخَلَ النَّارَ تو وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ وہ کتنی بھی عبادت و ریاضت کرتا ہو

صدقہ خیرات کرتا ہو، رفاہِ عامہ کے کام انجام دیتا ہو مگر ایمان کے بغیر اس کی کوئی نیکی کام نہیں آئیگی اور ایسا شخص جہنم رسید ہوگا۔

حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کے شاگرد اور مفسرِ قرآن ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں جب بھی کوئی حدیث رسول سنتا تو اس کا مصداق قرآن میں پاتا۔ ظاہر ہے کہ تمام صحیح احادیث کا مصداق قرآن میں موجود ہونا چاہیئے۔ فرمایا کہ جب میں نے مذکورہ بالا حدیث سنی کہ حضور علیہ السلام پر ایمان لائے بغیر تمام یہودیوں اور نصرانیوں کو دوزخ میں جانا ہوگا تو میں نے اس کا مصداق قرآن میں تلاش کیا آخر کار اس حدیث کی مصداق مجھے یہی آیت نظر آئی "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ"، گویا ایمان سے محروم شخص کا تعلق کسی مذہب یا دنیا کے کسی خطے امریکہ، روس، فرانس اور جرمنی سے ہو اُسے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ جہنمی ہے۔

حق من جانب اللہ

فرمایا فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ آپ کو اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ خطاب تو حضور علیہ السلام کو ہے مگر آپ علیہ السلام کو تو کسی شبہ کا احتمال نہیں ہو سکتا، البتہ یہ بات عام لوگوں کو سمجھائی جا رہی ہے کہ اہل ایمان کو اللہ کی بات میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن پاک اللہ کا آخری پروگرام ہے اس کا انکار کرنے والا لازماً جہنم میں جائے گا۔ فرمایا اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ مگر اکثر لوگ ایمان قبول نہیں کرتے آج کی دنیا میں بھی یہی صورت حال ہے۔ لوگوں کی اکثریت ایمان سے محروم ہے۔ پوری دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ مسلمان ہیں اور باقی چار ارب انسان کفر و شرک کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، انہیں ایمان نصیب

نہیں ہے۔ لوگوں کی غالب اکثریت اپنے عقل وفہم سے بنائے ہوئے
دین کو مانتے ہیں یا رسم ورواج کو ہی سینوں سے لگا رکھا ہے۔ یہ لوگ
قرآنی پروگرام کے قریب نہیں آتے بلکہ الٹا اس کی شدید مخالفت
کرتے ہیں۔ لہٰذا حق وصداقت کا معیار اکثریت نہیں بلکہ ایمان، توحید،
نیکی اور تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہی واضح راستہ اختیار کرنے کی توفیق
دے اور ساری دنیا اگر کفر وشرک میں غرق ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ نجات
کا راستہ صرف ایمان اور نیکی کا راستہ ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ
يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ
الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾
اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا
كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ۘ يُضٰعَفُ (وقف لازم)
لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا
كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ
فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰۗىِٕكَ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ
الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ
هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع ۲

ترجمہ :- اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ پر افترا باندھتا ہے جھوٹ۔ یہی لوگ ہیں جو پیش کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے اور کہیں گے گواہی دینے والے کہ یہ وہ ہیں کہ جنوں نے جھوٹ بولا اپنے پروردگار پر۔ سنو! لعنت ہے اللہ کی ظلم کرنے والوں پر (۱۸) وہ جو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے اور تلاش کرتے ہیں اُس راستے میں کجی اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں (۱۹) یہ لوگ ہیں کہ نہیں یہ عاجز کر سکتے زمین میں (اللہ کو) اور نہیں ہے ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی۔ دُگنا کیا جائے گا ان کے لیے عذاب، وہ نہیں طاقت رکھتے تھے سننے کی اور نہیں تھے وہ دیکھتے (۲۰) یہی لوگ ہیں جنوں نے نقصان میں ڈالا اپنی جانوں کو اور گم ہو جائے گا اُن سے وہ جو افتراء کرتے تھے (۲۱) ضرور بر ضرور بےشک یہ لوگ آخرت میں بہت نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے (۲۲) تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنوں نے اچھے کام کیے اور جنوں نے عاجزی کی اپنے رب کے سامنے، یہی لوگ ہیں جنت والے وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (۲۳) مثال دونوں فرقوں کی جیسا اندھا اور بہرہ اور دیکھنے والا اور سننے والا ہو؟ سے۔ کیا یہ دونوں برابر ہیں مثالیں۔ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے (۲۴)

ربطِ آیات گذشتہ درس میں قرآن کی حقانیت اور پیغمبر خدا کے بارے میں تھا کہ جو خدا کی جانب سے واضح راستے پر ہو اور قرآن بطور شاہد بھی اس کے ساتھ ہو تو ایسے لوگ

یقیناً کامیاب ہیں۔ جس طرح سابقہ امت میں موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوائی کرنے والی تھی اور باعث رحمت تھی اس طرح قرآن پاک ہے۔ جو گروہ اور جماعتیں اس کا انکار کریں گی ان کے لیے دوزخ کی آگ تیار ہے، وہی ان کے وعدے کی جگہ ہے کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن کریم تیرے پروردگار کی طرف سے برحق ہے مگر اکثر لوگ ایمان قبول نہیں کرتے

افترا علی اللہ

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے کفار، مشرکین اور منکرین قرآن کی مذمت بیان فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ جھوٹ باندھنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ کی کتاب یا اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتا تو وہ بھی افترا علی اللہ کا مرتکب ہے۔ اللہ کی ذات، صفات یا عبادت میں اس کا شریک ثابت کرنا بھی اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے کیونکہ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح جو شخص کوئی غلط دعویٰ کرتا ہے وہ بھی مفتری ہے جیسے مسیلمہ کذاب یا مرزا قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو انہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا کیونکہ اللہ نے تو انہیں نبی بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ یہ ساری باتیں افترا علی اللہ اور سب سے بڑا جرم ہے۔

اللہ کے حضور پیشی

اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ ایک دن آنے والا ہے جب سب کو اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا پڑے گا۔ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ اور گواہی دینے والے کہیں گے هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا۔ اور گواہی دینے والے اللہ کے فرشتے ہوں گے جو محافظِ اعمال ہیں۔ ان میں کراماً کاتبین اور بعض دوسرے فرشتے

بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ سورۃ طارق میں اللہ نے فرمایا ہے ”اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ“ ہر نفس پر نگران قوت مقرر ہے۔ یہ بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔ اِن کے علاوہ اللہ کے نبی بھی آدمی کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ جو اہلِ ایمان کسی کے متعلق جانتے ہوں گے وہ بھی شہادت دیں گے کہ فلاں نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا۔ اللہ کا فرمان ہے جس قطعہ زمین پر ہم عبادت کرتے ہیں یا گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں وہ قطعہ بھی بول کر گواہی دے گا، غرضیکہ نیکی اور بدی کا ہر مقام اور شجر اور حجر بھی انسان کے حق میں یا خلاف گواہی دیں گے۔ انسان کے اپنے اعضاء جوارح کے متعلق سورۃ یٰسین میں موجود ہے ”اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ“ اُس دن ہم اُن کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں بول کر گواہی دیں گے کہ اس شخص نے فلاں فلاں جرم کیا تھا۔ کفر، شرک اور معصیت کے سارے پول کھل جائیں گے۔ کسی کا حق غصب کیا ہے کسی کو تکلیف پہنچائی ہے ہر چیز کے متعلق گواہ پیش ہو کر بتا دیں گے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ پر افترا باندھا۔ انہوں نے اس ذات پر جھوٹ باندھا جو ان کی خالق، پرورش کرنے والی، نعمتیں بخشنے والی اور قائم رکھنے والی ہے۔ دیکھو! انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا پھر حکم ہوا اَلَا سنو! لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ظلم کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔ لعنت کا معنی خدا کی رحمت سے دوری ہے لہٰذا مفتری اشخاص اللہ کی رحمت کے قریب نہیں آسکیں گے بلکہ پھٹکار میں رہیں گے۔

اللہ کے راستے سے روکنے والے

فرمایا اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ وہ اپنے قول اور فعل سے کوشش

کرتے ہیں کہ لوگ صحیح راستہ اختیار نہ کریں۔ اس کے علاوہ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا اور اس راستے میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ اللہ کے صحیح راستے پر اعتراض کرتے ہیں، خدا کے سچے دین میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں تاکہ لوگ اس سے بدظن ہو جائیں۔ فرمایا وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ وہ آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں یعنی محاسبہ اور جزائے عمل کے بھی منکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی قیامت آنے کی اور نہ ہم سے ہمارے اعمال کی بازپرس ہوگی۔ اللہ نے فرمایا کہ کافر، مشرک اور منکرین جو کچھ بھی کریں أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ یہ لوگ اللہ کے ارادے اور مشیت کو زمین میں عاجز نہیں کر سکتے۔ اور نہ اس کی کسی سکیم کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف تو یہ سازش کر کے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہتے ہیں کبھی کامیاب ہو جاتے ہیں اور کبھی ناکام ہوتے ہیں مگر اللہ کے ہاں ان کی کوئی غلط کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

اسلام کے خلاف سازشیں

اس وقت دُنیا میں عیسائیوں کی آبادی اڑھائی ارب ہے جو کہ اسلام کے خلاف بے شمار سازشیں کر رہے ہیں۔ پیغمبر خدا، قرآن پاک اور دین حق کے پروگرام کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے بے انتہا دولت صرف کر رہے ہیں۔ عیسائی پادریوں نے اسلام پر بڑے اعتراض کیے ہیں۔ شکیب ارسلان اپنی کتاب حَاضِرُ الْعَالَمِ الْاِسْلَامِی میں رقمطراز ہیں کہ یورپ اور امریکہ عیسائیوں نے اسلام کے خلاف چھ لاکھ کتابیں اور رسالے لکھے ہیں جن میں قرآن کریم کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اسلام پر دو ہرا وار کیا ہے، دشمن کی حیثیت میں بھی اور دوست کی صورت میں بھی۔ مغربی مستشرقین ہمیشہ خیر خواہ کی صورت

میں آتے ہیں اور تحقیق کے نام پر قرآن کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ پیغمبر علیہ السلام کی ذات کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ لوگ بدگمان ہو کر دین سے بدظن ہو جائیں اور آپ کی ذات پر ایمان نہ لائیں۔ یہ لوگ رفاہ عامہ کے کاموں کے ذریعہ بھی اہل ایمان میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سکول اور ہسپتال قائم کرتے ہیں اور ان کے ذریعے عیسائیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ ایڈ کے نام پر غلط نظریات بھی داخل کرتے ہیں۔ سکولوں میں بائبل کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ ہسپتالوں میں ہر صبح ہر مریض کے سرہانے بائبل کی تلاوت کی جاتی ہے، انہیں عیسائیت کی خوبیوں سے آگاہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ ایمان کو چھوڑ کر مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کر لیں۔ لیکن اس کے باوجود اسلام کی حقانیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ حکومتیں اگرچہ اسلام کی آبیاری سے چشم پوشی اختیار کیے ہوئے ہیں اور دولت مند اس کے خلاف ہیں مگر اسلام ہے کہ مسلسل پھیل رہا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں انگریز کو دنیا میں سیاسی غلبہ حاصل رہا ہے اس دوران میں اس نے مسلمانوں کے دین، قومیت، اجتماعیت اور خلافت کو بگاڑنے کی ہر چند کوشش کی ہے مگر اسلام موجود ہے اور موجود رہے گا۔ قرب قیامت میں نزول مسیح علیہ السلام تک اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ یہ سچا دین ہے۔ وہ اس کی مدد کرتا رہے گا اور اسے کوئی نہیں مٹا سکے گا۔

جہاں تک خود مسلمانوں کے کردار کا تعلق ہے، وہ اسلام کی حمایت میں مخلص نہیں ہیں۔ دنیا بھر کی اسلامی حکومتیں اپنے اقتدار کے دوام کے لیے تگ و دو میں مصروف ہیں اور اسلام کی آبیاری ان کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام کی دعویدار ایرانی حکومت نے اسلام کے نصب العین کے لیے کیا کیا ہے؟ سعودی عرب میں ملوکیت کی حکومت

ہے انکی کچھ باتیں اچھی بھی ہیں جنکا احترام کیا جانا چاہیئے مگر دوسری طرف اقتصادی نظام کا بھی جائزہ لینا چاہیئے کہ وہاں اسلامی نظام معیشت رائج ہے؟ وہاں تو مغربی بنکاری نظام چل رہا ہے جسکی بنیاد سود پر ہے۔ بہرحال اسلام کا حامی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہ کافی ہے۔ گذشتہ دو صدیوں میں انگریزوں نے اسلام کو مٹانے کی پوری کوشش کی ہے۔ آپ اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ یہودیوں نے قرآن کے تحریف شدہ نسخے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیے ہیں۔ جب افریقہ میں ایسی کوشش کی گئی تو مصر کے ناصر مرحوم نے اس کا فوراً نوٹس لیا، ایک کمیٹی قائم کی جس نے قرآن پاک کے صحیح نسخے لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کیے تاکہ لوگ گمراہ نہ ہوں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ یہودیوں نے تحریف شدہ نسخے پاکستان میں بھی بھیجے ہیں۔ یہ ساری کوشش اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے کی جا رہی ہے۔

خود مسلمانوں کا کردار بھی ایسا ہے جو اسلام کے راستے میں کاوٹ بن رہا ہے۔ بہت سے گمراہ فرقے وجود میں آگئے ہیں جو اپنے باطل عقیدے اور عمل سے لوگوں کو بدظن کر رہے ہیں۔ اگر اسلام یہی ہے جو یہ لوگ پیش کر رہے ہیں تو پھر اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ یہ تو خدا کے راستے سے روکنے والی بات ہے۔ مسلمانوں کو دنیا میں نہایت احتیاط کے ساتھ چلنا چاہیئے اور کوئی ایسا عقیدہ، عمل اور کردار پیش نہیں کرنا چاہیئے جو اسلام کی بدنامی کا باعث بنے۔

منکرین کے لیے دگنا عذاب

فرمایا یہ لوگ زمین میں خدا کو عاجز نہیں کر سکتے اور یاد رکھو! وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ اللہ کے سوا ان کا کوئی حامی نہیں ہے يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ان کے لیے دگنا عذاب ہو گا۔ ایک عذاب اس لیے کہ وہ خود کفر، شرک اور معاصی کے مرتکب ہوئے اور دوسرا اس لیے کہ انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا فرمایا مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ

انہیں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ کچھ بات کو سنتے اور اس کو دیکھتے بھی نہیں مطلب یہ ہے کہ انہوں نے عقائد اور عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو ایسا بنا لیا تھا کہ وہ حقیقت کو سن سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ اور جو کچھ وہ افترا کیا کرتے تھے وہ سب گم ہو کر رہ گیا۔ قیامت کو پوچھا جائے گا کہ جن معبودانِ باطلہ کی تم پرستش کرتے تھے، جن کو حاجت روا اور مشکل کشا مانتے تھے، آج وہ کہاں گئے؟ تم نبی کی رسالت اور خدا کی کتاب کو جھٹلاتے تھے، آج تمہارے وہ دعوے کہاں گئے! تم قیامت کا انکار کرتے تھے مگر وہ برپا ہو چکی، یہ سارے افترا آج گم ہو گئے۔ فرمایا لَا جَرَمَ یعنی لامحالہ، ضرور بر ضرور أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ یہ لوگ آخرت میں بہت بڑا نقصان اٹھانے والے ہوں گے خاسر عام نقصان رسیدہ کو کہتے ہیں جب کہ اخسر بہت زیادہ نقصان اٹھانے والوں میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ بھی گمراہ ہوئے، دوسروں کو بھی گمراہ کیا، ان کے لیے اس سے بڑھ کر کیا خسارہ ہوگا کہ وہ ڈبل سزا کے مستحق ہوں گے۔

اہل ایمان کے لیے جنت

قرآن پاک میں عام طور پر جہاں منکرین اور اُن کے انجام کا ذکر ہوا ہے اس کے ساتھ اہل ایمان اور اُن کے انعامات کا تذکرہ بھی ہے اس مقام پر بھی مفترین کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے اہل ایمان کا ذکر کیا ہے إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کیا۔ پھر اللہ کے رسول اور وحی الٰہی پر ایمان لائے ملائکہ پر یقین لائے، خدا کی تقدیر اور جزائے عمل کو تسلیم کیا ان سب باتوں کی دل سے تصدیق کی۔ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اور اس کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ بھی انجام دیے۔ بنیادی طور پر عبادات اربعہ

نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ نیک اعمال ہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جس شخص کا عقیدہ صحیح ہوگا اور وہ چار عبادات ادا کریگا، وہ ضرور جنت تک پہنچے گا۔ اس کے علاوہ انسانی ہمدردی، غریب پروری، صدقہ خیرات وغیرہ سب نیک اعمال ہیں۔ فرمایا جو یہ انجام دیں گے وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ اور جنہوں نے اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی کی، پہلے گزر چکا ہے کہ کافر لوگ اکڑ دکھاتے تھے۔ اپنے آپ کو اعلیٰ اور نبی کو حقیر سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو سچا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مگر اللہ نے فرمایا، غرور و تکبر کی بجائے جنہوں نے خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار کیا، اس کی وحدانیت کو تسلیم کیا، اس کے نبی اور قرآن پر ایمان لائے اور پھر اس کے سامنے خشوع و خضوع کیا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ یہی لوگ جنت والے ہیں هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یاد رہے کہ اخبات یعنی عاجزی ان چار اخلاق میں سے ایک ہے جو تمام آسمانی شریعتوں میں بنی نوع انسان کے لیے ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ وہ چار اخلاق طہارت، سماحت اخبات اور عدالت ہیں، جو کسی نبی کی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئے اور ہم بھی ان کے پابند ہیں۔ تو یہاں پر عاجزی کرنے والوں کی اللہ نے تعریف بھی بیان فرمائی ہے۔ کہ جنت ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ اپنے رب کے سامنے عاجزی بھی کی۔

نیک و بد کا تقابل

آگے اللہ تعالیٰ نے نیک اور بد آدمی کا تقابل ایک مثال کے ذریعے کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا اور بہرہ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ اور دیکھنے والا اور سننے والا۔ ایک گروہ وہ ہے جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا، ان کی مثال اندھے اور بہرے

جیسی ہے جو نہ حق کو دیکھتے ہیں اور نہ اُسے سنتے ہیں، دوسرا گروہ ایمان ، نیکی اور عاجزی والا ہے جس کی مثال دیکھنے والے اور سننے والے کی ہے فرمایا ھَلۡ یَسۡتَوِیٰنِ مَثَلًا کیا یہ دونوں گروہ برابر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے اور اسی طرح بہرہ اور سننے والا برابر نہیں۔ کافر لوگ اندھوں اور بہروں کی طرح ہیں جو نہ حق بات کو دیکھتے ہیں اور نہ سنتے ہیں۔ اس کے برخلاف مومن آدمی حقیقت کو دیکھتا بھی ہے اور اسے سنتا بھی ہے۔ اور حقیقت میں یہی چیز بصیرت کی طرف راجع ہے اللہ نے سورۃ حج میں فرمایا ہے" فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَلٰكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ" ان بد طینت لوگوں کی ظاہر آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ ان کے دلوں کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اور وہ بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت کو پا ہی نہیں سکتے سورۃ اعراف میں گزر چکا ہے" وَتَرٰٮهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ وَهُمۡ لَا يُبۡصِرُوۡنَ" آپ ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف تک رہے ہیں مگر حقیقت میں وہ نہیں دیکھتے۔ اگر دل کی آنکھوں سے دیکھتے تو نبی کی ذات کو پہچان لیتے، حق کو پا لیتے مگر اُن کے دل کی آنکھیں اندھی ہیں اس لیے وہ حق کو دیکھ نہیں سکتے۔ ان کے دل کے کان بہرے ہیں جو اچھی بات کو نہیں سن سکتے۔ اس جس کے دل میں نورِ ایمان اور نورِ توحید ہے، وہ اہلِ بصیرت ہے۔ ایسا شخص دینِ حق کو فوراً پہچان لیتا ہے۔ اور پھر حسبِ استطاعت اس پر عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ ان دونوں کی مثالیں برابر ہو سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ کیا حق کی طرف تمہارا میلان نہیں ہوتا؟

اب اگلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ذکر آرہا

ہے جس کے متعلق سورۃ اعراف میں گزرچکا ہے "قَوْمًا عَمِیْنَ"
یہ ساری کی ساری قوم اندھی تھی۔ اس سورۃ میں بھی حضرت نوح علیہ السلام
کی تبلیغ اور قوم کے انکار کی بات ہو رہی ہے۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ اِنِّىۡ لَـكُمۡ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۝۲۵
اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ‌ ؕ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ
يَوۡمٍ اَلِيۡمٍ ۝۲۶ فَقَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ
مَا نَرٰٮكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا وَمَا نَرٰٮكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا
الَّذِيۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُـنَا بَادِىَ الرَّاۡىِ‌ۚ وَمَا نَرٰى لَـكُمۡ
عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۢ بَلۡ نَظُنُّكُمۡ كٰذِبِيۡنَ‏ ۝۲۷

ترجمہ:۔ البتہ تحقیق ہم نے رسول بنا کر بھیجا نوح علیہ السلام کو اُن کی قوم کی طرف (انہوں نے کہا) بیشک میں تمہارے لیے ڈر سنانے والا ہوں کھول کر (۲۵) کہ نہ عبادت کرو سوائے اللہ کے کسی کی۔ میں خوف کھاتا ہوں تم پر دردناک دن کے عذاب سے (۲۶) کہا سربرآوردہ لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا تھا اُن کی قوم میں سے کہ ہم نہیں دیکھتے تم کو مگر انسان اپنے جیسا اور ہم نہیں دیکھتے تجھ کو کہ تیرا اتباع کیا ہو مگر اُن لوگوں نے جو ہم میں رذیل ہیں، سرسری رائے والے۔ اور نہیں دیکھتے ہم تمہارے لیے اپنے اُوپر کوئی فضیلت بلکہ ہم خیال کرتے ہیں تم کو جھوٹا (۲۷)

تاریخ انبیاء

اس سورۃ کی پہلی آیت میں قرآنِ پاک کی حقانیت اور صداقت کا ذکر تھا۔ پھر اس کی دوسری آیت میں توحید کا بیان ہے۔ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ اے لوگو! اللہ

کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اب آج سے شروع ہونے والے حصہ سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کی تاریخ کا ایک حصہ بیان فرمایا ہے۔ ہر نبی کی تعلیم میں یہ بات ذکر کی گئی کہ انہوں نے اپنی اپنی قوم سے فرمایا یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اے میری قوم کے لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ گویا اپنی وحدانیت کا درس دینے کے لیے اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے کئی انبیاء کا ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے فریضۂ تبلیغ کو کس طرح ادا کیا، عقیدۂ توحید کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا اور پھر لوگوں نے اپنے انبیاء کو کیا جواب دیا اور ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہاں پر تاریخِ انبیاء کا اہم ترین حصہ آگیا ہے۔

زمانہ قبل از نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے اللہ کے تین نبی گزرے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اس خطۂ ارض پر پہلے انسان اور پہلے نبی تھے۔ نسل انسانی یعنی آدمیت کا دور حضرت آدم علیہ السلام ہی سے شروع ہوا۔ آپ کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمان ہے نَبِیٌّ مُّکَلَّمٌ آدم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں جن کے ساتھ اللہ نے کلام کیا تھا جب حضور سے دریافت کیا گیا کہ سب سے پہلے نبی کون ہیں تو آپ نے یہی جواب دیا تھا اور فرمایا تھا کہ آدم علیہ السلام ابوالبشر یعنی تمام انسانوں کے باپ ہیں۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے شیث علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔ اور پھر آدم علیہ السلام کی اولاد میں کئی پشتوں کے بعد اللہ کے نبی ادریس علیہ السلام پیدا ہوئے پہلی کتابوں میں آپ کا نام اخنوخ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم نوح علیہ السلام سے پہلے شیث علیہ السلام کی ملت میں صرف بنیادی عقاید توحید وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ طہارت، نماز، روزہ وغیرہ عبادات بھی تھیں مگر تفصیلی شرعی احکام نہیں تھے، بلکہ زیادہ تر دنیا کی آبادی کے مسائل تھے۔ پھر جب ادریس علیہ السلام کا دور آیا تو صاحب تفسیر مدارک کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعے دنیا کی آبادی کی ضروریات

کی بہت سی چیزیں سکھائیں۔ چنانچہ کپڑے سینے کی سوئی اور دیگر اوزار ادریس علیہ السلام نے ایجاد کیے۔ اللہ نے ان پر کئی صحیفے نازل فرمائے۔ ظاہر ہے کہ ان میں بنیادی عقائد کی تعلیم تو ضرور ہو گی جن میں توحید، طہارت، نماز، روزہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتی باڑی میں استعمال ہونے والے آلات، ظروف سازی اور پارچہ بافی بھی شامل ہیں۔ البتہ تفصیلی شرعی احکام نوح علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوئے۔

نوح علیہ السلام کا دور

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر قرآن پاک کی متعدد سورتوں اعراف، یونس، ہود اور صٰفٰت وغیرہ میں موجود ہے۔ اس مقام پر آپ کی تبلیغ کے متعلق کافی تفصیلات ہیں اور پھر آپ کے نام پر ایک مستقل سورۃ نوح بھی ہے جس میں مکمل طور پر آپ ہی کا ذکر ہے۔ اسی طرح سورۃ یوسف پوری کی پوری حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات پر مشتمل ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ جسمانی طور پر بڑے طاقتور تھے گویا نسلِ انسانی کی جوانی کا آغاز تھا۔ آپ کی قوم میں بہیمیت کا بہت زیادہ غلبہ تھا، اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بارہ مہینے روزے رکھنے کا حکم تھا۔ تاکہ ان کی بہیمیت کو کمزور کیا جا سکے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ آپ جہاں کہیں بھی پڑھیں کہ فلاں قوم کو زیادہ روزے رکھنے کا حکم تھا۔ تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ اس قوم کے لوگوں میں بہیمیت بہت بڑھی ہوئی ہو گی جسے توڑنے کے لیے ریاضت کی ضرورت تھی تو اللہ نے انہیں روزے رکھنے کا حکم دیا ہو گا۔ ہماری اس آخری امت میں بہیمیت پہلے ہی کمزور ہے لہٰذا ان پر زیادہ مشکل احکام نہیں ڈالے گئے بلکہ ان کے لیے عبادت و ریاضت کو آسان بنا دیا گیا ہے کہ یہ اپنی جسمانی کمزوری کے ساتھ ان

احکام پر آسانی سے عمل کر سکیں۔

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام روئے زمین پر اللہ کے سب سے پہلے رسول ہیں جن پر مستقل شریعت نازل ہوئی اور آپ نے لوگوں کو مسائل اور احکام دینیہ کی باقاعدہ تعلیم دی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ سفارش کے لیے مختلف انبیاء علیہم السلام کے پاس جائیں گے تو وہ حضرت نوح علیہ السلام سے عرض کریں گے یَا نُوْحُ اِنَّكَ اَوَّلُ الرُّسُلِ اِلَىٰ اَهْلِ الْاَرْضِ یعنی اے نوح علیہ السلام! آپ اہل زمین کی طرف اللہ کے اولین رسول ہیں جنہیں مستقل شریعت اور احکام دیے گئے اور پھر جب لوگوں نے ان احکام کی نافرمانی کی تو انہیں سزا بھی دی گئی۔ آپ سے پہلے کسی قوم کو سزا نہیں ملی۔ یہ پہلی قوم ہے جو اللہ کے عذاب کی مستحق بنی لہٰذا اس واقعہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے والد کا نام لمک یا ملک تھا۔ آپ متوشلخ کے فرزند تھے اور متوشلخ حضرت ادریس علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد نو سو پچاس ۹۵۰ برس تک لوگوں کو دین حق کی تبلیغ کرتے رہے۔ سورۃ عنکبوت میں ہے کہ ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا آپ ان کو پچاس کم ہزار سال تک تبلیغ کرتے رہے۔ سورۃ نوح میں آپ کے طریقہ تبلیغ کا ذکر بھی موجود ہے آپ نے رات اور دن میں کوئی موقع ضائع نہیں کیا۔ آپ لوگوں کے پاس تنہائی میں بھی گئے اور عام مجمعوں میں بھی فریضہ تبلیغ انجام دیتے رہے آپ نے ترغیب اور ترہیب دونوں طریقوں سے تبلیغ کی۔ آپ

نے اتنا لمبا عرصہ گزار کر اس دوران میں کئی نسلیں بدل گئیں۔ مگر قوم کے بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے، ان کی غالب اکثریت آپ کی مخالف رہی اور آپ کو طرح طرح کی تکالیف پہنچاتی رہی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا حضرت نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی۔ آپ نو سو پچاس سال تک تبلیغ کرتے رہے اور اس کے بعد آپ کی قوم پر عذاب آیا جس کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے طوفانِ نوح کسی خاص علاقے تک محدود نہیں تھا بلکہ یہ عالمی طوفان تھا جو ساری دنیا میں آیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ طوفان دریائے دجلہ اور فرات کے درمیانی دو آبہ تک محدود رہا۔ تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اہل ایمان اسی مرد و زن کے علاوہ روئے زمین پر کوئی بھی انسان زندہ نہ بچا۔ نوح علیہ السلام کی بیوی اور ایک بیٹا بھی طوفان میں ڈوب گئے۔ آپ کے تین بیٹے مومن تھے وہ زندہ بچ گئے۔ اس طوفان کے بعد نوح علیہ السلام ساٹھ برس تک مزید زندہ رہے اور آپ کی وفات واقع ہوگئی۔ اس طرح آپ کی کل عمر ایک ہزار پچاس سال بنتی ہے۔

آغاز تبلیغ

فرمایا، ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو آپ نے تبلیغ کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ اے لوگو! میں تمہارے لیے ڈرسنانے والا ہوں کھول کر۔ یعنی میں تمہیں تمہارے بُرے انجام سے واضح طور پر خبردار کر رہا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے بھی ایک موقع پر فرمایا تھا اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَانُ میں برہنہ نذیر ہوں یعنی ڈرانے والا ہوں۔ عربوں کا یہ دستور تھا کہ دشمن کی طرف سے حملہ کے وقت یا کسی دیگر شدید خطرے کے موقع پر اطلاع دینے والا آدمی کسی اونچی جگہ پر چڑھ جاتا۔ اپنے کپڑے پھاڑ کر نیزے پر لٹکا لیتا اور بالکل برہنگی کی حالت میں واصباحاہ کا اعلان کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ لوگو! دشمن سر پر آگیا

ہے۔ لہٰذا اپنی فکر کرلو۔ جب لوگ یہ اعلان سنتے اور یہ اعلان کرنے والے کو اس حالت میں دیکھتے تو فوراً اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیتے۔ اسی دستور کے مطابق حضور علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ لوگو! میں تمہارے لیے برہنہ نذیر ہوں۔ تمہیں خدا تعالیٰ کے عذاب سے خبردار کر رہا ہوں، لہٰذا اپنا بچاؤ کر لو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا کہ میں تمہارے لیے واضح ڈرانے والا ہوں۔ میری بات مان لو اور خدا کے عذاب سے بچ جاؤ۔

توحید باری تعالیٰ

آپ نے قوم کو سب سے پہلا سبق یہ دیا أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللّٰهَ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ عقیدہ توحید دین اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور دین کی پوری عمارت اسی عقیدے کے گرد گھومتی ہے۔ عبادت بدنی ہو یا مالی، قولی ہو یا فعلی، نذر و نیاز ہو یا سجدہ تعظیم، اللہ کے سوا کسی کے لیے روا نہیں۔ غیر اللہ کی عبادت شرک اور خدا کے ساتھ بغاوت ہے۔ اس سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے جو تین باتیں کہلائی ہیں، ان میں بھی یہی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اللہ سے معافی مانگو اور اس کے سامنے توبہ کرو۔ غرضیکہ اسی عقیدہ توحید کی تبلیغ کے لیے اللہ نے اپنے سارے نبی مبعوث فرمائے۔ اس فریضہ کو انبیاء نے کس طرح انجام دیا، اس کی تفصیلات پڑھنے سے انبیاء کی اولوالعزمی اور ان کی تکالیف برداشت کرنے کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ تمام انبیاء نے اپنی اپنی قوموں کو توحید کی دعوت دی، کفر و شرک کی مذمت بیان کی اور لوگوں کو ان کے بُرے انجام سے آگاہ کیا۔

توحید کی دعوت دیتے وقت حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو یہ بھی بتایا إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ میں تم پر دردناک دن کے عذاب سے خوف کھاتا ہوں۔ قرآن پاک میں عام طور پر عذاب الیم یا عذاب عظیم کا ذکر آتا ہے مگر اس مقام پر یوم الیم کے الفاظ آئے ہیں بظاہر دن تو دردناک نہیں ہوتا تاہم اطلاق مجازی کے طور پر اس کا معنی یہ ہوگا کہ ایسا

ذِی جس دن بڑا دکھ اور تکلیف ہوگی اور وہ قیامت کا دن ہے جسے یوم عظیم یعنی بڑا دن بھی کہا گیا ہے۔ فرمایا میں اس دن کی مشکلات سے تمہیں ڈراتا ہوں جس دن بڑا دکھ اور درد ہوگا۔ یہ نوح علیہ السلام کی تقریر کا سلسلہ ہے اور اس کے بعد قوم کا جواب آرہا ہے۔ آپ کی تقریر کا باقی حصہ آگے آئیگا۔

قوم کا جواب

نوح علیہ السلام کی دعوت توحید کے جواب میں فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ آپ کی قوم میں سے کفر کرنے والوں کے سربرآوردہ لوگوں نے جواب دیا مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا ہم تو تمہیں اپنے جیسا انسان خیال کرتے ہیں اے نوح علیہ السلام تم یہ نبوت کا دعویٰ کیسے کر رہے ہو، ہماری طرح کھاتے پیتے ہو، لباس پہنتے ہو، بازاروں میں چلتے پھرتے ہو، بیوی بچے رکھتے ہو، بھلا تم نبوت اور شریعت کی بات کیسے کرتے ہو۔

کفار و مشرکین ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ کوئی انسان نبوت و رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ کہتے تھے کوئی فرشتہ، جن یا کوئی دیگر مخلوق ہو تو ہم نبی مان لیں مگر اپنے جیسے انسان کو نبی نہیں مان سکتے۔ سورۃ قمر میں قوم ثمود کے واقعہ میں آتا ہے "فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ" کہنے لگے کیا ہم اپنے میں سے ایک انسان کے پیچھے لگ جائیں اگر ایسا کریں گے اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں پڑ جائیں گے۔ صالح علیہ السلام میں ہم سے زیادہ کون سی خوبی ہے جس کی بناء پر اُسے اللہ کا نبی تسلیم کر لیں۔ مکے کے مشرکین بھی یہی کہتے تھے کہ اے محمد! تو تو ہمارے جیسا انسان ہے ہم تمہیں کیسے رسول مان لیں؟ نبوت ملنی تھی تو مکے اور طائف میں سے کسی بڑے آدمی کو ملتی جو صاحب حیثیت ہوتا، جس کے پاس مال و دولت اور باغات ہوتے، کوٹھی اور نوکر چاکر ہوتے، بھلا ایک نادار آدمی کو ہم کیسے نبی مان لیں؟

بشریت انبیاء علیہم السلام

انسان ہونا اور پھر غریب ہونا، یہ دونوں باتیں نبی کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ رکاوٹ رہی ہیں۔ اس کا جواب اللہ نے قرآن پاک میں مختلف طریقوں سے دیا ہے۔ کہیں فرمایا، کوئی سمجھ داری کی بات کرو، اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو ہم فرشتوں کو رسول بنا کر بھیج دیتے۔ جب زمین میں انسان آباد ہیں تو پھر اُن کے پاس رسول بھی انسانوں میں سے ہی آئے گا ظاہر ہے کہ کسی حکم پر عمل درآمد کے لیے نمونے کی ضرورت ہے اور ایک انسان کے لیے انسان ہی نمونہ ہو سکتا ہے اگر انسان کی راہنمائی کے لیے کسی جن یا فرشتے کو رسول بنا کر بھیجا جائے تو وہ کیسے اقتدار کر سکیں گے۔ جنات انسان کی نسبت بڑی طاقتور مخلوق ہے، اسی طرح فرشتے بھی دوسری مخلوق ہیں۔ انہیں کھانے پینے کی ضرورت نہیں، وہ مشکل کام بھی کر سکتے ہیں، مگر ہم اُن کی پیروی کیسے کر سکتے ہیں؟ اتباع تو جبھی ہو گا جب اپنے جیسا آدمی کوئی کام کر کے دکھا لے۔ جب مدینہ کے گرد خندق کھودی جا رہی تھی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور علیہ السلام سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹ پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا بھی دکھایا۔ حضور نے فرمایا کہ بھوک مجھے بھی لگ رہی ہے اور میں نے اپنے پیٹ پر دو پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ گویا انسان نبی نے دو پتھر ان لوگوں کے لیے نمونہ پیش کر دیا، فرشتے تو ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی یہ حالت دیکھ کر صبر آ گیا اور انہوں نے بھوک کی دوبارہ شکایت نہیں کی۔

نبی کی نبوت اور بشریت کے مسئلہ میں پرانے زمانے کے کافر اور موجودہ دور کے بدعتی برابر ہیں۔ وہ بشر مانتے تھے اور نبوت کا انکار کرتے تھے جب کہ یہ نبی مانتے ہیں اور بشریت کا انکار کرتے ہیں۔ آج کے مسلمانوں نے نبی کو انسانیت کی نوع سے نکال کر نوری مخلوق میں داخل

کردیا ہے اور پھر خود ہی نورٌ مِّنْ نُوْرِ اللّٰہِ کا عقیدہ وضع کر لیا ہے یہ دونوں طبقے گمراہی میں مبتلا ہیں۔ نبی نورِ ہدایت تو ہو سکتا ہے مگر اُس کو انسانیت سے خارج نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ انسانوں ہی کی راہنمائی کے لیے آ رہا ہے۔

انسانوں کے درجات

ہاں ایک بات ضرور ہے کہ سارے انسان درجات کے لحاظ سے ایک جیسے نہیں۔ نبی، صدیق، شہید اور صالح انسانوں ہی کے مختلف درجات ہیں۔ ایک نیک اور بد آدمی برابر نہیں ہو سکتے۔ عالم اور جاہل بھی برابر نہیں اسی لیے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

نیستند آدم غلاف آدم اند

یعنی بعض لوگوں کی شکل و صورت آدمیوں جیسی ہے مگر حقیقت میں وہ آدمی نہیں ہیں۔ بلکہ آدمیت کا غلاف اوڑھا ہوا ہے۔ اندر سے وحشی اور درندے ہیں۔ انسان انسان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کافروں کی اس بات کو مولانا روم نے اپنی حقائق کی زبان میں اس طرح سمجھایا ہے۔

ہمسری با انبیاء برداشتند
اولیا را ہم چو خود پنداشتند

منکر لوگوں نے انبیاء کی ہمسری کی کہ ہم بھی انہی کی طرح انسان ہیں اسی طرح اولیاء اللہ کو بھی اپنے جیسے معترب خیال کیا۔

اور پھر اُن کی دلیل یہ تھی

گفتہ ایں نک ما بشر ایشاں بشر
ما و ایشاں بستہ خوابیم و خور

ہم بھی انسان ہیں اور یہ بھی انسان ہیں ہماری طرح یہ بھی کھاتے پیتے اور سوتے ہیں لہٰذا ہم ان کو نبی نہیں مان سکتے۔

ایں نہ دانستند ایشاں از عمیٰ
درمیانِ فرق بود بے منتہیٰ

اندھے پن کی وجہ سے انہوں نے اس بات کو نہ جانا کہ دو آدمیوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے

ہر دو گون زنبور خوردا ز یک محل
زیں یکے شد نیش و زاں دیگر عسل

دو مکھیاں ایک ہی جگہ سے ایک ہی پھول کا رس چوستی ہیں مگر بھڑ زہر پیدا کرتی ہے اور شہد کی مکھی شہد پیدا کرتی ہے۔

ہر دو گوں آہو گیاہ خوردند و آب
زاں یکے شد خون ازدیگر مشک ناب

دو ہرنیاں ایک جگہ سے گھاس چرتی اور پانی پیتی ہیں مگر ایک میں خون پیدا ہوتا ہے اور دوسرے میں کستوری۔

آں دو نے خوردند از یک آب خور
ایں یکے خالی و دیگر پر شکر

دو کلے ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ ایک کا خالی رہتا ہے۔ (صرف قلم وغیرہ بنانے کے کام آتا ہے) جب کہ دوسرا گنا یعنی گنا شکر سے بھر جاتا ہے۔

صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں
فرق شاں ہفتاد سالہ راہ بیں

ہزاروں مثالیں ایسی دیکھو کہ ان کے درمیان اتنا فرق ہو گا کہ ستر سال کی مسافت بھی طے ہو جائے تو پھر بھی وہ آپس میں نہ مل سکیں۔

بہرحال انبیاء علیہم السلام انسان ہوتے ہوئے بھی بڑے فضل والے ہوتے ہیں اللہ نے انہیں بڑا کمال عطا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ بنی نوع کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں ان کے دل نور ایمان سے

روشن ہوتے ہیں۔ اُن کا ہر قول، فعل، حرکت اور سکون خدا تعالیٰ کی رضا کے تابع ہوتا ہے۔ مگر ہوتے انسان ہی ہیں۔ روٹی کھاتے ہیں، لباس پہنتے ہیں۔ شادی کرتے ہیں، بیمار ہوتے ہیں، دشمنوں سے جہاد کرتے ہیں۔ کبھی اُن کو ہلاک کرتے ہیں، کبھی خود شہید ہو جاتے ہیں مگر دائرہ انسانیت سے خارج نہیں ہوتے۔

مشرکین کا دوسرا اعتراض

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ اے نوح ہم تو تمہیں اپنے جیسا انسان خیال کرتے ہیں اور دوسرا یہ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا ہم نہیں دیکھتے آپ کا اتباع کرتے مگر ہم میں، سے رذیل لوگ، اگر آپ کا اتباع کوئی کھاتے پیتے امیر کبیر لوگ کرتے تو ہم آپ کے دعویٰ پر غور کر سکتے تھے۔ مگر آپ کے متبعین تو کمی کمین لوگ ہیں، لہٰذا ہم اعلیٰ خاندان والے تمہاری نبوت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ کہنے لگے آپ کے پیروکار صرف رذیل لوگ ہی نہیں بلکہ بَادِيَ الرَّاْيِ ہیں یہ لوگ سرسری رائے رکھتے ہیں، کسی پختہ رائے کے مالک نہیں ہیں، لہٰذا جس شخصیت کو ایسے کمزور لوگوں نے نبی مانا ہے، ہم اسے نبی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کی بے نصیبی یہ تھی کہ وہ مال و دولت، جاہ و حشمت اور حسب نسب کو ہی کمال کی بنیاد سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے ہاں کمال اور کامیابی کا معیار ایمان اور نیکی ہے۔ مغرور لوگوں کی ہمیشہ سے یہ خصلت رہی ہے کہ وہ اہلِ حق کو حقیر جان کر اُن کی مخالفت کرتے ہیں، اُن کا تمسخر اڑاتے ہیں جب پاس سے گزرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ دیکھو! یہ جنت کے وارث اور حوروں کے خاوند جا رہے ہیں جن کے پاس رہنے کے لیے جھونپڑی نہیں۔ کھانے کے لیے خوراک نہیں اور پہننے کے لیے لباس سے محروم ہیں۔ مگر حقیقت میں یہی وہ لوگ تھے جن کا عقیدہ درست اور اخلاق

برگزیدہ تھا، جن کا عمل صحیح تھا۔ اور جو ایمان، نیکی اور تقوے کی دولت سے مالا مال تھے۔ اور اللہ کے ہاں انہیں کمال حاصل تھا۔

کامیابی کا مدار

الغرض! کامیابی کا مدار مال و دولت اور حسب نہیں۔ اگر فلاح کا معیار یہ چیزیں ہوتیں تو مکے میں امیہ بن خلف، مغیرہ اور ابوجہل جیسے سردار موجود تھے، طائف میں حبیب، مسعود اور عبد یالیل صاحب حیثیت تھے مگر اللہ کے نزدیک وہ جہنم کے کندہ ناتراش ہیں۔ دولت تو فرعون کے پاس بھی بہت زیادہ تھی، گذشتہ سورۃ میں گزر چکا ہے کہ وہ سونے کی زرہ پہنتا تھا۔ اس کے خیمے سونے کے کیلوں سے گاڑھے جاتے تھے ایسی ایسی عمارات اور مقبرے بنائے تھے جنہیں دیکھ کر ان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے مگر وہ بھی جہنم میں گیا، لہٰذا کسی کو حقیر نہیں جاننا چاہیئے۔ اکرام مسلم بہت بڑی حقیقت ہے۔ مومن ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کا احترام کرو، مال لباس، مکان اور جائداد کو سلام نہ کرو بلکہ ایمان اور نیکی کو دیکھو۔ یہ نبیوں کی تعلیم ہے۔ مومنوں کو حقیر جاننا کافروں کا کام ہے یہ مسلمانوں کا شیوہ ہرگز نہیں۔ بعض لوگ ایک دوسرے کو پیشے کی وجہ سے مطعون کرتے ہیں کہ فلاں دھوبی، نائی یا لوہار ہے۔ بھائی کوئی حلال پیشہ حقیر نہیں۔ البتہ حرام پیشے ممنوع ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے جو شخص اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتا ہے اُسے باز آجانا چاہیئے ورنہ ایسا آدمی ایسے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوگا جو غلاظت کی گولیاں بنا بنا کر اپنی ناک سے لڑھکاتا پھرتا ہے۔ اَلنَّاسُ کُلُّ اَبْنَآءُ اٰدَمَ سارے لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ فرمایا مجھے خطرہ ہے کہ میری امت کے لوگ ستارہ پرستی کریں گے اور ایک دوسرے کے نسب پر طعن کریں گے۔ اپنے آپ کو بڑا اور دوسرے کو حقیر جاننا مشرکین کا کام ہے۔ مشرکین نے حضرت نوح علیہ السلام سے یہ بھی کہا وَمَا نَرٰی

لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ ہم آپ میں اپنے اوپر کوئی برائی نہیں دیکھتے
تم ہم سے کسی طرح بھی بہتر نہیں ہو۔ نہ مال و دولت کے اعتبار سے، نہ نوکر چاکر
باغات اور جائداد کے اعتبار سے بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ بلکہ ہم تو تمہیں
جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تمہارا دعوئ نبوت درست نہیں ہے
مشرکین کی طرف سے یہ باتیں نوح علیہ السلام کی پہلی تقریر کے جواب میں
آئیں۔۔۔ آگے مزید تقریر اور سوال جواب اور واقعہ کی مزید تفصیلات آ رہی ہیں۔

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ
وَاٰتٰٮنِىۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِهٖ فَعُمِّيَتۡ عَلَيۡكُمۡ
اَنُلۡزِمُكُمُوۡهَا وَاَنۡتُمۡ لَهَا كٰرِهُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوۡمِ لَاۤ
اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ
اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ
وَلٰـكِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾
وَيٰقَوۡمِ مَنۡ يَّنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ اِنۡ طَرَدْتُّهُمۡ ؕ
اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَـكُمۡ عِنۡدِىۡ خَزَآٮِٕنُ
اللّٰهِ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ وَلَاۤ اَقُوۡلُ اِنِّىۡ مَلَكٌ وَّلَاۤ
اَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ تَزۡدَرِىۡۤ اَعۡيُنُكُمۡ لَنۡ يُّؤۡتِيَهُمُ اللّٰهُ
خَيۡرًا ؕ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ ۖۚ اِنِّىۡۤ اِذًا
لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۳۱﴾

ترجمہ :- کہا (نوح علیہ السلام نے) اے میری قوم کے لوگو!
بتلاؤ اگر میں واضح راستے پر ہوں اپنے رب کی طرف سے
اور اُس نے دی مجھے رحمت اپنی جانب سے اور وہ تم
پر مخفی رکھی گئی ہے ، تو کیا ہم لازم کریں اس کو تم پر حالانکہ
تم اس کو ناپسند کرتے ہو (۲۸) اور اے میری قوم : میں

نہیں مانگتا تم سے اِس پہ کوئی مال ۔ نہیں ہے میرا بدلہ مگر اللہ کے ذمے ۔ اور نہیں میں دھکیلنے والا اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ۔ بیشک وہ ملنے والے ہیں اپنے پروردگار سے لیکن میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم جاہل لوگ ہو (۲۹) اور اے میری قوم کے لوگو ! کون میری مدد کرے گا اللہ کے سامنے اگر میں نے اِن کو دھکیل دیا ۔ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے (۳۰) اور میں نہیں کہتا تمہارے سامنے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہیں جانتا میں غیب ۔ اور میں نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں ۔ اور میں نہیں کہتا ان لوگوں کو جنہیں تمہاری آنکھیں حقیر سمجھتی ہیں کہ اُن کو اللہ ہرگز نہیں دے گا بہتری ۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے نفسوں میں ہے ۔ اگر میں ایسا کروں تو بیشک میں البتہ ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤں گا (۳۰)

نبی کی وجہ امتیاز

جب نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوتِ توحید دی اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اے لوگو ! اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو ۔ اگر غیر اللہ کی عبادت سے باز نہیں آؤ گے تو سخت دن کی گرفت میں آ جاؤ گے ۔ اس پہ قوم کے لوگ کہنے لگے کہ اے نوح علیہ السلام ! تم تو ہمارے جیسے ہی انسان ہو اور تمہارے پیچھے چلنے والے کمی کمین لوگ ہیں جو سرسری رائے رکھنے والے بے عقل لوگ ہیں ، اُن کی موجودگی میں ہم تمہیں کیسے نبی مان لیں ۔ پھر یہ بھی ہے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت بھی حاصل نہیں جس کی وجہ سے ہم تمہاری سیادت کو تسلیم کریں ، ہم تو تمہیں دعویٰ نبوت میں جھوٹا خیال کرتے ہیں ، اُن کا مطلب یہ تھا کہ نبی اور عام لوگوں میں کوئی واضح امتیاز ہونا چاہیے ۔ یہ مطالبہ تو ان کا درست تھا کہ نبی کو پوری امت میں نمایاں حیثیت حاصل ہونی چاہیے ، مگر

وہ وجہ امتیاز میں غلطی کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عام لوگوں کی نسبت مال و دولت کی فراوانی ہونی چاہیئے۔ اس کے نوکر چاکر ہوں۔ زمینی اور منقلہ ہو، اُس کے پاس فوج ہو۔ مگر وہ اس بات کو بھول جاتے تھے کہ نبی کا امتیاز اس وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ نبی اپنی پوری امت میں اپنے اعلیٰ اخلاق، تقویٰ، نیکی، خدا پرستی اور انسانی ہمدردی کی وجہ سے ممتاز ہوتا ہے۔ یہ اعلیٰ اقدار ہر نبی کا طرۂ امتیاز ہوتے ہیں۔ نبی کا علم اور عمل اُسے ممتاز کرتا ہے۔ البتہ نبی کی شکل وصورت انسانوں جیسی ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی کھاتا پیتا ہے، کاروبار کرتا ہے، بیوی بچوں کی پرورش کا ذمہ دار ہوتا ہے دوسرے لوگوں سے میل جول رکھتا ہے، اُس کے بھی رشتہ دار ہوتے ہیں مگر وہ اپنے اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ اعمال کی بدولت سب سے اشرف ہوتا ہے۔ نبی عبادت و ریاضت میں بھی ساری امت پر فوقیت رکھتا ہے اور صفاتِ کمال کا مالک ہوتا ہے۔ یہی اُسکی وجہ امتیاز ہوتی ہے نہ کہ دنیاوی مال و دولت اور جاہ وحشمت۔

ہدایت جبراً نہیں ملتی

بہرحال قوم کے اعتراض کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا قَالَ يٰقَوۡمِ اے میری قوم کے لوگو! اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ بھلا بتلاؤ تو سہی اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح ہدایت پر ہوں وَاٰتٰٮنِىۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِهٖ اور اُس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت عطا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا نبی وحی الٰہی کی وجہ سے ہمیشہ واضح راستے یعنی صراطِ مستقیم پر ہی ہوتا ہے اس کا عقیدہ اور عمل بالکل ٹھیک ہوتا ہے، اس کے اخلاق پاکیزہ ہوتے ہیں اور خصوصی رحمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے نبوت کے عہدہ جلیلہ پر سرفراز فرمایا ہے اور یہ سب سے بڑا انعام خداوندی ہے یہ اونچی صفت اور بہت بڑی فضیلت ہے جسے اللہ تعالیٰ عطا کرے

فرمایا اگر اللہ کی طرف سے مجھ پر یہ انعامات ہوں فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اور یہ چیز تم پر مخفی رکھی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ جس کا عقیدہ فاسد اور عمل باطل ہے اس کے اندر باطنی روشنی ہی موجود نہیں ہے جس کے ذریعے وہ ان انعامات الٰہی کا مشاہدہ کر سکے۔ اس میں وہ صلاحیت ہی موجود نہیں جس کی وجہ سے آپ کے کمالات نبوت نظر آسکیں اور وہ نبی کے مرتبہ کو پہچان سکے۔

فرمایا اگر تم میرے واضح راستے اور مجھ پر ہونے والی اللہ کی خصوصی رحمت کا ادراک نہ کرو اَنُلْزِمُكُمُوهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ تو کیا ہم اسے تم پر لازم کر دیں اگرچہ تم اسے ناپسند ہی کرو۔ یعنی تم تو خدا کی ہدایت اور اس کی رحمت کو پسند ہی نہیں کرتے تو ہم کیسے یہ چیزیں زبردستی تمہیں بخش دیں فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہدایت اور خدا کی خاص مہربانی کسی کے سینے میں زبردستی نہیں ڈالی جا سکتی۔ اللہ کے ہاں جبر کا کوئی قانون نہیں ہے۔ اس نے انسان کو سارے قویٰ اور سامانِ زیست دے کر ایمان کی قبولیت کو اسی پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر اپنی مرضی سے دین حق کو قبول کر لو گے تو فلاح پا جاؤ گے اور اگر قبول نہیں کرو گے تو ذلت اٹھانی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ کسی سے زبردستی کوئی چیز نہیں منوانا چاہتا، ماننا یا نہ ماننا خود انسان کی اپنی صوابدید پر ہے اور اسی کے مطابق وہ جزا یا سزا کا حقدار ہو گا

تبلیغ دین کا اجر

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے دوسری بات یہ فرمائی کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں نے اپنی کمزور مالی پوزیشن کی وجہ سے تبلیغ دین کو ذریعہ معاش بنا لیا ہے اور میں اس لیے تبلیغ کر رہا ہوں کہ مجھے کچھ دنیاوی مال و متاع حاصل ہو جائے تو خوب سن لو وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا اے میری قوم کے لوگو! میں تم سے اس کام کے بدلے کوئی مال و دولت طلب نہیں کرتا۔ میں تم تک جو خدا کا پیغام پہنچا رہا ہوں، تم سے جو خیر خواہی کر رہا ہوں، اس کا میں تم سے کوئی معاوضہ

طلب نہیں کرتا۔ نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ نبوت کا دعویٰ کر کے تمہیں اپنا تابع بنالوں اور خود تم پر حاکم بن کر بیٹھ جاؤں۔ نبوت کے جھوٹے دعویدار تو ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ مسیلمہ کذاب نے مال و دولت اور سیادت کی خاطر ہی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ ہمارے دور میں قادیانی مدعی نبوت کا بھی یہی مقصد تھا۔ وہ لوگوں سے مال و دولت ہی اکٹھا کرنا چاہتا تھا اور ان کے درمیان بڑا بننا چاہتا تھا۔ مگر اللہ کے سچے نبی ہمیشہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ تبلیغ دین کے سلسلے میں انہیں کسی مال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی یہی بات کی اور فرمایا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ میری مزدوری تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ میں کسی مخلوق سے کچھ نہیں مانگتا۔ میں جس مالک الملک کی خوشنودی اور رضا کی خاطر فریضہ تبلیغ انجام دے رہا ہوں، میرا معاوضہ اسی کے پاس ہے اور وہی سب سے بہتر اجر ہوگا۔ تبلیغ دین کے سلسلے میں تم سے میرا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں۔

اہل ایمان کی قدردانی

قوم نوح کے سرداروں کا یہ اعتراض بھی تھا کہ نوح علیہ السلام کے پیچھے لگنے والے غریب لوگ ہیں، جن کی نہ کوئی رائے ہے اور نہ عقل ہے کہتے تھے کہ ان کی موجودگی میں ہم تمہاری مجلس میں نہیں بیٹھ سکتے۔ مشرکین مکہ کو بھی یہی اعتراض تھا۔ وہ بھی کہتے تھے کہ اگر ہمارے ساتھ بات کرنا ہے تو ان کمی کمین لوگوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں کیونکہ ان کے برابر بیٹھنے سے ہماری ہتک ہوتی ہے۔ بہرحال اس بیہودہ اعتراض کا جواب حضرت نوح علیہ السلام نے اس طرح دیا وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں ان لوگوں کو اپنی مجلس سے دھکیلنے والا نہیں ہوں جو ایمان لا چکے ہیں بھلا میں ان کو اس لیے اپنی مجلس سے نکال دوں کہ بڑے لوگ میری بات سن سکیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اصولی طور پر غلط بات ہے۔ جو کوئی ایمان

خوشی سے ایمان قبول کرلیا ہے۔ وہ فیض اٹھاتا ہے اور اٹھاتا رہے گا اس کو محروم نہیں کیا جائے گا کیونکہ اِنَّهُم مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں۔ وہ اگرچہ غریب ہیں مگر اللہ کے ہاں وہی برگزیدہ ہیں۔ اگر ہم ان سے ساتھ زیادتی کریں گے، ان کو حقیر سمجھ کر اپنی مجلس سے اٹھادیں گے تو وہ اللہ کے حضور ہماری شکایت کریں گے تو اس وقت ہمارا کیا جواب ہوگا؟

فرمایا وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ میں تو تمہیں جاہل لوگ خیال کررہا ہوں، تم نادان ہو جو اس قسم کے بے ہودہ مطالبات پیش کرتے ہو۔ بنی نوع انسان خصوصاً اہل ایمان کو حقیر سمجھنا جہالت کی علامت ہے۔ ہاتھ سے کام کرنا اور کسی پیشے سے منسلک ہونا تو قابل قدر بات ہے۔ عربی کا محاورہ بھی ہے اَلْكَاسِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ یعنی کسب یا کمائی کرنے والا تو اللہ کا پیارا ہے، اس کو حقیر سمجھنا بڑی نادانی کی بات ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ اے میری قوم کے لوگو! اگر میں ان کو ہٹا دوں تو کون میری مدد کرے گا۔ میں تو خدا تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوجاؤں گا۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے اگر میں تمہارے غلط مطالبات مان لوں تو خدا کی گرفت میں آجاؤں گا۔ پھر کون ہے جو میری مدد کرسکے گا؟

نبی کی شخصی حیثیت

منکرین کا نوح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی اعتراض تھا کہ تم تو ہمارے جیسے انسان ہو، تمہیں ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہلوایا وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ میں تمہیں یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ میں تو اس کا بندہ ہوں اور اس کی راہ دکھانے پر مامور

ہوں۔ میں نے تو اقتدار، حکومت یا مال و خزانے کا دعویٰ نہیں کیا۔ خزانوں اور تصرف کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وَلَآ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ اور میں نے غیب دان ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ غیب بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ مخلوق میں سے کوئی بھی غیب دان نہیں ہے وہ ہمیں وحی کے ذریعے جو حکم بھیجتا ہے، وہ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات کہ کل کو کسی کے ساتھ کیا معاملہ پیش آئیگا اور کسی کا کیا انجام ہوگا، اس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ بھی اللہ کے علم میں ہے کہ کون آدمی ہدایت قبول کرے گا اور کون اس سے محروم رہے گا۔ میں نے تو برتری کا دعویٰ نہیں کیا۔ وَلَآ اَقُوۡلُ اِنِّىۡ مَلَكٌ اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، جو کھانے پینے، پہننے اور بیوی بچوں سے پاک ہوں بلکہ مجھے تو تمام لوازماتِ بشریت کی ضرورت ہے۔

امیر و غریب میں تفاوت

فرمایا، یہ بھی یاد رکھو! وَلَآ اَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ تَزۡدَرِىۡۤ اَعۡيُنُكُمۡ اور میں نہیں کہتا اُن لوگوں کے متعلق جنہیں تمہاری آنکھیں حقیر جانتی ہیں لَنۡ يُّؤۡتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيۡرًا ؕ کہ اللہ انہیں ہرگز بہتری عطا نہیں کریگا۔ جن لوگوں کو تم اپنی جہالت، غرور اور تکبر کی وجہ سے ادنیٰ خیال کرتے ہو، اُن کی بہتری تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہ جب چاہے اور جس قدر چاہے عطا کرے، میں تو اُن کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے انہیں ایمان کی دولت سے نوازا ہے تو وہ بہتری بھی عطا کرے گا، انہیں کامیابی حاصل ہوگی۔

غرباء کے اولین ایماندار ہونے کی شہادت ہرقل قیصر روم نے بھی دی تھی۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نامہ مبارک ہرقل کے دربار میں پیش کیا گیا تو اُس [1] نے حکم دیا کہ اگر کوئی عرب کا رہنے والا موجود ہو تو اُسے پیش کیا جائے۔ اُس وقت ابو سفیان کا تجارتی قافلہ موجود تھا۔

---

[1] بخاری صہ۴ ج۱ و مسلم صہ۹۸ ج۲

آپ اُس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ آپ کو شاہی دربار میں پیش کیا گیا تو بادشاہ نے ان سے حضور علیہ السلام کے متعلق کچھ سوال کیے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے، وہ کمزور ہیں یا صاحبِ ثروت ابوسفیان نے جواب دیا کہ وہ تو کمزور لوگ ہیں ہرقل نے کہا وَهُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ ابتداء میں انبیاء کے متبعین کمزور لوگ ہی ہوا کرتے ہیں اور بڑے لوگ آخر میں اُس وقت ایمان لاتے ہیں جب ان کے فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود ابوسفیان مکے کا سردار تھا، اُس نے اکیس سال تک حضور علیہ السلام کی مخالفت کی، جنگیں بھی لڑیں اور آخر کار فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے جب کوئی چارہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے غریب لوگ فوراً ایمان لے آتے ہیں جب کہ دولت مند کوئی شاذ و نادر ہی راہِ راست پر آتے ہے تو فرمایا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقیر جانتی ہیں ان کے متعلق میں نہیں کہتا کہ انہیں بہتری حاصل نہیں ہوگی۔

فرمایا اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان کے نفسوں میں ہے۔ ان میں اخلاص ہے یا نفاق اُن کی نیت کھری ہے یا کھوٹی، یہ اللہ ہی جانتا ہے اور اس کا بدلہ بھی اُسی کے ذمے ہے، میری اس معاملے میں کوئی ذمہ داری نہیں۔ ہم تو ظاہر کو دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ضعیف ہے مگر ایمان قبول کرتا ہے، نیکی اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرتا ہے تو ہم اس کو اپنا متبع ہی سمجھیں گے اور آپ کے کہنے پر اُسے اپنی مجلس سے نہیں اٹھائیں گے۔ تاہم اُس کے خلوص، ایمان، دیانت اور صداقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

فرمایا کہ اگر میں اس خیال سے غرباء کو اپنی مجلس سے نکال دوں کہ

اس طرح امیر لوگ ایمان لے آئیں گے تو ایسا کرنے میں إِنِّي إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ میں تو ظالموں میں سے ہو جاؤں گا ۔ نہ تو کسی کو دین قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ اہل ایمان کو دھکیلا جا سکتا ہے دین کی قبولیت اپنی مشیت اور ارادے سے ہوتی ہے ، اس میں امیر اور غریب میں کوئی تفاوت نہیں ۔ جو قبول کرے گا وہ فیض حاصل کرے گا ، خواہ وہ غریب ہی کیوں نہ ہو ۔ اور وہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ آدمی ہوگا ۔ امیری اور غریبی تو اللہ کی حکمت کے مطابق آتی ہے خدا تعالیٰ نافرمانوں کو بھی بڑی دولت عطا کر دیتا ہے اور کبھی مخلص بندے تکالیف بھی برداشت کرتے ہیں مگر ایمان کی بات ہی سب کے لیے بہتر ہے ۔ ایمان قبول کرنے کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جائیگا ۔ سورۃ کہف میں موجود ہے فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ جو چاہے ایمان قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے جو کفر کریگا وہ اپنے لیے جہنم کا سامان پیدا کرے گا ۔ اگر میں امراء کی طرفداری میں غرباء کو نظر انداز کردوں تو ظلم کا مرتکب سمجھا جاؤں گا ۔ دوسرے مقام پر آتا ہے کہ آپ ان مخلص مومنوں سے نگاہ شفقت نہ ہٹائیں ، کیا آپ دنیا کی زندگی کی زینت چاہتے ہیں ؟ یہ تو بالکل غیر مناسب ہے ۔ آپ ہمیشہ غرباء پر نگاہ شفقت رکھیں ، ان کو اپنے آپ سے دور کرکے ظلم کی حد میں داخل ہو جائیں گے ۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ کسی بڑے آدمی کے ایمان لانے سے ایمان کی رونق میں اضافہ ہو جائے گا جبکہ حقیقی رونق تو ایمان ، تقوے اور عمل صالح سے ہوتی ہے ۔ اسی کے ذریعے اسلام کو ترقی حاصل ہوگی عروج اور ترقی کا مدار محض مال و دولت پر نہیں ہے ۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا
بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا
يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾
وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ
اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وقف
وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ
اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا
تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع

ترجمہ:- کہا (نوح علیہ السلام کی قوم نے) اے نوح ! تحقیق تو نے جھگڑا کیا ہے ہمارے ساتھ، پس بہت زیادہ جھگڑا کیا ہے۔ پس لے آ تو ہمارے پاس جس (عذاب) سے تو ہمیں ڈراتا ہے، اگر تو سچا ہے ﴿۳۲﴾ کہا (نوح علیہ السلام نے) بیشک لائے گا اس کو تمہارے پاس اللہ، اگر وہ چاہے گا، اور تم اُس کو عاجز نہیں کر سکتے ﴿۳۳﴾ اور نہیں فائدہ دیگی تمہیں میری نصیحت اگر میں تمہیں نصیحت کروں اگر اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں گمراہ کر دے۔ وہی تمہارا رب ہے اور اُسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے ﴿۳۴﴾ کیا کہتے ہیں یہ لوگ کر گھڑ لیا ہے اس (قرآن) کو اس شخص نے۔ آپ کہہ دیجئے

(اے پیغمبر) اگر میں نے اس کو گھڑا ہے۔ پس مجھ پر ہی ہے میرا گناہ اور میں بری ہوں اُن گناہوں سے جن کا ارتکاب تم کرتے ہو (۳۵)

ربطِ آیات

اِن دو رکوعات میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ میں تو ڈر سنانے والا ہوں۔ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اگر ایسا کرو گے تو مجھے تمہارے بارے میں خطرہ ہے کہ کہیں تم دردناک دن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ قوم نے آپ کی نصیحت کو قبول نہ کیا اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تم تو ہمارے جیسے ہی انسان ہو، تمہاری اتباع کرنے والے ہمارے کمی کمین لوگ ہیں، جنہیں کوئی برتری حاصل نہیں، لہٰذا اُن کی موجودگی میں ہم تمہاری بات سُننے کے لیے تیار نہیں۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ لوگو! اگر میں اپنے رب کی طرف سے صحیح راستے پر ہوں، اللہ نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہے اور وہ ہدایت اور مہربانی تم پر مخفی رکھی گئی ہے تو کیا ہم یہ ہدایت تم پر زبردستی ٹھونس دینگے جب کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ہم جو کچھ تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں اس پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے کیونکہ ہمارا معاوضہ تو اللہ کے پاس ہے۔ پھر فرمایا کہ جن لوگوں کو تم حقیر سمجھتے ہو میں ان کو دور ہٹانے والا نہیں ہوں۔ یہ ایماندار لوگ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم بڑی جہالت میں مبتلا ہو۔ فرمایا اگر میں اِن غرباء کو اپنی مجلس سے علیحدہ کر دوں تو کون میری مدد کرے گا، کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں۔ فرمایا میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں یا میں غیب جانتا ہوں۔ میں کوئی فرشتہ بھی نہیں جو کھانے پینے اور دیگر لوازماتِ زندگی سے مبرا ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تمہاری نظروں میں حقیر لوگوں کو اللہ تعالیٰ بھلائی عطا نہیں کریگا۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ایمان اور اخلاص کو خوب جانتا ہے وہی اُن کو بدلہ عطا کریگا۔ اگر میں بھی ان کو حقیر جاننے لگوں تو میں ظلم کرنے والوں میں ہو جاؤنگا

عذاب کا مطالبہ

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر طوفان آنے سے پہلے آپ نے نو سو پچاس ۹۵۰ برس تک قوم کو تبلیغ فرمائی۔ صبح و شام، خلوتوں میں اور اجتماعات میں قوم کو ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی مگر قوم نے یہ جواب دیا قَالُوا يٰنُوحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا اے نوح علیہ السلام! آپ نے ہم سے جھگڑا کیا ہے یعنی بحث و تکرار کی ہے فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا ہے ہمیں تبلیغ کرتے کرتے صدیاں بیت گئی ہیں ہم ایسی باتوں کو مزید سننے کے لیے تیار نہیں ہیں انہوں نے تبلیغ حق کو بحث و تکرار سے تعبیر کیا اور کہنے لگے کہ یہ بحث اب بند ہو جانی چاہیئے اور حتمی بات کرو فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا پس ہمارے پاس وہ چیز یعنی عذاب لے آؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے رہتے ہو اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ اگر آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں کہ قیامت آنے والی ہے اور عذاب نازل ہونے والا ہے تو وہ عذاب ہم پہلے ہی لے آؤ، ہم تمہاری خالی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوتے۔

لوگوں کی بدوضعی کا اندازہ لگائیں کہ نوح علیہ السلام یا اللہ کا کوئی نبی کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں کرتا۔ وہ تو انسانیت کے فائدے کی بات کرتا ہے مگر وہ اسے جھگڑا اور فساد بتاتے ہیں۔ نوح علیہ السلام نے تو ہمیشہ ان کے ساتھ خیر خواہی کی بات کی مگر قوم نے تسلیم نہ کیا۔ ان کی طبیعتیں ایسی مسخ ہو چکی تھیں اور دل ایسے ویران ہو چکے تھے کہ خدا کے عذاب کا خود مطالبہ کرتے تھے۔ ایسی بات تو فہم کے معکوس ہونے کی انتہائی صورت ہوتی ہے۔ مشرکین مکہ نے بھی حضور علیہ السلام سے اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا۔ قرآن پاک میں موجود ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا دے، ہم پر پتھر کیوں نہیں برستے یا اگر تو

چاہیے تو ہم پر فلاں عذاب کیوں نہیں نازل ہو جاتا۔ غرضیکہ ضد اور ہٹ دھرمی تمام مشرکین کا قدیم شیوہ ہے۔

نوح علیہ السلام کا جواب

قوم کے عذاب کے مطالبہ پر نوح علیہ السلام نے فرمایا قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ اس عذاب کو اللہ تعالیٰ ہی تمہارے پاس لائے گا، اگر وہ چاہیگا، یہ چیز میرے اختیار میں نہیں ہے وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ اور تم خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے یاد رکھو! خدا قادر مطلق ہے، تم اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے جب اس کا عذاب آجائیگا۔ تو وہ ٹالا نہیں جائے گا۔ جب بھی کسی پیغمبر کی قوم نے اس قسم کا مطالبہ پیش کیا تو ہر نبی نے یہی کہا کہ یہ چیز ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر اللہ کسی کو اس دنیا میں عذاب دینا چاہے گا تو وہ حکمت کے مطابق بھیج دیگا، یہ اس کی مشیت پر موقوف ہے، ہمارا کام تو اس کے احکام و فرامین کو لوگوں تک پہنچا دینا ہے اور ہم اپنا فرض انجام دے رہے ہیں۔

نوح علیہ السلام نے قوم کو یہ بھی فرمایا وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اے لوگو! اگر میں تمہیں نصیحت کرنے کا ارادہ بھی کروں تو میری نصیحت تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتی اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ اگر خدا تعالیٰ تمہیں گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مشیت خداوندی اُن کے حق میں نہیں تو کوئی تبلیغ، نصیحت اور وعظ مفید نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں یہ بات جگہ جگہ سمجھائی گئی ہے کہ جو لوگ ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں، عناد اور تعصب سے کام لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو گمراہی سے نہیں بچاتا۔ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ بلاوجہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا بلکہ اس کے اسباب انسان خود پیدا کرتا ہے

جب کوئی شخص ضد اور تکبر کی حد سے بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے دِل کو معکوس کر دیتا ہے اور پھر کسی نبی، مرشد، ہادی اور مبلغ کی تبلیغ اس پر کچھ اثر نہیں کرتی۔ اور ایسا شخص گمراہی میں مزید آگے بڑھ جاتا ہے۔

عذاب کے مطالبے کے ضمن میں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رح فرماتے ہیں کہ حق پرست کبھی خود عذاب لانے کا دعویٰ نہیں کرتے، وہ تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی بات تم تک پہنچا دی ہے، ہم نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے۔ اب تمہارے تعصب اور عناد کی وجہ سے خدا کو تمہاری اصلاح منظور نہیں ہے تو ہماری نصیحت کچھ مفید نہیں ہو سکتی، ہماری لاکھ کوشش کے باوجود بھی تم گمراہی اور انجام بد سے نہیں بچ سکتے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا کہ میری نصیحت تم پر کارگر نہیں ہو سکتی، اگر اللہ ہی تمہیں گمراہی میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے۔ فرمایا هُوَ رَبُّكُمْ وہی تمہارا رب ہے۔ سارا اختیار اسی کے پاس ہے۔ ہدایت اور گمراہی کے کچھ اصول وضوابط ہیں جن کے مطابق یہ دونوں چیزیں آتی ہیں۔ فرمایا تم ہدایت پر ہو یا ضلالت پر وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور پھر اسی کے پاس جزائے عمل کا سلسلہ ہوگا۔ وہ ہر چیز کا مالک اور مختار ہے۔ تو نوح علیہ السلام نے بہترین انداز میں قوم کو نصیحت فرمائی کہ ہم عذاب نہیں لا سکتے۔ یہ تو تمہارے اعمال اور اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت پر مبنی ہے۔ اگر اللہ کے ہاں تمہاری استعداد ہی خراب ہو چکی ہے تو پھر ہماری خواہش اور کوشش بارآور نہیں ہو سکتی۔

افترا کا الزام

آگے ارشاد ہوتا ہے اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ کیا وہ منکر لوگ کہتے ہیں کہ اُس نے اس قرآن کو گھڑ لیا ہے۔ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ آپ کہہ دیں کہ اگر میں نے اس کو گھڑ لیا ہے تو اس کا جرم بھی مجھ پر ہوگا، میں ہی اس کا ذمہ دار ہوں گا اور اس کا خمیازہ بھگتوں گا۔ وَاَنَا

بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ " اور میں تمہارے گناہوں سے بری الذمہ ہوں تمہارے گناہوں کا حساب کتاب تمہیں دینا ہوگا، یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لو۔

مفسرین کرام اس آیت کریمہ کے دو مختلف مصداق بیان فرماتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق بھی نوح علیہ السلام کے ساتھ ہی ہے گذشتہ سے پیوستہ درس میں گزر چکا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے آپ کے متعلق کہا تھا بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ یعنی ہم تو تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ تو اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا اے نوح کہہ دو کہ اگر تم اسے افتراء سمجھتے ہو تو اس جرم کا ذمہ دار میں ہی ہوں اور حق کی تکذیب کر کے جس جرم کا ارتکاب تم کر رہے ہو، اس کے ذمہ دار تم ہو گے، میں ان سے بری الذمہ ہوں۔

بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ وعرب کا شکوہ کیا ہے۔ نزول قرآن کے زمانے کے مشرکین کا بھی یہی حال تھا جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا۔ وہ بھی کہتے تھے کہ یہ قرآن محمد نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، یہ خدا کا کلام نہیں ہے۔ یہ مضمون اسی سورۃ میں، اس سے پچھلی سورۃ یونس اور سورۃ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مشرکین کو چیلنج دیا کہ اگر تم اس قرآن پاک کو خود ساختہ سمجھتے ہو اسے انسانی کلام سے تعبیر کرتے ہو تو پھر تم بھی تو آخر انسان ہو، اس جیسی کوئی ایک سورۃ ہی بنا کر لے آؤ، مگر قرآن نے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے۔ سارے انسان اور جن مل کر بھی قرآن پاک کی نظیر لانا چاہیں تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ فرمایا اگر تم ایسا نہ کر سکو " فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ " (البقرۃ) تو دوزخ کی اس آگ سے ڈر جاؤ جس کا

ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جو مجرمین کے لیے تیار کی گئی ہے۔
بات سمجھانے کا یہ نہایت ہی حکیمانہ انداز ہے۔ کہ اگر میں نے کوئی جُرم کیا ہے یا اس کا میں ذمہ دار ہوں اور تمہارے گناہوں کے تم ذمہ دار ہو گے، میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہو گا۔ اگر تم توحید، رسالت، معاد اور جزائے عمل کا انکار کر رہے ہو تو یاد رکھو اس کی جواب دہی تمہیں کرنی ہے اللہ کے نبی کی طرف سے اس قسم کا جواب حق پرستی کو ظاہر کرتا ہے اس میں کسی قسم کی سختی نہیں کی گئی بلکہ مؤثر طریقے سے بات سمجھا دی گئی ہے کہ معاملہ اس طرح ہے، تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر کسی فیصلے پر پہنچو۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ
قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾
وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ
وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ
قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا
تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ
يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

ترجمہ:- اور وحی نازل کی گئی نوح علیہ السلام کی طرف کہ بیشک ہرگز نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم میں سے مگر وہ جو ایمان لا چکے ہیں۔ پس آپ غمگین نہ ہوں اِن باتوں پر جو کچھ یہ کر رہے ہیں ﴿۳۶﴾ اور تیار کر کشتی ہمارے سامنے اور ہمارے حکم سے۔ اور میرے ساتھ مخاطبت نہ کرنا اُن لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا۔ بیشک وہ غرق کیے جائیں گے ﴿۳۷﴾ اور وہ (نوح علیہ السلام) بناتے تھے کشتی اور جب بھی گزرتا تھا اُن پر کوئی گروہ اُن کی قوم کا تو ٹھٹھا کرتے تھے اُن کے ساتھ۔ کہا نوح علیہ السلام نے کہ اگر تم ٹھٹھا کرتے ہو

ہمارے ساتھ ، پس بیشک ہم بھی تمہاری ہنسی اڑائیں گے جیسا کہ تم ہنسی اڑاتے ہو (۳۸) پس عنقریب تم جان لو گے کہ کس کے پاس آتا ہے رسوا کرنے والا عذاب اور کس پر اترتا ہے ہمیشہ رہنے والا عذاب (۳۹)

وقتِ انتقام

گذشتہ درس میں حضرت نوح علیہ السلام کے وعظ کے جواب میں قوم کا ردِ عمل بیان ہو چکا ہے کہ انہوں نے اس وعظ نصیحت کو جھگڑے سے تعبیر کیا اور عذاب کا مطالبہ کیا۔ نوح علیہ السلام نے اس بات کا جواب بھی دیا۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عدل کے پیش نظر قومِ نوح سے انتقام لینے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ حالات خراب ہو چکے تھے۔ قوم کے لوگ نوح علیہ السلام کو سخت اذیتیں پہنچا رہے تھے اسکے متعلق تورات میں بھی آتا ہے کہ نوح علیہ السلام اللہ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے یعنی اللہ کے حکم کے مطابق فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہے مگر زمین ظلم سے بھر چکی تھی اور قوم سے انتقام لینے کا وقت آگیا تھا وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ چنانچہ وحی کی گئی نوح علیہ السلام کی طرف اور اُن پر واضح کر دیا گیا اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ کہ آپ کی قوم میں سے کوئی فرد بھی ایمان نہیں لائے گا اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ مگر وہ جو ایمان لا چکے ہیں۔ اور پھر آپ کی کارگزاری کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی بھی دی۔

نوح علیہ السلام کے ساتھ زیادتی

جب بھی نوح علیہ السلام اپنی قوم کو خدا کا پیغام پہنچاتے تو وہ آپ کو مارنا پیٹنا شروع کر دیتے اور آپ کو سخت اذیت پہنچاتے مثلاً آپ کسی مجلس میں وعظ کر رہے ہیں تو اتنے میں ایک شخص اُٹھ کر آپ کا گلا دبا دیتا ہے اور آپ بیہوش ہو جاتے اس قسم کے واقعات امام بغویؒ اور صاحبِ تفسیر مظہری وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے ذکر کیے ہیں۔ بعض اوقات آپ کو ادھ مُوا کر کے کسی نمدے میں لپیٹ کر کہیں پھینک دیتے اور سمجھتے کہ اب آپ کی جان نہیں بچ

سنے گی مگر دوسرے دن وہ پھر نوح علیہ السلام کو اللہ کا پیغام سناتے ہوئے پاتے۔ ایک دفعہ لاٹھی کے سہارے چلنے والے ایک بوڑھے آدمی نے اپنے جوان بیٹے سے کہا کہ اس بوڑھے دیوانے (نوح علیہ السلام) کی باتوں میں نہ آنا۔ بیٹے نے وہی لاٹھی باپ کے ہاتھ سے لے کر آپ کے سر پر اس زور سے ماری کہ آپ لہولہان ہو گئے اور بیہوش ہو کر گر پڑے بڑی بڑی تکالیف برداشت کرنے کے بعد جب، نوح علیہ السلام ہوش میں آتے تو یہی دعا کرتے رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ خداوندکریم! میری اس قوم کو معاف کر دے کہ یہ نادان ہیں۔

نوح علیہ السلام کی دعا

پھر جب حالات زیادہ سنگین ہو گئے، زمین ظلم سے بھر گئی اور کل اسّی یا بیاسی افراد کے علاوہ کسی دیگر فرد کے ایمان لانے کی کوئی امید باقی نہ رہی اور اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس بات کی خبر بھی دے دی، تو نوح علیہ السلام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں آپ اس پر غمگین نہ ہوں۔ اب عدل کا وقت آچکا ہے اور ان سے انتقام لیا جائے گا اس پر نوح علیہ السلام نے بھی دعا کی اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (القمر) اے پروردگار میں مغلوب ہو چکا ہوں، لہٰذا میری مدد فرما۔ سورۃ نوح میں آپ کی دعا مذکور ہے "رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا" پروردگار! زمین پر چلنے پھرنے والے کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑ کیونکہ ان میں اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ بہرحال یہ دعا نوح علیہ السلام نے اُسوقت کی جب اللہ نے بذریعہ وحی بتا دیا کہ اب کوئی ایمان نہیں لائیگا۔

کشتی کی تیاری

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی تیار کرو اس کشتی کی بہت سی تفصیلات تورات اور قرآن پاک کی تفاسیر میں ملتی

ہیں۔ یہ کشتی اتنی بڑی تھی کہ تمام مومن مرد و زن اور دیگر جاندار اس میں سوار ہو گئے۔ تورات کے مطابق نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ گوفر کی لکڑی سے کشتی تیار کرو۔ عام تفاسیر والے ساگوان کا ذکر کرتے ہیں جو کہ بہت مضبوط لکڑی ہوتی ہے۔ ممکن ہے گوفر اور ساگوان ایک ہی درخت کے دو نام دو مختلف زبانوں میں ہوں۔ محققین کی تحقیق کے مطابق کشتی ۵۲۵ فٹ لمبی، تقریباً ۸۷/۸ ۸۷ فٹ چوڑی اور ساڑھے باون فٹ یا ۵۲ فٹ اونچی تھی، اس کی تین منزلیں تھیں۔ ایک منزل پر جانور تھے، دوسری پر سامان اور تیسری منزل پر انسان سوار ہوئے۔ لمبائی چوڑائی کے لحاظ سے یہ کشتی اتنی بڑی تھی جتنا بڑا پاکستانی بحری جہاز سفینہ حجاج تھا۔ یہ جہاز جرمنی کا ساختہ تھا اور جرمن فوج نقل و حمل کے لیے استعمال کرتی رہی پاکستان کی تحویل میں آیا تو یہ حاجیوں کی نقل و حمل کے لیے کراچی اور جدہ کے درمیان چلتا رہا۔ کچھ عرصہ قبل اسے ناقابل سروس قرار دے کر ضائع کر دیا گیا۔ اس جہاز کی گیارہ منزلیں تھیں جب کہ کشتی نوح صرف تین منزلوں پر مشتمل تھی۔ بہر حال اس کشتی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کھڑکیاں اور روشن دان بھی بنائے گئے۔

اس دنیا میں استعمال ہونے والی بعض چیزوں کی ابتداء وحی الٰہی سے ہوئی۔ اللہ نے کسی شخص کے ذہن میں کوئی بات ڈال دی، ایک ڈھانچہ تیار ہو گیا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں نقل و حمل کے لیے جتنی بھی سواریاں زیر استعمال ہیں ان سب کی بنیاد پہیے پر ہے۔ چنانچہ اس آدمی کا بہت بڑا کمال ہے جس نے سب سے پہلے پہیہ ایجاد کیا۔

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی سو سال میں تیار ہوئی۔ بعض کہتے ہیں اس پر تیس سال کا عرصہ صرف ہوا

عام مشہور روایت یہ ہے کہ یہ کشتی دو سال کے عرصہ میں تیار ہوگئی۔ بہر حال یہ کشتی تیار ہوگئی اور پھر اس کے ساتھ دو واقعات پیش آئے جن کا ذکر آگے آئے گا اور جو اللہ تعالیٰ کے علم اور حکمت کے مطابق تھے۔ اس کشتی کو اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک باعثِ عبرت بھی بنا دیا اور یہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

ایمان اور اعمال صالحہ بطور کشتی

شیخ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کا جسم مادیت سے پڑ ہے اور یہ جسم مادیت کے طوفان میں گھرا ہوا ہے۔ جب مادی جسم ختم ہو جائے گا۔ تو پھر اس کی روح کو منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ایمان اور اعمال کی کشتی کی ضرورت پڑے گی۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے ملفوظات میں بھی یہ بات آتی ہے کہ اے لوگو! ساری زمین پانی ہے۔ بالآخر انسانی جسم ویران ہو جائے گا لہٰذا اس وقت سے پہلے ایمان اور اعمال صالحہ کی کشتی تیار کر لو تاکہ اس پر سوار ہو کر کامیابی کی منزل تک پہنچ سکو۔ اگر تمہارے پاس یہ کشتی نہ ہو تو مادیت کے دلدل اور طوفان میں پھنس کر ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاؤ گے۔ لہٰذا ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے لیے ایمان اور اعمال صالحہ کی کشتی تیار کرے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ میرے اہل بیت کی مثال کشتی جیسی ہے اور میرے صحابہؓ کی مثال ستاروں جیسی ہے۔ ان دونوں گروہوں کو نظر انداز نہ کرو۔ اہل بیت کی کشتی پر سوار ہو جاؤ یعنی اہل بیت کے ساتھ مل جاؤ جیسا کہ نوح علیہ السلام کی امت کے مومن آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر مل گئے تھے۔ جس طرح تاریکی میں ستاروں سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے اسی طرح تم میرے صحابہؓ سے راہنمائی حاصل کرو۔ یہ بات امام رازیؒ نے لکھی ہے۔ غرضیکہ انسان کو چاہیئے کہ وہ ایمان اور اعمال صالحہ کی کشتی تیار کر کے اس پر سوار ہو جائے۔ جسم تو ایک دن خراب ہو جائے گا

پھر اگر یہ کشتی ہوگی تو اس طوفان سے پار ہوکر ہمیشہ کے لیے کامیاب ہوجائے گا۔

سفارش کی ممانعت

نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ہمارے حکم سے ہمارے سامنے کشتی تیار کرو وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا اور ظلم کرنے والوں کے بارے میں مجھ سے بات نہ کرنا۔ جن لوگوں نے آپ کی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے اور آپ کی اطاعت سے انکار کر دیا ہے، وہ ظالم لوگ ہیں کفر و شرک میں مبتلا ہیں، آپ اُن کی بہتری کے لیے مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا۔ اس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔ جب قوم لوط پر عذاب کا وقت آیا تو ابراہیم علیہ السلام کی خواہش تھی کہ یہ عذاب کسی طرح ٹل جائے مگر اللہ نے فرمایا يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا اے ابراہیم علیہ السلام! اس بات کو چھوڑ دیں إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ بے شک آپ کے رب کا حکم آچکا ہے وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ (ہود) ان کے پاس نہ ٹلنے والا عذاب آچکا ہے اور إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ یہ غرق ہوجانے والے ہیں۔

نوح علیہ السلام کے ساتھ ٹھٹھہ

پھر اللہ کے حکم کے مطابق وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے اور اس دوران وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِنْ قَوْمِهِ جب بھی آپ کی قوم کے سردار آپ کے پاس سے گزرتے تھے سَخِرُوا مِنْهُ تو نوح علیہ السلام کے ساتھ ٹھٹھا کرتے تھے، کہتے، نبوت کے دعویٰ کے بعد اب یہ بڑھئی بن گیا ہے۔ ابن عربیؒ اور بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ جس طرح قوم نوح کے لوگ آپ کے ساتھ ٹھٹھا کرتے تھے اسی طرح ہر زمانے کے شاطر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں کسی داڑھی والے آدمی کو دیکھتے ہیں تو مغرب زدہ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ کسی نے ٹخنوں سے اوپر سنت کے مطابق پاجامہ

بین لیا تو اُسے مذاق کرتے ہیں۔ کسی نے شادی سنت کے مطابق کی، خرافات سے بچا رہا تو بھی تضحیک کا نشانہ بنتا ہے۔ لیکن یہ سب ناکامی کے ذرائع ہیں۔ غرضیکہ نوح علیہ السلام قوم کو عذابِ الٰہی سے بچانے کی کوشش کرتے تھے مگر قوم اُن کی ہنسی اڑاتی تھی۔

مذاق کا انجام

جب منکرین کی طرف سے ٹھٹھا حد سے بڑھ گیا قَالَ اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا نوح علیہ السلام نے کہا، اگر آج تم ہمارے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہو، فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡكُمۡ كَمَا تَسۡخَرُوۡنَ تو ہم بھی تمہاری اسی طرح ہنسی اڑائیں گے جس طرح تم ہنسی اڑا رہے ہو۔ اور پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کفر اور شرک کا کیا انجام ہوتا ہے۔ مشرکینِ مکہ کے متعلق بھی آتا ہے کہ جب سردارانِ قوم کسی غریب ایماندار کے پاس سے گزرتے وَاِذَا مَرُّوۡا بِهِمۡ يَتَغَامَزُوۡنَ (المطففین) تو ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے اشارے کرتے اور ہنستے ہوئے نکل جاتے۔ کہتے دیکھو یہ جنت کے وارث جا رہے ہیں جن کے پاس نہ پہننے کو کپڑا ہے نہ رہنے کو مکان اور نہ معاش کے لیے کوئی کاروبار۔ اللہ نے فرمایا "فَالۡيَوۡمَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡكُفَّارِ يَضۡحَكُوۡنَ (المطففین) ایک دن آئے گا جب ایمان والے کافروں کی ہنسی اڑائیں گے۔ تو فرمایا کہ اگر تم ہمارے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہو فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ تم عنقریب جان لوگے مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ کہ کس کے پاس رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے وَيَحِلُّ عَلَيۡهِ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ اور کس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے اور تمہیں جلدی ہی اُس کا پتہ چل جائے گا۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا
مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ
الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۴۰
وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ
اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۴۱ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ
مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ
مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ
الْكٰفِرِيْنَ ۴۲ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ
الْمَآءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ
رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ
الْمُغْرَقِيْنَ ۴۳

ترجمہ :- یہاں تک کہ جب آیا ہمارا حکم اور تنور نے جوش مارا تو ہم نے کہا (نوح علیہ السلام سے) چڑھا لے اس (کشتی) میں ہر قسم کے جوڑے کو اور اپنے گھر والوں کو مگر وہ کہ جن پر پہلے بات ہو چکی ہے۔ اور (ان کو بھی) جو ایمان لائے اور نہیں ایمان لائے اس کے ساتھ مگر بہت تھوڑے لوگ ۴۰ اور فرمایا اس نے سوار ہو جاؤ اس کے اندر اللہ تعالیٰ

کے نام کے ساتھ ہی ہے اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا بیشک میرا پروردگار بہت بخشش کرنے والا اور ازحد مہربان ہے (۴۱) اور وہ کشتی اِن کو لے کر چل رہی تھی۔ موجوں کے اندر جو پہاڑوں جیسی تھیں۔ اور پکارا نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو اور تھا وہ دور کنارے پر۔ فرمایا اے بیٹے! سوار ہو جاؤ ہمارے ساتھ اور نہ ہو کفر کرنے والوں کیساتھ (۴۲) تو کہا اُس نے کہ بس پناہ پکڑوں گا اس پہاڑ کی طرف جو مجھے بچا لے گا پانی میں ڈوبنے سے۔ فرمایا (نوح علیہ السلام نے) نہیں ہے کوئی بچانے والا آج کے دِن اللہ کے حکم سے مگر وہ جس پر رحم کیا اُس نے۔ اور حائل ہو گئی اُن کے درمیان ایک موج، پس تھا وہ ڈوبنے والوں میں (۴۳)

ربط آیات

حضرت نوح علیہ السلام نے طویل عرصہ تک قوم کو تبلیغ کی مگر اُن کے مسلسل انکار کی وجہ سے مایوس ہو گئے۔ پھر آپ کو وحی الٰہی کے ذریعے پتہ چل گیا کہ اَب مزید کوئی فرد ایمان نہیں لائیگا، لہٰذا آپ نے اللہ کی بارگاہ میں قوم کے خلاف دُعا کی۔ پھر اللہ کے حکم سے آپ نے کشتی تیار کی۔ اس دوران نوح علیہ السلام قوم کو ظلم و زیادتی سے منع کرتے رہے اور اُن کو آگاہ کرتے تھے کہ نافرمانی سے باز آجاؤ اللہ کے عدل و انصاف اور انتقام کا وقت آچکا ہے اور اب تم بچ نہیں سکو گے۔

طوفان کی علامت

ارشاد ہوتا ہے حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا کہ اِس قوم کو اَب سزا ہی دینی ہے اور کسی کافر کو زندہ نہیں چھوڑنا تو پھر اُس عذابِ الٰہی کی علامت بھی ظاہر ہو گئی وَفَارَ التَّنُّوْرُ اور تنور نے جوش مارا۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو آگاہ کر رکھا تھا کہ اُس کے عذاب کی نشانی یہ ہے کہ فلاں مقام سے پانی اُبلنے لگے گا، جو بڑھتے بڑھتے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لیکر انہیں غرق کر دیگا۔

عربی، فارسی، اُردو، پنجابی وغیرہ میں تنور اُس بھٹی کو کہتے ہیں جس میں آگ جلا کر روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ بعض مفسرین اس سے عام روٹی پکانے والا تنور ہی مراد لیتے ہیں۔ جب کہ بعض فرماتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کے گھر میں ایک تنور تھا جس میں حضرت حوا روٹیاں پکایا کرتی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے اسی تنور کو عذاب کی علامت قرار دیا تھا کہ جب اس تنور سے پانی ابلنے لگے تو سمجھ لینا کہ اللہ کا عذاب آگیا ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ تنور کے جوش مارنے سے مراد طلوع فجر ہے کیونکہ عام طور پر اسی وقت اکثر قوموں پر عذاب نازل ہوا ہے جب قوم لوط پر عذاب آیا تو صبح کا وقت ہی تھا آگے اسی سورۃ میں آرہا ہے إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ان کا وعدے کا وقت صبح ہے اور کیا صبح اب قریب نہیں ہے؟ اسی طرح قوم عاد اور ثمود پر بھی صبح کے وقت ہی عذاب آیا۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تنور سے مراد سطح ارض ہے۔ اللہ نے فرمایا تھا کہ جب سطح ارض سے پانی پھوٹنے لگے تو سمجھ لینا کہ اب طوفان آگیا ہے۔ امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اکثر مفسرین نے اسی روایت کو اختیار کیا ہے۔ بہر حال تنور سے مراد خاص تنور ہو، کوئی خاص چشمہ ہو یا سطح ارض ہو، مراد یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب کی آمد کے لیے جو بھی نشانی مقرر کی تھی، اس سے پانی ابلنے لگا۔ اور اسی وقت کے لیے نوح علیہ السلام کو اللہ کا حکم تھا کہ جب یہ نشانی ظاہر ہو جائے تو فوراً کشتی میں سوار ہو جانا۔

ہر قسم کے جانور

جب عذاب کی علامت ظاہر ہو گئی تو اللہ نے فرمایا قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ہم نے نوح علیہ السلام کو فرمایا کہ اس کشتی میں ہر قسم کے جانوروں کا جوڑا جوڑا سوار کر لو۔ بائیبل کے بیان

کے مطابق اس سے روئے زمین کے تمام جانور مراد ہیں مگر ایسا نہیں ہے نوح علیہ السلام نے وہ مویشی وغیرہ اپنے ساتھ سوار کیے تھے جو عام طور پر پالے جاتے ہیں اور بذریعہ عمل تناسل پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں اونٹ، بھیڑ بکری، بلی، کتا وغیرہ اور بعض پرندے شامل ہیں۔ البتہ ان میں کیڑے مکوڑے شامل نہیں تھے۔ جن کی پیدائش بغیر سلسلہ تولید کے ہوتی ہے۔ بہر حال جن کو طوفان سے بچانا مقصود تھا، ان انسانوں اور جانوروں کو کشتی پر سوار کرایا گیا اور باقی طوفان میں غرق ہو گئے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان تو اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک ہوئے مگر جانور، چرند، پرند وغیرہ کس جرم کی پاداش میں ہلاک کر دیے گئے۔ وہ تو بیچارے بے گناہ تھے۔ اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جانوروں کی ہلاکت سزا کے طور پر نہیں بلکہ طبعی تھی اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے وہ اس مقصد کی تکمیل کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی طبعی موت ہوتی ہے۔ دنیا میں بھیڑ بکری گائے بیل وغیرہ ہر روز کتنی بڑی تعداد میں ہلاک ہوتے ہیں۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو آج کی دنیا میں جتنے جانور ایک دن میں اپنی طبعی موت کو پہنچتے ہیں اتنے جانور طوفانِ نوح میں بھی ہلاک نہیں ہوئے ہوں گے بہر حال جانوروں کی موت طبعی تھی جب کہ انسانوں کی ہلاکت ان کے اعمالِ بد کی پاداش میں واقع ہوئی۔

فرمایا ہر جانور کا ایک ایک جوڑا اس کشتی میں سوار کر لو۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کشتی کے اوپر تلے تین منزلیں تھیں نچلے حصے میں جانور تھے، درمیانے حصے میں انسان اور ان کا سامان تھا اور اوپر والے حصے میں پرندے تھے۔ بعض فرماتے ہیں کہ انسان اوپر والی منزل میں تھے، درمیان میں سامان تھا اور نچلے حصے میں جانور وغیرہ تھے۔

گھر والے اور اہل ایمان

فرمایا ایک نوجانوروں کو سوار کرلو وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ اور اپنے گھر والوں کو بھی سوار کرلو سوائے ان کے جن کے متعلق بات ہو چکی ہے کہ ان کی ہلاکت لازمی ہے۔ ان افراد خانہ میں ایک بیوی اور ایک بیٹا کنعان شامل ہیں۔ اس کے متعلق سعدی صاحب کہتے ہیں ے

طبع ناموزوں بود پیغمبر زادگی قدر نافزود

یعنی کنعان کی طبیعت ناموزوں تھی اور اس نے پیغمبر زادہ ہونے کی بھی کوئی قدر نہ کی۔ بعض کہتے ہیں کہ کنعان نوح علیہ السلام کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔ بلکہ آپ کی بیوی کا بیٹا تھا مگر اکثر کہتے ہیں کہ یہ آپ کا حقیقی بیٹا ہی تھا مگر کافرہ بیوی کے بطن سے تھا۔ سورۃ تحریم میں موجود ہے "كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ" یعنی نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام دونوں کی بیویاں کافرہ تھیں اور اللہ نے ان کو جہنم رسید کیا، اسی طرح بیٹا بھی نافرمان تھا اور کافروں سے ملا ہوا تھا، اسی لیے فرمایا کہ اپنے گھر والوں کو سوار کرلیں سوائے بیوی اور بیٹے کے جن کے متعلق پہلے فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ غرق ہی ہوں گے۔ ان کے علاوہ وَمَنْ اٰمَنَ ان کو بھی کشتی میں سوار کرلیں جو ایمان لا چکے ہیں۔ یعنی تمام اہل ایمان مرد و زن کو بھی کشتی میں بٹھالیں جن کی تعداد بعض روایات کے مطابق اسی یا بیاسی تھی فرمایا وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ اور نہیں ایمان لائے تھے نوح علیہ السلام کے ساتھ مگر تھوڑے آدمی۔ اہل ایمان میں نوح علیہ السلام کے تین بیٹے حام، سام اور یافث اور ان کی بیویاں بھی تھیں۔ ان کے علاوہ نوح علیہ السلام کی ایک بیوی بھی تھی جو ایمان لا چکی تھی۔ بعض فرماتے ہیں کہ کشتی میں سوار تمام افراد میں سے آئندہ نسل انسانی صرف نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سے ہی چلی، اور کسی انسان کی اولاد آگے نہیں

چلی۔ اسی لیے نوح علیہ السلام کو آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی حکمت میں یہی تھا۔

سوار ہونے کی دعائیں

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا نوح علیہ السلام نے کہا اس میں سوار ہو جاؤ۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ہی ہے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا۔ اس کی قرأت مُجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا بھی آتی ہے اور یہ مصدر میمی ہے۔ جری کا معنی چلنا اور رسی کا معنی ٹھہرنا یا لنگر انداز ہونا ہے۔ گویا کشتی کا چلنا بھی اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت سے ہے اور اس کا رک جانا بھی اسی کے نام سے ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ بیشک میرا پروردگار البتہ بخشش کرنے والا اور از حد مہربان ہے۔ نوح علیہ السلام نے کشتی پر سوار ہو کر یہ دعا پڑھی۔ اس امت کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان بھی یہ ہے کہ کشتی یا جہاز میں سوار ہوتے وقت یہی دعا پڑھیں تو اللہ تعالیٰ غرق ہونے سے امن دے گا۔ بِسْمِ اللّٰهِ الْمَلِكِ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اگر زائد حصہ یاد نہ ہو تو قرآن پاک کی آیت والا حصہ ہی کافی ہے۔ دوسری سورۃ میں خشکی کی سواری پر بیٹھ کر پڑھنے کی دعا بھی موجود ہے۔ "سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (الزخرف) کسی بھی سواری پر بیٹھیں موٹر کار، اونٹ، گھوڑا وغیرہ یہ دعا پڑھنا سنت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے تابع بنایا اور ہم ان کو تابع کرنے کے اہل نہ تھے۔

ہر صنعت کی تیاری میں اللہ تعالیٰ ہی کا فضل شامل حال ہے

سائنسدان اور انجینئر اُسی مالک کی عطا کی ہوئی عقل اور سمجھ کے ذریعے ایجادات کرتے ہیں مگر اِن ایجادات کے لیے جن عناصر (ELEMENTS) ایلیمنٹس کی ضرورت ہے وہ خالقِ کائنات ہی کے پیدا کردہ ہیں اور انجینئر یا سائنسدان ایک تولہ لوہا یا ایک قطرہ پیٹرول پیدا نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالے نے خام مواد مہیا کر کے لوگوں کو سمجھ عطا فرمائی تو انہوں نے انسانی ضروریات کی یہ سب چیزیں بنالی ہیں۔ سائنسدان بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ بہر حال ہر قسم کی سواری پر بیٹھ کر دعائے مسنونہ پڑھنی چاہیئے اور محض گپ بازی سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

کشتی کی روانگی

فرمایا وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وہ کشتی اِن سب کو لیکر پہاڑوں جیسی بلند موجوں کے درمیان چل رہی تھی۔ قرآن پاک اور بائیبل میں بھی ہے کہ اللہ کے حکم سے زمین کے سارے چشموں نے پانی اگل دیا اور اُوپر سے بارش بھی برسنے لگی۔ تورات کی روایت کے مطابق چالیس دِن تک مسلسل بارش ہوتی رہی۔ یہاں دس بارہ گھنٹے تک بارش نہ رُکے تو کہرام مچ جاتا ہے، مکان گرنے لگتے ہیں اور لوگ بے بس ہو جاتے ہیں مگر یہ حال چالیس دِن تک متواتر بارش ہوتی رہی اور زمین کے چشموں کا سارا پانی بھی باہر آگیا تو وہاں ہلاکت کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ روئے زمین پر پانی کی سطح اس قدر بلند ہوگئی کہ اونچی سے اونچی پہاڑیوں سے بھی پانی بیس یا تیس ہاتھ اُوپر چلا گیا۔ بعض نے پندرہ ہاتھ کا ذکر کیا ہے جو کہ پچیس فٹ بنتا ہے۔ بہر حال اللہ نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانا تھا اور کفار کو نیست و نابود کرنا تھا جس کے لیے پانی کو ان پر مسلط کر دیا۔ نوح علیہ السلام کی کشتی چلتی رہی حتیٰ کہ بائیبل کی روایت میں آتا ہے کہ مومن لوگ ایک سو پچاس (۱۵۰) روز تک کشتی میں سوار رہے پھر وہ کشتی ایک پہاڑ کے ساتھ جا لگی۔

بیٹے کے ساتھ مکالمہ

ارشاد ہوتا ہے وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ
اور ادھر نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی جو کہ کنارے پر کھڑا تھا
فرمایا يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا اے بیٹے! کشتی پر ہمارے ساتھ سوار ہو
جا وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ اور کفر کرنے والوں کے ساتھ
مت رہو۔ بیٹا نافرمان تھا قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ کہنے
لگا میں اونچے پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ
وہ مجھے پانی میں ڈوبنے سے بچا لیگا۔ اس پر حضرت نوح علیہ السلام
نے بیٹے کو پھر سمجھایا قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ
آج کے دن اللہ کے حکم یعنی اس کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا
إِلَّا مَن رَّحِمَ سوائے اس کے کہ جس پر رحم کیا گیا۔

جس پر رحم کیا جائے وہ تو معصوم کہلاتا ہے مگر یہاں پر عاصم کا
لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ فاعل کا صیغہ ہے۔ اس کے متعلق مفسرین
کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر عاصم کا معنی معصوم ہی ہے اور اس قسم کی
مثالیں قرآن پاک میں دوسری جگہ بھی موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ الطارق میں ہے
خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ "اللہ تعالیٰ نے انسان کو ٹپکانے ہوئے
پانی سے پیدا کیا۔ یہاں دافق مدفوق کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اسی
طرح سورۃ فجر کے آخر میں نفس انسانی کے متعلق آتا ہے "ارْجِعِي
إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" اے جان اپنے رب کی طرف
لوٹ جا اس حالت میں کہ تو خوش بھی ہوگی اور خوش کی ہوئی بھی۔
یہاں پر بھی راضیۃ دراصل مرضیۃ ہی ہے۔ عربی زبان میں کہتے
ہیں سِرٌّ كَاتِمٌ پوشیدہ راز۔ یہ بھی دراصل کاتم نہیں بلکہ مکتوم کا
معنی دیتا ہے۔ اسی طرح اس آیت کریمہ میں عاصم بمعنی معصوم ہے
اور اگر اسے فاعل کے معنوں میں ہی لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا

کہ آج کے دن اللہ کے حکم سے کوئی نہیں بچانے والا مگر وہی جو رحم کرنے والا یعنی خود خدا ہے۔ یعنی فرماتے ہیں لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ کا معنی یہ ہے کہ آج کے دن بچانے والا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ مجرموں کو اللہ کے عذاب سے کوئی ٹھکانا، کوئی مکان نہیں بچا سکتا وہی ٹھکانا کہ جس پر اللہ نے رحم کیا ہے اور یہ ٹھکانا کشتی ہے کہ بچنے والے اس کشتی کے ٹھکانے پر ہی بچ سکیں گے اور باقی سب کے سب غرق ہو جائیں گے

قوم کی غرقابی

امام ابن کثیرؒ اور بعض دیگر مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ ایک نافرمان عورت طوفان میں گھری ہوئی تھی۔ جوں جوں پانی آتا رہا وہ بلند پہاڑی پر چڑھتی گئی۔ اس کے پاس شیرخوار بچہ بھی تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ رحم فرماتا تو اس بچے پر ضرور کرتا مگر خدا تعالیٰ کے علم اور قدرت میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ان سب کو ہلاک کرنا ہے۔ چنانچہ جب پانی اس عورت کے پاس پہنچ گیا تو اس نے بچے کو کندھے پر بٹھا لیا۔ پھر جب پانی اسکی گردن تک پہنچ گیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے بچے کو اوپر اٹھا لیا، مگر بالآخر ایک موج آئی اور دونوں ماں بیٹے کو ہلاک کر دیا گیا۔

فرمایا آج بچانے والی کوئی جگہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور وہ رحم والا مقام کشتی ہی تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان مذکورہ مکالمہ جاری تھا وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ کہ ان دونوں کے درمیان پانی کی ایک موج حائل ہو گئی۔ ایسی زبردست لہر آئی جس نے کنعان کو نشانہ بنایا فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ پس تھا وہ ڈوبنے والوں میں سے۔ وہ بھی باقی قوم کے ساتھ ہی طوفان کی نذر ہو گیا۔

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ
الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ
بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ
اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ
الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ
غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْٓ
اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ
اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ
وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾

ترجمہ :۔ اور حکم دیا گیا (زمین کو) اے زمین ! نگل جا تو اپنے
پانی کو اور (آسمان کو حکم دیا گیا) اے آسمان ! اب تھم جاؤ تم
(بارش برسانے سے) اور خشک کر دیا گیا پانی اور فیصلہ کیا گیا
معاملے کا اور جا ٹکی وہ کشتی جودی پہاڑ پر اور کہا گیا کہ
دوری (اور ہلاکت) ہے اُن لوگوں کے لیے جو ظلم کرنے والے
ہیں ﴿۴۴﴾ اور پکارا نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو . بیشک
میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ برحق ہے اور
تو سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم ہے ﴿۴۵﴾ فرمایا اُس نے

اے نوح ! بیشک وہ نہیں تیرے اہل سے ۔ بیشک وہ سراپا غیر صالح عمل ہے ۔ پس نہ سوال کر مجھ سے اس چیز کا جس کا تجھے علم نہیں ۔ میں نصیحت کرتا ہوں تجھ کو اس بات سے کہ ہو جائے تو نادانوں سے (۴۶) عرض کیا ، اے پروردگار ! بیشک میں پناہ پکڑتا ہوں تیری ذات کے ساتھ اس بات سے کہ میں سوال کروں آپ سے اِس چیز کا جس کا مجھے علم نہیں ۔ اور اگر تو نہیں معاف کریگا مجھ کو اور رحم نہیں کریگا ، تو ہو جاؤں گا میں نقصان اٹھانے والوں میں سے (۴۷)

ربطِ آیات

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی قوم پر طوفان کی شکل میں عذاب نازل فرمایا اور ساری نافرمان قوم کو اس طوفان میں غرق کیا۔ پھر یہ بات بھی بیان ہو چکی ہے کہ آپ کی قوم کے اہلِ ایمان کو اللہ نے کشتی کے ذریعے نجات دی۔ یہ طوفان تقریباً سات ماہ تک اُس قوم پر مسلط رہا۔ چالیس دِن تک متواتر بارش ہوتی رہی اور زمین کے چشمے بھی پھوٹتے رہے حتیٰ کہ کہ پوری سطح ارض بلند ترین پہاڑوں سے بھی بیس ہاتھ اُوپر تک پانی سے بھر گئی جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ زمین پر پہاڑوں جتنی بلند موجیں اٹھ رہی تھیں اور نوح علیہ السلام کی کشتی اُن کے درمیان چل رہی تھی۔ وہ منظر کتنا خوفناک ہو گا۔ اس پریشانی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام اور اُن کے ایماندار ساتھیوں کو بچا لیا۔

طوفان تھم گیا

جب پوری قوم غرق ہو گئی وَقِيلَ يَاأَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ اے زمین اپنا پانی نگل لے۔ بارش اور چشموں کا جو پانی سطح زمین پر جمع ہو گیا تھا اُس کے متعلق زمین کو حکم ہوا کہ اس سارے پانی کو اپنے اندر جذب کرے۔ سورۃ زمر میں "فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ" اللہ تعالیٰ نے نالیوں اور چشموں کی صورت میں پانی کو زمین کے اندر ذخیرہ کر دیا ہے۔ چنانچہ پانی کی عام ضروریات بارش کے علاوہ زمینی پانی سے بھی پوری کی جاتی ہیں۔ اشتعال

نے زمین کی تہ میں پانی کو محفوظ کر دیا ہے۔ جو کنوئیں، ہینڈ پمپ اور ٹیوب ویل کے ذریعے نکال کر انسانی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت سے پانی کو کیسے سطح ارض سے قریب رکھا ہے جہاں سے بیس تیس فٹ کی گہرائی سے پانی مل جاتا ہے جب کہ بعض خطے ایسے ہیں جہاں پر بارہ بارہ سو میٹر کی گہرائی سے پانی نکالنا پڑتا ہے بہرحال بارش اور ان چشموں کا جو پانی اللہ کے حکم سے زمین کی سطح پر آگیا تھا اس کے متعلق حکم ہوا کہ اے زمین اس سارے پانی کو اب واپس اپنے اندر چشموں کی صورت میں جذب کر لے۔ اور ساتھ یہ بھی حکم ہوا۔ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ اور اے آسمان تھم جاؤ یعنی بارش برسانے سے رک جاؤ۔ وَغِيْضَ الْمَآءُ اور جو پانی زمین پر موجود تھا اُسے بتدریج خشک کر دیا گیا۔ مطلب یہ کہ طوفان کے تمام ذرائع کو ختم کر دیا گیا وَقُضِيَ الْاَمْرُ اور معاملے کا فیصلہ کر دیا گیا یعنی جن نافرمانوں کو ختم کرنا مقصود تھا اُن کو پانی میں غرق کر دیا گیا۔

جودی پہاڑ

اُدھر کشتی تو پانی پر چل رہی تھی جب پانی اُتر گیا وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ تو کشتی جودی پہاڑ پر جا کر رک گئی۔ تورات میں اس پہاڑی کا نام ارارطیا ارارا طا آیا ہے۔ تاہم اس بات کی وضاحت کہیں نہیں ملتی کہ زمین کا پانی کتنے عرصہ میں خشک ہوا جس کے بعد لوگ کشتی سے باہر آئے۔ البتہ تفسیری روایات سے یہ بات واضح ہے کہ نوح علیہ السلام طوفان کے بعد بھی ساٹھ سال تک زندہ رہے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی اولاد کو خوب پھیلایا۔ روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کشتی میں سوار انسانوں میں سے نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں سام، حام اور یافث سے نسل انسانی آگے بڑھی اور زمین پھر انسانوں سے آباد ہو گئی۔

جودی پہاڑ آرمینیا کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔ یہ سلسلہ کوہ خلیج فارس سے لے کر کردستان تک پھیلا ہوا ہے اور یہیں ایک پہاڑ جودی بھی ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں کوہ ہمالیہ اور قراقرم اڑھائی تین ہزار میل میں پھیلا ہوا ہے، اسی طرح آرمینیا کا پہاڑی سلسلہ بھی ہزاروں میلوں میں موجود ہے۔ بہر حال نافرمان قوم کی ہلاکت کے بعد طوفان کو روک دیا گیا۔ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ اور کہا گیا کہ ہلاکت ہے ظالم قوم کے لیے۔ جن لوگوں نے اللہ کی توحید کا انکار کیا، حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت و رسالت کو تسلیم نہ کیا۔ قیامت کا انکار کیا، اللہ کے نبی کو بے حد تکلیفیں دیں، حقیقت میں انہوں نے بڑا ظلم کیا اور اللہ نے ان کے لیے ہلاکت و تباہی کا حکم صادر فرما دیا۔

بیٹے کے لیے دعا

پچھلے درس میں گزر چکا ہے کہ نوح علیہ السلام نے اپنے نافرمان بیٹے کنعان کو بھی کشتی میں سوار ہونے کی دعوت دی مگر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں غرق ہونے سے بچنے کے لیے کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ مگر اسی دوران میں پانی کی ایک زبردست لہر آئی جو کنعان کو بہا کر لے گئی۔ اس موقع پر نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اس بیٹے کے حق میں دعا بھی کی تھی جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ اور نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو پکارا فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ اور کہا اے پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ اور تیرا وعدہ بھی برحق ہے۔ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ اور تو سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم ہے۔ اللہ کا وعدہ یہ تھا کہ کشتی میں اپنے گھر والوں کو سوار کر سوائے ان کے کہ جن کے متعلق بات ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ اہل ایمان کو اور ہر جانور کا جوڑا جوڑا بھی لاد لو، اللہ تعالیٰ ان کو محفوظ کیے

گا اور باقی سب کو ہلاک کر دیگا۔ تو وَعْدَكَ الْحَقُّ سے یہی مراد ہے کہ مولا کریم! تو نے خود فرمایا تھا کہ اپنے اہل کو سوار کرے مگر یہ نافرمان بیٹا خود انکار کر رہا ہے۔ تیرا وعدہ بھی برحق ہے اور یہ سوار بھی نہیں ہوتا۔ آخر اس میں تیری کیا حکمت ہے؟

اللہ تعالیٰ کا سخت جواب

نوح علیہ السلام کی اس دعا کا اللہ تعالیٰ نے بڑی سختی کے ساتھ جواب دیا قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ فرمایا، اے نوح علیہ السلام! یہ بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ یہ سراپا بے عمل ہے، ایسا شخص تیرے اہل میں سے کیسے ہو سکتا ہے؟ تیرے اہل میں سے تو ایمان دار ہی ہو سکتے ہیں مگر یہ تو کلیۃً بے عمل ہی بے عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مبالغے کے طور پر یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں۔ بعض نے اس قرأت میں بھی پڑھا ہے اِنَّهٗ عَمِلَ غَيْرَ صَالِحٍ اس نے برا کام لیا ہے۔ بد اعتقادی اور بدعملی کو یکجا کر دیا ہے بعض اس کا معنی یہ بھی کرتے ہیں اِنَّهٗ ذُوْ عَمَلٍ غَيْرُ صَالِحٍ یہ تو ایسے عمل کا مالک ہے جو صالح نہیں، بہرحال اللہ نے فرمایا یہ تیرے اہل میں سے نہیں کیونکہ اس کے اعمال بہتر نہیں فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ پس نہ سوال کر مجھ سے اس چیز کے بارے میں جس کا تجھے علم نہیں۔ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے ہو جائے گا۔ جس چیز کے متعلق تجھے علم نہیں اس کا کیوں سوال کرتے ہو؟

خالی نسلی قرابت مفید نہیں

اس سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا۔ ہے کہ نبی کے ساتھ خالی نسلی قرابت مفید نہیں جب تک کہ ایمان موجود نہ ہو۔ خود حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

نے بھی اپنی بیٹی، پھوپھی اور چچاؤں سے فرمایا تھا کہ میرا تم سے قرابت کا رشتہ ہے جس کا حق میں تمہیں دنیا میں ہی ادا کرتا رہوں گا۔ لیکن اگر تم ایمان قبول نہیں کرو گے اور نیکی اختیار نہیں کرو گے تو اللہ کے پاس میں تمہیں بچا نہیں سکوں گا۔ اَنْقِذُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مِّنَ النَّارِ اپنی جانوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ یعنی ایمان قبول کرو کیونکہ رشتہ داری اور قرابت ایمان کے ساتھ ہی قبول ہو سکتے ہیں۔ یہی بات اس آیت میں بھی پائی جاتی ہے اور حضور علیہ السلام کی حدیث بھی موجود ہے کہ خالی نسلی قرابت کسی کام نہ آئے گی۔

نوح علیہ السلام کی لغزش

جمہور مفسرین نے بیٹے کے حق میں اس دعا کو نوح علیہ السلام کی لغزش قرار دیا ہے، یہ کوئی ایسی گناہ کی بات نہ تھی، معمولی لغزش تھی۔ مگر چونکہ آپ اللہ کے نبی اور مقرب تھے اس لیے اللہ نے اس معمولی لغزش کا بھی سختی سے نوٹس لیا اور آپ کو ایسا سوال کرنے کی وجہ سے جھڑک دیا۔ البتہ بعض مفسرین کو یہ نکتہ سمجھنے میں خود غلطی ہوئی ہے جن میں ہمارے زمانے کے مفسر قرآن مولانا مودودی بھی شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تفسیر اردو دان طبقے میں کثرت سے پڑھی جاتی ہے مگر یہ اغلاط سے خالی نہیں۔ اس میں کئی اعتقادی اور فقہی یعنی فقہی مسائل کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مولانا ذہین اور وسیع المطالعہ شخصیت تھے مگر ان کی غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے علم مطالعہ کے زور پر حاصل کیا تھا کسی استاد سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، لہٰذا مستند عالم نہیں تھے۔ استاد سے پڑھنے والے آدمی کے خیالات منظم ہوتے ہیں اور جہاں کہیں اشکال پیدا ہوا کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو استاد یا شیخ کی طرف رجوع کر لیا جاتا ہے۔ مولانا مرحوم میں یہ چیز مفقود تھی لہٰذا جو کچھ ان کی سمجھ میں آ گیا، انہوں نے بلا تصدیق لکھ

دیا۔ مولانا سید احمد رضا بجنوری ابھی بقیدِ حیات ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مولانا صاحب کی تفسیر کا مطالعہ کیا ہے اور میں نے اس میں علمی، اعتقادی فقہی اور تفسیری ایک سو غلطیاں نوٹ کی ہیں۔ چنانچہ مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

۵ اس ارشاد کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان نہ کرے۔ کہ حضرت نوحؑ کے اندر روحِ ایمان کی کمی تھی، یا ان کے ایمان میں جاہلیت کا کوئی شائبہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہوسکتا کہ ہر وقت اُس بلند ترین معیارِ کمال پر قائم رہے جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے، لیکن جونہی کہ اسے یہ احساس ہوتا ہے، یا اللہ کی طرف سے احساس کرا دیا جاتا ہے کہ اس کا قدم معیارِ مطلوب سے نیچے جا رہا ہے، وہ فوراً توبہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں اسے ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہوتا۔ حضرت نوحؑ کی اخلاقی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی جوان جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہوا ہے اور اس نظارہ سے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ فرمایا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لیے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صلب سے پیدا ہوا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے، تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پروا ہو کر اُس طرزِ فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضیٰ ہے۔

دیکھو کتنی غلط بات کہہ رہے ہیں کہ نبی اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو کر معیارِ کمال سے گر جاتا ہے۔ حالانکہ نبی اس کمال کو ہر وقت قائم رکھتے ہیں جو اللہ نے اُن کے لیے رکھا ہے۔ خدا تعالیٰ اُن سے کوئی گناہ نہیں ہونے دیتا کیونکہ یہ عصمتِ انبیاء کے خلاف بات ہے۔ مودودی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک آدمی جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی بات کرتا ہے، اسی طرح نبی بھی ایسی بات کرتا ہے۔ اس طرح تو نبی مقتدا کیسے بنے گا اور اس کی بات کا ہر وقت یقین کیسے ہوگا؟

اسی طرح آگے آپ نے نوح علیہ السلام کے لیے جذبہ جاہلیت ثابت کیا ہے۔ یہ فحش غلطی ہے۔ نوح علیہ السلام میں نہ جذبہ جاہلیت تھا اور نہ وہ بشری کمزوری میں مبتلا ہو کر معیارِ کمال سے نیچے گرے تھے۔ یہ نہ تو گناہ کبیرہ تھا اور نہ صغیرہ، بلکہ صرف ایک اجتہادی لغزش تھی اور نبی سے اجتہادی لغزش ہو سکتی ہے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام سے بھی ہوئی۔ ہر نبی سے کچھ نہ کچھ معمولی لغزش ہو جاتی ہے جو کہ عام آدمی کے اعتبار سے گناہ ہی نہیں ہوتا لیکن نبی کی ذات چونکہ بلند ہوتی ہے، اس لیے وہاں معمولی سی بات پر بھی بڑی گرفت ہوتی ہے۔

ماتریدیؒ کی توجیہ

امام ابو منصور ماتریدیؒ امام ابو حنیفہؒ کے دو واسطوں سے شاگرد تھے۔ وہ تفسیر میں لکھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کو اپنے بیٹے کے ایمان کے بارے میں علم ہی نہیں تھا۔ وہ آپ ہی کے گھر میں منافقوں کی طرح رہتا تھا مگر کافروں کے ساتھ ملا ہوا تھا، بیوی کا بھی یہی حال تھا۔ یہ دونوں درپردہ کافروں کے ساتھ تھے مگر نوح علیہ السلام کو علم نہیں تھا کہ یہ حقیقت میں ایمان سے خالی ہیں۔ یہ بات تو قرین قیاس ہے کیونکہ نبی عالم الغیب تو ہوتا نہیں کہ اُسے معلوم ہو کہ فلاں فلاں منافق

آدمی ہیں۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ نے سورۃ توبہ میں فرمایا ہے۔ کہ مدینہ اور اردگرد میں کتنے منافق ایسے ہیں" لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ "جن کو آپ نہیں جانتے بلکہ ہم انہیں جانتے ہیں۔ وہ لوگ آپ کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں آپ کی مجلس میں آتے ہیں اور بعض اوقات جہاد میں شریک ہوتے ہیں مگر جب تک وحی کے ذریعے اطلاع نہ دی جائے اُن کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ نوح علیہ السلام کو بھی بیٹے کے کفر اور نفاق کا علم نہ ہو مگر اللہ نے اس معاملے میں سختی اس لیے کی کہ آپ کا بیٹا آپ کی دعوت کے باوجود آپ کے ساتھ کشتی میں سوار نہ ہوا اور نبی کی فراست بھی غیر معمولی ہوتی ہے تو آپ کو بیٹے کے کفر کا اندازہ ہو جانا چاہیئے تھا اور خدا کی بارگاہ میں اس لیے دُعا نہیں کرنی چاہیئے تھی، کیونکہ یہ بات خدا کی مرضی کے خلاف تھی۔ یہ نہ تو جذبہ جاہلیت تھا اور نہ نوح علیہ السلام اپنے مقامِ عصمت سے گرے تھے۔ یہ تو چھوٹی سی لغزش تھی۔ نبی معصوم ہوتا ہے، خدا اس سے گناہ نہیں سرزد ہونے دیتا بلکہ اُسے گارنٹی حاصل ہوتی ہے۔ نبی خواہ خوشی کی حالت میں ہو یا غمی کی حالت میں یا غصے کی حالت میں، اُس کی ہر بات حق اور واجب التعمیل ہوتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ مبارک ہے کہ میں جو کچھ زبان سے کہتا ہوں۔ وہ حق ہوتا ہے، چاہے میں کوئی بات ہنسی مذاق میں ہی کیوں نہ کروں۔ تو امام ابو منصور ماتریدیؒ کی توجیہ یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کو علم نہیں تھا کہ اُن کا بیٹا کافر ہے۔ آپ سوال کر بیٹھے تو اللہ نے سخت ڈانٹ پلائی۔ آپ کے بلند مرتبہ پر فائز ہونے کی وجہ سے اللہ نے اتنی سی لغزش بھی معاف نہ فرمائی۔ خود حضور علیہ السلام نے نابینا آدمی سے ذرا بے اعتنائی برتی تھی تو سورۃ عبس کی آیات نازل ہو گئیں" عَبَسَ وَتَوَلّٰى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى "آپ نے ایک نابینا

آدمی سے روگردانی کی۔ یہ کوئی گناہ نہیں تھا بلکہ ذرا سی بے توجہی کی تو فوراً گرفت آگئی۔

شیخ الاسلامؒ کی توجیہ

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ اگر نوح علیہ السلام کو بیٹے کے کفر کا علم تھا تو پھر سوال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نوح علیہ السلام اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کو سمجھنا چاہتے تھے کہ اے پروردگار! تیرا وعدہ تو یہ تھا کہ تیرے اہل کو بچا لوں گا مگر میرا بیٹا ڈوب رہا ہے، مجھے خبر دے کہ اس کی حکمت کیا ہے۔ آپ کے سوال کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کو کیوں غرق کیا یا اس کو ضرور ہی بچا لیا جائے۔ تاہم شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ اگر حقیقت حال ہی معلوم کرنا مطلوب تھی، تو بڑے آدمیوں کو پہلے مالک کی مرضی معلوم کرنی چاہیئے کہ وہ ایسے سوال سے ناراض تو نہیں ہوگا، مگر نوح علیہ السلام نے براہِ راست بیٹے کے متعلق سوال کر دیا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند تھا، اس لیے اس نے تنبیہ فرمائی۔ نوح علیہ السلام کو بیٹے کے کفر کے بارے میں علم نہیں تھا اور جس بات کے متعلق علم نہ ہو، اس کو ابہام پر ہی رہنے دینا چاہیئے تھا۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی چیز کو مخفی رکھنا چاہتا ہے اور اگر ایسی بات کے متعلق سوال ہوگا تو اللہ تعالیٰ ناپسند کرے گا۔

معافی کی درخواست

جب نوح علیہ السلام سمجھ گئے کہ بیٹے کے متعلق ان کا سوال اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آیا تو انہوں نے فوراً رجوع کر لیا۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ اے پروردگار میں تیری ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں کہ میں کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں۔ یہی آپ کے کمال کی علامت ہے جب آدم علیہ السلام کو اپنی لغزش کا احساس ہوا تو انہوں نے بھی فوراً اقرار کر لیا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا اے پروردگار! بیشک ہم

نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔" وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اعراف) اگر تو ہمیں معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے یہی عاجزی اور ابتہال نوح علیہ السلام نے اللہ کے سامنے کی۔ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ اور اگر تو مجھے معاف نہیں کرے گا اور مجھ پر رحم نہیں فرمائے گا۔ تو میں نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاؤں گا آپ نے یہ نہیں کہا کہ باری تعالیٰ! میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا بلکہ لغزش کی معافی طلب کر لی اور یہی عاجزی اللہ کے نزدیک سب سے بڑا کمال ہے۔

قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰى
اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ
مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ
اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ
هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ؕۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

ترجمہ :- کہا گیا (نوح علیہ السلام سے) اے نوح ! اتر جاؤ سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ جو تجھ پر ہوں گی اور ان اُمتوں پر ہوں گی جو اُن میں سے ہیں جو تیرے ساتھ ہیں ۔ اور کچھ اُمتیں ایسی ہیں کہ ہم اُن کو فائدہ پہنچائیں گے ۔ پھر پہنچے گا اُن کو ہماری طرف سے دردناک عذاب ﴿۴۸﴾ یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں ، ہم وحی کے ذریعے اِن کو آپ تک پہنچاتے ہیں ۔ آپ ان کو نہیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم کے لوگ اس سے پہلے ۔ پس آپ صبر کریں ۔ بیشک انجام متقیوں کے لیے ہی ہے ﴿۴۹﴾

ربط آیات

اس سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ اور محنت کا ذکر ہوا ۔ پھر اللہ نے آپ کی قوم کا کچھ حال بیان کیا اور ساتھ آپ کے بیٹے کی نافرمانی کا ذکر بھی کیا ۔ پھر آخر میں نافرمانوں پر مسلط ہونے والے عذاب اور اس میں قوم کی ہلاکت کا ذکر کیا ۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نوح علیہ السلام نے کشتی تیار کی اور اس میں اپنے اہل اور مومنوں کو سوار کیا ۔ اس کے

ساتھ ہر جانور کا ایک ایک جوڑا بھی لاد لیا۔ پھر اللہ نے طوفان کا ذکر کیا کہ طوفانی پانی اونچے سے اونچے پہاڑ سے بھی تیس ہاتھ اوپر تک پہنچ گیا جس میں نوح علیہ السلام کی کشتی چلتی رہی اور پھر ایک سو پچاس دن کے بعد جودی پہاڑ پر جا کر رُک گئی۔ اس کے بعد اللہ کے حکم سے پانی اُتر گیا، بارش تھم گئی اور زمین خشک ہونے لگی۔

دسویں محرم کی فضیلت

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ طوفان کے تھم جانے اور کشتی والوں کے زمین پر قدم رکھنے کے درمیان ایک سال کا وقفہ گزر گیا۔ یہ کشتی محرم کی دس تاریخ کو جودی پہاڑ پر جا کر رکی تو نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں نے اس دن شکرانے کا روزہ رکھا جس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے نجات پائی، اس دن بھی یہی تاریخ تھی اور بنی اسرائیل نے نجات حاصل ہونے پر روزہ رکھا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل ہمیشہ دسویں محرم کا روزہ رکھتے تھے۔ ہماری امت کے لیے اس دن کا روزہ مستحب ہے اور باعثِ اجر ہے۔ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے اس دن کا روزہ فرض تھا، پھر جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو اس دن کا روزہ نفلی ہوگیا۔ حضور علیہ السلام نے دسویں محرم کے ساتھ نویں محرم کو بھی شامل کر لیا اور دو دن کا نفلی روزہ رکھنے کی ترغیب دی۔

کشتی سے اترنے کا حکم

جب کشتی کو رُکے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ کہا گیا، اے نوح علیہ السلام اُتر جاؤ (اُترو) کشتی سے بھی ہو سکتا ہے اور جودی پہاڑ سے بھی کیونکہ آپ کشتی پر سوار تھے اور کشتی پہاڑ پر جا کر ٹکی تھی۔ تو اللہ کا حکم ہوا کہ اب زمین بسنے کے قابل ہوگئی ہے لہٰذا آپ اتر کر معمولاتِ زندگی میں دوبارہ مصروف ہو جائیں۔ اور اترنے کی صورت کیا ہے بِسَلٰمٍ مِّنَّا ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ۔ وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ اور آپ پر برکتوں کے ساتھ

وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ اور ان امتوں پر جو آپ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے کشتی کے ساتھیوں کو امتوں سے تعبیر فرمایا ہے حالانکہ اُس وقت تو آپ کے ہمراہ چند آدمی تھے اور پوری امتیں نہیں تھیں۔ قرآن پاک میں اس بات کی تصریح بھی موجود ہے کہ کشتی میں سوار ہونے والے نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث کے علاوہ کسی شخص کی نسل آگے نہیں چلی۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور آپ کی اولاد کو سخت مصیبت سے نجات دی وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ اور ہم نے نوح علیہ السلام کی اولاد کو ہی باقی رکھا۔ باقی لوگ طوفان کے بعد اپنی زندگیاں گزار کر اس دنیا سے چلے گئے مگر کسی کی اولاد آگے نہیں چلی، غرضیکہ اُس وقت نہ تو امتیں موجود تھیں اور نہ عام لوگوں کی نسلیں ہی آگے چلیں، تو اس مقام پر امتوں سے مراد وہی امتیں ہیں جو آگے چل کر نوح علیہ السلام کے تینوں بیٹوں سے دنیا کے مشرق و مغرب میں پھیلیں مفسر قرآن محمد ابن کعب خورزیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے

اللہ کی طرف سے سلامتی

جس سلامتی کی خوشخبری دی ہے۔ وہ نوح علیہ السلام سے لے کر قیامت تک پیدا ہونے والے ایمانداروں کے لیے ہے اور کہ جس عذاب الیم کا ذکر ہے وہ بھی قیامت تک پیدا ہونے والے کافروں کے لیے ہے یہاں پر اُمَمٌ کا لفظ آیا ہے جو کہ امت کی جمع ہے۔ امت، گروہ، فرقہ یا جماعت کو کہا جاتا ہے تو فرمایا ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اُتر جاؤ۔ یہاں پر مطلق سلامتی کا ذکر ہے۔ جب کہ سلامتی مادی، جسمانی یا روحانی بھی ہو سکتی ہے جسمانی اور مادی سلامتی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو تندرستی نصیب ہو، اچھی اولاد نصیب ہو، آرام و آسائش کی سہولتیں میسر ہوں۔ اور روحانی سلامتی یہ ہے کہ کسی کو اچھا اخلاق حاصل ہو، نیک اعمال انجام دینے کی توفیق

نصیب ہو اور اچھے طریقے سے عبادت کرنے کا ذوق و شوق پیدا ہو۔
یہاں پر مطلق سلامتی کا ذکر کیا گیا ہے جس سے مادی اور روحانی دونوں قسم
کی سلامتی مراد ہے۔ قرآن پاک میں یہ بھی موجود ہے کہ ہم ہر شخص کو آزمائیں
گے۔ اس آزمائش کے دوران میں اگر مادی سلامتی کسی وقت نہ بھی حاصل
ہو تو روحانی سلامتی ہر حال نصیب ہوتی ہے۔ سلامتی کو عافیت سے
بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے سَلِ اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ
یعنی اللہ سے ہمیشہ عافیت طلب کیا کرو۔ عافیت انسانی جسم میں سعادت
کی طرح ہوتی ہے یہ انسان کی جسمانی سعادت ہے کہ اُسے عافیت نصیب
ہو اور وہ آفات سے محفوظ ہے۔ یہ سب چیزیں عافیت میں داخل
ہیں تاہم جسمانی عافیت ہمیشہ نہیں رہتی۔

غَرَّ امْرَءً مِّنْتُہُ نَفْسُہٗ اَنْ تَدُوْمَ لَہُ السَّلَامَۃُ

اُس آدمی کے نفس نے اُسے
دھوکہ دیا جو یہ سمجھتا ہے کہ سلامتی اس کے لیے ہمیشہ رہیگی۔ تندرستی مال
اقتدار وغیرہ دائمی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ دنیا دار الابتلاء ہے۔ اگر انسان کو
عافیت نصیب ہو تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ بڑھاپا آنے
والا ہے جو اس کی سلامتی میں کمی کرکے اُسے امراض کا شکار بنائے گا
گویا اس دنیا میں ہمیشہ کی سلامتی ناممکن ہے، یہ تو صرف دار السلام میں
پہنچ کر ہی نصیب ہو سکتی ہے۔

سلامتی عربی ادب میں

جس طرح ہمارے ہاں ڈاکٹر اقبال قومی شاعر تصور کیے جاتے ہیں
اسی طرح مصر کے شوقی بڑے مشہور شاعر ہیں۔ جاپان میں جب قیامت
خیز زلزلہ آیا تھا تو شوقی نے اس کا ذکر یوں کیا تھا۔

قِفْ بِتُوْکِیُوْ وَقِفْ عَلٰی یُوْکُوْھَامَۃَ
وَسَلِ الْقَرْیَتَیْنِ کَیْفَ الْقِیَامَۃ

جاپان کی دو بستیوں توکیو اور یوکوہاما میں جا کر ٹھہرو اور اُن سے پوچھو

کہ قیامت کیسی ہوتی ہے۔ یہ زلزلہ بالکل قیامت کا نمونہ تھا جس میں ڈیڑھ لاکھ آدمی ہلاک اور اڑھائی لاکھ زخمی ہوگئے زمین میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئیں اور ملک کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا۔ پھر شاعر انسان کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

لَا تَثِقْ بِمَا شِئْتَ مِنْ زَمَانِكَ
بِالْاَصْحِبَةِ الْعَيْشِ اَوْجَوَارِ السَّلَامَةِ

اپنے زمانے کی ہر چیز پر اعتماد کرو مگر دائمی عیش اور سلامتی کی امید نہ رکھو۔ انسان کو سلامتی اور عافیت کا جتنا وقت نصیب ہو جائے۔ اسی کو غنیمت جانے کیونکہ یہ ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح ایک شاعر یوں کہتا ہے

كُلُّ ابْنِ اُنْثٰى وَاِنْ طَالَتْ سَلَامَتُهٗ
لَا بُدَّ يَوْمًا عَلٰى اٰلَةٍ الْحَدْبَاءِ مَحْمُوْلٗ

ہر حوا کا بیٹا ایک دن ٹیڑھی چارپائی (جنازے والی چارپائی) پر سوار ہونے والا ہے اگرچہ اس کی سلامتی کتنی ہی دراز کیوں نہ ہو۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ پر اور آپ کے ساتھیوں کی امتوں پر سلامتی ہوگی۔ ان میں سے روحانی سلامتی تو ہمیشہ قائم رہے گی مگر مادی سلامتی اسی دنیا میں بعض کو نصیب ہو جاتی ہے تاہم یہ دیرپا نہیں ہوتی اور کسی وقت بھی چھن سکتی ہے۔

اللہ کی طرف سے برکت

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے لیے سلامتی کے علاوہ برکت کا ذکر کیا ہے۔ امام راغب اصفہانی[3] مفردات القرآن میں فرماتے ہیں کہ برکت ایسی بہتری اور زیادتی کو کہتے ہیں جس میں تقدیس کا مادہ پایا جاتا ہے۔ برکت دینا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے کسی کی عمر میں برکت ہوتی ہے کسی کے مال میں، کسی کی اولاد میں، کسی کی عبادت

میں اور کسی کے اوقات میں۔ بسا اوقات بعض لوگ تھوڑے وقت میں بہت زیادہ کام کر جاتے ہیں۔ یہ اوقات میں برکت ہوتی ہے بعض اوقات اللہ تعالیٰ تھوڑی سی چیز میں برکت عطا کرتا ہے تو وہی چیز بہت زیادہ لوگوں کی پیٹ پروری اور سیرابی کا باعث بن جاتی ہے۔ بعض اوقات بڑی سے بڑی چیز میں بھی بے برکتی ہوتی ہے جس سے نہ پیٹ پروری ہوتی ہے اور نہ سیرابی۔

عذاب کے مستحقین

بعض امتوں کے لیے سلامتی اور برکات کے ذکر کے بعد فرمایا وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ کچھ امتیں، جماعتیں، گروہ، خاندان اور نسلیں ایسی ہیں، جن کو ہم فائدہ پہنچائیں گے ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ پھر ان کو ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔ یہ نافرمان، کافر، مشرک، منافق اور ملحد لوگوں کا ذکر ہے جن کے متعلق فرمایا کہ دنیا میں اُن کو فائدہ پہنچے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق دنیا میں ہر انسان کو مہلت دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مال و دولت اور اقتدار دیتا ہے مگر جب وہ امتحان میں پورے نہیں اترتے تو عذاب الیم کے مستحق بن جاتے ہیں۔ یہ قانون قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُسی وقت نوح علیہ السلام کو بتلا دیا تھا۔

غیب کی خبریں

نوح علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد اگلی آیت میں حضور علیہ السلام کو تسلی دی جا رہی ہے کہ جس قسم کے حالات نوح علیہ السلام کو پیش آئے وہی حالات آپ کے ساتھ بھی پیش آ رہے ہیں۔ نوح علیہ السلام کا واقعہ حضور علیہ السلام کی صداقت وحقانیت کی دلیل ہے ارشاد ہوتا ہے تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم نے وحی کے ذریعے آپ پر نازل کیا ہے۔ نوح علیہ السلام کے واقعات

کو ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا۔ کیا یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ نہیں ہے جس ہستی نے نہ سکول میں پڑھا، نہ کسی انسان سے درس لیا، نہ تعلیم یافتہ سوسائٹی میسر آئی۔ نہ تاریخ پڑھی بلکہ ایک اُمّی ہونے کے باوجود ہزاروں سال پُرانے واقعات بلا کم و کاست بیان کرنا ہی آپ کی نبوت و رسالت کا ثبوت ہے۔ فرمایا یہ واقعات — ہم نے آپ کو وحی کے ذریعے بتلائے ہیں مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ نہ آپ اِن واقعات کو جانتے تھے وَلَا قَوْمُكَ اور نہ آپ کی قوم کے لوگ مِنْ قَبْلِ هٰذَا اس سے پہلے جانتے تھے۔ آپ کی قوم کی غالب اکثریت بھی امی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ڈیڑھ ہزار سال تک وہ صحیح دین پر تھے۔ پھر حضور علیہ السلام کی بعثت سے ساڑھے چار سو سال قبل دین میں بگاڑ پیدا ہوا اور دین کا کچھ کا کچھ بن گیا یہود و نصاریٰ کے پاس تو کسی نہ کسی صورت میں کتابیں موجود تھیں مگر عربوں کے ہاں تو علم کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ لہٰذا وہ ان واقعات سے بالکل بے بہرہ تھے، مگر وحی کے ذریعے علم ہونے پر آپ نے یہ سارے واقعات بیان کر دیئے۔

نبی عالم الغیب نہیں ہوتا

معلوم ہوا کہ اللہ کا نبی بھی غیب دان نہیں ہوتا۔ غیب دان صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ قرآن پاک ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور مخلوق میں سے کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے" لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ "آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ قُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ آپ کہہ دیں کہ غیب صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو چیزیں مخلوق کی نگاہ سے غائب ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو جانتا ہے۔" وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ علیم کل صرف ذات

خداوندی ہے۔ علمِ محیط، قدرتِ تامہ اور تصرفِ تام اللہ تعالیٰ کی صفات مختصہ ہیں، ان میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ معبود بھی وہی ہے، نافع، ضار، ما فوق الاسباب متصرف۔ علیمِ کل، محیطِ کل صرف اللہ تعالیٰ ہے کوئی فرشتہ، جن یا انسان غیب نہیں جانتا۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق میں سب سے زیادہ علم والے ہیں جن پر اللہ نے قرآن جیسی کتاب نازل فرمائی۔ مگر اُن کا علم بھی محدود ہے۔ لہٰذا عالم الغیب کا اطلاق آپ پر بھی جائز نہیں۔ ہاں جو بات آپ کو وحی کے ذریعے تبلا دی جاتی تھی اسے آپ جانتے ہیں۔ شریعت ساری کی ساری غیب کے علم پر مشتمل ہے جس کا آپ کو مکمل علم ہے اس کے علاوہ بھی تکوینی طور پر آپ نے بیشمار باتیں تبلائیں جن کا علم آپ کو بذریعہ وحی ہوا۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ایک یہودی عالم نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں سوال کیا کہ شکم مادر میں بچے یا بچی کی شکل و شباہت ماں یا باپ پر کیسے بنتی ہے؟ حضور نبی اکرم نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا کہ عورت اور مرد میں جس کا مادہ منویہ سبقت کرتا ہے۔ پیدا ہونے والے بچے بچی کی شکل و شباہت اسی کے مطابق ہوتی ہے۔ جب سوال کرنے والا چلا گیا تو حضور نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جب اس شخص نے سوال کیا تو اس وقت مجھے اس کے جواب کا علم نہیں تھا۔ پھر جب جبرائیل علیہ السلام نے آکر خبر دی تو میں نے اس شخص کو جواب دیا۔ غرضیکہ عالم الغیب نبی کی ذات بھی نہیں ہوتی۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفات مختصہ انبیاء میں پائے جانے کی نفی کرنا واجب ہے، یعنی یہ کہ نبی مخلوق ہے اس کا علم محدود ہے، نہ وہ علیمِ کل ہے اور نہ قادرِ مطلق۔ ایسا کہنا نبی کی توہین نہیں بلکہ تعریف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا علم آپ کو دیا۔ اس کو آپ

جانتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے مطابق جن چیزوں کا علم آپ کو نہیں دیا گیا، آپ اس کو نہیں جانتے بعض لوگ بعض آیات سے غلط استدلال کرتے ہیں اور انبیاء کے علاوہ اولیاء اللہ کو بھی غیب دان مانتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہاں اگر اللہ کسی نبی یا ولی کے ہاتھ سے کوئی معجزہ یا کرامت ظاہر کر دے تو یہ اس کا کام ہے اور اسی کی مشیت سے ہوتا ہے۔ کسی نبی یا ولی کو از خود معجزے یا کرامت کے اظہار کا اختیار نہیں ہوتا۔

صبر کی تلقین

فرمایا فَاصْبِرْ آپ کفار و مشرکین کی ایذا رسانی پر صبر کریں حضرت نوح علیہ السلام نے تقریباً ایک ہزار برس تک تکالیف برداشت کیں، اسی طرح آپ بھی صبر کا دامن تھامے رکھیں۔ "وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ" صبر بھی اللہ ہی کی توفیق سے حاصل ہوتا ہے آپ تکالیف برداشت کر کے بھی اپنے مشن کو جاری رکھیں۔ صبر ملت ابراہیمی کا بہت بڑا اصول ہے۔ اللہ کا ذکر، شکر، صبر، شعائر اللہ کی تعظیم اور نماز وغیرہ بڑے بڑے اصول ہیں جو ہماری امت کے لیے بھی واجب التعمیل ہیں۔ لہٰذا تکلیف کے وقت برداشت کرو اور ناشکری کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالو۔

فرمایا پس آپ صبر کریں اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ بیشک نیک انجام متقیوں کے لیے ہی ہے۔ جو لوگ ایماندار ہیں اللہ کی وحدانیت کے قائل ہیں، کفر اور شرک سے بیزار ہیں، وہی لوگ متقی ہیں اور وہی اچھے انجام کے حقدار ہیں۔ بہر حال نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی دی ہے۔ آگے دوسرے انبیاء کا حال بیان ہوگا۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا
لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿۵۰﴾
يَٰقَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى
الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۵۱﴾ وَيَٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوا
رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم
مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا
مُجْرِمِينَ ﴿۵۲﴾

ترجمہ :- اور قوم عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود (علیہ السلام) کو رسول بنا کر بھیجا (انھوں نے اپنی قوم کے سامنے اس طرح تقریر کی کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو، نہیں ہے تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود۔ نہیں ہو تم مگر افترا باندھنے والے ﴿۵۰﴾ اے میری قوم کے لوگو! میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی بدلہ۔ نہیں ہے میرا بدلہ مگر اُس ذات پر جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا تم نہیں سمجھتے ﴿۵۱﴾ اور اے میری قوم کے لوگو! بخشش طلب کرو اپنے پروردگار سے پھر توبہ کرو اس کے سامنے۔ وہ چھوڑ دے گا آسمان کو تمہارے اُوپر بارش برسانے والا، اور زیادہ کریگا تمہارے لیے طاقت کو تمہاری طاقت کے ساتھ۔ اور نہ روگردانی کرو مجرم (گنہگار) بن کر ﴿۵۲﴾

ربطِ آیات: اپنی توحید کو بیان کرنے ، اپنے پیغمبر آخر الزمان کو تسلی دینے اور صبر کا قانون سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ ہود میں بعض سابقہ انبیاء کا ذکر فرمایا ہے ۔ یہ سورۃ حضرت ہود علیہ السلام کے نام پر ہی موسوم ہے ۔ آج کے درس میں آپ ہی کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے ۔ آپ کی دعوت کے جواب میں آپ کی قوم کی نافرمانی اور کفر اور شرک کا تذکرہ ہے اور پھر ان کا حشر بھی بیان کیا گیا ہے ۔ اللہ نے اس قوم کو عبرتناک سزا دی ۔ پہلے نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم کا ذکر تھا ، اب ہود علیہ السلام اور ان کی تقریر و نصیحت کا کچھ حصہ ان آیات میں بیان کیا جا رہا ہے ۔ پھر آگے قوم کا جواب آئے گا اور آخر میں ان پر نازل ہونے والے عذاب کا تذکرہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو نزولِ قرآن اور بعد کے زمانے والے لوگوں کے لیے باعثِ عبرت بنا دیا ہے ۔

ہود علیہ السلام اور آپکی قوم: ارشاد ہوتا ہے وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا اور قوم عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا ۔ اس آیت کا عطف حضرت نوح کے واقعہ کی ابتدائی آیت " وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ " کے ساتھ ہے ۔ جس طرح ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا اسی طرح ہود علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا ۔ قوم عاد پرانی قوموں میں سے مشہور قوم ہے جس کا ذکر قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں ملتا ہے ۔ یہ قوم سام ابن نوح کی اولاد میں سے ہے اور ہود علیہ السلام بھی اسی قوم کے فرد تھے ۔ قوم عاد کے لوگ جسمانی طور پر بڑے مضبوط تھے وہ غرور کرتے تھے مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حٰمٓ سجدہ) ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے اس کے علاوہ یہ لوگ بہت زیادہ متکبر تھے جس کا ذکر سورۃ شعراء میں موجود ہے ۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم

اور اس کے بعد والی قوموں میں پائی جانے والی کفر و شرک کی بیماری قوم عاد میں بھی پائی جاتی تھی۔ بہرحال ہود علیہ السلام کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا آپ کا شجرہ نسب ہود ابن عبداللہ ابن رباح اور پھر آخر میں سام ابن نوح سے جا ملتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی تباہی کے بعد دنیا میں جس قوم کو عروج حاصل ہوا، وہ قوم عاد تھی۔ یہ قوم جنوبی عرب میں یمن اور اس کے اطراف۔ حضرموت، مکلا، عمان اور خلیج فارس کے بہت بڑے حصے پر آباد تھی اور دوسری طرف مصر تک ان کو اقتدار حاصل تھا تاہم ان کا پایہ تخت یمن تھا۔

عربی زبان میں عادی پرانی چیز کو کہتے ہیں جیسے عادی الارض (بنجر زمین) یا شئی عادیٌ (پرانی چیز)۔ چونکہ یہ پرانے لوگ ہیں اس لیے ان کا نام عاد پڑ گیا۔ باقی رہی یہ بات کہ ان کا زمانہ عروج کون سا ہے۔ تو اس کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کے دو سو سال بعد اس قوم کو عروج حاصل ہو گیا تھا مگر یہ بات زیادہ قرین قیاس نہیں بعض ان کا زمانہ عروج نوح علیہ السلام کے نو سو سال بعد بتاتے ہیں۔ البتہ امام جلال الدین سیوطی مفسر قرآن کی رائے مختلف ہے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد پانچ سو تک پہنچتی ہے جن میں تفسیر حدیث، تاریخ اور دیگر فنون شامل ہیں۔ آپ اپنی مشہور زمانہ دو جلدوں پر مشتمل تاریخ کی کتاب "حسن المحاضرۃ فی احوال المصر والقاھرۃ" میں لکھتے ہیں کہ ہود علیہ السلام کی بعثت مصرابن بیصر بادشاہ کے زمانے میں ہوئی اور یہ بادشاہ طوفانِ نوح کے ۷۰۰ سال بعد برسرِ اقتدار رہا۔

مصر ابن بیصر کا زمانہ حکومت ۴۸۰ برس ہے جب کہ ہود علیہ السلام صابی مذہب

کی عمر مبارک ۹۶۴ سال تھی۔ کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام سے پہلے ایک صابی دور گزرا ہے۔ جس کے چار مشہور اصول توحید، طہارت، نماز اور روزہ تھے۔ ابتدا میں یہ مذہب بھی ٹھیک تھا مگر بعد میں لوگوں نے اس میں بگاڑ پیدا کر دیا۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اصل مذہب تو سارے ہی درست تھے حتیٰ کہ زرتشت مذہب بھی ٹھیک تھا مگر بعد میں مجوسیوں نے اس کو بگاڑ کر ستارہ پرستی کی طرف موڑ دیا۔ یہود و نصاریٰ کا بھی یہی حال ہے۔ اصل مذہب اپنے زمانہ میں حق پر تھے مگر بعد میں آنے والوں نے ان کو بالکل مسخ کر دیا۔ بہرحال صابی مذہب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک چلتا رہا۔ پھر آپ کے زمانہ میں توحید کا تصور بالکل ختم ہو گیا۔ حضور علیہ السلام کی بعثت کے وقت بھی توحید خالص ختم ہو چکی تھی۔ گذشتہ پانچ سو سال میں دین کا حلیہ بگڑ چکا تھا اور توحید کا تصور ایک فیصد بھی باقی نہیں رہا تھا آپ کے زمانہ بعثت میں توحید کا تصور رکھنے والے چند آدمیوں کا ذکر ملتا ہے، ورنہ سارے کے سارے شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔

اہرامِ مصر

امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ مصر کے سرگرشتہ مینار بہت پرانے زمانے کے بنے ہوئے ہیں جن میں قوم عاد کا زمانہ بھی شامل ہے فرماتے ہیں کہ ان میں سے دو مینار تو نوح علیہ السلام سے بھی پہلے کے ہیں اور ان کے نیچے حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام کی قبریں ہیں، اور باقی میناروں کے نیچے فراعین کی قبور ہیں۔ یہ سرگرشتہ مینار بڑے بڑے پتھر جوڑ کر نہایت پُرپیچ طریقے سے بنائے گئے ہیں، ساڑھے چھ ہزار سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی یہ مینار قائم ہیں۔ آج کا انسان انہیں دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ اتنے وزنی پتھر ایک دوسرے کے اوپر کن ذرائع کے ساتھ رکھے گئے جب کہ اُس وقت کوئی مشینری

یا کرین وغیرہ بھی نہیں تھی۔ پھر ان پتھروں کو جوڑنے کے لیے عجیب و غریب مسالہ استعمال کیا گیا جس کی وجہ سے ابھی تک شکستگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے ان میں سب سے بڑا مینار چار سو فٹ سے بھی زیادہ بلند ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اِن کو اتنی طاقت عطا فرمائی تھی کہ اتنے بڑے بڑے کام انجام دیتے تھے۔

قوم عاد کا مسکن

قوم عاد کا مسکن عرب کے ربع خالی میں وادی دہنا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے میں ہزاروں میل کا خطہ بے آباد ریگستان ہے جب وہاں پر ہوائیں چلتی ہیں تو ریت کے طوفان اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہاں پر ریت کے بڑے بڑے ٹیلے ہیں۔ پہاڑوں جتنے بڑے ٹیلے دیکھتے ہی دیکھتے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اُن کی زد میں آنے والے قافلے مع اونٹ اور سازوسامان سرخ و سفید ریت کے پہاڑوں میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ قوم عاد یہیں آباد تھی۔ تفسیر حقانی والے لکھتے ہیں کہ قوم عاد کے لوگ عمارات کی تعمیر میں بڑا کمال رکھتے تھے اِن کا بنایا ہوا ایک ایک مکان سات سات منزلہ ہوتا اور ہر منزل کے درمیان چالیس گز کی مسافت ہوتی۔ اس قسم کی بعض عمارات حضرت عثمان ؓ کے دورِ خلافت تک موجود تھیں۔ بہرحال یہی وہ قوم عاد تھی جس کی طرف اللہ نے اُن کے بھائی ہود علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔

اخوت کی مختلف صورتیں

اخوت کی مختلف صورتیں ہیں۔ حقیقی بھائی تو وہ ہوتے ہیں جو نسل اور خاندان کے اعتبار سے بھائی ہوتے ہیں، تاہم کسی ایک دین کے پیروکار دینی بھائی بھی ہوتے ہیں جیسے خود مومنوں کے متعلق قرآن پاک میں ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات) سارے مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس لیے اگر ایک مومن خود کو دوسرے سے برتر سمجھتا ہے تو وہ شیطان کا مرید ہے کیونکہ دین میں کوئی اونچ

پہنچ نہیں ملکہ سارے مسلمان برابر ہیں۔ پھر زبان کے لحاظ سے بھی اخوت ہوتی ہے۔ ہم زبان بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں تو قومیت کی بنیاد وطن پر ہے۔ اس لیے کسی ایک ملک کے باشندے رشتہ اخوت میں منسلک ہوتے ہیں۔ ذرائع نقل وحمل کی فراوانی کی وجہ سے آجکل دنیا بھر کا سفر نہایت آسان ہے۔ جب کسی ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک میں جاتا ہے تو وہ اپنی ملکی قومیت کے اعتبار سے پہچانا جاتا ہے جیسے فلاں پاکستانی ہے اور فلاں ہندی، ملائی، امریکن یا جرمن ہے۔ پاسپورٹ پر بھی شہریت کا اندراج ملکی اعتبار سے ہی ہوتا ہے اگرچہ ایک ملک میں کئی صوبے ہوتے ہیں اور کئی زبانیں بولی جاتی ہیں مگر قومیت ایک ہی ہوتی ہے۔

یہاں پر ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی نسلی اعتبار سے کہا گیا ہے۔ آپ انہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اگرچہ آپ اللہ کے رسول تھے اور ساری قوم کافر تھی۔ اس دینی تفاوت کے باوجود وہ نسلی اعتبار سے بھائی تھے۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مذاہب رکھنے کے باوجود لوگ ایک ہی خاندان اور برادری سے متعلق ہوتے ہیں مثلاً ہمارے راجپوت مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ ان کا جد امجد ایک ہی تھا۔ پھر خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی تبلیغ سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے اور دوسرے ہندو ہی رہے، چنانچہ آج بھی ہندوستان میں ہندو راجپوتوں کی بڑی آبادی موجود ہے۔

بہر حال ہود علیہ السلام کی قوم کے ساتھ اخوت نسلی اعتبار سے بھی تھی اور لسانی لحاظ سے بھی، کیونکہ وہ سب عربی زبان بولتے تھے اور قدیم عرب کہلاتے ہیں۔ یہ عرب بائدہ کہلاتے ہیں جو اللہ کے عذاب کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے۔ دوسرے نمبر پر قحطانی نسل آتی ہے اور

اُن کی زبان بھی عربی ہے۔ عربی زبان بولنے والا تیسرا خاندان بنی جرہم ہے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ یاد رہے کہ اسماعیل علیہ السلام عربی زبان بولتے تھے جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان عبرانی اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبان سریانی تھی۔

ہود علیہ السلام کی دعوت توحید

فرمایا ہم نے ہود علیہ السلام کو اُن کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا انہوں نے اپنی قوم کو جو وعظ و نصیحت اور تقریر کی اس کے الفاظ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں محفوظ کر دیے ہیں۔ انہوں نے کہا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ اے میری قوم کے لوگو اللہ کی عبادت کرو مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں۔ کوئی مشکل کشا، حاجت روا اور مافوق الاسباب متصرف نہیں۔ قادرِ مطلق، علیم کل ہمہ دان، ہمہ بین اور ہمہ توان وہی ہے، لفظ الٰہ میں یہ ساری چیزیں آجاتی ہیں۔ جیسا کہ سورۃ اعراف کی آیات سے معلوم ہو گیا ہے۔ ان لوگوں نے مختلف معبود بنا رکھے تھے، کوئی بیماری سے شفا کے لیے کوئی مقدمہ سے بری کرانے کے لیے، کوئی رزق فراہم کرنے والا اور کوئی اولاد دینے والا۔ اسی بنا پر وہ ان کی دہائی دیتے تھے، ان کے سامنے رکوع و سجود کرتے تھے اور ان سے حاجتیں طلب کرتے تھے، مگر حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا۔

اِس زمانے میں بھی لوگ اپنی حاجات کے لیے مختلف معبودوں کی حاضری دیتے ہیں۔ بیماری سے شفا کے لیے فلاں قبر پر جاؤ اور اولاد کے لیے فلاں مزار پر منت مانو۔ اگر ملازمت کی ضرورت ہو تو فلاں کی چلتی ہے اور مال و دولت چاہیئے تو فلاں قبر کا چلّہ کاٹو۔ توحید کا مسئلہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ ہذا کی ابتدائی آیت میں ہی بیان کر دیا تھا اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی تبلیغ کا لب لباب بھی یہی تھا اور ہود علیہ السلام نے بھی قوم کو یہی سبق دیا۔ لوگو! اللہ کی عبادت کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ تم تو افترا باندھنے والے ہو۔ اللہ کے علاوہ اپنی حاجات میں دوسروں کو پکارنا ہی شرک اور افترا علی اللہ ہے۔ پیچھے گزر چکا ہے "فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" اللہ تعالیٰ کی ذات ان چیزوں سے پاک ہے جن کو یہ خدا کا شریک بناتے ہیں اور پھر مختلف طریقوں سے ان کی عبادت بھی کرتے ہیں۔

شرک کی بنیاد

امام محمد ابن عمر رازیؒ ایران کے علاقے رَے کے رہنے والے تھے آپ محمد غوری کے زمانے میں ہوئے ہیں اور آپ کی وفات ۶۰۶ھ میں ہوئی۔ آپ عظیم عالم باپ کے بیٹے تھے، اولاد بھی عالم فاضل تھی۔ آپ نے تفسیر کبیر لکھنے کی وجہ سے شہرت پائی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ہندوستان کا سفر بھی کیا۔ وہاں میں نے کسی کو خدا تعالیٰ کی ذات میں شریک بناتے نہیں سنا۔ سب یہی کہتے تھے کہ واجب الوجود صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے وجود میں کوئی شریک نہیں مگر عبادت میں آکر اللہ کے شریک ٹھہرا لیتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی فرماتے ہیں، کہ توحید کے درجات تو سارے مشرک بھی تسلیم کرتے ہیں، یعنی واجب الوجود صرف اللہ ہے، اور خالق بھی وہی ہے مگر جب عبادت کی باری آتی ہے تو اس میں غیروں کو بھی شریک کرنے لگتے ہیں اس کے علاوہ صفات میں بھی پھسلتے ہیں۔ اللہ کی صفات بندوں میں ثابت کی جائیں یا بندوں کی صفات اللہ میں مانی جائیں تو یہ شرک فی الصفات ہو گیا۔ اسی طرح خدا کے لیے اولاد کی صفت ثابت کرنا عقیدہ تشبیہ ہے جو کہ کفر ہے۔ اللہ کی صفات بندوں میں اس طرح ثابت کی جاتی ہیں کہ

فلاں بھی سب کچھ جانتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے، وہ ہمارے دل کی باتوں کو بھی جانتا ہے۔ اسی طرح اللہ ہر چیز پر گواہ اور حاضر ہے۔ مگر یہ صفت غیروں میں بھی ثابت کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ نبی اور ولی بھی حاضر ناظر ہیں اور یہی شرک ہے۔ عبادت میں شرک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی غیر کی انتہائی تعظیم اس نیت کے ساتھ کی جائے کہ اس ہستی کو مافوق الاسباب تصرف حاصل ہے۔ اس کو نافع اور ضار سمجھا جاتا ہے اس کے سامنے رکوع و سجود کیا جاتا ہے، اس کے نام کی نیاز دی جاتی ہے، اس کے نام کا ورد کیا جاتا ہے اور اس کے سامنے مناجات پیش کی جاتی ہے یہ سب عبادت ہے کوئی قولی ہے، کوئی فعلی اور کوئی مالی۔

ہود علیہ السلام نے قوم سے یہ فرمایا یٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اے میری قوم کے لوگو! میں اپنی اس تبلیغ کا تم سے کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا۔ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ میرا اجر تو اس ذات کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ میرے کام کی مزدوری وہی دے گا اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ کیا تم اتنی عقل بھی نہیں رکھتے

استغفار کی برکات

حضرت ہود علیہ السلام نے یہ بھی کہا وَيٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ اے میری قوم کے لوگو! اللہ سے معافی طلب کرو۔ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ پھر اس کے سامنے توبہ کرو۔ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ استغفار صابن کی طرح روح کی میل کچیل کو صاف کرتا ہے اور تسبیح و تہلیل بمنزلہ خوشبو ہے۔ چونکہ لوگوں سے اکثر گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں، اس لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ بہتر لوگ وہی ہیں جو معافی مانگتے رہتے ہیں اور توبہ کرتے رہتے ہیں۔ خود حضور علیہ السلام ایک ایک مجلس میں سو سو مرتبہ اپنی زبان سے استغفار کے کلمات ادا فرماتے تھے کہ اے اللہ

جو غلطی ہو گئی ہے اُسے معاف فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور اس
کے سامنے توبہ کرنا مومن کی سات منزلوں میں سے پہلی منزل ہے سورۃ توبہ
میں یہ سات منزلیں گنی گئی ہیں اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ
الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ
الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ مفسرین فرماتے ہیں کہ جب
اس قوم نے نافرمانی کی تو تین سال تک بارش بند رہی اور اس عرصہ میں
عورتیں بھی بانجھ ہو گئیں، کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا، تو ہود علیہ السلام نے
فرمایا کہ لوگو! استغفار اور توبہ کرو، جس کے نتیجے میں يُرْسِلِ السَّمَآءَ
عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا اللہ تعالیٰ آسمان کو تم پر بارش برسانے کے لیے
چھوڑ دیگا۔ قحط سالی دور ہو جائیگی وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ
اللہ تعالیٰ تمہیں جسمانی قوت کے ساتھ قوت عطا کریگا۔ تمہاری طاقت
میں اضافہ ہو جائے گا اور اولاد بھی ہونے لگے گی وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ
تم مجرم بن کر پشت نہ پھیرو۔ ہود علیہ السلام کی تقریر کا یہ پہلا حصہ ہے
جو آپ نے قوم کے سامنے پیش کیا۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ
اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۳
اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ قَالَ اِنِّيْٓ
اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۵۴
مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝۵۵
اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ
اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۶
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ
وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا
اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝۵۷

ترجمہ :- انہوں نے کہا ۔ اے ہود علیہ السلام ! نہیں لایا تو ہمارے پاس کوئی کھلی دلیل (نشانی) اور نہیں ہم چھوڑنے والے اپنے معبودوں کو تیری بات کی وجہ سے اور نہیں ہم تیری بات کی تصدیق کرنے والے ۝۵۳ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے بعض معبودوں نے تمہیں برائی پہنچائی ہے ۔ کہا ہود علیہ السلام نے بیشک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ بن جاؤ ۔ بیشک میں بیزار ہوں اُن چیزوں سے جن کو تم شریک بناتے ہو ۝۵۴ اس کے سوا ، پس کرو تم سب

کے سب تدبیر میرے خلاف اور پھر مہلت بھی نہ دو (۵۵)
بیشک میں بھروسہ رکھتا ہوں اللہ کی ذات پر جو میرا بھی رب
ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ نہیں ہے کوئی چلنے پھرنے
والا جانور مگر یہ کہ اللہ اس کی پیشانی کو پکڑنے والا ہے۔ بیشک
میرا پروردگار سیدھی روش پر ہے (۵۶) اور اگر تم روگردانی کرو
گے، پس تحقیق میں نے پہنچا دیا ہے تمہیں وہ پیغام جو مجھے
دے کر بھیجا گیا تھا تمہاری طرف۔ پھر جانشین بنائیگا میرا پروردگار
کسی قوم کو تمہارے سوا، اور تم اُس کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا
سکو گے۔ بیشک میرا پروردگار ہر ایک چیز پر نگہبان ہے (۵۷)

ربط آیات

کل کے درس میں حضرت ہود علیہ السلام کی تقریر اور قوم کی نصیحت کا پہلا حصہ بیان ہوا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو اللہ کی عبادت کا حکم دیا کیونکہ اُس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ حاجت روا، مشکل کشا، نافع اور ضار، علیم کل، محیط کل اور متصرف اس کے سوا کوئی نہیں۔ آپ نے قوم سے فرمایا کہ تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا کر اُس پر افترا باندھ رہے ہو۔ پھر ہود علیہ السلام نے اپنی بے لوث خدمت کا ذکر بھی کیا کہ میں اس مخلصانہ نصیحت کا تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا کیونکہ میرا بدلہ تو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کے سامنے استغفار اور توبہ کرو، وہ تم پر مہربانی فرمائے گا، تمہیں قوت بھی زیادہ دے گا اور بارش برسا کر قحط کو بھی دور کر دیگا، تم روگردانی کر کے مجرم نہ بنو۔ غرضیکہ ہود علیہ السلام نے نہایت عمدہ طریقے سے قوم کو سمجھایا مگر انہوں نے ایک نہ مانی اور آپ کو الٹا جواب دیا۔

معجزے کا مطالبہ

قَالُوْا کہنے لگے يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ اے ہود علیہ السلام آپ تو ہمارے پاس کوئی نشانی لے کر نہیں آئے۔ بینہ نشانی اور واضح چیز کو کہتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد معجزہ ہے۔ یعنی آپ ہمارے پاس کوئی معجزہ لے کر نہیں آئے، حالانکہ

اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کے ہاتھ پر کوئی نہ کوئی معجزہ ظاہر فرمایا ہے مگر مشرک
لوگ اپنی مرضی کا معجزہ حاصل کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ قرآن میں مختلف
مقامات پر آتا ہے " لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ " اس پر ہماری مرضی کی کوئی
نشانی کیوں نہیں نازل ہوئی۔ اللہ کے نبیوں نے اس کے جواب میں
ہمیشہ یہی کہا ہے کہ معجزہ ظاہر کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ تو
اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ
اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی نشانی دی ہے جسے دیکھ کر لوگ ایمان
لائے۔ فرمایا، اللہ نے مجھے جو خصوصی معجزہ عطا فرمایا ہے وہ قرآن ہے
جو وحی الٰہی کے ذریعے نازل ہوا۔ یہ لوگ معجزات کا مطالبہ محض ضد اور عناد
کی وجہ سے طلب کرتے ہیں، ورنہ نبی کا وجود، اس کی تقریر، اس کا چہرہ
آواز اور عمل سب معجزات ہیں۔ پیچھے اسی سورۃ میں اور سورۃ انعام اور
بعض دوسری سورتوں میں بھی ہے کہ تم نشانیاں طلب کرتے ہو۔ تمہارے
اپنے وجود میں اور تمہارے اردگرد قدرت کی ہزاروں نشانیاں بکھری
پڑی ہیں۔ ذرا ان درختوں اور پودوں کو ہی دیکھو، اللہ کی قدرت کے
کمال نمونے نظر آئیں گے۔ کیا یہ خدا کی قدرت کی نشانیاں نہیں ہیں جو
مزید نشانیاں طلب کرتے ہو۔ نبی کی ہر چیز بینہ ہوتی ہے مگر جس نے
نہیں ماننا وہ اپنی مرضی کی نشانی طلب کرتا ہے۔ مشرکین مکہ نے شق القمر
کا معجزہ خود طلب کیا تھا مگر جب چاند دو ٹکڑے ہو گیا، ایک ٹکڑا پہاڑ کی
ایک طرف نظر آرہا تھا اور دوسرا دوسری طرف، تو وہ پھر بھی کہنے لگے،
" سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ " یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ بہرحال ہود علیہ السلام
کی قوم نے بھی آپ سے معجزہ طلب کیا۔

معبودان بظاہر اصرار

اور دوسری بات یہ کی وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ
قَوْلِكَ ہم تیری بات کی وجہ سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے

نہیں۔ تو کتنی بھی وعظ و نصیحت کرے، اِس کا ہم پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔ اور ہم اپنے معبودان کی پرستش کرتے رہیں گے۔ ہم ان کے نام کی منتیں مانیں گے۔ ان پر چڑھاوے چڑھائیں گے، اُن سے مرادیں مانگیں گے اور اِن کی تعظیم کرتے رہیں گے۔ مکے کے مشرک بھی یہی کہتے تھے "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ" (ص ۲) کیا ہم تمام معبودوں کی بجائے صرف ایک معبود بنالیں۔ یہ تو عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ کیا ہم لات، منات، عزیٰ، ہبل، ود، سواع، نائلہ اور اصنات سب کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کی عبادت کریں ہم اپنے آباؤ اجداد کے تمام معبودوں کو کیسے چھوڑیں۔ قرآن پاک نے مشرکین کی دو باتوں پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ ایک وقوعِ قیامت پر اور دوسرا توحید کے مسئلہ پر، ان میں شرک اس بار رچ بس گیا تھا کہ وہ اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہر قوم، خاندان اور قبیلے کا الگ الگ معبود تھا۔ ہر گھر میں علیحدہ علیحدہ معبود تھے۔ ہر معبود کی علیحدہ شکل و صورت اور اس کے ذمے مخصوص کام تھا جو وہ انجام دیتا تھا۔ بہر حال انہوں نے کہا کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی آتا ہے کہ اُن کی قوم کے لوگوں نے کہا اِصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اپنے معبودوں پہ جمے رہو، ان کو ترک نہ کرنا۔ اس کی بجائے ابراہیم علیہ السلام کو ہلاک کر دو۔ تاکہ ہمارے معبودوں کی مذمت بیان نہ ہو۔

ہود علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ تیرا بیان کتنا بھی شیریں اور پرکشش کیوں نہ ہو مگر ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑیں گے وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ اور نہ ہی ہم تیری تصدیق کرنے والے ہیں۔ ہم تمہیں اللہ کا رسول تسلیم نہیں کرتے یہ معبودان ہمیں خدا کا قرب دلاتے ہیں۔ ہماری مرادیں پوری کراتے ہیں، خدا کے پاس ہماری سفارش کرتے ہیں

بھلا ان کو ہم کیوں چھوڑ دیں۔ کہنے لگے اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ہم تو کہیں گے کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں برائی پہنچائی کسی معبود نے تمہیں مخبوط الحواس بنا دیا ہے۔ تم ان کی برائی بیان کرتے تھے ان کی توہین کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی معبود کی تم پر مار پڑ گئی ہے۔ تم بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ ہر زمانے میں مشرکین عام طور پر اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں اور توحید کے انکار کے لیے اسی قسم کی تاویلات کرتے ہیں۔

شرک سے بیزاری

قوم کی ان باتوں کے جواب میں ہود علیہ السلام نے فرمایا قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ فرمایا اے لوگو! میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اور تم بھی گواہ ہو جاؤ کہ بے شک میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کا شریک بناتے ہو مِنْ دُوْنِهٖ خدا کے ورے یا خدا کے سوا تم جن کو بھی شریک ٹھہراتے ہو میں ان سب سے بیزار ہوں یعنی میں ان سے نفرت کرتا ہوں۔ یہ بے حقیقت چیزیں ہیں۔ نرا جھوٹ اور افترا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہی بات فرمائی تھی اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (الزخرف) میں تو ان سب سے بیزار ہوں جن کی تم پوجا کرتے ہو۔ یہ سب میرے دشمن ہیں اور میرا دوست صرف رب العٰلمین ہے۔ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ معبودان باطلہ بہت سے لوگوں کی گمراہی کا باعث بنے ہیں اور ایسا کام کوئی دشمن ہی کر سکتا ہے، میں ان معبودوں کے بارے میں کسی قسم کی نرمی اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گویا تمام باطل ادیان، کفر اور شرک سے بیزاری کا اعلان بھی ضروری ہے۔ تَبَرَّاْتُ مِنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ وَالنِّفَاقِ اے اللہ! میں کفر، شرک، نفاق اور ہر باطل دین یہودیت، نصرانیت وغیرہ سے

بیزار ہوں۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی توحید، رسالت، ملائکہ، انبیاء، کتب، بحالاً معاد اور تقدیر خیر و شر پر تو ایمان رکھتا ہے مگر کفر و شرک سے اظہار بیزاری نہیں کرتا تو اس کا ایمان قابل قبول نہیں ہے۔ اگر ایک یہودی خدا تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک مانتا ہے حضور علیہ السلام کو سچا رسول مانتا ہے مگر یہودیت سے بیزاری کا اظہار نہیں کرتا تو اس کا ایمان قابل قبول نہیں ہوگا۔ گاندھی بھی کہتا تھا کہ اسلام سچا مذہب ہے مگر ہندومت کو بھی برحق خیال کرتا تھا، اس سے برأت کا اعلان نہیں کرتا تھا لہٰذا وہ کافر ہی رہا۔ مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر کفر، شرک اور باطل دین سے برأت کا اظہار کرے۔

توحید پر ثابت قدمی

الغرض! ہود علیہ السلام نے بھی یہی بات کی کہ اے لوگو! اس بات میں خدا تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ بن جاؤ کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے ساتھ شریک بناتے ہو۔ فرمایا اس معاملے میں فَكِيدُونِي جَمِيعًا تم سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرو ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ پھر مجھے مہلت بھی نہ دو۔ دیکھئے اللہ کا نبی توحید اور توکل کے کس اعلیٰ مقام پر کھڑا ہے کہتا ہے اِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ بیشک میں تو اللہ ہی پر بھروسہ کرتا ہوں رَبِّي وَرَبِّكُم جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ یہ درجہ کمال ایک نبی کو ہی حاصل ہو سکتا ہے، ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اللہ کے سارے نبیوں نے یہی کہا وَمَا لَنَا اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا (ابراہیم) ہم خدا کی ذات پر کیوں توکل نہ کریں کہ اس نے ہمیں صراط مستقیم پر فائز فرمایا ہے۔ ہمیں ہدایت کا راستہ اسی نے بتلایا ہے اور اسی نے اس کو آگے پھیلانے کا حکم دیا ہے۔ تمام اہل ایمان کے متعلق بھی یہی آیا ہے وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُوْنَ" (ابراہیم) کہ وہ بھی اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ کرتے ہیں اہل ایمان اسباب کو اختیار تو کرتے ہیں مگر بھروسہ خدا کی ذات پر ہوتا ہے۔ جب وہ چاہتا ہے، کسی چیز میں اثر پیدا کر دیتا ہے نہیں چاہتا تو سارے اسباب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اختیار سارا اللہ کے پاس ہے۔ اگر وہ نقصان پہنچانا چاہے گا تو پہنچے گا، ورنہ کوئی کسی کا بال بیکا نہیں کر سکتا کیونکہ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا جاندار نہیں مگر اللہ تعالیٰ اس کی پیشانی کو پکڑنے والا ہے وہ جب چاہے پکڑ کر گھسیٹ لے۔ ہود نے فرمایا تم مجھے کن چیزوں سے ڈراتے ہو، ہر چیز پر اختیار تو میرے رب کا ہے۔ ڈرنا تو تمہیں چاہئے جو کفر و شرک کی غلاظت میں پھنسے ہوئے ہو اور بالآخر پکڑے جاؤ گے۔

عدل و انصاف کا راستہ

فرمایا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ بیشک میرا پروردگار صراط مستقیم پر ہے۔ یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ صراط مستقیم پر چلنے کا حکم تو خود اللہ نے اپنے بندوں کو دیا ہے اور ہم خود اپنی دعا میں کہتے ہیں "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ عطا فرما اور اللہ بھی کہتا ہے "ھٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ" (الحجر) قرآن کا راستہ ہی صراط مستقیم ہے جو مجھ تک پہنچنے والا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے صراط مستقیم پر ہونے کا کیا مطلب ہے؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا پروردگار عدل کے سیدھے راستے پر ہے۔ وہ عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔ وہ مجرموں کو سزا دے گا اور مومنوں کو بہترین اجر سے نوازے گا، کہ عدل کا یہی تقاضا ہے

فرمایا اس کے باوجود فَاِنْ تَوَلَّوْا اگر تم روگردانی کرو گے، اس

کی وحدانیت کو تسلیم نہیں کرو گے، کفر اور شرک پر اڑے رہو گے، تو یاد رکھو! فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ جو چیز مجھے دیکر تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ وہ میں نے تم تک پہنچادی ہے۔ میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے کہ لوگو! عبادت صرف خداتعالیٰ کی کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس سے معافی مانگو اور اس کے سامنے توبہ کرو۔ یہ پیغام تمام انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو پورے طریقے سے پہنچا دیا ہے اور میں بھی تم تک پہنچا رہا ہوں۔ فرمایا اگر تم نافرمانی سے باز نہیں آؤ گے وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ تو میرا رب تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو تمہارا قائم مقام بنا دیگا، تمہاری بُری روش کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا اور تم خداتعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے یاد رکھو! اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ میرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے۔ تمہاری نافرمانی، کفر اور شرک اس سے مخفی نہیں ہے، ہماری نیکیاں اور کوششیں بھی خدا سے پوشیدہ نہیں، وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور ہر چیز کی حفاظت کر رہا ہے۔ یاد رکھو! جزائے عمل پیش آنے والی ہے جب تمہیں اس بُری روش کا بدترین بدلہ دیا جائے گا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا هُوۡدًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ
مِّنَّا‌ ۚ وَنَجَّيۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ۝۵۸ وَتِلۡكَ عَادٌ ۟
جَحَدُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَعَصَوۡا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ كُلِّ
جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ ۝۵۹ وَاُتۡبِعُوۡا فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا لَعۡنَةً وَّيَوۡمَ
الۡقِيٰمَةِ‌ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوۡا رَبَّهُمۡ‌ ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّعَادٍ
قَوۡمِ هُوۡدٍ ۝۶۰ ع

ترجمہ:۔ اور جس وقت آیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات دی ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی خاص رحمت کے ساتھ۔ اور ہم نے بچایا ان لوگوں کو گاڑھے عذاب سے (۵۸) اور یہ عاد ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور جنہوں نے نافرمانی کی اس کے رسولوں کی، اور پیروی کی انہوں نے ہر جبار سرکش کے حکم کی (۵۹) اور ان کے پیچھے لگائی اس دنیا کے اندر بھی لعنت اور قیامت والے دن بھی۔ سنو، بیشک عاد نے کفر کیا اپنے پروردگار کے ساتھ آگاہ رہو، ہلاکت ہے عاد کے لیے جو ہود علیہ السلام کی قوم تھی (۶۰)

ربط آیات
اس سے پہلے حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کے سامنے تقریر، ان کی نصیحت وعظ، تبلیغ اور اس ضمن میں کی جانے والی محنت اور کوشش کا ذکر ہو چکا ہے۔ اللہ نے آپ کی قوم کی نافرمانی اور سرکشی کا ذکر بھی فرمایا۔ قوم ہود کا ذکر قرآن پاک کی مختلف سورتوں

میں آیا ہے۔ سورۃ احقاف میں آپ کا بیان ہے اور سورۃ اعراف میں زیادہ تفصیل ہے۔ وہاں پر کفر و شرک کی مختلف باتوں کا تذکرہ ہے اُن لوگوں نے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے مختلف معبود بنا رکھے تھے۔ ہود علیہ السلام کی تبلیغ کے جواب میں قوم نے آپ کو بیوقوف کہا، جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ وہ کہتے تھے، اے ہود! تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے اور تم پر ہمارے معبودوں کی مار پڑ گئی ہے تم ہمیں خواہ مخواہ ڈرا رہے ہو کہ اگر ان معبودوں کی عبادت نہ چھوڑی تو ہلاک ہو جائیں گے ہم تمہاری باتوں سے خوف نہیں کھاتے "فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا" تم ہمیں جس عذاب سے ڈرا رہے ہو۔ اُسے لے آؤ۔ ہم تمہاری کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔

حضرت ہود علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی، جیسا بالعموم اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے۔ آپ نے کل ۴۶۴ سال عمر پائی اور اس سارے عرصہ میں خدا تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے اور تکلیفیں اٹھاتے رہے۔ آپ فرماتے تھے کہ تم نے جو کچھ میرے ساتھ کرنا ہے، کر گزرو، مجھے کسی چیز کا خوف نہیں، بلکہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتا ہوں جو میرا رب اور تمہارا سب کا پروردگار ہے ہر جاندار کی پیشانی اُس کے ہاتھ میں ہے، وہ جب چاہے کسی قوم کو ہلاک کر کے کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قوم عاد کی مسلسل نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر تنگی ڈال دی قحط پڑ گیا اور اُن کی عورتیں بھی بانجھ ہو گئیں۔

قوم عاد کے دو خاندان

ترمذی شریف کی روایت کے مطابق امام بیضاویؒ اور بعض دیگر مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ ہود علیہ السلام پر ایمان لانے والے لوگوں کی تعداد صرف چار ہزار تھی جب کہ باقی ساری قوم منکر ہی تھی اس دور

میں مکے کے اطراف میں بھی قومِ عاد ہی آباد تھی، البتہ وادی دہنا اور مکے کے قرب و جوار میں بسنے والے سامی نسل سے ہی دو مختلف خاندان تھے. جو مکے والے خاندان کا سردار معاویہ ابنِ بکر تھا جب کہ یمن والے خاندان کا ایک ابن اعوز تھا۔ دونوں خاندانوں کی آپس میں رشتہ داریاں اور میل ملاقات بھی مفسرین فرماتے ہیں کہ اُس دور میں خانہ کعبہ کی عمارت تو سیلاب کی نظر ہو چکی تھی، البتہ اس مقام پر ایک سرخ ٹیلہ تھا، جسے متبرک سمجھا جاتا تھا اور لوگ وہاں جا کر دُعائیں کرتے تھے۔

قومِ عاد کا وفد

یمن کے علاقے میں جب عرصے تک بارش نہ ہوئی تو پانی کی قلت پیدا ہو گئی اور قحط کے آثار پیدا ہونے لگے، اِن حالات میں قومِ عاد نے فیصلہ کیا کہ اپنا ایک وفد مکے بھیجا جائے جو وہاں جا کر بارش کے لیے دُعا کرے تو شاید اللہ تعالیٰ قحط کو دور کر دے اور خوشحالی لوٹ آئے چنانچہ ستر آدمیوں کا ایک وفد دو سرداروں کیل اور مرثد کی قیادت میں مکے روانہ ہوا۔ وہ لوگ مکے کے قریب وہاں کے سردار معاویہ ابن بکر کے ہاں جا کر اُترے. میزبان نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی اور وہاں کے رواج کے مطابق ان کے خورد و نوش اور عیش و آرام کے لیے خوب انتظام کیا حتیٰ کہ اُن کی تفریحِ طبع کے لیے گانے والی لونڈیوں کا بندوبست کیا۔ وہ لوگ مہینہ بھر دعوتیں اڑاتے رہے اور جس مقصد کے لیے آئے وہ بھول ہی گئے۔ میزبان خود بھی ان کے قیام کی طوالت سے تنگ آچکا تھا مگر انہیں کہہ نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ عرب کے اصولِ میزبانی کے خلاف تھا۔ بالآخر مہمان سردار مرثد کو خیال آیا کہ ہم تو خوشحالی کی دُعا کرنے آئے ہیں مگر یہاں عیش و آرام میں پڑ کر اسے بھی بھول گئے اُس نے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ اب انہیں ——— یہاں سے رخصت ہو کر اصل مقصد کی طرف آنا چاہیے اُس نے یہ بھی کہا کہ میرا دل یہ گواہی دیتا ہے

کہ جب تک تم اللہ کے رسول ہود علیہ السلام پر ایمان نہیں لاؤ گے، یہاں پر دعائیں کرنا بھی تمہیں کچھ مفید نہیں ہوگا۔ دوسرے ساتھیوں نے سمجھ کر مرثد ہود علیہ السلام پر ایمان لا چکا ہے، لہٰذا وہ اس سے ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کہ اسے ہم دعا کے مقام پر اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے

اُدھر جب میزبان اُن کے قیام سے تنگ آ گیا تو اس نے ایک ترکیب سوچی اور گانے والی لونڈی کو کہا، کہ جب گانے کی محفل قائم ہو تو اس میں تم یہ شعر گانا۔

اَلَا یَا قَیْلُ وَیْحَكَ قُمْ فَهَیْنِمْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُصْبِحُنَا غَمَامَا	اے قیل اٹھو! اور کچھ مناجات اور التجا کرو۔ شاید اللہ تعالیٰ ہمیں بارش سے سیراب کر دے۔
فَیَسْقِیْ اَرْضَ عَادٍ اِنَّ عَادًا قَدْ اَمْسَوْا لَا یُبِیْنُوْنَ الْكَلَامَا	شاید کہ اللہ تعالیٰ ارض عاد کو سیراب کر دے کیونکہ عاد کے لوگ اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ بات بھی نہیں کر سکتے

جب لونڈی کی زبان سے مہمانوں نے یہ شعر سنے تو پھر انہیں ہوش آیا کہ ہم نے تو یہاں بہت دیر کر دی ہے۔ ہمیں فوراً اپنے مقصد کی طرف جانا چاہیئے۔ چنانچہ بیت اللہ شریف کے مقام پر واقع ٹیلے پر جا کر انہوں نے دعا کی کہ اے پروردگار! ہم بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں جس طرح تو پہلے قوم عاد کو سیراب کرتا تھا، اب بھی ان کے لیے پانی نازل فرما۔

قوم عاد پہ عذاب — مفسرین بیان کرتے ہیں کہ اس دعا کے بعد تین قسم کے بادل اٹھے یعنی سفید، سرخ اور سیاہ۔ غیب سے قیل سردار کے نام آواز آئی کہ ان بادلوں میں سے جو نا چاہو پسند کر لو۔ چونکہ عموماً کالی گھٹائیں زیادہ سے زیادہ بارش کا سبب بنتی ہیں، اس لیے قیل نے سیاہ بادلوں کو

پسند کیا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آیا ہے کہ آواز آئی اچھا پھر اپنی کو اختیار کر لو لَا تُبْقِیْ مِنَ الْعَادِ اَحَدًا یہ قوم عاد میں سے کسی کو بھی باقی نہیں چھوڑیں گے۔ جب سیاہ بادل وادیوں پر نمودار ہوئے تو وہ لوگ بڑے خوش ہوئے کہ اب خوب بارش ہوگی اور قحط دور ہو جائے گا۔ سورۃ احقاف میں ہے "فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا" پھر جب انہوں نے دیکھا کہ بادل ان کے میدانوں کی طرف آ رہے ہیں تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا۔ مگر اللہ نے فرمایا یہ بارش برسانے والے بادل نہیں بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ بلکہ یہ تو وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی کرتے تھے رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ اس میں آندھی ہے جس میں دردناک عذاب بھرا ہوا ہے۔ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا یہ ایسی چیز ہے جو ہر چیز کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیگی۔ چنانچہ جب بادل آئے تو ان میں سے ایسی زہریلی ہوا خارج ہوئی جس نے پوری قوم کو تباہ کر دیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ ہوا مغرب کی جانب سے آئی تھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان بھی ہے کہ قوم عاد کو مغرب کی طرف سے چلنے والی گرم ہوا سے ہلاک کیا گیا۔ جب کہ اللہ نے میری مدد مشرق سے چلنے والی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ کی۔ غزوہ احزاب کے موقع پر بھی مشرق کی جانب سے ٹھنڈی ہوا چلی تھی جس کی وجہ سے مشرکین کے خیمے اکھڑ گئے اور انہوں نے محاصرہ اٹھا کر واپس جانے کا فیصلہ کیا بہرحال قوم عاد پر ایسی خطرناک ہوا چلی کہ اس نے ہر چیز کو تہ و بالا کر دیا۔ درخت گرا دیے، عمارتیں منہدم ہو گئیں انسانوں کو اچھال اچھال کر آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ہلاک کیا گیا۔ گرم اور تیز ہوا لوگوں کے ناک میں

داخل ہو کر دوسری طرف نکل جاتی تھی اور اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھی۔ سورۃ الحاقہ میں ہے سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا یہ تند و تیز ہوا سات راتیں اور آٹھ دن تک مسلسل چلتی رہی اور پوری قوم کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ بڑے بڑے جسیم آدمی ایسے پڑے تھے جیسے کھجوروں کے تنے ہوں۔ اللہ نے فرمایا فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ کیا ان میں سے ایک بھی زندہ بچا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر ایسا سخت عذاب نازل فرما کر پوری قوم کو ملیا میٹ کر دیا۔

اہل ایمان کی نجات

اللہ نے فرمایا وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جب ہمارا حکم آگیا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ہم نے ہود علیہ السلام اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی خاص مہربانی سے بچا لیا۔ ان کی تعداد چار ہزار تھی کہتے ہیں کہ جس مکان میں اہل ایمان موجود تھے وہاں مسموم ہوا نہیں پہنچی تھی، باقی ساری قوم کا خاتمہ ہو گیا۔ اللہ نے فرمایا وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ہم نے انہیں گاڑھے عذاب سے نجات دی۔ اگر عذاب غلیظ سے دنیوی عذاب مراد ہے تو پھر یہ وہی گرم ہوا ہے جو کافروں پر متواتر ہفتہ بھر چلتی رہی اور بالآخر سب کو ہلاک کر دیا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگلی آیت میں قیامت کا ذکر بھی ہے اور اس لحاظ سے عذاب غلیظ سے آخرت کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے۔ یہاں پر نَجَّيْنَا کا لفظ دو دفعہ آیا ہے تو اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اہل ایمان کو ایک دفعہ ہم نے اس دنیا کے عذاب سے نجات دی اور پھر آگے چل کر قیامت کے دن کے عذاب سے بھی نجات دیں گے۔

آیات اور رسولوں کا انکار

فرمایا وَتِلْكَ عَادٌ یہ ہے قوم عاد کہ جن کی کارگزاری بیان ہوئی

ہے۔ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ انہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا وَعَصَوْا رُسُلَہٗ اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی۔ ان کو جھوٹا اور مجنوں کہا اور ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ذکر تو صرف ہود علیہ السلام کا ہو رہا ہے مگر رسل جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ ممکن ہے اس وقت ہود علیہ السلام کے علاوہ بعض دوسرے رسول بھی موجود ہوں کیونکہ ایک ایک وقت میں کئی کئی انبیاء کا ذکر بھی تو ملتا ہے۔ جیسے بنی اسرائیل کے دور میں ہوتا رہا ہے۔ یونس علیہ السلام کے زمانے میں بھی بیک وقت پانچ رسول موجود تھے جن میں سے آپ کو منتخب کر کے نینوی کی بستی کی طرف بھیجا گیا۔ بعض فرماتے ہیں کہ جمع کا صیغہ رسولوں کے متعلق دیگر مقامات پر بھی استعمال ہوا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک رسول کا انکار تمام رسولوں کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ دین اور پیغام تو سب کا ایک ہی رہا ہے۔ سارے پیغمبر یہی کہتے رہے۔ اُعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔

سرکشوں کی پیروی

فرمایا قوم عاد نے آیات الٰہی کا انکار کیا، رسولوں کی نافرمانی کی وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ اور ہر سرکش اور عنادی آدمی کی پیروی کی۔ ہر ایسے سردار اور چوہدری کے پیچھے لگے جو حق کے ساتھ عناد رکھتا تھا اور حکم الٰہی کی سرتابی کرتا تھا۔ بالعموم مفاد پرست اور اغراض کے بندے ایسے ہی لوگوں کا اتباع کرتے ہیں اور اچھے لوگوں کی بات نہیں مانتے۔ فرعون نے بھی موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی بات نہ مانی بلکہ اپنے عنادی سرداروں کا کہا مانا۔ قوم عاد نے بھی یہی کیا کہ اللہ کے رسول ہود علیہ السلام کی بات پر غور نہ کیا بلکہ عناد اور تعصب کے پیچھے چلتے رہے۔

لعنت کا طوق

اس کا نتیجہ یہ ہوا وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً۔ اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس دُنیا میں بھی قومِ فرعون، عاد، ثمود یا قومِ لوط کو اچھے لفظوں سے یاد نہیں کیا جاتا ہے تاریخ میں ان کا ذکر نافرمان اور عذاب زدہ قوموں کی حیثیت سے آتا ہے اور انہیں ہمیشہ کے لیے لعنت کا تمغہ لگا دیا گیا ہے۔ یہ تو اس دنیا کا حال ہے وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ اور قیامت کے دن بھی یہ لوگ لعنت میں گرفتار رہیں گے۔ وہاں ان کو اس دُنیا سے بھی زیادہ ذلت اٹھانا پڑے گی۔

آگے عام لوگوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے أَلَا سنو! إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ۔ بےشک عادیوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا۔ اپنے وجود بخشنے والے نعمتیں عطا کرنے والے اور ہر آسائش مہیا کرنے والے رب کا انکار کیا، اس کی توحید اور اس کے رسولوں کو تسلیم نہ کیا اور اس کا حکم نہ مانا۔ فرمایا أَلَا سنو! بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ۔ قومِ ہود کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے بُعد کا معنیٰ دوری ہوتا ہے اور یہاں مراد اللہ کی رحمت سے دوری ہے لعنت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ لعنتی آدمی اللہ کی رحمت سے دُور ہو جاتا ہے۔ بُعد کا دوسرا معنیٰ ہلاکت ہوتا ہے اور اس مقام پر یہی موزوں ہے۔ اس لفظ کو ایک شاعرہ نے اپنے شعر میں اس طرح استعمال کیا ہے۔

إِخْوَتِي لَا تَبْعَدُوا
بَلَىٰ وَاللّٰهِ قَدْ بَعِدُوا

اے میرے بھائیو! خدا کرے تم ہلاک نہ ہو۔ مگر میں یہ بات کیسے کروں کیونکہ وہ تو ہلاک ہو چکے ہیں یعنی سارے کے سارے لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔ تو فرمایا سنو! ہلاکت ہے قومِ عاد کے

لیے جو ہود علیہ السلام کی قوم تھی۔ انہوں نے اپنے مخلص اور خیر خواہ نبی کی بات نہ مانی بلکہ سرکش اور مخالف لوگوں کا اتباع کیا جس کی وجہ سے وہ تباہی و بربادی کا شکار ہوئے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ
مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ
رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا
مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا
وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾ قَالَ
يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ
مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫
فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

ترجمہ:- اور قوم ثمود کی طرف (ہم نے رسول بنا کر بھیجا) اُن کے بھائی صالح علیہ السلام کو۔ انہوں نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی۔ نہیں ہے تمہارے لیے اُس کے سوا کوئی معبود۔ اُسی نے تمہیں پیدا کیا ہے زمین سے اور اُسی نے تمہیں آباد کیا ہے اس (زمین) میں۔ پس اُسی سے بخشش طلب کرو۔ پھر توبہ کرو اُس کے سامنے۔ بیشک میرا پروردگار قریب ہے اور قبول کرنے والا ہے (دعا کو) ﴿۶۱﴾ کہا اُن لوگوں نے اے صالح علیہ السلام! تحقیق تھا تو ہمارے

درمیان اُمید کیا گیا (ہونہار) اس سے پہلے۔کیا تو روکتا ہے
ہمیں اس بات سے کہ ہم عبادت کریں اُن کی جن کی ہمارے
باپ دادا عبادت کرتے تھے اور بیشک ہم تردد (شک)
میں ہیں، اس چیز کی طرف سے جس کی طرف تو ہمیں دعوت
دیتا ہے (۶۲) کہا صالح (علیہ السلام) نے۔ اے میری قوم کے
لوگو! بتلاؤ اگر میں کھلی بات پر ہوں اپنے رب کی طرف سے
اور اُس نے دی ہو مجھے اپنی طرف سے مہربانی، پس کون میری
مدد کرے گا اللہ کے سامنے اگر میں اُس کی نافرمانی کروں۔ پس
نہیں زیادہ کرتے تم میرے لیے سوائے نقصان کے (۶۳)

ربطِ آیات مسئلہ توحید کو سمجھانے اور اس پر ایمان لانے کے لیے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر فرمایا اور پھر آپ کی قوم کی نافرمانی اور غرقابی کا حال بیان کیا۔ اس کے بعد ہود علیہ السلام کی وعظ و نصیحت اور اُن کی قوم کا ذکر بھی کیا۔ اللہ کے دونوں پیغمبروں کی تبلیغ کا موضوع ایک ہی تھا کہ اے لوگو! اللہ کی عبادت کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ نوح علیہ السلام کی قوم سے صرف وہی لوگ بچے جو ایمان لا کر کشتی میں سوار ہو گئے اور ہود علیہ السلام کی قوم کے بھی صرف ایمان دار ہی بچے اور کافروں میں سے فردِ واحد بھی زندہ نہ بچا۔

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے قومِ ثمود کا ذکر فرمایا ہے یہ قوم عادِ ثانیہ بھی کہلاتی ہے۔ عاد کی طرح یہ لوگ بھی ارم بن سام بن نوح کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت نوح کے بعد قوم عاد کو ۸۰۰ سال بعد یا ۲۶۰۰ سال بعد عروج حاصل ہوا۔ اور پھر عاد کے ایک سو یا دو سو سال بعد قوم ثمود برسرِ اقتدار آئی۔

قومِ ثمود جیسا کہ پہلے درس میں بیان ہو چکا ہے قوم عاد جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں ربع خالی کی وادی دہنا میں آباد تھی جب کہ قوم ثمود شمال میں تبوک سے لے کر وادیٔ قریٰ

تک کے درمیان رہتے تھے۔ تفسیر عزیزی (مفسر قرآن) لکھتے ہیں کہ اس علاقے میں قوم کے ایک ہزار سات سو دیہات، قصبات اور شہر آباد تھے۔
یہ لوگ بڑے متمدن تھے، سنگ تراشی کے بڑے ماہر تھے، پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر بڑے عالیشان نقش و نگار والے مکان تعمیر کرتے تھے۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے کہ کھلی جگہوں پر یہ لوگ بڑے عالیشان محلات تعمیر کرتے تھے۔
ان کے بنائے ہوئے مکانات ہزاروں سال گزر نے کے بعد آج بھی موجود ہیں۔ ان پر بنے ہوئے نقش و نگار ان لوگوں کی صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ دنیا بھر کے سیاح ان تعمیرات کو دیکھنے کے لیے جاتے ہیں۔ ان عمارات کے کھنڈرات پر ثمودی، سامی یا آرامی زبان میں لکھے ہوئے کتبے بھی موجود ہیں۔
ہندوستان میں مہاتما بدھ کے دور میں بھی تعمیرات کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے۔ اس زمانے میں موجودہ ٹیکسلا بہت بڑا شہر تھا جو چار پانچ میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس دور کے بعض برتن اور مجسمے وغیرہ ٹیکسلا میوزیم میں موجود ہیں۔ برصغیر میں صوبہ بہار اور دکن میں ایجنٹا اور الورا کی تمدنیوں کے اثرات اب بھی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں موجود ہے کہ پہلی قوموں کے لوگ بڑے سمجھدار تھے مگر دنیاوی معاملات میں۔ وہ لوگ معاد کے اعتبار سے بالکل اندھے تھے اور وہ آخروی عقل سے محروم تھے، خدا کے دین اور ایمان کی بات کو نہیں سمجھتے تھے۔

صالح علیہ السلام کی بعثت

بہر حال یہاں پر اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کا حال بیان فرمایا ہے کہ انہوں نے کس طرح اللہ کے نبی صالح علیہ السلام کی مخالفت کی، اُن کو جھٹلایا اور پھر آخر کار قوم کا کیا حشر ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اور قوم ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ یہاں پر بھی وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا کے الفاظ محذوف ہیں۔ یہ الفاظ نوح علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ آئے ہیں

اور ان کا اطلاق ہود علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ اور اب صالح علیہ السلام کے بیان کے ساتھ بھی کیا گیا ہے۔ آپ کی قوم کا تعلق بھی سامی نسل سے ہے۔ آپ کا شجرہ صالح ابن عبید اور پھر جا کر سام ابن نوح سے جا ملتا ہے بعض اقوام کی طرف رسول باہر سے آکر تبلیغ کرتے رہے ہیں جیسے لوط علیہ السلام ہیں۔ وہ عراق کے رہنے والے تھے جبکہ انہیں تبلیغ کے لیے شرق اردن کی طرف مبعوث کیا گیا۔ حضرت یونس علیہ السلام بھی شام سے نینویٰ کی بستی میں آئے۔ تاہم ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام اپنی اپنی اقوام کی طرف ہی مبعوث ہوئے۔ صالح علیہ السلام اپنی قوم ثمود ہی کے ایک فرد تھے اور اللہ نے انہیں اپنی قوم کو تبلیغ کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔

دعوۃ الی التوحید

صالح علیہ السلام نے بھی اپنی تبلیغ کا آغاز دعوت الی التوحید سے ہی کیا جیسا کہ دوسرے انبیاء کرتے رہے ہیں۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فرمایا اے میری قوم کے لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اس قوم نے بھی بہت سے معبود بنا رکھے تھے۔ ہر کام کا علیحدہ علیحدہ معبود تھا۔ ان کے سامنے سجدہ کیا جاتا۔ ان کے نام کی نذر و نیاز دی جاتی۔ ان پر چادریں اور چڑھاوے چڑھتے۔ یہ دیکھ کر اللہ کے نبی نے فرمایا لوگو! اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں۔ عبادت انتہائی درجے کی تعظیم کا نام ہے جو اس اعتقاد کے ساتھ کی جاتی ہے کہ جس کی تعظیم کی جا رہی ہے وہ ہماری حالت کو جانتا ہے، ہماری مشکلات کو حل کر سکتا ہے، عالم اسباب پر اس کا کنٹرول ہے اور وہ نفع نقصان کا مالک ہے۔ مشرک لوگ ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اختیار دے رکھا ہے کہ جس کی چاہو حاجت برآری کرو مگر وہ اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے تو بڑی وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان کر دیا ہے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ

مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ) آسمان سے لیکر زمین تک کے ذرے ذرے کی تدبیر تو خود اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کے اسباب حیات اور رزق رسانی کی ذمہ داری اُس نے اٹھا رکھی ہے، ترقی و تنزل کے تمام تصرفات وہ خود انجام دیتا ہے، اُس نے کسی کو کہاں اختیار دے رکھا ہے کہ میرے حکم کے بغیر جو چاہو کرتے پھرو۔ یہ تو مشرکین کا زعم باطل ہے، لائق عبادت وہی ذات ہو سکتی ہے جو واجب الوجود، خالق، متصرف اور مدبر ہو، اس کے بغیر کوئی ذات کوئی ہستی عبادت کے لائق نہیں۔

مٹی سے انسانی تخلیق

مسئلہ توحید کے دلائل کے طور پر صالح علیہ السلام نے بعض باتیں قوم کو تبلائیں۔ فرمایا هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یہ وہی ذات خداوندی ہے جس نے تمہیں مٹی سے یعنی زمین سے پیدا کیا۔ مٹی سے انسانی تخلیق کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ تمام انسانوں کے جد امجد آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست مٹی سے پیدا فرمایا جیسا کہ سورۃ آل عمران میں ہے خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس میں روح ڈالی اور کہا ہو جا، تو وہ ہو گیا۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ مٹی کو گوندھ کر اُس کا خمیر بنایا گیا، پھر اس کا مجسمہ بنایا اور اس میں روح ڈالی۔ مطلب یہ کہ جب اولین انسان کی پیدائش براہ راست مٹی سے ہوئی تو باقی انسان بھی بالواسطہ مٹی ہی کی پیدائش تصور کیے جائیں گے۔ اسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں کو یاد دلایا کہ ان کی تخلیق حقیر مٹی سے ہوئی اس لیے وہ ایک دوسرے پر نسلی فوقیت پر فخر نہ کیا کریں فرمایا لَا يَفْخَرْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ تم میں سے بعض لوگ بعض دوسروں پر فخر نہ کیا کریں كُلُّكُمْ اَبْنَآءُ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم

علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔

نسلی اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے انسانی تخلیق کا انتظام فرمایا ہے کہ جب مرد و زن آپس میں ملتے ہیں تو رحم مادر میں ان کا مادہ منویہ اکٹھا ہو کر انسان کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔ اب عورت اور مرد کے جسمانی مواد جو بچے کی پیدائش کا ذریعہ بنتے ہیں وہ اس خوراک سے بنتے ہیں جو انسان کھاتا ہے اور انسانی خوراک کا سارا دارومدار زمین یعنی مٹی پر ہے۔ ہر چیز زمین سے پیدا ہوتی ہے، اجناس، سبزیات حتیٰ کہ نمک اور دیگر معدنیات جو انسانی جسم کا حصہ ہیں سب زمین کی پیداوار ہیں۔ تو گویا اولین انسان براہ راست مٹی سے پیدا ہوا اور پھر نسلی اعتبار سے پیدا ہونے والے تمام انسان مٹی سے حاصل ہونے والی خوراک کے بل بوتے پر پیدا ہو کر اپنی مدت العمر تک زندہ رہتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے تمہیں زمین یعنی مٹی سے پیدا کیا۔

زمین کی آبادکاری

وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا اور اسی زمین میں تمہیں آباد کیا۔ استعمار کا معنیٰ مدت العمر تک آباد کرنا ہے۔ جب تک تمہاری زندگی ہے تمہارے تمام مفادات اور ضروریات اسی زمین سے وابستہ ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ انسانی خوراک اور اس کی ضروریات کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ زمین ہی سے پیدا کرتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں وَاسْتَعْمَرَكُمْ میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اے لوگو! تم اس زمین کو آباد کرو۔ اس میں کھیتی باڑی کر کے غلہ اگاؤ، باغات لگا کر پھل پیدا کرو اور زمین کی تہ سے پانی اور معدنیات نکالو اور ان چیزوں کو اپنے استعمال میں لاؤ۔ زمین کی آبادکاری کا یہی مطلب ہے۔ چنانچہ فقہائے کرام اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ جو شخص زمین کا مالک ہے اور اسے آباد نہیں کرتا۔ تو ایسی صورت میں حکومت کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اس زمین کو آباد کرنے کے

یہ مدت مقرر کرے اور اگر پھر بھی مالک اسے آباد کرنے سے قاصر ہے تو زمین چھین لی جائے اور کسی آباد کرنے والے کو دے دی جائے کیونکہ اس آیت کی رو سے زمین کی آباد کاری واجب ہے

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ کسی ملک کی آبادی زراعت سے ہوتی ہے۔ انسانی ضروریات کے سلسلے میں زراعت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے لہٰذا ہر ملک کا اسّی فیصد زراعت میں اور باقی بیس فیصد صنعت و حرفت میں استعمال ہونا چاہئے۔ اگر تمام لوگ کارخانوں میں کام کرنے لگیں یا فوج کی ملازمت اختیار کریں تو زراعت کا کام کون کرے گا۔ اگر زراعت رُک گئی تو ملک ویران ہو جائے گا۔ لہٰذا حکومت اور خود مالک اراضی کا فرض ہے کہ زمین کو آباد کریں تاکہ لوگوں کی خوراک کا بندوبست ہو سکے۔

عمرہ کا لفظ بھی اسی لفظ وَاسْتَعْمَرَ سے مشتق ہے اگر کوئی شخص اپنا مکان یا زمین عمر بھر کے لیے کسی دوسرے شخص کو دے دیتا ہے تو وہ ہبہ یا صدقہ ہو جائے گا۔ ایسی جائیداد دوسرے شخص کی ملکیت میں چلی جائے گی اور پھر واپس نہیں ہو سکے گی۔ اس شخص کی وفات کے بعد وہ جائیداد اس کے وارثان میں تقسیم ہوگی اور اصل مالک کو واپس نہیں ہو سکے گی۔ اگر کوئی شخص ہبہ کرتے وقت کسی خاص مدت کے بعد واپسی کی شرط لگائے گا تو ایسی شرط باطل سمجھی جائے گی۔

استغفار کی تلقین

فرمایا اللہ نے تمہارے لیے اس زمین میں آبادی کا سامان پیدا کیا ہے۔ اب تمہارا بھی فرض ہے کہ فَاسْتَغْفِرُوهُ اس پروردگار سے بخشش طلب کرتے رہو، اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ استغفار بہت بڑی حقیقت اور بڑی ضروری چیز ہے۔ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ انسان کے لیے استغفار بمنزلہ صابن کے ہے۔ انسان کے دل پر جتنی

زیادہ میل کچیل ہوگی اتنی زیادہ استغفار کی ضرورت ہوگی۔ اس کے بعد تسبیح وتہلیل بمنزلہ خوشبو کے ہے اور استغفار کے بعد تسبیح وتہلیل انسان کی روح کو نکھار دیتی ہے۔ اسی لیے بزرگانِ دین ان وظائف کی بڑی تلقین کرتے ہیں۔

حدیث شریف میں استغفار کے کئی کلمات آئے ہیں بمثلاً
اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ میں اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ اور قائم ہے اور میں اُس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔
اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ میں ہر گناہ سے اللہ تعالیٰ کی بخشش طلب کرتا ہوں اور اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ خالی اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ کا ورد بھی کرتا ہے تو درست ہے صحابہ بیان کرتے ہیں کہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک ایک مجلس میں سو سو مرتبہ استغفار کے کلمات اپنی زبان مبارک سے ادا فرماتے تھے۔

ترمذی اور ابن ماجہ شریف کی روایت میں آتا ہے كُلُّكُمْ خَطَّاؤُوْنَ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ یعنی تم میں سے ہر شخص خطا کار ہے اور بہتر خطا کار وہ ہے جو غلطی کرنے کے بعد معافی مانگ لیتا ہے اور اس پر اصرار نہیں کرتا۔ جب کوئی شخص صدقِ دل سے تائب ہو جاتا ہے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ تو فرمایا ایک تو اللہ سے معافی مانگو اور دوسرا کرو ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ پھر اُس کے سامنے توبہ بھی کرو کہ آئندہ ایسا غلط کام نہیں کروں گا۔

فرمایا اپنے رب کے سامنے استغفار اور توبہ کرو اور ساتھ یہ بھی

[1] ابن ماجہ ۳۱۳

سمجھ لو اِنَّ رَبِّیۡ قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ جیسے میرا پروردگار میرے قریب بھی ہے اور میری دعا کو قبول بھی کرتا ہے۔ اس لفظ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ رب تعالیٰ کہیں دور دراز مقام پر ہے، بلکہ وہ تو انسان کے بالکل قریب ہے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان موجود ہے "نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ" ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس وقت درمیان میں حجاب پڑے ہوتے ہیں، جب یہ دور ہو جاتے ہیں، تو انسان کو حضوری نصیب ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ خدا تعالیٰ قریب اور مجیب بھی ہے کہ وہ ہر دعا کرنے والے کی دعا کو سنتا ہے اور قبول کرتا ہے مشرک لوگ درمیان میں بلاوجہ واسطہ ڈالتے ہیں کہ ہماری تمہارے آگے اور تمہاری خدا کے آگے، یہ باطل نظریہ ہے۔ اللہ نے قریب و مجیب کے الفاظ لا کر اس باطل عقیدہ کی جڑ کاٹ دی ہے مگر مشرک لوگ اسی عقیدے پر اڑے ہوئے ہیں کہ ہم ان کو راضی کرتے ہیں اور یہ آگے خدا تعالیٰ کو راضی کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ تو علی الاعلان کہہ رہا ہے کہ وہ ہر شخص کے قریب ہے اور اس کی دعا کو سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔

توسل کی حقیقت

بس توسل کو بزرگان دین جائز قرار دیتے ہیں، وہ ایک فروعی بات ہے۔ اس توسل کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ان لوگوں سے ہمیں محبت ہے کیونکہ انہوں نے ہمیں اللہ کا راستہ بتایا ہے۔ دعا کا قبول و رد تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے تاہم ہم التجا کرتے ہیں کہ ان بزرگوں کے طفیل سے ہماری دعا کو قبول فرما۔ اور اگر کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ فلاں بزرگ اللہ تعالیٰ کو ضرور ہی راضی کرے گا۔ لہٰذا ہمیں اس کو راضی کرنا چاہیئے تو یہی شرک ہے۔

حضرت مولانا حسین علی صاحب واں بھچراں والے کہتے ہیں کہ

کسی نبی یا ولی کا وسیلہ درحقیقت اعمال ہی کا واسطہ ہوتا ہے جو کہ سب کے نزدیک جائز ہے۔ اعمال کا وسیلہ یہ ہے کہ انسان کہے کہ اے مولا کریم! میرے اس نیک عمل کے طفیل میرے گناہ معاف کر دے یا میری فلاں حاجت پوری کر دے، اسی طرح یوں کہنا کہ اے اللہ! علی ہجویریؒ یا فلاں بزرگ کے طفیل سے میری دعا قبول کر لے تو یہ بھی حقیقت میں فعل ہی کا واسطہ ہے کیونکہ کوئی نبی یا ولی بذاتِ مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ محبت ہونے کی وجہ سے اس کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور محبت ایک فعل ہے اسی طرح کسی متبع کی اتباع ایک فعل ہے اور اس فعل کی برکت سے وہ دعا کی قبولیت کی درخواست کرتا ہے اس سے زیادہ وسیلے کا کوئی مقصد نہیں۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ کوئی نبی یا ولی من حیث الذات اس کی مراد پوری کرتا ہے اور وہ اسی کی رضا چاہتا ہے یا وہ سفارش کر کے بچا لے گا تو یہ مشرکانہ عقیدہ ہے جس کی عدم معافی کا اللہ نے بار بار اعلان فرمایا ہے۔

آباؤ اجداد کا طریقہ

صالح علیہ السلام کی یہ تقریر سن کر قَالُوْا یٰصٰلِحُ وہ لوگ کہنے لگے کہ اے صالح علیہ السلام قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اس سے پہلے تو ہمارے درمیان امید کیا گیا تھا۔ تمہاری تبلیغ سے پہلے ہم تمہیں بڑا ہونہار اور لائق سمجھتے تھے کہ تو باپ دادا کا نام روشن کرے گا مگر تو ان کی راہ سے ہٹ کر انہی راہ کو مٹانے کے درپے ہے کہنے لگے اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا کیا تو ہمیں روکتا ہے ان کی عبادت کرنے سے جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ تو ہمارے آباؤ اجداد کے رسم و رواج ہم سے چھڑانا چاہتا ہے آج کے مشرک بھی یہی کہتے ہیں کہ فلاں کام اور فلاں رسم تو وہ بھی کرتے تھے، وہ کوئی بیوقوف تھے جو ایسا کرتے تھے۔ یہ نئے عالم پیدا ہو گئے

ہیں جو ہمیں تیسرے اور چلّے سے روکتے ہیں۔ قبروں پر گنبد بنانے ان پر چادریں پھیلانے اور چڑھاوے چڑھانے سے منع کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہمارے بزرگ کرتے چلے آئے ہیں، یہ کون ہیں ہمیں روکنے والے مشرک لوگ ہمیشہ اپنے بڑوں کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں جب کہ اللہ نے فرمایا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (البقرۃ) اگرچہ اُن کے آباؤ اجداد عقل وشعور اور ہدایت سے محروم ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں اگر آباؤ اجداد یا بزرگ صحیح راستے پر ہوں تو پھر ضرور ان کے راستے پر چلو اور اس کی دعوت دوسروں کو بھی دو۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی کہا تھا وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ (یوسف) میں تو اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کی ملت کا اتباع کرتا ہوں کیونکہ وہ حق پر تھے۔ بہر حال اگر آباؤ اجداد توحید الٰہی پر ہیں تو اُن کی مانی جائے گی اور اگر وہ گمراہ ہیں تو اُن پر فخر کرنا جہنمی ہونے کی علامت ہے۔

تو فرمایا۔ اے صالحؑ! کیا تو ہمیں اُن کی عبادت کرنے سے روکتا ہے جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ تو ہمیں جس چیز کی دعوت دیتا ہے ہم تو اس کے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں تمہاری بات بھی معلوم نہیں ہوتی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب کی حاجات ایک ہی خدا پوری کرے اور ہم سب کو چھوڑ کر اُسی ایک کو پکاریں۔

توحید پر استقامت

اس کے جواب میں صالح علیہ السلام نے فرمایا قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ اے میری قوم کے لوگو مجھے بتلاؤ، کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی دلیل پر ہوں اُس نے مجھ پر وحی نازل فرمائی اور مجھے صحیح دین عطا کیا وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ

رَحْمَةً اور اُس اللہ نے اپنی طرف سے مجھے مہربانی بھی عطا کی ہے ہدایت، ایمان، نیکی اور تقویٰ یہ سب اللہ کی مہربانی ہی تو ہے جو اس نے عطا فرمائی ہے۔ فرمایا اِن حالات میں فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللّٰهِ إِنْ عَصَيْتُهُ اگر میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں گا تو اس کے سامنے کون میری مدد کریگا۔ یہ ایسی واضح بات ہے کہ جس میں کوئی شک اور تردد نہیں۔ فرمایا اگر میں تمہاری بات مان لوں فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ پس نہیں زیادہ کرتے تم میرے لیے نقصان کے سوا مطلب یہ کہ اگر میں توحید کا درس چھوڑ دوں اور تمہاری شرکیہ رسوم کی تردید کرنے کی بجائے خود اختیار کر لوں تو مجھے نقصان کے سوا کیا حاصل ہوگا یہ تو سراسر نقصان کا سودا ہوگا، لہٰذا نہ میں پیغام الٰہی پہنچانے سے باز آسکتا ہوں اور نہ تمہاری غلط بات کے پیچھے لگ سکتا ہوں اب اگلی آیات میں قوم کی طرف سے نشانی کا مطالبہ آرہا ہے اور پھر ان کی ہلاکت وتباہی کا تذکرہ ہے۔

وَيٰقَوۡمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَـكُمۡ اٰيَةً فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ
فِىۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَيَاۡخُذَكُمۡ عَذَابٌ
قَرِيۡبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوۡهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوۡا فِىۡ دَارِكُمۡ ثَلٰثَةَ
اَيَّامٍ‌ ؕ ذٰ لِكَ وَعۡدٌ غَيۡرُ مَكۡذُوۡبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا
نَجَّيۡنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا
وَمِنۡ خِزۡىِ يَوۡمِئِذٍ‌ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِىُّ الۡعَزِيۡزُ ﴿۶۶﴾
وَاَخَذَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ
جٰثِمِيۡنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا‌ ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوۡدَا۟ كَفَرُوۡا
ع ۶ رَبَّهُمۡ‌ ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّثَمُوۡدَ ﴿۶۸﴾ ع

ترجمہ:- اور اے میری قوم کے لوگو! یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لیے ایک خاص نشانی۔ پس چھوڑ دو اس کو کہ کھائے اللہ کی زمین میں اور نہ چھونا اس کو برائی کے ساتھ۔ پس پکڑ لے گا تمہیں عذاب جلد ﴿۶۴﴾ پھر انہوں نے (نافرمانی کرتے ہوئے) اس اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیے۔ پس کہا (صالح علیہ السلام نے) فائدہ اٹھالو اپنے گھروں میں تین دن تک۔ یہ ایسا وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہوگا ﴿۶۵﴾ پس جب آیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات دی صالح علیہ السلام کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان

لانے اُن کے ساتھ اپنی رحمت سے۔ اور اس دن کی رسوائی سے۔ بیشک تیرا پروردگار قوت والا اور غالب ہے (۶۶) اور پکڑا اُن لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا ایک چیخ نے، پس ہوگئے اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرے ہوئے (۶۷) گویا کہ وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ آگاہ رہو، بیشک ثمود نے کفر کیا اپنے پروردگار کے ساتھ۔ آگاہ رہو، دوری (ہلاکت) ہے ثمود کیلئے (۶۸)

ربط آیات

اللہ تعالیٰ نے مسئلہ توحید کی تفہیم کے لیے اس سورۃ مبارکہ میں متعدد انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلے حضرت نوح اور ہود علیہما السلام کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے اپنی اپنی قوم کو یہی دعوت دی۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اے لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو کہ اُس کے بغیر تمہارا کوئی معبود نہیں۔ سورۃ کی ابتداء میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہی کلمات دہرائے گئے اور صالح علیہ السلام کی تبلیغ کا لب لباب بھی یہی تھا کہ لوگو! عبادت صرف اللہ کی کرو، اس سے معافی مانگو اور اُس کی طرف رجوع رکھو۔ آپ کی قوم نے کہا کہ ہم تو تمہیں بڑا ہونہار سمجھتے تھے کہ تو باپ دادے کا نام روشن کرے گا مگر تو نے ہمیں انہی کے دین سے ہٹانا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں تو تیری بات مشکوک نظر آتی ہے۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اے لوگو! اگر میں کھلے ثبوت اور واضح دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے جس نے مجھے خاص مہربانی عطا کی ہے اگر میں اُس کی نافرمانی کروں تو اُس کے سامنے میری کون مدد کرے گا۔ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔ اگر میں تمہاری بات مان لوں تو سراسر نقصان اٹھاؤں گا۔

نشانی کا مطالبہ

اکثر انبیاء کی اقوام نے اُن سے من مرضی کی نشانی طلب کرنے پر اصرار کیا ہے۔ اکثر مقامات پر ایسا بھی ہوا ہے کہ اللہ نے اپنے نبی سے کہلوایا کہ نشانی پیش کرنا میرا کام نہیں ہے بلکہ اس کا دارو مدار اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت پر ہے۔ وہ جب چاہے کوئی نشانی ظاہر فرمائے۔ مگر بعض اوقات اللہ تعالیٰ مطلوبہ نشانی ظاہر بھی فرما دیتا

تھا۔ مکے والوں نے حضور نبی کریم سے شق القمر کی نشانی طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔ ایک ٹکڑا پہاڑ کی ایک طرف چلا گیا اور دوسرا دوسری طرف اس معجزے کو سب لوگوں نے دیکھا پھر بھی "سِحرٌ مُّستَمِر" کہہ کر ٹال دیا اور واضح معجزے کا انکار کر دیا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہمارے سامنے پہاڑوں میں سے بڑی جسامت والی اونٹنی نکالو جو ہمارے سامنے بچہ جنے اور اس میں فلاں فلاں خصوصیت ہو تو ہم ایمان لے آئینگے حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں دُعا کی جسے اللہ نے منظور فرما لیا۔ قوم کے میلے کا دِن تھا۔ کھلے میدان میں مشرک کافر اور اہل ایمان ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ اُن سب کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے چٹان سے اونٹنی کو نکالا۔ پھر اس پر دردِ زِہ جیسی کیفیت طاری ہوئی اور سب کے سامنے اُس نے بچہ جنا۔ پھر یہ بچہ بھی بڑا ہو گیا۔ اس اونٹنی کے متعلق اللہ نے بعض پابندیاں بھی عائد کیں جن کا ذکر قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں موجود ہے۔ اِس معجزہ اونٹنی کے متعلق حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے روایت بیان کی ہے جسے شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے اپنی تفسیر عزیزی میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے اونٹنی کے بیٹھنے والی جگہ کو پیمائش کیا تھا تو یہ ساٹھ ہاتھ یعنی نوّے فٹ ہوئی تھی۔

مسند احمد کی روایت میں آپ نے کہ اے لوگو! اپنے منہ سے نشانیاں اور معجزے نہ طلب کیا کرو۔ دیکھو قوم ثمود نے اپنے منہ سے معجزہ طلب کیا تھا اللہ نے ان کا مطالبہ پورا کر دیا۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیوں کی پاسداری نہ کر سکے جس کی وجہ سے اللہ نے ان پر سخت عذاب نازل فرما کر انہیں ہلاک کر دیا۔

اونٹنی کے لیے شرائط

یہ عجیب و غریب اونٹنی کھلی پھرتی تھی، اپنی مرضی سے کبھی اس درّے میں جاتی کبھی اُس درے میں۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ جس

کنویں یا چشمے سے قوم کے جانور پانی پیتے تھے، اللہ نے اس کو اس اونٹنی اور باقی جانوروں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ ایک دن صرف اونٹنی سارا پانی پی جاتی تھی جب کہ دوسرے دن باقی جانور اُس گھاٹ سے سیراب ہوتے تھے۔ سورۃ قمر میں موجود ہے، اللہ نے فرمایا اے صالح علیہ السلام "اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ" اُن کو آگاہ کریں کہ ان پہ پانی کی باری مقرر کر دی گئی ہے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی باری پہ آنا چاہیے۔

بہرحال یہ اونٹنی جس کثرت سے پانی پیتی تھی اسی کثرت سے دودھ بھی دیتی تھی جسے تمام لوگ استعمال کرتے تھے۔ جس کا جی چاہتا اونٹنی کا دودھ نکال کر پی لیتا۔

آج کے درس میں اسی اونٹنی کی طرف اشارہ ہے وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ صالح علیہ السلام نے فرمایا، اے میری قوم کے لوگو! یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ اونٹنی کی اللہ کے ساتھ یہ نسبت ایسی ہی ہے جیسی بیت اللہ شریف کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ گھر تو سارے کے سارے اللہ ہی کے ہیں مگر خانہ کعبہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہاں پر اللہ تعالیٰ کی تجلیات نازل ہوتی رہتی ہیں اور وہ اللہ کی عبادت کا اولین مرکز ہے کلمۃ اللہ اور عیسیٰ روح اللہ جیسے کلمات کی اللہ کی طرف نسبت اُن کی شرافت کی بنا پر ہے کلمات تو سارے اللہ ہی کے ہیں اور روح بھی سارے کے سارے اللہ کے پیدا کردہ ہیں مگر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش چونکہ غیر معمولی طریقہ سے ہوئی تھی اس لیے آپ کو روح اللہ کا لقب دیا گیا۔ اسی طرح اونٹنیاں تو ساری اللہ ہی کی پیدا کردہ ہیں مگر صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو اللہ تعالیٰ نے سلسلہ تولید و تناسل کے بغیر معجزانہ طور پر پیدا فرمایا۔ اس لیے اسے ناقۃ اللہ کا لقب دیا گیا۔

فرمایا یہ اللہ کی اونٹنی ہے لَكُمْ اٰيَةً یہ تمہارے لیے ایک خاص نشانی کے طور پر ہے۔ فَذَرُوْهَا پس اس کو چھوڑ دو تَاْكُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰهِ تاکہ یہ زمین میں کھاتی رہے۔ یہ جہاں چاہے چرتی پھرے اس کے ساتھ کوئی تعرض نہ کرو وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ اور اس کو برائی کے ساتھ مت چھونا یعنی اس کو کوئی گزند نہ پہنچانا۔ اگر ایسا کرو گے فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ تو تمہیں اللہ کا عذاب بہت جلدی آکر پکڑ لے گا اور پھر تمہیں مہلت بھی نہیں ملے گی۔ یہ بات جان لینی چاہیئے کہ یہ اونٹنی اللہ کی نشانی ہے، اس کا احترام لازمی ہے اور اس کی توہین موجب سزا ہے اللہ کے تمام شعائر کی تعظیم ضروری ہے۔ سورۃ حج میں موجود ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ اور جو کوئی شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے تو یہ تو دل کے تقوے کی بات ہے یعنی جس کے دل میں خوفِ خدا ہو گا۔ وہ ضرور اللہ کے شعائر کی تعظیم کریگا۔ اب شعائر اللہ میں بہت سی چیزیں آتی ہیں جن میں بیت اللہ شریف اور ساری مسجدیں ہیں، صفا و مروہ کی پہاڑیوں کو اللہ نے شعائر اللہ کا لقب دیا ہے۔ قرآنِ پاک، نماز، آذان، حج اور خود نبی کی ذات شعائر اللہ میں داخل ہیں، ان سب کا احترام ضروری ہے، جو توہین کرے گا سزا کا مستحق ہو گا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص دنیا کی زندگی میں چند روز سزا سے بچا رہیگا مگر شعائر اللہ کی توہین کر کے کوئی شخص اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ کی تعظیم خود اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے برابر ہے کیونکہ شعائر اللہ ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ اسی لئے اللہ نے قومِ ثمود کو فرمایا کہ اس اونٹنی کو برائی کے ساتھ مت چھونا، ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تمہیں جلد ہی آکر پکڑ لے گا۔ اُس قوم نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی۔ سورۃ الشمس میں ہے کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ۔ قومِ ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو جھٹلایا اور پھر شدید عذاب

شعائر اللہ کی تعظیم

میں مبتلا ہوئے۔ اس واقعہ کی مزید تفصیلات سورۃ اعراف اور بعض دوسری سورتوں میں بھی موجود ہیں۔

عذاب الٰہی کی آمد

اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کے باوجود قوم ثمود نے نافرمانی کی فَعَقَرُوْهَا اور اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈیئے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک آدمی مقرر کیا جس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ یہ لوگ گھات لگا کر ایک درے میں بیٹھ گئے، جب اونٹنی پھرتی پھراتی وہاں سے گزری تو غنڈوں نے تلوار چلا کر اس کے پاؤں کاٹ دیئے۔ پھر جب وہ زمین پر گر گئی تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا گوشت تقسیم کر لیا۔ جب اونٹنی زمین پر گر گئی تو اس کے بچے نے تین چیخیں ماریں اور پھر دوڑ کر اسی پہاڑی کی طرف چلا گیا جہاں سے اونٹنی پیدا ہوئی تھی اور وہیں غائب ہو گیا۔ صالح علیہ السلام نے بچے کی کافی تلاش کی مگر وہ نہ ملا۔ اس سانحہ کے بعد فَقَالَ اللہ کے نبی نے فرمایا تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ تین دن تک اپنے گھروں میں فائدہ اٹھا لو۔ زاد المسیر اور دوسری تفاسیر میں ذکر ہے کہ صالح علیہ السلام نے قوم کو بتلا دیا تھا کہ تمہارا عرصہ حیات صرف تین دن ہے۔ پہلے دن تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے، دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ پڑ جائیں گے اور پھر تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بدھ کے دن ان کے چہرے زرد ہوئے، جمعرات کو سرخ اور جمعہ کو سیاہ ہو گئے۔ پھر ہفتے کے دن علی الصبح اُن پر عذاب مسلط ہوا اور وہ ہلاک کر دیئے گئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ نے اُن پر دو عذاب بھیجے۔ اوپر سے چیخ آئی اور نیچے سے زلزلے نے آپکڑا۔ فرشتے نے ایسی خوفناک چیخ ماری جس سے لوگوں کے قلب و جگر پھٹ گئے اور وہ ہلاک ہو گئے، حضور نے فرمایا کہ قوم ثمود کے کافروں میں سے مشرق و مغرب میں کسی کو بھی اللہ نے زندہ نہ چھوڑا۔ فرمایا، عذاب کے وقت ابو رغال نامی ایک شخص

بیت اللہ شریف میں ہونے کی وجہ سے بچ گیا مگر جب وہ حرم سے باہر نکلا تو اس پر بھی وہی سزا آئی جو قوم کے دوسرے افراد پر آئی تھی ۔ غزوہ حنین کے بعد جب حضور علیہ السلام طائف کی طرف جا رہے تھے تو آپ نے صحابہ رضؓ سے فرمایا کہ اس مقام پر ابو رغال ہلاک ہوا تھا اور اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کے پاس سونے کی چھڑی تھی جو کہ اسی جگہ پر اس کے ساتھ ہی دفن ہے ۔ صحابہؓ نے وہ جگہ اکھاڑی تو وہاں سے چھڑی برآمد ہو گئی ۔

بدبخت آدمی

قوم ثمود کے جس آدمی نے اونٹنی کے پاؤں کاٹے تھے اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے ایک دفعہ حضرت علیؓ سے خطاب فرماتے ہوئے کہا ۔ اے علیؓ ! پہلی امتوں کا بدبخت آدمی احمر ثمود نامی تھا ۔ یہ سرخ رنگ اور ٹھگنے قد کا آدمی بڑا بدمعاش تھا جس نے اللہ کی اونٹنی کو ہلاک کیا ، اور اس امت کا بدبخت آدمی وہ ہوگا جو تمہارے سر کے خون سے تمہاری داڑھی کو رنگین کرے گا ۔ یہ عبدالرحمٰن ابن ملجم خارجی تھا جس نے حضرت علیؓ کو شہید کیا ، شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ یہ عجیب اتفاق ہے کہ احمر ثمودی نے بھی ایک عورت کی خاطر اللہ کی اونٹنی کو ہلاک کیا اور اس خارجی نے بھی عورت ہی کی خاطر حضرت علیؓ کو شہید کیا ، آپ خلیفہ علیٰ منہاج النبوۃ تھے اور یہ خلافت راشدہ آپ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ۔ بہر حال صالح علیہ السلام نے قوم کو متنبہ کیا کہ اپنے گھروں میں تین دن تک فائدہ اٹھا لو اس کے بعد تم ہلاک ہو جاؤ گے ۔ فرمایا ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ اللہ تعالیٰ کا یہ ایسا وعدہ ہے ، جو جھوٹا نہیں ، بلکہ پورا ہو کر رہیگا اور تم صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جاؤ گے ۔

اہل ایمان کی نجات

فرمایا فَلَمَّا جَاۤءَ اَمْرُنَا پھر جب ہمارا حکم یعنی عذاب آگیا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ہم نے بچا لیا صالح علیہ السلام اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کو ۔ اہل ایمان پہ نہ تو

چیخ کا کوئی اثر ہوا اور نہ ہی زلزلے نے انہیں تہ و بالا کیا۔ وہ اللہ کے نبی کی ہمراہی میں الگ تھلگ رہے اور اس عذاب سے بچ گئے۔

فرمایا ان کا محفوظ رہنا بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا ہماری خاص مہربانی سے ہوا وہ اللہ پر ایمان لائے۔ اس کی وحدانیت کو تسلیم کیا اور نبی کی اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی رحمت کی اور عذاب سے بچا لیا اور پھر یہی نہیں بلکہ وَمِنۡ خِزۡيِ يَوۡمِئِذٍ اس دن کی رسوائی سے بھی بچ گئے جس دن اللہ نے باقی قوم کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو قیامت والے دن کی رسوائی سے بھی محفوظ رکھے گا۔ فرمایا۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِيُّ الۡعَزِيۡزُ بیشک تمہارا پروردگار طاقت ور بھی ہے اور غالب بھی۔ وہ جس طرح چاہے کسی قوم کو ہلاک کر دے، اس کے راستے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اس نے کسی قوم کو طوفان کے ذریعے ہلاک کیا، کسی کو تیز گرم ہوا بھیج کر تباہ کیا اور کسی کو چیخ اور زلزلہ بھیج کر نابود کر دیا۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے اور جو چاہے کر گزرتا ہے۔

ظالموں کی ہلاکت

فرمایا اللہ کی وحدانیت کے انکار اور نبی کی مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا۔ وَاَخَذَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ اور پکڑ لیا ظلم کرنے والوں کو چیخ نے۔ اوپر سے چیخ آئی اور جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے نیچے سے زلزلہ بھی آیا۔ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ پس ہو گئے وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرنے والے۔ جب زلزلہ آتا ہے تو لوگوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں اور وہ اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ قوم ثمود کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے فرمایا وہ ایسے ہو گئے كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا گویا کہ وہ ان بستیوں میں کبھی آباد ہی نہ تھے۔ ان کی تمام بستیاں ویران ہو گئیں اور وہاں کوئی فرد بشر نظر نہیں آتا تھا حالانکہ ان کے علاقے میں ایک

ہزار ساٹھ سو قصبات اور شہر آباد تھے۔ یہ ظلم کا نتیجہ تھا، ظلم میں کفر و شرک سرِ فہرست ہیں۔ نبی کی توہین، شعائر اللہ کی توہین اور جزائے عمل کے انکار کا نتیجہ اُن کی تباہی کی صورت میں نکلا۔ اُن کے بڑے بڑے محلات تھے جو ویران ہو گئے اور اُن میں بسنے والا کوئی متنفس وہاں باقی نہ رہا۔ اللہ نے تمام نافرمانوں کو ہلاک کر دیا۔

سامان عبرت اور تنبیہ

اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والوں کے لیے باعث عبرت اور تنبیہ بنا دیا ہے۔ فرمایا اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ قوم ثمود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، اُس کی توحید کا انکار کیا اور نبی کی نافرمانی کی اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ خبردار! دوری اور ہلاکت ہے قوم ثمود کے لیے۔ بُعد کا معنی دُوری ہے یعنی وہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے دُور ہو گئے اور بُعد کا معنی ہلاکت بھی آتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ صفحۂ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے یہ تو اس دنیا میں عذاب آیا اور آخرت کا مرحلہ ابھی آگے ہے۔ غرضیکہ تنبیہ کی جا رہی ہے کہ جو بھی رب تعالیٰ کے ساتھ کفر کرے گا، وہ بچ نہیں سکے گا۔ یہ نہ سمجھیں کہ یہ سزا صرف قوم عاد یا قوم ثمود کے لیے تھی بلکہ ہر نافرمان ایسی ہی سزا میں پکڑا جا سکتا ہے۔ مالک الملک اپنے قانونِ امہال کے مطابق کسی فرد یا قوم کو مہلت دیتا رہتا ہے مگر جب وہ مہلت پوری ہو جاتی ہے، تو اس کی گرفت آجاتی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا
قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾
فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ
مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ
لُوْطٍ ﴿۷۰﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ
وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا
عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾
قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ
عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا
ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى
يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ
اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ
قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ
مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

ترجمہ: اور البتہ تحقیق آئے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر۔ انہوں نے کہا سلام۔ ابراہیم علیہ السلام بولے، سلام ہے پس نہ

حضرت (ابراہیم علیہ السلام) کچھ زیادہ دیر نہ کی کہ لے آئے ایک تلا
ہوا بچھڑا (۶۹) پھر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اُس کی طرف نہیں
پہنچتے ہیں تو اوپرا سمجھا اُن کو اور محسوس کیا اُن کی طرف سے
خوف۔ وہ کہنے لگے، نہ خوف کھا، بیشک ہم بھیجے ہوئے ہیں
قومِ لوط کی طرف (۷۰) اور اُن کی بیوی کھڑی تھی، پس وہ ہنس
پڑی اور اُس کو ہم نے خوشخبری دی اسحاق (بیٹے) کی، اور
اسحاق کے بعد یعقوب (پوتے) کی (۷۱) وہ کہنے لگی تعجب
ہے میرے لیے کہ اب میں جنوں گی اور میں بڑھیا ہوں۔
اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے۔ یہ تو البتہ عجیب چیز ہے (۷۲)
وہ کہنے لگے۔ کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم پر، اللہ کی
رحمت اور اُس کی برکتیں ہیں تم پر اے اہل بیت! بیشک
وہ تعریفوں والا اور بزرگ ہے (۷۳) پس جب دور ہوگیا ابراہیم
علیہ السلام سے خوف اور اُن کو خوشخبری حاصل ہوگئی، تو وہ
جھگڑنے لگے ہمارے ساتھ قومِ لوط کے بارے میں (۷۴) بیشک
ابراہیم علیہ السلام البتہ بڑے بردبار (نرم دل) اور رجوع رکھنے
والے تھے (۷۵) (ارشاد ہوا) اے ابراہیم علیہ السلام! چھوڑ دو
اس بات کو۔ بیشک آچکا ہے تیرے رب کا حکم اور
ان لوگوں کے پاس آنے والا ہے ایسا عذاب جس کو ٹالا
نہیں جا سکتا (۷۶)

ربطِ آیات گذشتہ کئی دروس سے مختلف انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا تذکرہ ہو رہا ہے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو یہی نصیحت کی کہ لوگو! اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگو

اور اسی کی طرف رجوع رکھو۔ اِن نافرمان قوموں پر عذاب کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ قومِ نوح طوفان میں تباہ ہوئی، قومِ ہود کو تیز آندھی نے آپکڑا اور صالح علیہ السلام کی قوم کے لیے اُوپر سے چیخ اور نیچے سے زلزلہ آیا جس نے ساری قوم کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اصطلاح میں یہ تذکیر بایام اللہ ہے۔ یہ لفظ آگے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں آرہا ہے اور دوسری جگہوں پر بھی موجود ہے۔ تذکیر کا معنے نصیحت پکڑنا ہے اور مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شکر گزار لوگوں کے انعامات اور نافرمانوں کی سزاؤں کا ذکر فرمایا ہے تاکہ لوگ ان واقعات سے عبرت پکڑیں اور نصیحت حاصل کریں۔ اسی سلسلے میں لوط علیہ السلام کی قوم کا تذکرہ آرہا ہے۔ اِس نافرمان قوم کو بھی اللہ نے ہلاک کیا، تاہم واقعہ کی ابتدا میں تمہید کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت اور آپ کے گھرانے کا تذکرہ ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو بشارت

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ البتہ تحقیق آئے ہمارے بھیجے ہوئے یعنی فرشتے اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى وہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر آئے۔ دراصل یہ فرشتے قومِ لوط پر عذاب لے کر آئے تھے اور درمیان میں ابراہیم علیہ السلام کو بشارت بھی سنا کر گئے۔ یہاں پر ابراہیم علیہ السلام نے اُن کی میزبانی کا جو فریضہ انجام دیا، اُس کا ذکر بھی آگیا ہے۔

رسول انسانوں میں بھی ہوتے ہیں اور ملائکہ میں بھی۔ یہاں جن رسولوں کا ذکر ہے وہ فرشتے تھے اور تفسیری روایات میں ان کی تعداد مختلف بتائی گئی ہے۔ بعض نے تین، ______ بعض نے چار، بعض نے چھ اور بعض نے بارہ فرشتوں کا ذکر کیا ہے مگر کسی صحیح حدیث میں اِن کی تعداد ذکر نہیں کی گئی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ

یہ فرشتے جبرائیل، میکائیل، اور اسرافیل تھے۔ بہرحال وہ فرشتوں کی ایک جماعت تھی کیونکہ یہاں پر جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اور جو بشارت وہ لے کر آئے تھے اُس کے متعلق آگے موجود ہے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کو ان کے فرزند کی بشارت تھی۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ قوم لوط کی ہلاکت کی بشارت تھی جس پر ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو بڑی خوشی تھی کیونکہ اس قوم کے لوگ بڑے خبیث تھے جنہیں دنیا میں باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا تاہم صحیح بات یہی ہے کہ یہ خوشخبری اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کی ولادت کی خوشخبری تھی۔ اس ولادت سے آگے بہت بڑی نسل اور قوم آباد ہونے کا فیصلہ ہو رہا تھا، جن میں اللہ کے بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام بھی شامل ہیں۔ دوسری طرف ایک ناہنجار اور بدبخت قوم کو تباہ کیا جا رہا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی

فرمایا، ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر گئے قَالُوا سَلٰمًا انہوں نے کہا سلام۔ اور سلام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کہے السلام علیکم۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھایا تھا کہ جب فرشتوں کی جماعت میں جاؤ تو جا کر السلام علیکم کہو۔ اور جو کچھ وہ جواب دیں وہ آپکا اور آپکی نسل کا قیامت تک کیلئے جواب ہوگا۔ اور وہ جواب تھا علیکم السلام یا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ فرشتوں کے سلام کے جواب میں قَالَ سَلٰمٌ ابراہیم نے کہا سلام ہے۔ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا جواب زیادہ بہتر تھا۔ یہ جملہ اسمیہ ہے جو دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے اور جس کا مطلب ہے کہ ہر لمحہ، ہر دور اور ہر زمانے میں تم پر سلام ہو۔

ارشاد ہوتا ہے فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ابراہیم علیہ السلام کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہرے مگر ایک تلا ہوا بچھڑا لے آئے ابراہیم علیہ السلام بڑے مہمان نواز تھے۔ مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا

کھانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مہمان بھی حسین وجمیل نوجوان تھے، آپ نے ان کی خاطر مدارت کے لیے فوری انتظام کیا۔ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ مگر جب آپ نے دیکھا کہ مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں نَکِرَهُمْ آپ نے اس کو اوپرا سمجھا کہ کیا بات ہے، مہمان کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ اُس دور کا یہ دستور تھا کہ کوئی دشمن اپنے دشمن کا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی شخص کا نمک کھا کر اُس کے ساتھ دشمنی کرنا درست نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو بھی اسی قسم کا شبہ پیدا ہوا وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً اور آپ نے اُن کی طرف سے خوف محسوس کیا۔ کہنے لگے ہم تو ان کو نہایت تکریم کے ساتھ کھانا پیش کر رہے ہیں مگر یہ کھاتے نہیں۔ اگلی آیت میں یہ بھی آرہا ہے کہ اُس وقت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ بھی مہمانوں کی خدمت تواضع میں مدد کے لیے قریب ہی کھڑی تھیں۔

شاہ عبدالقادرؒ مفسر قرآن فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا خوف میں مبتلا ہونا طبعی امر تھا کیونکہ فرشتے اللہ کی طرف سے عذاب لے کر اور شان غضب اور انتقام کا مظہر بن کر قومِ لوط کی طرف جا رہے تھے اور اس کا اثر ابراہیم علیہ السلام کے قلب مبارک پر پڑ رہا تھا۔ جب فرشتوں نے آپ کو خوفزدہ دیکھا قَالُوْا لَا تَخَفْ کہنے لگے ڈرو نہیں۔ ہم فرشتے ہیں اور کھانا نہیں کھاتے اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ہمیں تو قومِ لوط کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ انہیں سزا دیں۔

اس موقع پر بعض مفسرین نے کئی باتیں بیان کی ہیں جن کے دلائل قوی نہیں ہیں، تاہم یہ باتیں تفسیری روایات میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک بات امام ابن کثیرؒ نے بھی اپنی تفسیر میں بیان کی ہے۔

کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے مہمانوں سے کھانا نہ کھانے کی وجہ پوچھی

تو وہ کہنے لگے کہ ہم بغیر قیمت ادا کیے کھانا نہیں کھاتے۔ آپ نے فرمایا اچھا پھر اس کھانے کی قیمت ادا کر دو۔ فرشتوں نے قیمت دریافت کی تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ کھانے کی قیمت یہ ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے اللہ کا نام لو یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہو اور کھانا کھا چکنے کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو۔ اس پر فرشتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا کہ اس شخص کا اخلاق اتنا عالی ہے۔ جبھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا خلیل بنا رکھا ہے ایک اور عجیب و غریب بات بھی بیان کی جاتی ہے کہ جب فرشتے کھانا کھانے کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے تو جبرائیل علیہ السلام نے اُس تلے ہوئے بچھڑے کی طرف اشارہ کیا تو اللہ نے اُس کو زندہ کر دیا اور وہ اٹھ کر صحن میں بندھی ہوئی اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس قسم کی باتیں بطور معجزہ تو پیش آسکتی ہیں تاہم ایسے واقعات کی کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے۔

مسئلہ علم غیب

اس واقعہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علم غیب کی نفی بھی ہوتی ہے۔ آپ اُن فرشتوں کو انسان سمجھ رہے تھے اور اسی لیے انہیں کھانا بھی پیش کیا۔ پھر جب انہوں نے کھانے کی طرف رغبت نہ کی تو آپ کو خوف بھی محسوس ہوا۔ ظاہر ہے کہ اُن کے فرشتے ہونے کا علم آپ کو اس وقت تک نہیں ہوا جب تک کہ آپ کو بتلایا نہیں گیا۔ آگے لوط علیہ السلام کے واقعہ میں بھی یہی بات آرہی ہے انہوں نے بھی فرشتوں کو انسان ہی سمجھا تو نہ صرف ابراہیم علیہ السلام بلکہ اللہ کے سارے انبیاء لوازمات بشریت کے ساتھ متصف ہوتے ہیں اور انسانیت کے لوازمات میں یہ ہے کہ کوئی بھی مخلوق علیم کل نہیں ہے۔ مخلوق کو اتنا ہی علم ہوتا ہے، جتنا خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ ذرے ذرے کا علم تو خدا تعالیٰ کا خاصہ ہے

وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ وہی ذات ہے جس کو ہر چیز کا علم ہے سورۃ یونس میں گزر چکا ہے "وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ" تیرے رب کے علم سے ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز غائب نہیں ۔ ہر چیز علمِ الٰہی میں بھی ہے اور لوحِ محفوظ میں بھی درج ہے ۔ علمِ غیب اللہ تعالیٰ کی شان ہے یہ کسی مخلوق کو حاصل نہیں ۔

بیٹے اور پوتے کی بشارت

جب ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی ، وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ تو ابراہیم علیہ السلام کی بیوی پاس ہی کھڑی تھی جب اُسے معلوم ہوا کہ مہمان انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں فَضَحِكَتْ تو وہ ہنس پڑی بمفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت سارہ اس لیے ہنسی تھیں کہ انہیں قومِ لوط جیسی غلیظ قوم کی ہلاکت کا پتہ چل گیا تھا آگے اللہ نے فرمایا فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ پھر ہم نے حضرت سارہ کو اسحاق بیٹے کی بشارت سنائی ۔ حضرت سارہؓ ابتداء ہی سے پسندیدہ اور اونچے درجے کی خاتون تھیں ، آپ مقربین الٰہی میں سے تھیں ۔ آپ کو ساری عمر بچے کی خواہش رہی یہاں تک کہ آپ کی عمر ننانوے ۹۹ سال کی ہو گئی اور اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی عمر مبارک ایک سو بیس ۱۲۰ سال کی تھی آپ کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہؓ سے اسماعیل علیہ السلام چودہ ۱۴ برس قبل پیدا ہو چکے تھے اور اس وجہ سے بھی حضرت سارہ کو اولاد کی شدید خواہش تھی ۔ بہر حال اس عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری دی اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نبی اور رسول ہو گا ۔ اور پھر فرمایا خوشی در خوشی کی بات یہ ہے کہ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ کہ اسحاق بیٹے کے بعد یعقوب پوتا بھی ہو گا ۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے ایک سو پچھتر ۱۷۵ برس عمر پائی اور اس دوران میں انہوں نے یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کو بھی پایا ۔

بیٹے کی خوشخبری سن کر حضرت سارہ کو سخت حیرت ہوئی قَالَتْ

یٰوَیۡلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوۡزٌ ہائے! میں بچہ کیسے جنوں گی جب کہ میں تو بوڑھی ہو چکی ہوں اور بانجھ ہوں وَھٰذَا بَعۡلِیۡ شَیۡخًا اور میرا یہ خاوند ابراہیمؑ بھی بوڑھا ہے۔ ساری زندگی بے اولاد گزر گئی ہے اِنَّ ھٰذَا لَشَیۡءٌ عَجِیۡبٌ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ اس عمر میں میرے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔

ابراہیم علیہ السلام کے اہل بیت

قَالُوۡۤا فرشتوں نے کہا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ کیا تمہیں اللہ کے حکم پر تعجب ہے۔ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور اس بوڑھی عمر میں بھی اولاد عطا کر سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا انعام تو یہ ہے کہ رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں اَھۡلَ الۡبَیۡتِ ابراہیم علیہ السلام کے اہل بیت پر۔ اہل بیت اور آل سے ابراہیم علیہ السلام کا گھرانہ مراد ہے۔ ہم درود شریف میں بھی پڑھتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰۤی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیۡتَ عَلٰۤی اِبۡرٰھِیۡمَ وَعَلٰۤی اٰلِ اِبۡرٰھِیۡمَ فرشتوں کی بات چونکہ حضرت سارہؓ سے ہو رہی تھی، اس لیے معلوم ہوا کہ اہل بیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیویاں بھی داخل ہیں۔ شیعہ حضرات حضور علیہ السلام کی بیٹی فاطمہؓ اور آپ کی اولاد کو اہل بیت میں شامل کرتے ہیں جب کہ حضور کی ازواج کو اس میں داخل نہیں کرتے۔ یہ غلط نظریہ ہے قرآن پاک کی آیتیں بیویوں کے حق میں نازل ہوئیں اور اولاد تو صلبی ہونے کی حیثیت سے ویسے ہی اہل بیت میں داخل ہے۔ بیوی کو اہل بیت سے خارج کرنا گمراہی کی بات ہے تو فرمایا، اے اہل بیت ابراہیمؑ! تم پر اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں۔ اِنَّہٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ بے شک اللہ تعالیٰ تعریفوں والا اور بزرگی والا ہے جس نے ابراہیم علیہ السلام

کے گھرانے پر مہربانی فرمائی، اُن کو دین کا علم عطا کیا، بزرگی دی، آپ کے خاندان کو وسعت عطا کی اور دنیا کے تمام کمال اس خاندان میں رکھ دیے۔ نبوت اور رسالت اس گھرانے کا طرۂ امتیاز ہے اللہ تعالیٰ نے اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں چار ہزار نبی اٹھائے اور پھر اسی خاندان کی دوسری شاخ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے اپنے آخری نبی اور رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اس لیے فرمایا کہ اس خاندان پر اللہ کی بے شمار رحمتیں اور برکتیں ہیں۔

قوم لوط سے متعلق گفتگو

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ جب ابراہیم علیہ السلام سے خوفزدگی دور ہوگئی وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى اور انہیں خوشخبری بھی حاصل ہوگئی يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ تو وہ قوم لوط کے بارے میں ہمارے ساتھ جھگڑا کرنے لگے۔ یہاں جھگڑے سے مراد محض بات چیت ہے۔ جو ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کی اور اپنی عرض پیش کی۔ آپ نے فرشتوں سے کہا کہ آپ قوم لوط کو ہلاک کرنے کے لیے آئے ہیں مگر ان میں تو مومن بھی موجود ہیں۔ فرمایا کیا تم ایسی بستی کو ہلاک کرو گے جس میں تین سو مومن بھی رہتے ہوں۔ فرشتوں نے کہا، ہم ایسی بستی کو تباہ نہیں کریں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے دو سو مومنوں کا ذکر کیا، پھر تیس مومن حتیٰ کہ فرمایا اگر ایک مومن ہو تو فرشتوں نے پھر بھی انکار کیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ وہاں تو خود لوط علیہ السلام اور اُن کی مومنہ بیٹیاں بھی ہیں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا دراصل ابراہیم علیہ السلام کی خواہش تھی کہ کسی طرح عذاب ٹل جائے اور اُس قوم کو کچھ مزید مہلت مل جائے۔ اُن کی یہ ہمدردی اس لیے تھی اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ کہ بیشک ابراہیم علیہ السلام بڑے بردبار اور تحمل والے تھے۔ آپ اَوَّاهٌ یعنی آہ کرنے والے تھے۔ اس سے

آپ کی نرم دلی کی طرف اشارہ ہے کہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر آپ پریشان ہو جاتے تھے۔ سورۃ ابراہیم میں آپ کی دعا مذکور ہے فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي "جس نے میری اتباع کی وہ میرے گروہ میں شامل ہو گیا" وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ "اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے"۔ یہ آپ کی نرم دلی کا ثبوت ہے۔ نیز فرمایا ابراہیم علیہ السلام مُنِيبٌ بھی تھے۔ یعنی آپ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع رکھنے والے تھے، آپ ہمیشہ انابت الی اللہ چاہتے تھے، اسی لیے آپ چاہتے تھے کہ کسی طرح قوم بچ جائے آپ لوط علیہ السلام اور ان کی بچیوں کے متعلق خاص طور پر فکرمند تھے۔

ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا اے ابراہیم اس خیال کو چھوڑ دو۔ إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ اب تیرے رب کا حکم یعنی فیصلہ آچکا ہے وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ان کے پاس ایسا عذاب آنے والا ہے جس کو لوٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ لوگ سرکشی میں حد سے بڑھ چکے ہیں اور اب ان کے لیے عبرتناک سزا کا وقت آچکا ہے۔ اب آپ ان کی سفارش نہ کریں اور انہیں عذاب کا مزا چکھنے دیں۔ یہ فرشتوں کا جواب تھا۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ
ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۸﴾ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ
يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۖ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ
السَّيِّاٰتِ ۚ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۖ اَلَيْسَ مِنْكُمْ
رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ
بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾ قَالَ
لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾
قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ
اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۖ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۖ اِنَّ
مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۖ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾
فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا
عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً
عِنْدَ رَبِّكَ ۖ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ ع النصف ۸

ترجمہ :۔ اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے لوط علیہ السلام

کے پاس، غمگین ہوگئے وہ اُن کی وجہ سے اور اُن کا دل تنگ ہوا، اور کہنے لگے یہ بہت مشکل دن ہے (۷۷) اور آئی اُن کی قوم اُن کے پاس دوڑتی ہوئی، اور اس سے پہلے وہ کرتے تھے بُرائیاں۔ تو کہا لوط علیہ السلام نے۔ اے میری قوم کے لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہارے لیے پاک ہیں۔ ڈرو اللہ سے اور نہ رسوا کرو مجھے مہمانوں کے بارے میں۔ کیا تم میں کوئی سمجھ والا انسان نہیں ہے (۷۸) کہنے لگے وہ البتہ تحقیق تو جانتا ہے کہ نہیں ہے ہمیں تیری بیٹیوں میں کوئی رغبت۔ اور بیشک تو جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں (۷۹) کہا (لوط علیہ السلام نے) کاش اگر میرے اندر قوت ہوتی یا میں پناہ پکڑتا کسی مستحکم کنارے کی طرف (۸۰) کہا (فرشتوں نے) اے لوط علیہ السلام! بیشک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ ہرگز نہیں پہنچ سکیں گے تیری طرف۔ پس تو اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے حصے میں نکل جا، اور نہ پلٹ کر دیکھے تم میں سے کوئی بھی، مگر تیری بیوی۔ بیشک اس کو پہنچنے والی ہے وہی سزا جو اُن کو پہنچے گی۔ بیشک اس کے وعدے کا وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں ہے (۸۱) پس جب آیا ہمارا حکم، کر دیا ہم نے اُن (بستیوں) کے اُوپر والے حصے کو نیچے، اور ہم نے برسائے اُن پر پتھر کھنگر تہ بہ تہ (۸۲) نشان لگائے ہوئے تیرے رب کے پاس۔ اور نہیں تھے وہ ظالموں سے زیادہ دُور (۸۳)

ربطِ آیات: گذشتہ آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی جانے والی بشارت کا ذکر

تھا اور پھر لوط علیہ السلام اور آپ کی قوم کا تذکرہ تھا، دراصل مضمون کا یہی حصہ ہے جو سابقہ موضوع کے تسلسل میں ہے بعض سابقہ انبیاء اور اُن کی قوموں کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور پھر اُن کی نافرمانی کی بنا پر اُن قوموں پر جو عذاب آیا اس کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ اب لوط علیہ السلام کے واقعہ میں ———— آپ کی قوم پر عذاب کی کیفیت بیان ہو رہی ہے۔

یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر اکٹھا آیا ہے۔ جو فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے لیے بشارت لائے تھے۔ وہی قوم لوط پر عذاب برپا کرنے پر بھی مامور تھے۔ لوط علیہ السلام رشتے میں ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ دونوں حضرات اکٹھے ہی بابل سے آئے تھے۔ راستے میں اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو نبوّت اور رسالت عطا فرمائی اور اُن کو بحیرہ میت کے کنارے آباد سدوم، عامورہ، دوامہ اور سوآبہ وغیرہ بستیوں کے باشندوں کو تبلیغ کرنے پر مامور فرمایا۔ یہ نہایت سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ پانی کی فراوانی، کھیتیاں اور باغات عام تھے۔ اس علاقے کی کل آبادی کم و بیش چھ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی لوط علیہ السلام نے اس قوم میں لمبا عرصہ گزارا، اسی قوم میں شادی کی اور پھر دو بچیاں بھی پیدا ہوئیں اور یہیں وہ سن بلوغت... کو پہنچیں اِن لوگوں کی بدبختی تھی کہ آپ کی دو بچیوں کے علاوہ قوم میں سے کوئی فرد بھی آپ پر ایمان نہ لایا، حتیٰ کہ بیوی بھی محروم ہی رہی۔ قوم نوح، قوم عاد اور ثمود کی طرح اس قوم کی عام بیماری بھی کفر اور شرک ہی تھی۔

لواطت کی بیماری

مختلف قوموں میں مختلف اخلاقی بیماریاں بھی موجود رہی ہیں مثلاً

قوم عاد میں غرور و تکبر تھا۔ قوم ثمود بھی اسی بیماری میں مبتلا تھی جب کہ شعیب علیہ السلام کی قوم ناپ تول میں کمی کی مجرم تھی اسی طرح قوم لوط کی اخلاقی بیماری لواطت تھی۔ یہ لوگ شہوت رانی کے لیے مردوں کی طرف التفات کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو فرمایا بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ (الشعراء) تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔ قضائے شہوت کے لیے جو چیز اللہ نے فطری طور پر مقرر کی ہے تم اُسے چھوڑ کر غیر فطری چیز کو اختیار کرتے ہو۔ اللہ کا فرمان ہے کہ لواطت کی بیماری سب سے پہلے اسی قوم میں آئی جسے شیطان نے جاری کیا۔ یہ زنا سے بھی بڑا جرم ہے کیونکہ یہ بد فطرتی ہے۔ لوط علیہ السلام کے سمجھانے کے باوجود یہ لوگ نہ تو آپ پر ایمان لائے اور نہ ہی اس قبیح حرکت سے باز آئے بلکہ اس پر اصرار کرتے رہے۔ بالآخر دیگر نافرمانوں کی طرح اس قوم پر بھی خدا تعالیٰ کا قہر و غضب نازل ہوا اور ساری قوم ہلاک ہو گئی

فرشتوں کی آمد

ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کی آمد کا تذکرہ گزشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ ان کا اگلا ہدف لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کرنا تھا اور آج کی آیات میں اسی بات کا ذکر ہے ارشاد ہوتا ہے وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ یہ فرشتے حسین و جمیل نوجوان لڑکوں کی شکل میں تھے۔ بستی میں آکر انہوں نے لوط علیہ السلام کا پتہ پوچھا کہ ان کے مہمان ہیں جب ان کے پاس پہنچے سِیْٓءَ بِهِمْ تو لوط علیہ السلام غمگین ہو گئے وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا اور ان کا دل تنگ ہو گیا۔ ذرع دراصل بازو کو کہتے ہیں مگر اس کا کنایہ دل پر ہوتا ہے۔ لوط علیہ السلام بڑے تنگدل ہوئے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ آپ کی قوم کے لوگ بڑے خبیث ہیں اور یہ مہمانوں پر دست درازی کریں گے۔

یہاں بھی وہی ابراہیم علیہ السلام والی بات کا اعادہ ہو رہا ہے نہ ابراہیم کو علم ہو سکا اور نہ لوط علیہ السلام نے جانا کہ یہ فرشتے ہیں۔ وہ تو انہیں انسان سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ فرشتے ہیں تو آپ کو غمگین اور تنگدل ہونے کی کیا ضرورت ہے معلوم ہوا کہ اللہ کے نبی غیب دان نہیں ہوتے بہر حال لوط علیہ السلام نے قوم کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے فرمایا وَقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ یہ تو بڑا مشکل دن آگیا ہے۔ ابھی آپ اسی سوچ و بچار میں تھے وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ کہ آپ کی قوم آپ کی طرف دوڑتی ہوئی آئی۔ يُهْرَعُوْنَ اگرچہ مجہول کا صیغہ ہے مگر معنی معروف ہی ہے کہ وہ لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ نوجوان لڑکوں کی آمد کی خبر ملی تو فوراً برائی کے ارادے سے آ گئے اور ان کی عادت یہ تھی وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ کہ اس سے پہلے بھی برائیوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ سورۃ العنکبوت میں ہے وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ اپنی مجلسوں میں برائیاں کرتے تھے۔ گویا برائی کے کھلے عام ارتکاب یا اس کے علی الاعلان اعتراف کرنے میں بھی انہیں کوئی شرم و حیا نہیں تھی۔ اس خلافِ وضع فطری برائی کے علاوہ وہ مسافروں کو لوٹ لیتے تھے، ان پر پتھر پھینکتے تھے، کبوتر بازی کے شوقین تھے اور طرح طرح کی فضول حرکتیں کرتے تھے۔

لوط علیہ السلام کی پیشکش

بائیبل کی روایت کے مطابق قوم کے لوگ لوط علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جو مہمان تمہارے پاس آئے ہیں انہیں ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اپنی قبیح خواہش کی تکمیل کر سکیں۔ لوط علیہ السلام سخت پریشان ہوئے قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ کہنے لگے اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں۔ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ یہ تمہارے لیے

پاکیزہ ہیں۔ اِن سے نکاح کرکے اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کرلو کیونکہ اللہ نے انہیں اسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر بیٹیوں سے لوط علیہ السلام کی اپنی بیٹیاں مراد ہیں تو قوم کو برائی اور بے حیائی سے بچانے کیلئے یہ پیشکش بھی درست تھی، مگر صحیح بات یہ ہے کہ اس سے لوط علیہ السلام کی اپنی بیٹیاں مراد نہیں تھیں کیونکہ آپ کی تو صرف دو ہی بیٹیاں تھیں اور وہ لوگ بہت زیادہ تعداد میں تھے تو اس پیشکش سے آپ کی مراد یہ تھی کہ اے بدنصیبو! قوم کی بچیاں میری بچیاں ہیں کیونکہ نبی ساری قوم کا باپ ہوتا ہے۔ اللہ نے اِن بچیوں کو تمہاری شہوت کے لیے پیدا فرمایا ہے، لہٰذا تم نکاح کرکے ان سے استفادہ حاصل کرو اور غیر فطری کام سے باز آجاؤ۔ آپ نے فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ پس اللہ سے ڈر جاؤ اور یہ گندے کام نہ کرو۔ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ اور مجھے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو۔ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ کیا تم میں کوئی بھی سمجھ بوجھ والا آدمی نہیں ہے؟ کیا کوئی نیک چلن اور دانا آدمی نہیں ہے؟

قوم کیا تکرار

قَالُوْا قوم کے لوگ کہنے لگے لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ اے لوط علیہ السلام! آپ جانتے ہیں کہ آپکی بیٹیوں میں ہمارے لیے کوئی رغبت نہیں وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ اور آپ ہمارے ارادے کو بھی جانتے ہیں۔ ہم تو اپنی خواہش ضرور پوری کریں گے۔ اس پر لوط علیہ السلام سخت پریشان ہوگئے اور قَالَ فرمایا لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً کاش میرے پاس تمہارے مقابلے کیلیے طاقت ہوتی اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ یا میں مستحکم کنارے کی طرف پناہ پکڑتا۔ چونکہ آپ اُس قوم کے فرد نہیں تھے اس لیے نہ کوئی آپ کی برادری تھی اور نہ ہی کوئی اہل ایمان موجود تھے جو آپ کی مدد کرتے، تو اس لیے آپ نے نہایت اضطراب کی حالت میں اپنی زبان سے فرمایا، کاش کہ میں تمہارے مقابلے کی طاقت رکھتا۔

محدثین اور مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اُس وقت لوط علیہ السلام کے

ذہن میں یہ بات تھی کہ خدانخواستہ اگر ان کے مہمانوں کی تذلیل ہوئی تو وہ مہمان اس قوم کے متعلق کیا نظریہ قائم کریں گے۔ چنانچہ یہ بات آپ نے مہمانوں کی دل جوئی کے لیے کی تاکہ وہ سمجھ جائیں کہ ہمارا میزبان ہمارے دفاع کی کوشش کر رہا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک بھی ہے رَحِمَ اللّٰهُ لُوْطًا لَقَدْ كَانَ يَأْوِيْ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے، وہ کو بڑے مضبوط رکن کی طرف پناہ پکڑنے والے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں تھے، مگر یہ کلمات اضطراری حالت میں ادا کر رہے تھے۔ تاہم انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسہ تھا۔

فرشتوں کی طرف سے تسلی

سورۃ قمر میں موجود ہے کہ جب قوم کے لوگ ہجوم کر کے آگئے وہ اندر داخل ہونا چاہتے تھے اور لوط علیہ السلام ان کو روک رہے تھے تو جبرائیل علیہ السلام نے حضرت لوط علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر انہیں پیچھے ہٹایا حالانکہ آپ کو علم ہی نہیں تھا کہ اس کا مہمان جبرائیل علیہ السلام ہے۔ پھر جبرائیل نے اپنا ذرا سا پر ہلایا تو اللہ نے فرمایا فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ کہ ہم نے ان کی آنکھیں ہی مٹا دیں اور وہ سب اندھے ہوگئے۔ مگر اس کے باوجود وہ ٹٹول ٹٹول کر مہمانوں کو تلاش کرتے رہے۔ پھر قَالُوْا فرشتوں نے کہا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ اے لوط! بےشک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ یہ آپ تک ہرگز نہیں پہنچ سکیں گے۔ لہٰذا آپ پریشان نہ ہوں۔ ساتھ ہی اللہ کا حکم ہوا فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے حصے میں چلے جائیں وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے مگر آپ کی بیوی۔

لوط علیہ السلام کی بیوی

بائیبل کے بیان کے مطابق لوط علیہ السلام کی بیوی بھی آپ کے ساتھ ہی بستی سے نکل کھڑی ہوئی تھی مگر راستے میں اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور کہا کہ اللہ نے میری قوم کو اسی وقت مسخ کر دیا۔ اتنی بات تھی کہ وہ عورت نمک اور پتھر کا کھمبا بن گئی۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ جب آپ کی بیوی نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو اس پر اللہ کی جانب سے ایک پتھر برسا اور وہ ہلاک ہو گئی۔ وہ کافرہ تھی اور در پردہ کافروں کے ساتھ ساز باز کر رکھی تھی۔ اگرچہ وہ لوط علیہ السلام کے نکاح میں تھی مگر ایمان نہیں لائی تھی اور منافقوں کی طرح آپ کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں مومن اور کافرہ کا نکاح درست تھا۔ ہماری امت کے ابتدائی دور میں بھی ایسا نکاح روا تھا مگر بعد میں اسے ممنوع قرار دیدیا گیا۔ اب کسی مومن آدمی کا نکاح کسی کافرہ یا مشرکہ سے نہیں ہو سکتا۔ بعض فرماتے ہیں کہ آپ کی بیوی آپ کے ساتھ نکلی ہی نہیں تھی۔ تاہم اللہ نے فرمایا اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ کہ اس عورت پر بھی وہی آفت آنے والی تھی جو باقی قوم کے مقدر میں ہو چکی تھی۔ اور عذاب کی آمد کے متعلق اللہ نے فرمایا اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ بیشک ان کے وعدے یعنی عذاب کے نازل ہونے کا وقت صبح مقرر کیا گیا تھا۔ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ کیا صبح قریب نہیں ہے ہے۔ فرشتوں نے لوط علیہ السلام کو تسلی دی کہ صبح کے وقت ان کی مہلت پوری ہو جائیگی اور پھر ان پر عذاب نازل ہو جائے گا۔

عذاب الٰہی آگیا

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق لوط علیہ السلام اپنی بچیوں کو لے کر رات کے آخری حصے میں بستی سے نکل گئے اور پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا جب کافی دور چلے گئے تو صبح کا وقت بھی ہو گیا۔ پھر کیا ہوا۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جب ہمارے عذاب کا حکم آگیا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا تو ہم نے ان بستیوں کے اوپر والے حصے کو نیچے اور نیچے والے کو اوپر کر دیا ساری بستیوں کو الٹ کر رکھ

دیا کیونکہ وہ لوگ کام ہی الٹے کرتے تھے ، کے علاوہ فرمایا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ہم نے اِن پر پتھروں کی بارش برسائی جو مٹی کے پکے ہوئے کنکروں کی صورت میں تھے ۔ اور مَّنضُودٍ یہ پتھر تہ در تہ برس رہے تھے مُّسَوَّمَةً وہ پتھر نشان زدہ بھی تھے عِندَ رَبِّكَ تیرے پروردگار کی طرف سے ہر پتھر پر اللہ نے نشان لگا دیے تھے یا نام لکھ دیے تھے کہ یہ فلاں سردار کے سر پر لگے گا ، یہ فلاں کی پشت میں پیوست ، ہو جائیگا اور یہ فلاں کا خاتمہ کر دیگا ۔ چنانچہ صبح کے وقت سارا علاقہ درہم برہم ہو گیا ۔ یہ علاقہ بحر میت کے کنارے پر واقع ہے اور اس کے پانی میں اللہ تعالیٰ نے ایسی خرابی پیدا کر دی کہ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود اب تک بھی ٹھیک نہیں ہوا ۔ تو اللہ تعالیٰ نے کفر ، شرک اور لواطت کی بیماریوں کی وجہ سے ان کو ایسی مہلک سزا میں مبتلا کیا کہ چھ لاکھ کی آبادی میں سے ایک فرد بھی زندہ نہ بچا ۔ سوائے لوط علیہ السلام اور آپ کی بچیوں کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ یہ عذاب ظالموں سے کچھ زیادہ دور نہیں ۔ اس سے پہلی اقوام عاد ، ثمود ، قوم نوح وغیرہ پر بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت آگئی ۔ یہی بات مکے اور عرب کے مشرکین کو بھی سمجھائی جا رہی ہے اور بعد میں آنے والوں کو بھی بتائی جا رہی ہے کہ یاد رکھو ! اللہ کی سزا ظالموں سے دور نہیں ہے ۔ اگر پہلی قومیں اس قسم کے ظلم کی وجہ سے ہلاک ہوئیں تو ایسی سزا تم پر بھی آسکتی ہے ۔ عرب لوگ بحر میت کے کنارے سے تجارتی سفر کے دوران گزرتے تھے ، شام ، فلسطین یا مصر کے لیے یہی راستہ تھا ، تو اِن اُجڑی ہوئی بستیوں کو دیکھتے تھے ۔ اللہ نے اُن کو متنبہ کیا کہ دیکھو ! اِن لوگوں نے نافرمانی کی تو صفحہ ہستی سے ناپید ہو گئے ، اگر تم بھی شرک ، کفر یا معاصی پر اصرار کرو گے ، تو خدا کا عذاب دور نہیں ہے وہ کسی وقت بھی نازل ہو سکتا ہے ۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا
اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ
وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ
عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿٨٤﴾ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ
وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٨٥﴾ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ
لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم
بِحَفِيظٍ ﴿٨٦﴾

ترجمہ :- اور مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب (علیہ السلام)
کو (ہم نے رسُول بنا کر بھیجا) انہوں نے کہا ، اے میری قوم
کے لوگو ! عبادت کرو اللہ کی ، نہیں ہے تمہارے لیے کوئی
معبود اُس کے سوا ۔ اور نہ کمی کرو ماپ اور تول میں بیشک
میں دیکھتا ہوں تم کو بہتری میں ۔ اور مجھے خطرہ ہے تم پر
گھیرنے والے دِن کے عذاب کا (۸۴) اور اے میری قوم
کے لوگو ! پورا کرو ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ ، اور
لوگوں سے اُن کی چیزوں کو کم نہ کرو ۔ اور زمین میں فساد کرتے
ہوئے مت چلو (۸۵) اللہ کا چھوڑا ہوا بہتر ہے تمہارے لیے
اگر تم ایمان والے ہو ۔ اور نہیں ہوں میں تم پر کوئی نگہبان (۸۶)

ربط آیات

اس سورۃ مبارکہ میں تاریخ انبیاء علیہم السلام کے ضمن میں حضرات نوح، ہود، صالح اور لوط علیہم السلام اور ان کی قوموں کا حال بیان ہو چکا ہے اس بات کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے کہ اللہ کے نبیوں نے حق تبلیغ ادا کرنے اور اپنی اپنی قوموں کو سمجھانے میں کتنی محنت اور کوشش کی اور پھر ان قوموں کا ردِعمل کیا ہوا، اور وہ کس طریقے سے دردناک عذاب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوئے۔ اب اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکرہ ہو رہا ہے۔ آپ کا ذکر اس سورۃ مبارکہ کے علاوہ سورۃ اعراف میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ سورۃ شعراء اور بعض دیگر سورتوں میں بھی آپ کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام

ارشاد ہوتا ہے وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ وَاِلٰی مَدْیَنَ کا عطف بھی حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کے ابتدائی الفاظ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا کے ساتھ ہے۔ گویا یہاں پر یہ الفاظ محذوف ہیں اور پورا مفہوم یہی ہے کہ ہم نے شعیب علیہ السلام کو مدین کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

مدین حجاز سے شمال مغرب اور فلسطین سے جنوب کی طرف خلیج عقبہ اور بحر احمر کے کنارے ایک مشہور شہر اور تجارتی منڈی تھا۔ یمن یا مکے سے شام یا مصر کو جانے والے قافلے یہیں سے گزرتے تھے کیونکہ یہ بستی ایک بڑی شاہراہ پر واقع تھی۔ مدین کی بستی دراصل ایک شخص مدین ہی کے نام پر موسوم تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ آپ کی بیویاں سارہ اور ہاجرہ تو مشہور ہیں۔ تاہم آپ کی دیگر بیویاں بھی تھیں جن میں سے مدین اپنی ماں قطورا کے بطن میں سے تھے۔ پھر اسی نام سے شہر، قبیلہ اور قوم بھی مشہور ہو گئی جیسا کہ اُس زمانہ میں اکثر ایسا ہوتا تھا۔

حضرت شعیب علیہ السلام اسی قوم مدین کے فرد تھے۔ بائبل میں آپ کا نام حباب اور یپرو بھی ذکر کیا گیا ہے تاہم قرآن نے آپ کا نام شعیب بتایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعیب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دو قوموں کی طرف مبعوث فرمایا تھا ایک اصحاب مدین دوسرے اکیہ والے۔ ایکہ جنگل کو کہتے ہیں اور یہ مدین کے قریب ہی واقع تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ایکہ اور مدین والے ایک ہی قبیلہ کے لوگ تھے تاہم زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مدین اور ایکہ والے الگ الگ خاندان تھے اور اللہ نے شعیب علیہ السلام کو ان دونوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

مؤرخین اور مفسرین میں شعیب علیہ السلام کی شخصیت کے متعلق قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ شعیب علیہ السلام اللہ کے وہی نبی ہیں جن کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس برس تک قیام کیا تھا اور پھر ان کی بیٹی سے نکاح بھی کیا تھا۔ تاہم بعض کہتے ہیں کہ جن کی خدمت میں موسیٰ علیہ السلام رہے تھے، وہ خود شعیب علیہ السلام نہیں تھے بلکہ آپ کے بھتیجے یا بھانجے تھے تاہم مشہور یہی ہے۔

شعیبی سے کلیمی دو قدم ہے

کہ آپ شعیب علیہ السلام ہی تھے جو اللہ کے برگزیدہ نبی ہوتے ہیں۔
بہر حال موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکل کر جس مقام پہ آکر کنوئیں پر بیٹھے تھے اور پھر آپ نے شعیب علیہ السلام کے جانوروں کو پانی بھی پلایا تھا ابتداء میں سے مقدس مقام خیال کیا جاتا تھا۔

شعیب علیہ السلام کی دعوت

فرمایا ہم نے شعیب علیہ السلام کو مدین کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ تو باقی انبیاء علیہم السلام کی طرح آپکی تبلیغ کا مرکزی نقطہ بھی دعوت الی التوحید تھا۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا،

کہ اللہ کی عبادت کرو مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ کیونکہ اس کے خلاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تمہارا خالق، مالک، مربی، نافع، ضار، متصرف فی الامور، علیم کل، قادر مطلق صرف اللہ ہے۔ لہٰذا عبادت بھی اسی کی روا ہے۔ اُس کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت قطعی حرام، شرک، اور خدا کے ساتھ بغاوت کے مترادف ہے۔ اگلی آیات میں قوم کا جواب بھی آرہا ہے کہ انہوں نے شعیب علیہ السلام کی خیر خواہی کا جواب کس بھونڈے طریقے سے دیا۔ بہرحال اس واقعہ میں حضور علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کے لیے تسلی کا پہلو بھی ہے اور دوسری طرف توحید کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے حوصلہ افزائی بھی کی جارہی ہے شرک کی بیماری ساری قوموں میں پائی گئی ہے اور آج بھی دنیا کے اکثر و بیشتر لوگوں میں موجود ہے۔ اسی لیے سب سے پہلے اسی بنیادی عقیدے کی درستگی کی سعی کی گئی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی مکی زندگی کا اکثر حصہ ایسے ہی حالات میں گزارا۔ آپ بھی لوگوں کو یہی دعوت دیتے قُولُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا اے لوگو! کہو دو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فلاح پا جاؤ گے۔ آپ علیہ السلام نے ہر مقام اور ہر مجلس میں یہی بات کی۔ باقی انبیاء کی دعوت بھی یہی تھی۔ کیونکہ جب تک بنیادی عقیدہ توحید درست نہیں ہوگا، دین کی عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تمام انبیاء نے مسئلہ توحید کو ہی سمجھانے کے لیے سب سے اولین کوشش کی ہے اللہ کا فرمان ہے " فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ (الانبیاء) جو کوئی نیک اعمال کرے گا بشرطیکہ ایمان موجود ہو تو اس کی ناقدری نہیں کی جائیگی۔ غرضیکہ دین اور شریعت کی بنیاد ایمان اور توحید پر قائم ہے۔ اگر ایمان ہی خراب ہے، اس میں کفر اور شرک کی ملاوٹ ہے

توجہ [illegible] کوئی فائدہ نہیں، جب اس کا نتیجہ الٹا ہی نکلے گا۔ اسی لیے شعیب علیہ السلام نے فرمایا۔ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، اس کے بغیر کوئی بھی مستحق عبادت نہیں۔

ماپ تول میں کمی

شروع ہی سے ہر قوم میں کوئی نہ کوئی اخلاقی برائی رہی ہے جس سے اللہ کے نبی روکتے رہے۔ بعض قوموں میں غرور و تکبر کی بیماری تھی بعض میں فضول خرچی کی اور بعض میں لواطت کی۔ قوم شعیب چونکہ تجارت پیشہ لوگ تھے، ان کی اخلاقی برائی ماپ تول میں کمی تھی۔ اللہ کے نبی نے ایک طرف تو شرک اور کفر کی بیماری سے روکا اور توحید کا درس دیا، تو دوسری طرف ان کو تجارتی بداخلاقی سے بھی منع فرمایا۔ آپ نے واضح کیا کہ لین دین میں بندوں کے حقوق کا معاملہ ہوتا ہے جن کو پورا کرنا ضروری ہے اور کسی کی حق تلفی بہت بُرے نتیجے کا باعث بنتی ہے یہ ایسی برائی ہے کہ اس کو اللہ بھی اُس وقت تک معاف نہیں کرے گا، جب تک وہ بندہ راضی نہ ہو جائے جس کی حق تلفی ہوئی ہے۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو تلقین فرمائی وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ اے لوگو! ماپ اور تول میں کمی نہ کرو یعنی تجارتی لین دین میں ڈنڈی نہ مارا کرو۔ ایک دفعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بازار میں تشریف لے گئے تو آپ نے تاجروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا[1] يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ قَدْ وُلِّيتُمْ أَمْرَيْنِ هَلَكَتْ فِيهِ الْأُمَمُ السَّالِفَةُ قَبْلَكُمْ اے تاجروں کے گروہ! تمہیں دو چیزوں کا ذمہ دار بنایا گیا ہے جن کی وجہ سے پہلی کئی قومیں تباہ ہو گئیں۔ وہ دو چیزیں اَلْكَيْلُ وَالْمِيزَانُ ماپ اور تول ہیں حضور علیہ السلام نے جمع کا صیغہ فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قوم شعیب سے پہلے بھی کئی قومیں ناپ تول میں کمی کی بیماری میں مبتلا تھیں سورۃ مطففین میں بھی یہی بات سمجھائی گئی ہے کہ ناپ تول میں کمی کرنے

۱؎ ترمذی ص۱۹۶

والوں کے لیے ہلاکت و تباہی ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں ترازو [illegible] نے کا مقصد ہی یہ بیان فرمایا ہے اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ کہ اس میں تجاوز نہ کرو یعنی ماپ تول میں کمی نہ کرو۔

خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کسی کو کوئی چیز دیتے تو تولنے والے کو کہتے زِنْ وَارْجِحْ یعنی جب تولو تو کچھ زیادہ ہی دو، کمی نہ کرو۔ ماپ تول میں کمی کی بیماری آج کے معاشرے میں بھی موجود ہے۔ لوگ گز اور میٹر چھوٹے کر لیتے ہیں۔ بعض میٹر کے حساب سے کپڑا بیچتے ہیں مگر ناپتے وقت گز استعمال کرتے ہیں جس سے گاہک کو نقصان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کپڑا ماپتے وقت کھینچ کر ماپتے ہیں۔ گاہک جب کپڑا سینے کے لیے حساب کرتا ہے تو بیس انچ کی بجائے اٹھارہ انچ ہی نکلتا ہے اس طرح کی دھوکے کی کمائی قطعی حرام ہے اور مال حرام کا مقولہ یہ ہے کہ "مال حرام بود بجائے حرام رفت۔" اس قسم کا حرام مال بے برکت ہوتا ہے اور وہ حرام کاموں ہی میں صرف ہوتا ہے یا تو شادی اور غمی کی فضول اور غلط رسومات کی نذر ہو جاتا ہے یا عیش و عشرت کے کاموں میں ضائع چلا جاتا ہے۔ بیماری میں لگ جاتا ہے اور کبھی کسی مقدمے میں اڑ جاتا ہے بہر حال ماپ تول میں کمی کی بیماری ایک مہلک بیماری ہے جس سے شعیب علیہ السلام نے قوم کو منع فرمایا۔

حقوق العباد

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے اَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو توبہ کرنے سے کوئی گناہ معاف کر دیگا۔ مگر حقوق العباد کی معافی اُس وقت تک نہیں ہوگی جب تک صاحب حق خود معاف نہیں کرے گا۔ حضور علیہ السلام وفات سے چند روز قبل آخری بار منبر پر تشریف لائے۔ آپ نے وعظ و نصیحت کی اور حضرت فضل ابن

عباسؓ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا، اے لوگو! اگر کسی نے مجھ سے کوئی حق یعنی کوئی درہم و دینار لینا ہے تو آج لے لو، کیونکہ قیامت کے دن معاملہ بڑا دشوار ہوگا۔ آپ نے مردوں کے سامنے بھی بیان کیا اور عورتوں کو بھی وعظ کیا۔ بہر حال جو باتیں حضور علیہ السلام نے سخت تاکید کے ساتھ فرمائی ہیں ان میں حقوق العباد بھی شامل ہے۔

عذاب کا خطرہ

فرمایا، لوگو! ماپ تول میں کمی نہ کرو اِنِّیٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ میں تمہیں بہتری یعنی آسودہ حالی میں دیکھ رہا ہوں۔ جب تم تجارت کے ذریعے محنت کر کے کمائی کرتے ہو تو اس میں کسی کا حق ضائع نہ کرو۔ ایک طرف تو میں تمہیں اچھی حالت میں دیکھ رہا ہوں، اور دوسری طرف وَاِنِّیٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ میں خائف ہوں تم پر گھیر لینے والے دن کے عذاب سے مجھے ڈر ہے کہ قیامت والے دن تم ایسے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے کہ جس سے نکلنا کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ گویا کسی کی حق تلفی ایسی بری چیز ہے کہ اس کی وجہ سے انسان دائمی عذاب میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ میں ہے [illegible] ہے کہ کم ماپنے اور تولنے والوں کے لیے ہلاکت اور جہنم کی آگ ہے، ایسے لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب آگے دینے کا موقع آتا ہے تو اس میں کمی کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی چیز چار سیر تول کر دی۔ ہے تو وہ پونے چار سیر ہی نکلے گی، یا تو باٹ ہی کم ہوتے ہیں یا پھر تولتے ہیں کمی کر جاتے ہیں۔ یہ سب حرام ہے۔ فرمایا، میں تمہیں بہتری میں دیکھ رہا ہوں اور مجھے خوف ہے کہ تم گھیر لینے والے دن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

فساد فی الارض

تو شعیب علیہ السلام نے قوم کو خطاب فرمایا وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ اے میری قوم کے لوگو! پورا کرو

ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ. کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو. وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ اور نہ کم کرو لوگوں سے ان کی چیز. وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ اور زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے مت چلو، شرک، کفر، بدعات، رسومات باطلہ یہ سب فساد فی الارض ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں ہرگز پسند نہیں. فساد کے برخلاف اصلاح کی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو مانا جائے، قانونِ شریعت کی پابندی کی جائے، کھیل تماشے، حق تلفی، جرائم کاری، جوا بازی، رشوت خوری اور فضول رسومات سے اجتناب کیا جائے. چوری، ڈاکہ، دنگا فساد، زنا، قتل وغیرہ زمین میں فساد کا باعث بنتے ہیں. اللہ تعالیٰ کا فرمان تو یہ ہے "وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ" کہ وہ فتنہ و فساد کو پسند نہیں فرماتا. اللہ تعالیٰ تو عدل و انصاف اور حق رسی کو پسند کرتا ہے مگر آجکل تو ہر جگہ نا انصافی کا دور دورا ہے. کسی عدالت، تھانے، دفتر یا ادارے میں انصاف مشکل سے ہی ملے گا.

بقیت اللہ ہی بہتر ہے

آگے شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایک بہت بڑا اصول بتلایا ہے اے میری قوم! بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اللہ کا باقی بچہ ہوا ہی تمہارے لیے بہتر ہے إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم ایماندار ہو. اللہ تعالیٰ کے بقیہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دیے ہوئے مال میں تمام حقوق بشمولہ فرائض، واجبات وغیرہ ادا کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچ رہے اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے، وہی بابرکت ہے. اس کے علاوہ اگر حقوق ادا نہیں کرو گے یا مال کو ناجائز طریقے سے حاصل کرو گے، تو وہ حرام ہوگا اور بالآخر قابلِ مؤاخذہ ہوگا. اگرچہ بظاہر زیادہ مال میں زیادہ فائدہ نظر آئے گا مگر حقیقت اس کے برخلاف ہے ایسا مال حاصل کر کے یا مال کے حقوق ادا نہ کر کے انسان سخت خسارہ اٹھاتا ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے

کہ صحیح اور جائز حق ہی اپنے پاس رکھو اور کسی دوسرے شخص کا مال ناجائز طریقے سے کھانے کی کوشش نہ کرو۔ اگر کوئی شخص زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ قربانی نہیں کرتا، صدقہ فطر ادا نہیں کرتا، اقربا، یتیموں اور مسکینوں کا حق نہیں دیتا تو ایسا مال بے برکت ہوگا۔ بابرکت مال وہی ہوگا جس پر کسی دوسرے کا حق متعلق نہ ہو۔ فرمایا دیکھو! وَمَآ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ میں تم پر کوئی نگہبان نہیں ہوں۔ میں تو نصیحت ہی کرتا ہوں، تم سے زبردستی عمل نہیں کرا سکتا، لہٰذا میں تمہارے عمل کا ذمہ دار نہیں ہوں اس کی جوابدہی تمہیں خود ہی کرنا ہوگی۔ میں نے خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے اور ہر نبی ایسا ہی کرتا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ
اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ
الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ
عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ
اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰي مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ
اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ
اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ
اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾
وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ
وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

ترجمہ۔ کہا انہوں (شعیب کی قوم) نے، اے شعیب! کیا
تیری نماز تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں اُن چیزوں
کو جن کی پوجا کرتے تھے ہمارے آباؤاجداد، یا یہ کہ ہم کریں اپنے
مالوں میں جو چاہیں۔ بیشک تو بڑا بردبار اور نیک چلن ہے ﴿۸۷﴾
کہا (شعیب نے) اے میری قوم کے لوگو! یہ تبلاؤ کہ اگر
میں کھلی بات پر ہوں اپنے رب کی طرف سے اور اُس

نے مجھے روزی دی ہو اپنی طرف سے اچھی روزی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری مخالفت کروں اُن چیزوں کی طرف جن سے میں تمہیں منع کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا مگر اصلاح جتنی میں طاقت رکھتا ہوں۔ اور نہیں توفیق میرے اندر مگر اللہ کے ساتھ۔ اُسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اُسی کی طرف میں نے لوٹ کر جانا ہے (۸۸) اور اے میری قوم کے لوگو! میری مخالفت تمہیں آمادہ نہ کرے اس بات پر کہ پہنچے تمہیں وہ چیز جو پہنچی تھی نوح (علیہ السلام) کی قوم کو یا ہود (علیہ السلام) کی قوم کو یا صالح (علیہ السلام) کی قوم کو۔ اور نہیں لوط (علیہ السلام) کی قوم تم سے کچھ زیادہ دور (۸۹) اور بخشش طلب کرو اپنے پروردگار سے۔ پھر رجوع کرو اُس کی طرف۔ بیشک میرا پروردگار رحم کرنے والا اور محبت کرنے والا ہے (۹۰)

ربطِ آیات

حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی تبلیغ کا ذکر کیا کہ انہوں نے قوم کو غیر اللہ کی عبادت سے منع کیا اور ماپ تول میں کمی کے ذریعے لوگوں کی حق تلفی کرنے سے ڈرایا۔ یہ دونوں قبیح چیزیں ہیں۔ شرک اور کفر اعتقادی نجاست ہے جب کہ حقوق کا ضیاع اخلاقی گندگی ہے۔ شعیب علیہ السلام نے لوگوں کو سمجھایا کہ اپنے مال میں سے تمام حقوق ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے گا اُسی میں تمہارے لیے بہتری ہے اور اسی کا نتیجہ تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔ مگر آپکی قوم نے آپ کی اس پاکیزہ نصیحت کا نہایت ہی قبیح جواب دیا۔ آج کے درس میں قوم کا جواب ہے اور پھر حضرت شعیب علیہ السلام کی مزید تقریر ہے۔

شعیب علیہ السلام پر طعن

قوم نے جواب دیا قَالُوْا يٰشُعَيْبُ، کہنے لگے، اے شعیب علیہ السلام! اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ کیا تمہاری نماز تمہیں یہ

حکم دیتی ہے کہ ہم اُن چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباؤ و اجداد کرتے تھے۔ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا یا اپنے مال میں اپنی مرضی سے تصرف کرنے کو ترک کر دیں۔ گویا مکذبین نے شعیب علیہ السلام کو نماز کا طعنہ دیا کہ کیا تمہاری نماز تمہیں یہ کچھ سکھاتی ہے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر نماز سے مراد معروف نماز نہیں بلکہ اس سے شعیب علیہ السلام کا تقدس مراد ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر معنی یہ ہوگا کہ کیا تیرا تقدس، پرہیزگاری، بزرگی یا دعویٰ نبوت کا یہ تقاضا ہے کہ تو ہمیں دیرینہ مروجہ امور سے روکنا چاہتا ہے؟ مگر صحیح بات یہی ہے کہ یہاں پر نماز سے نماز ہی مراد ہے۔ کفار آپ پر اس لیے طعن بازی کر رہے تھے کہ دیگر تمام انبیاء کی طرح آپ بھی کثرت سے نماز ادا کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قرب دلانے والی عبادات میں سے نماز سب سے اہم ہے شعیب علیہ السلام تو رضائے الٰہی کے لیے نماز پڑھتے تھے مگر آپ کے مخالفین نے اسی کو اعتراض کا ذریعہ بنا لیا کہ بڑا نمازی بنا پھرتا ہے جو ہمیں اپنے معبودوں کی پوجا اور مال کے تصرف سے منع کرتا ہے۔

دیندار آدمیوں کو تضحیک کا نشانہ بنانا بے دین معاشرے کا ہمیشہ سے شغل رہا ہے اور آج بھی حالات کچھ مختلف نہیں۔ اس زمانے میں بھی ملحد قسم کے لوگ نمازی کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں کو نماز کا ہیضہ ہو گیا ہے جو ہر وقت نمازیں ہی پڑھتا رہتا ہے۔ اللہ کی وحدانیت کی بات کرو تو کہیں گے کہ اسے توحید کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ ہر وقت اسی کام میں لگا رہتا ہے، کوئی اور بات سوجھتی ہی نہیں کسی اور نیکی کی بات کرو تو اس پر ٹھٹھا کریں گے۔ غرضیکہ شعیب علیہ السلام کی قوم نے بھی آپ کو نماز کا طعن دیا کہ ان نمازوں کی وجہ سے تو ہمیں ہمارے پسندیدہ کاموں سے روکنا چاہتا ہے، اللہ کے نبی عقیدے، آسمانی شرائع اور مال کے کسب و تصرف کے

کسب و تصرف پہ پابندی

متعلق بھی ہدایات دیتے ہیں۔ انسانوں کی ... اصلاح بھی نبی کے فرائض میں ہوتی ہے۔ تو اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ مال کے حصول اور اس کے خرچ کرنے کے متعلق شرائع کی پابندی کریں۔ اگر دولت کے ارتکاز اور اس کے مصرف میں ناجائز ذرائع استعمال کیے جائیں تو یہ مال وبالِ جان بن جائیگا۔ مال اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ انعام ہوتا ہے۔ اس میں من مانی کرنا درست نہیں۔ جو مال شراب، جوئے، رشوت، چوری، ڈاکے سود اور سمگلنگ کے ذریعے کمایا جائیگا، وہ قطعی حرام ہے۔ اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح جو مال لہو ولعب، عیش و عشرت، سینما بینی، بلڈنگ سازی اور رسومات باطلہ پر خرچ کیا جائے گا۔ اس کا وبال بھی خرچ کرنے والے پر ہوگا۔ ہر جائز وناجائز طریقے سے کمانا اور حرام راستوں پر خرچ کرنا سرمایہ دارانہ ذہنیت کی عکاسی ہے آخرت میں جا کر اس کا جواب دینا پڑے گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ قیامت کے دن جب سب لوگ محاسبے کے لیے اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو کوئی آدمی اُس وقت تک قدم نہیں اٹھا سکے گا جب تک بعض سوالوں کا جواب نہیں دے گا۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ دنیا میں رہ کر مال کن ذرائع سے کمایا تھا اور کن مدات پر خرچ کیا تھا۔ کیا تو نے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات ادا کیے تھے۔ غربا اور مساکین کا حق ان کو دیا تھا یا سارا مال شادی اور غمی کی رسومات میں خرچ کر دیا تھا، اپنی شان دکھانے کے لیے عمارات بنا رہا، گاڑیاں خریدتا رہا یا کھیل تماشے، عیاشی اور فحاشی میں مال ضائع کر دیا، غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے مال کے اکتساب اور اس کے مصرف دونوں پر حدود و قیود قائم کی ہیں۔ اسلامی نظام معیشت اور سرمایہ دارانہ نظام میں یہی بنیادی فرق ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ اکتساب کے جائز ذرائع کی حوصلہ افزائی کرے جب کہ ناجائز ذرائع کو ختم کرے، صنعت و حرفت اور زراعت جیسے حلال پیشوں کے فروغ میں مدد دینی چاہیئے جب کہ سود، جوا، چور بازاری، شراب نوشی جیسے قبیح ذرائع پہ پابندی عائد کرنی چاہیئے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے[1] فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ اللہ سے ڈر جاؤ اور روزی کے لیے حلال ذرائع استعمال کرو۔ حرام راستے سے کمائی ہوئی دولت ہلاک کر کے رکھ دے گی۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے " لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ، بلکہ رزق کی تلاش میں جائز ذرائع اختیار کرو۔

قوم نے شعیب علیہ السلام کو نماز کا طعنہ دیا تھا، پھر آپ کی پارسائی کو بھی وجہ تضحیک بنایا، کہنے لگے اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ تو بڑا بردبار اور نیک چلن بنا پھرتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے سارے نبی حلیم اور رشید ہوتے ہیں مگر ان لوگوں نے آپ کے حلم اور رشد کے اعتراف کے بجائے ٹھٹے کے طور پر کہا کہ یہ بڑا پرہیزگار بنا پھرتا ہے جو ہمیں اپنی من مانی کارروائیوں سے منع کرتا ہے کہتا ہے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو، لوگوں کے حقوق ادا کرو اور باپ دادا کی رسومات چھوڑ دو ہم تمہاری بات ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں۔

حلال روزی

قوم کی اس طعن بازی کے باوجود اللہ کے نبی نے ان کو ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ آج کی اگلی آیات حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر پر مشتمل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ قَالَ يٰقَوْمِ آپ نے فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ بھلا بتلاؤ! اگر میں اپنے رب کی طرف سے کھلی دلیل یا واضح راستے

[1] کنز العمال ص ۳، ۱۴ ج ۲

پر ہوں۔ بیّنہ واضح برہان اور واضح ہدایت کو کہتے ہیں۔ فرمایا اگر میں کھلے راستے پر ہوں وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا اور اللہ نے مجھے اپنی طرف سے حلال روزی عطا کی ہے۔ رزق حسن کو مفسرین نے دو معنوں پر محمول کیا ہے۔ اس سے ایک مراد تو نبوت ہے اور شعیب علیہ السلام اسی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اللہ نے مجھے نبوت عطا فرمائی ہے۔ مجھ پر وحی نازل کی ہے جس کے مطابق میں خود بھی عمل کر رہا ہوں اور دوسروں کو بھی تلقین کر رہا ہوں، اور میں بلاوجہ کسی کی مخالفت نہیں کرتا۔ اور اس کا دوسرا معنی حلال روزی ہے اللہ کے نبی نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اللہ نے اسے حلال روزی نصیب کی ہے۔ قرآن میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء کو یہی تعلیم دی ہے "كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا" یعنی حلال اور پاکیزہ رزق کھاؤ اور نیک اعمال انجام دو اور پھر اللہ کا شکر بھی ادا کرو۔ یہی حکم تمام اہل ایمان کے لیے بھی ہے حلال روزی کمانے اور حرام سے بچنے کی اللہ نے بار بار تاکید کی ہے حرام کی کمائی جسمانی، روحانی، دینی اور اخروی ہر لحاظ سے مضر ہے اور اس سے بچنا چاہیئے۔ غرضیکہ رزق حلال سے مراد وہ رزق ہے جو پاکیزہ ہو اور خیانت، دھوکہ دہی، حق تلفی اور کسب ضار سے پاک ہو۔

قول و فعل کی مطابقت

شعیب علیہ السلام نے مزید یہ بات کی کہ اے لوگو! وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری ان چیزوں میں مخالفت کروں جن سے میں خود تمہیں روکتا ہوں میں جن باتوں کا تمہیں حکم دیتا ہوں، ان پر خود بھی عمل پیرا ہوں اور جن سے منع کرتا ہوں ان کو خود بھی اختیار نہیں کرتا۔ آپ نے لوگوں پر واضح کر دیا کہ میرے قول اور فعل میں مطابقت ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کا نبی قوم کو تو ایک بات سے منع کرے اور خود اس میں ملوث ہو۔ اللہ

کے دین پر سب سے زیادہ کاربند اس کے نبی ہوتے ہیں۔ وہ پہلے خود احکامِ الٰہی پر عمل کر کے امت کے لیے نمونہ بنتے ہیں۔ اللہ نے ہر نبی کو یہی حکم دیا اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (الانعام) تو جو کچھ آپ کی طرف وحی کی گئی ہے، اس کی مکمل اتباع کریں۔ اور نبی ایسا کر کے دکھاتے ہیں۔ نبی کا ہر عمل اس کے قول کے مطابق ہوتا ہے کیونکہ سورۃ صف میں اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ اے لوگو! لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کر کے نہیں دکھاتے۔ اگر عام معاشرے کی حالت یہ ہے کہ نچلی سطح سے لے کر حکومت کے اعلیٰ ایوانوں تک قول و فعل کا تضاد پایا جاتا ہے۔ تو شعیب علیہ السلام نے قوم پر واضح کیا کہ میں نہیں چاہتا کہ ایسے معاملہ میں تمہاری مخالفت کروں جس سے تمہیں منع کرتا ہوں۔

اصلاح احوال آپ نے یہ بھی قوم سے فرمایا اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ میں تو اصلاح کرتا ہوں جتنی طاقت رکھتا ہوں۔ میرا کام تو برائی کو مٹا کر اچھا معاشرہ قائم کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ اپنا حق بھی پورا کریں، اللہ کا حق بھی ادا کریں اور بنی نوع انسان کے حقوق کو بھی پورا کریں۔ اگر ان تینوں قسم کے حقوق کی پاسداری کی جائے تو معاشرہ سنور جائے گا۔ اصلاح احوال پیدا ہو جائے گی۔ تو فرمایا میں اپنی طاقت کے مطابق اصلاح کرتا ہوں، کیونکہ اللہ کی عطا کردہ وسعت سے زیادہ کوئی کچھ نہیں کر سکتا اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد بھی موجود ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ) کوئی انسان اپنی طاقت سے زیادہ ماخوذ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جس قدر طاقت بخشی ہے اسی کے مطابق احوال کی اصلاح کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے حضور علیہ السلام نے ایک شخص سے بیعت لی اور اسے احکام شریعت کی پابندی کا حکم دیا تو اس شخص نے کہا کہ میں ان باتوں پر عمل پیرا ہوں گا مَا اسْتَطَعْتُ جتنی میری طاقت ہے۔

توفیق ایزدی

حضرت شعیب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ اور نہیں ہے مجھ میں توفیق مگر اللہ کے ساتھ۔ ہر کام کی توفیق اللہ ہی بخشتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال نہ ہو تو انسان کچھ نہیں کر سکتا، لہٰذا تمام قوتوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ نیکی کا کام انجام دینے اور برائی سے بچنے کی طاقت بھی اللہ ہی کی توفیق سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے شعیب علیہ السلام نے یہ بھی کہا عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ میں تو اُس خداوند تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرتا ہوں۔ ہر ایماندار کا بھی فرض ہے کہ وہ صرف اللہ پر ہی بھروسہ کرے، اُس کے بغیر کوئی ذات ایسی نہیں جس پر توکل کیا جائے وَإِلَيْهِ أُنِيبُ میرا ہر وقت اُسی کی طرف رجوع ہے۔ دوسری جگہ ہے أَنِيبُوٓا إِلَىٰ رَبِّكُمْ اے ایمان والو! اپنے رب کی طرف ہی رجوع رکھو وَأَسْلِمُوا اور اسی کی فرمانبرداری کرتے رہو، کفر، شرک اور معاصی سے بچتے رہو۔

قومیں دلی خیرخواہی

فرمایا وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيٓ أَنْ يُّصِيبَكُمْ مِّثْلُ مَآ أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ اے میری قوم کے لوگو! میری مخالفت تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم برائی کا ارتکاب کر کے اس چیز کے مستحق بن جاؤ جس کے مستحق قوم نوح، قوم ہود اور قوم صالح علیہم السلام کے لوگ بنے۔ مطلب یہ ہے کہ تم میری مخالفت کر کے کفر، شرک اور ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرو گے تو تم بھی اُسی سزا میں مبتلا ہو سکتے ہو جس میں سابقہ قومیں مبتلا ہوئیں۔ قوم نوح نے توحید کو تسلیم نہ کیا تو طوفان کی نذر ہو گئے۔ قوم ہود نافرمانی کر کے

تباہ و برباد ہوئے اور قوم صالح علیہ السلام کو چیخ نے پکڑ لیا جس سے اُن کے دل اور جگر پھٹ گئے اور وہ ملیامیٹ ہو گئے۔ اور قوم لوط کے متعلق فرمایا وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ اور قوم لوط کا معاملہ تو تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ قربت دو اعتبار سے ہے زمانے کے لحاظ سے بھی قوم لوط اور قوم شعیب کا زمانہ قریب قریب ہی ہے اور مکانیت کے اعتبار سے بھی دونوں علاقے آپس میں ملتے جلتے ہی ہیں۔ مدین اور شرق اردن میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے تو فرمایا، اے لوگو! میری مخالفت میں تم کسی ایسی سزا کے مستوجب نہ بن جانا جس سے سابقہ قومیں تباہ ہوئیں۔ تم اب بھی سمجھ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کر لو اور میرا کہا مان لو۔

اور دوسری بات یہ کرو وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ سابقہ گناہوں کی اپنے پروردگار سے معافی مانگ لو۔ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ پھر اسی کی طرف رجوع رکھو۔ اگر ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کر دے گا۔ اور تمہاری توبہ قبول کرے گا کیونکہ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ میرا پروردگار مہربانی کرنے والا بھی ہے اور محبت کرنے والا بھی اس کی ان دو صفات کا تقاضا ہے کہ جب بندہ اس کے دروازے پر آجاتا ہے تو اس کی سابقہ کوتاہیوں پر معافی کا قلم پھیر دیتا ہے وہ اپنے بندوں سے محبت کرنے لگتا ہے اور بندے اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں۔ لہٰذا اب بھی موقع ہے کہ راہِ راست پر آجاؤ اور فلاح پا جاؤ

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا
لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫
وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ
عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ
اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا
عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ
يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا
اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا
شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَاَخَذَتِ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ
جٰثِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا
لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾ ع

ترجمہ :- اُن لوگوں نے کہا، اے شعیب! نہیں سمجھتے ہم
بہت سی وہ باتیں جو تم کہتے ہو۔ اور بیشک ہم دیکھتے ہیں
تم کو اپنے درمیان کمزور۔ اور اگر نہ ہوتا تیرا یہ خاندان تو ہم
تمہیں سنگسار کر دیتے۔ اور نہیں ہے تو ہمارے اُوپر کوئی صاحبِ
عزت ﴿٩١﴾ کہا (شعیب علیہ السلام نے) اے میری قوم کے لوگو

کیا میرا خاندان زیادہ عزیز ہے تم پر اللہ کی نسبت۔ اور ڈال
دیا ہے تم نے اُس کے حکم کو اپنی پشتوں کے پیچھے۔ بیشک
میرا پروردگار گھیرنے والا ہے جو کچھ تم کرتے ہو (۹۲) اور
اے میری قوم کے لوگو! عمل کرو اپنی جگہ پر۔ بیشک میں
بھی عمل کرنے والا ہوں۔ عنقریب تم جان لو گے کہ کس
کے پاس آتا ہے رسوا کرنے والا عذاب اور کون جھوٹا ہے
اور انتظار کرو۔ بیشک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے
والوں میں ہوں (۹۳) اور جب آیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات
دی شعیب اور ان لوگوں کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے
تھے اپنی خاص رحمت کے ساتھ۔ اور پکڑا اُن لوگوں کو
جنہوں نے ظلم کیا تھا چیخ نے پس ہو گئے وہ اپنے
گھروں میں اوندھے منہ گرنے والے (۹۴) گویا وہ ان میں
بسے ہی نہیں بسنو! ہلاکت ہے مدین کی قوم کے لیے
جیسا کہ ہلاک ہوئی قوم ثمود (۹۵)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں شعیب علیہ السلام نے قوم کی طرف سے کئے گئے
بیہودہ اعتراض کا جواب دیا تھا۔ انہوں نے شعیب علیہ السلام کی نماز کو طعن کی بنیاد
بنایا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم تمہارے کہنے سے اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں
کو نہیں چھوڑ سکتے اور نہ ہی اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے تصرف سے باز آسکتے
ہیں۔ شعیب علیہ السلام نے اچھے طریقے سے سمجھایا کہ دیکھو! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے
نبوت اور پاکیزہ روزی عطا فرمائی ہے، میں جو بات تم سے کہتا ہوں، اس پر خود بھی
عمل کرتا ہوں یعنی میرے قول و فعل میں تضاد نہیں ہے، میں حسب استطاعت
اصلاح کی کوشش کر رہا ہوں اور میرا بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے کیونکہ ہر کام

اُسی کی توفیق سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا، لوگو! میری مخالفت میں اتنے دور نہ نکل جانا کہ جس کی وجہ سے تم پر بھی وہی عذاب آجائے جو عذاب حضرات نوح، صالح اور لوط علیہم السلام کی اقوام پر آیا تھا۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اسی کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ نہایت مہربان اور اپنے بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔

نافہمی کا بہانہ

شعیب علیہ السلام کی اس نصیحت آموز تقریر کے جواب میں قوم نے کہا قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ اے شعیب علیہ السلام ہم نہیں سمجھتے بہت سی باتیں جو تم کہتے ہو۔ یہ بات انہوں نے تعصب اور عناد کی بنا پر کی، ورنہ شعیب علیہ السلام کی بات سمجھنے میں انہیں کوئی امر مانع نہیں تھا۔ آپ اسی قوم کے فرد تھے۔ وہی زبان بولتے تھے، وہ آپ کی ہر بات سمجھتے تھے مگر جب اعتقادی اور اخلاقی بیماری کا ذکر آتا ہے تو نافہمی کا بہانہ بنا دیتے تھے ویسے بھی شعیب علیہ السلام کی فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ آپ خطیب الانبیاء مشہور ہیں۔ اللہ نے آپ کو تقریر کا خوب ملکہ عطا کیا تھا مگر ہٹ دھرمی کی وجہ سے قوم کو آپ کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار، اور شرک کا انکار، ماپ تول میں انصاف، حقوق العباد کی پاسداری، ظلم سے پرہیز کون سی ایسی باتیں ہیں جو عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہوں، مگر آپ کی قوم تعصب اور عناد میں غرق ہو چکی تھی اور وہ آپ کی کسی نصیحت کی بات کو سننے کے لیے تیار نہیں تھی اور نافہمی کا بہانہ بنا رہی تھی۔

جب کسی بات کو تسلیم کرنے کا ارادہ نہ ہو تو پھر اس قسم کے بہانے تراشنا ایک معمول کی بات ہے۔ مشرکین مکہ بھی حضور علیہ السلام کے متعلق کہتے تھے کہ یہ شخص عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد

بڑے ذہین وفطین اور عظیم لوگ تھے، وہ سب اپنی معبودوں کی پوجا کرتے ہیں مگر یہ شخص ان کے خلاف بات کرتا ہے۔ ﴿وَيَقُولُونَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ﴾ (القلم) کفار کو بھی کہتے تھے یہ تو دیوانہ ہے، بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ یہ قوم شعیب کی ہٹ دھرمی یعنی کفر وشرک میں پختگی کی علامت تھی، ورنہ شعیب علیہ السلام کی بات ناقابلِ فہم نہیں تھی۔ یہ ساری باتیں آسانی سے سمجھ میں آ رہی تھیں۔

کمزوری کا طعنہ

شعیب علیہ السلام کے مخالفین آپ کو ایک یہ طعنہ بھی دیتے تھے ﴿وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا﴾ ہم تمہیں اپنے درمیان کمزور خیال کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تمہاری کوئی حیثیت نہیں، تم نے خواہ مخواہ قوم کو اپنا دشمن بنا رکھا ہے۔ اپنے حال پر رحم کرو اور خاموشی سے گزر اوقات کرو۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ یہاں پر ضعف سے مراد نابینا ہونا ہے کیونکہ شعیب علیہ السلام اپنی زندگی میں کچھ عرصہ کے لیے نابینا بھی ہوگئے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام بھی صدمہ فرزندگی کی وجہ سے نابینا ہوگئے تھے، پھر اللہ نے معجزانہ طریقے پر بینائی لوٹادی، اسی طرح شعیب علیہ السلام بھی کثرت گریہ کی وجہ سے بینائی کھو بیٹھے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام سے دریافت کیا کہ تم اتنا کیوں روتے ہو، جنت کے شوق میں یا دوزخ کے ڈر سے، تو آپ نے جواب دیا، پروردگار! تیری بقا کا خیال کر کے اس لیے روتا ہوں کہ پتہ نہیں کہ دیدار کے وقت آپ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

اللہ کا ارشاد ہوا، اے شعیب! تمہاری ملاقات اور دیدار تمہیں مبارک ہو۔ میں نے تمہاری اس ضعف کے باعث اپنے کلیم موسیٰ ابن عمران کو تمہاری خدمت پہ مامور کر دیا ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے بعد میں شعیب علیہ السلام کی بینائی واپس لوٹادی تھی۔

خاندان کا لحاظ

آپکی قوم نے یہ بھی کہا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ اگر تیرا یہ خاندان نہ ہوتا تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے۔ سنگساری انسانی تاریخ کی سخت ترین سزا ہے جو شادی شدہ زانی کے لیے اللہ نے مقرر کی ہے کہنے لگے تیرے خاندان کی اکثریت تیرے مذہب پر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے آبائی دین پر ہیں۔ ہمیں ان کی دل جوئی منظور ہے ورنہ تمہیں سنگساری جیسی سخت سزا دیتے، اور دوسری بات یہ ہے وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ اور تو ہم میں کوئی عزت والا بھی نہیں ہے۔ شعیب علیہ السلام نے جواب میں فرمایا قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اے میری قوم! کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ سے زیادہ عزیز ہے؟ تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے حکم کا تو کچھ خیال نہیں اور محض میرے خاندان کا لحاظ ہے۔ یہ تو بہت غلط بات ہے کہ خدا تعالیٰ جو خالق، مالک، مربی معطی، نافع، ضار اور معبودِ برحق ہے اس کا تو خیال نہ ہو، اس کے احکام کو پس پشت ڈال دیا جائے مگر خاندان اور قبیلے کو اعلیٰ حیثیت دی جائے حالانکہ تمہیں اس خداوندِ قدوس کے احکام کو اولیت دینی چاہیے جس نے مجھے نبی بنا کر تمہاری طرف بھیجا ہے۔ فرمایا وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا تم نے اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دیا ہے جو کہ کسی طرح بھی جائز اقدام نہیں ہے۔ یاد رکھو! اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ تم جو بھی کام کرتے ہو، میرا پروردگار اس کا احاطہ کرنے والا ہے ہر چیز اور تمہارا ہر عمل اس کی نگاہوں میں ہے۔ تمہیں خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال کا کچھ خیال نہیں اور مجھ پر میرے خاندان کا دباؤ ڈالنا چاہتے ہو، یہ تو بالکل تمہارا غلط نظریہ اور غلط سوچ ہے۔

حق و باطل میں امتیاز

شعیب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ پر کام کرتے رہو۔

إِنِّي عَامِلٌ اور میں اپنے طور پر عمل کرتا ہوں۔ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّأْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا کہ رسوا کن عذاب کس پر آتا ہے۔ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ اور یہ بھی جان لو گے کہ جھوٹا کون ہے، میں یا تم۔ آپ نے فرمایا وَارْتَقِبُوْا إِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ تم بھی راہ دیکھتے رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں، جلدی ہی حق و باطل میں امتیاز ہو جائے گا۔ رقیب کا لفظی معنیٰ نگرانی کرنا اور راہ دیکھنا ہوتا ہے۔ فرمایا انتظار کرو، اللہ تعالیٰ اسی طرح انبیاء کو بھیج کر اور پھر موقع دے کر آزماتا ہے۔ پھر جب حجت تمام ہو جاتی ہے اور لوگ راہ راست پر نہیں آتے، تو سزا میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بہر حال شعیب علیہ السلام نے اُن پر واضح کر دیا کہ اللہ کے سارے نبی نہایت ہی استقامت کی حالت میں ہوتے ہیں اور وہ قوم کے ڈرانے دھمکانے سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔

عذاب کی آمد

بہر حال یہ ساری باتیں شعیب علیہ السلام اور آپ کی قوم کے درمیان ہو گئیں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آگیا۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جب ہماری سزا کا حکم آگیا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا تو ہم نے بچا لیا شعیب علیہ السلام اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی خاص مہربانی سے۔ اُن پر اُس عذاب کا کچھ اثر نہ ہوا جو باقی قوم پر آیا۔ وَأَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ اور ظلم کرنے والوں کو ایک چیخ نے پکڑ لیا جس کی وجہ سے وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے فَأَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ اور ہو گئے وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرنے والے۔ گویا کہ وہ خوفزدہ ہو کر منہ کے بل زمین پر گر پڑے۔

قومِ شعیب کی سزا کے متعلق اس مقام پر صرف چیخ کا ذکر ہے

جب کہ سورۃ اعراف میں رجفۃ یعنی زلزلے کا ذکر بھی آیا ہے "فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ" اور پھر سورۃ شعراء میں سائبان کے دن کا عذاب بتایا گیا ہے "فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ" انہیں یوم ظلہ کے عذاب نے پکڑ لیا۔ بعض فرماتے ہیں کہ ایکہ والوں پر سائبان کا عذاب آیا تھا اور مدین والوں پر چیخ اور زلزلہ آیا تھا۔ یعنی ابتدائی طور پر زلزلہ آیا تھا اور پھر خوفناک چیخ سنائی دی جس سے لوگوں کے جگر اور دل پھٹ گئے اور وہ ہلاک ہو گئے۔ تاہم مفسر قرآن امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اصحاب ایکہ اہل مدین ایک ہی قوم کے فرد تھے یا دو علیحدہ علیحدہ قومیں تھیں لیکن سب پر تینوں قسم کا عذاب آیا تھا البتہ اللہ تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں مختلف عذاب کا ذکر خاص مناسبت کی وجہ سے کیا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں آیا ہے کہ آپ کی قوم نے شعیب علیہ السلام کو دھمکی دی "لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا" کہ یا تو تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے متبعین کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے۔ اس کے جواب میں اللہ نے ان پر زمین ہی کا زلزلہ مسلط کر دیا کہ تم اللہ کے نبی کو جس زمین سے نکالنا چاہتے ہو، اسی زمین پر خود تمہیں ٹھکانا میسر نہیں ہوگا۔ اس سورۃ مبارکہ میں مخالفین کے غرور و تکبر کا ذکر ہے کہ وہ کہتے تھے کہ کون بڑا نمازی بنا پھرتا ہے اور ہمیں اپنے ہی کمائے ہوئے مال میں من مرضی کا تصرف کرنے سے روکتا ہے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اے شعیب! تیری یہ ناصحانہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، تو انہیں اپنے تک ہی محدود رکھ۔ وہ لوگ آپ پر خاندانی لحاظ کا رعب بھی ڈالتے تھے کہ تیرے خاندان کی وجہ سے تمہارا لحاظ کر رہے ہیں، ورنہ تمہیں سنگسار کر دیں۔ چونکہ یہ ساری غرور و تکبر کی باتیں تھیں، تو اللہ نے [illegible] غرور و تکبر کرنے

کے لیے اُن کو چیخ کے ذریعے ہلاک کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ اور آگے سورۃ شعراء میں جہاں یوم الظلۃ کے عذاب کا ذکر ہے، وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کے مخالفین کی اس بڑ کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ کہتے تھے اے شعیب! ہم تیری بات ماننے کے لیے تیار نہیں اور اگر تو سچا ہے فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پہلے سخت گرمی بھیجی، پانی خشک ہو گیا اور مارے گرمی اور پیاس کے لوگوں کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ سات دن تک یہی صورت حال رہی۔ پھر اللہ نے بادلوں کو ٹھنڈی ہوا کے ساتھ بھیجا۔ سب لوگ بادلوں کے نیچے اکٹھے ہو گئے کہ اب بارش برسے گی اور جل تھل ایک ہو جائے گا۔ مگر ہوا یہ کہ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو بادلوں سے آگ برسنے لگی۔ جس نے ساری قوم کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ یوم الظلۃ کا عذاب تھا۔ بہرحال امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ نے اس قوم پر تینوں قسم کے عذاب بھیجے

مکمل تباہی

فرمایا، اللہ کے بھیجے ہوئے عذاب نے انہیں اس طرح تباہ کر دیا کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا گویا کہ وہ وہاں کبھی آباد نہ تھے۔ فرمایا اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ آخر میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ خدا کی رحمت سے دوری اور ہلاکت ہے مدین والوں پر کَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ جیسا کہ قوم ثمود ہلاک ہوئی۔ وہ لوگ بھی بڑے عقلمند، ذہین اور مغرور تھے بڑے صناع اور کاریگر تھے مگر ان کی نافرمانی کی وجہ سے اُن کو بھی اللہ نے تباہ و برباد کیا اور اسی طرح قوم شعیب بھی ہلاک ہوئی۔ دراصل یہ اہل مکہ اور بعد میں آنے والوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اے منکرین! تم بھی اپنا انجام سوچ لو اگر تم بھی نافرمان قوموں کے نقش قدم پر چلو گے تو تمہارا انجام بھی اُن سے مختلف نہیں ہو گا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى
فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ
فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتْبِعُوْا
فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ
الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ
مِنْهَا قَاۗىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ
ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ
الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاۗءَ
اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ :۔ اور البتہ تحقیق ہم نے بھیجا موسیٰ (علیہ السلام)
کو اپنی آیتوں اور کھلے غلبے کے ساتھ ﴿۹۶﴾ فرعون اور اُس
کے سرداروں کی طرف، پس انہوں نے اتباع کیے
فرعون کی بات کا اور نہیں تھی فرعون کی بات کوئی
درست ﴿۹۷﴾ آگے آگے ہوگا وہ اپنی قوم سے قیامت
کے دن پس پہنچائے گا اُن کو آگ میں، اور بُرا ہے
وہ گھاٹ جس پر وہ پہنچیں گے ﴿۹۸﴾ اور پیچھے لگائی گئی

اُن کے اِس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن۔ بُرا عطیہ ہے جو اُن کو دیا گیا (۹۹) یہ ہیں بستیوں کی خبروں سے ہم بیان کرتے ہیں اِن کو آپ پر۔ بعض ان میں سے قائم ہیں اور بعض کٹی ہوئی (۱۰۰) اور ہم نے نہیں ظلم کیا اُن پر، مگر تھے وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے۔ پس نہ کام دیا اُن کو اُن کے معبودوں نے، جن کو پکارتے تھے اللہ کے سوا، کچھ بھی، جب کہ آگیا تیرے رب کا حکم، اور نہ زیادہ کیا انہوں نے اُن کے لیے سوائے ہلاکت کے (۱۰۱)

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر تھا۔ تاریخ انبیاء کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو واقعات بیان فرمائے ہیں، اِن کے ذریعے مسئلہ توحید کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ کے اِن پاک نفوس نے یہ مسئلہ کس طرح لوگوں کے سامنے پیش کیا پھر جن لوگوں نے اس کا انکار کیا وہ کس طرح اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں چند اقوام کا ذکر بطور تذکیر بایام اللہ کیا ہے۔ یعنی اُن ایام کا تذکرہ جو مختلف اقوام پر سزا اور نجات کے ساتھ پیش آئے

موسیٰ علیہ السلام کی بعثت

حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے ارشاد ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا اور البتہ تحقیق ہم نے رسول بنا کر بھیجا موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیتوں کے ساتھ۔ آیات میں احکام بھی شامل ہیں اور معجزات بھی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات کی شکل میں احکام بھی دیئے تھے۔ معجزات کے ضمن میں آپ کی نو نشانیوں کا ذکر قرآنِ پاک میں آیا ہے جن میں سے دو زیادہ واضح ہیں یعنی عصا اور یدِ بیضا آیات سے دلائل بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی توحید کے متعلق بڑے واضح دلائل پیش کیے اور یہ کام سارے انبیاء ہی کرتے رہے ہیں۔ ایک تو نشانیاں عطا فرمائیں اور دوسری چیز وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ کھلا غلبہ یا کھلی سند بھی

موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی۔ کھلے غلبے یا کھلی سند سے بھی معجزات ہی مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر بہت سے معجزات ظاہر کیے حتیٰ کہ لاٹھی کا معجزہ دیکھ کر تمام جادوگر بھی ایمان لے آئے مگر فرعون نے پھر بھی ضد اور عناد کا اظہار کرتے ہوئے انکار ہی کیا۔

فرمایا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیتوں اور کھلی سند کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف فرعون اور اس کی قوم قبطی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو مصر کے قدیم باشندے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت دونوں اقوام کی طرف تھی۔ یہاں پر قبطی قوم کی طرف اشارہ ہے جب کہ دوسرے مقام پر بنی اسرائیل کا ذکر بھی ہے۔ چونکہ فرعون اور اس کے سردار سرکشی میں حد سے بڑھ چکے تھے تو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اُن کا ذکر کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی طرف مبعوث کیا گیا۔ فَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ فِرۡعَوۡنَ ان سرداروں نے فرعون کے حکم کا اتباع کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا انکار کر کے تزکیہ سے محروم رہے انہوں نے اپنی فکر اور عقیدے کو پاک کرنے، اللہ کی وحدانیت کو اپنانے اور ایمان کو درست کرنے کی بجائے فرعون کی بات کی پیروی کی۔ وَمَاۤ اَمۡرُ فِرۡعَوۡنَ بِرَشِيۡدٍ حالانکہ فرعون کی بات نیکی، ہدایت یا سمجھ بوجھ والی بات نہیں تھی۔ فرعون کی بات میں تو سراسر تکبر اور غرور تھا، یہ کفر و شرک سے پُر تھی اور نیکی سے خالی تھی یہ تو سو فیصدی غلط بات تھی مگر قوم واضح نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائی اور دشمنِ خدا کے پیچھے چلتی رہی اِس قوم کا انجام بھی بالآخر وہی ہوا جو ہمیشہ نافرمان قوموں کا ہوا کرتا ہے۔ پہلی اقوام کے واقعات موجود ہیں کہ وہ لوگ مغلوب اور ذلیل ہوئے یا پھر اپنے لاؤ لشکر سمیت تباہ و برباد ہوئے۔ یہاں پر فرعون کے متعلق

روز حشر کی قیادت

فرمایا يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کہ قیامت والے دن وہ اپنی قوم کی قیادت کریگا۔ اور ان کے آگے آگے چلے گا، جس طرح دنیا میں وہ بحیثیت بادشاہ اور ڈکٹیٹر قوم کی قیادت کرتا تھا، اُن کو اپنے پیچھے لگا رکھا تھا، ہر بات کی تعمیل کراتا تھا، اسی طرح قیامت کو بھی اِس کی قوم اس کے پیچھے پیچھے ہوگی۔ اللہ نے سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا، يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ اُس دن ہم تمام لوگوں کو ان کے مقتداؤں سمیت طلب کریں گے۔ متبوع آگے ہوں گے اور تابع پیچھے پیچھے۔ اسی اصول کے مطابق فرعون بھی اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ پھر اُن کو لے کر دوزخ میں جائیگا وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ اور یہ بہت ہی بُرا گھاٹ ہے۔ جس پر یہ لوگ وارد ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون جیسا مغرور و متکبر شخص اپنے متبعین سمیت دوزخ والے گھاٹ پر پہنچے گا جو انہیں جلا کر بھسم کر دیگی۔ وہاں دکھ ہی دکھ ہوگا، آرام و آسائش کی کوئی بات نہیں ہوگی مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اِمْرَءُ الْقَيْسِ حَامِلُ لِوَاءِ الشُّعَرَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ اِلَى النَّارِ یعنی امرالقیس جاہلیت کے زمانے کے شعراء کا جھنڈا ہاتھ میں لیے سب کو جہنم میں لے جائیگا۔ یہ شخص جاہلیت کے زمانہ کا بہت بڑا شاعر ہوا ہے حضور علیہ السلام کی ولادت سے بیس برس قبل مرگیا۔ اُس نے اپنے زمانے میں بڑا نام پیدا کیا اور بہت سے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ حضور نے فرمایا کہ اِن سب لوگوں کو لے کر وہ جہنم میں چلا جائے گا یہی حال فرعون کا ہوگا کہ وہ بھی اپنے حمایتیوں سمیت دوزخ کا ایندھن بنے گا۔

دنیا و آخرت کی لعنت

فرمایا اس بات کا نتیجہ یہ نکلا وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً اس دُنیا میں اُن کے پیچھے لعنت لگائی گئی وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اور قیامت کے دن بھی وہ اسی لعنت میں گرفتار رہیں گے وَبِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ اور یہ بہت برا عطیہ ہے جو ان کو دیا گیا۔ دوزخ کے ٹھکانے کو عطیہ یا انعام تحکم کے طور پر کہا گیا ہے کہ ان کو ایسی دردناک نعمت میسر آئے گی جس میں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہو گا۔ یہ بہت برا انجام ہو گا۔

تذکیر بایام اللہ

فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى یہ بستیوں میں رہنے والے لوگوں کے حالات و واقعات ہیں۔ یہ واقعات اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے شروع کر کے موسیٰ علیہ السلام تک ذکر کیے ہیں۔ ان میں عاد، ثمود، قوم لوط، ایکہ اور مدین کے سارے واقعات آگئے ہیں۔ انہوں نے اللہ کے نبیوں کی نافرمانی کی تو اللہ نے ان پر عذاب کو بھیج کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ فرعون بھی بڑی تمدن سلطنت کا مالک تھا اس کے حالات قرآن پاک کی متعدد سورتوں میں مذکور ہیں، اس کے غرور، تکبر اور نافرمانی کی وجہ سے اللہ نے اسے اور اس کی پوری قوم کو بھی ہلاک کر دیا اور پھر اس کی لاش کو عبرت کے لیے محفوظ کر دیا۔ فرمایا نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ ہم یہ واقعات آپ پر بیان کرتے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ قیامت تک آنے والی نسلیں ان واقعات سے عبرت حاصل کریں۔ تذکیر بایام اللہ کا یہی مطلب ہے کہ لوگوں کو خبردار کر دیا جائے کہ کفر، شرک اور نافرمانی کا انجام یہی ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا مِنْهَا قَآئِمٌ جن بستیوں کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض قائم ہیں یعنی ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات موجود ہیں جو ہر آنے والے کو عبرت کا درس دے رہے ہیں۔ وَّحَصِيْدٌ اور بعض بستیاں کٹی ہوئی ہیں یعنی ایسی ناپید ہوئی ہیں کہ ان کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ ان کو اللہ نے ایسا ملیامیٹ کیا کہ کوئی نشان بھی باقی نہیں بچا۔

فرمایا ان لوگوں کو ہلاک کر کے وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ ہم نے اُن پر کوئی
زیادتی نہیں کی۔ ہم نے انہیں بلاوجہ نیست و نابود نہیں کیا وَلٰکِنْ
ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے اللہ تعالیٰ
تو مخلوق پر ہمیشہ مہربان ہوتا ہے اور اُن پر زیادتی نہیں کرتا کیونکہ اس کا
فرمان ہے "وَمَا اللّٰهُ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ" یعنی اللہ تعالیٰ اپنے
بندوں پر قطعاً زیادتی نہیں کرتا۔ بلکہ ہر زیادتی کرنے والا خود ہی اپنے
انجام کو پہنچتا ہے کیونکہ اللہ کا قانون ہے "وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ"
جو کوئی برائی کا ارتکاب کرے گا، اس کا وبال خود اسی پر پڑے گا۔ مطلب
یہ کہ فرعون اور اس کی قوم نے اپنے آپ پر خود ہی ظلم کیا۔

معبودانِ باطل سے بیزاری

فرمایا، فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ کفر اور شرک کرنے والے اللہ کے سوا جن
معبودانِ باطلہ کو پکارا کرتے تھے، وہ اُن کے کچھ کام نہ آئے جن معبودوں
کی نذر و نیاز دیتے، انہیں اپنی حاجتوں میں پکارتے تھے، اُن میں اختیارات
کو تسلیم کرتے تھے۔ قیامت والے دن وہ معبود اُن کے کچھ کام نہیں آئیں گے
بلکہ اُن سے بیزاری کا اظہار کر دیں گے۔ یہ لوگ دنیا میں جو کچھ کرتے رہے اور
جو عقیدہ انہوں نے بنا رکھا تھا وہ جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوا۔ حقیقت یہ
ہے کہ اِن باطل معبودوں کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ اللہ تعالیٰ
نے انہیں تدبیر و تصرف کا مالک بنایا تھا۔ دنیا میں اللہ کا رسول منع کرتا
تھا کہ اِن سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ان کو چھوڑ دو مگر یہ کہتے تھے
کہ ہم اِن معبودوں کو کیسے چھوڑ دیں۔ جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے
آئے ہیں۔ اور جن کی وہ نذر و نیاز دیتے رہے ہیں۔ فرمایا لَمَّا جَآءَ اَمْرُ
رَبِّكَ جب تیرے پروردگار کا حکم یعنی سزا کا وقت آگیا۔ تو کسی نے
کوئی فریاد رسی نہ کی۔

فرمایا وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ اور انہوں نے ہلاکت کے سوا کچھ بھی اضافہ نہ کیا۔ البتہ افسوس مزید پیدا ہوا کہ ہم دنیا میں جن کی پرستش کرتے رہے، انہوں نے دھوکہ دیا اور آج کسی کام نہ آئے معبودانِ باطلہ اپنے متبعین کو تو کیا بچاتے وہ الٹا ان کی ہلاکت اور مزید تباہی کا باعث بنے۔ ان پر خدا تعالیٰ کا مزید غضب نازل ہوا اور وہ ناکام و نامراد ہو گئے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ؕ
اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ
لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ
اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ
اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِىٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا
الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ
شَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ
وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا
يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ
رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِىْ مِرْيَةٍ
مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ
اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ
غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ ع

ترجمہ :- اور اسی طرح ہے پکڑ تیرے رب کی جس

وقت کہ وہ پکڑتا ہے بستیوں میں رہنے والوں کو درآنحالیکہ
وہ ظلم کرنے والے ہوتے ہیں۔ بیشک اُس کی پکڑ بڑی
دردناک اور بہت شدید ہوتی ہے (۱۰۲) بیشک اس میں البتہ
عبرت ہے اُن لوگوں کے لیے جو خوف کھاتے ہیں آخرت
کے عذاب سے ۔ یہ ایک دن ہے جس میں لوگ اکٹھے
کیے جائیں گے ، اور یہ دن ہے کہ جس میں حاضری ہوگی (۱۰۳)
اور ہم نہیں اُس کو مؤخر کرتے مگر ایک وقت مقررہ
کے لیے (۱۰۴) جس دن وہ آئے گا ۔ نہیں کلام کرے گا
کوئی نفس مگر اُس کی اجازت سے ۔ پس بعض اُن میں سے
بدبخت ہوں گے اور بعض نیک بخت (۱۰۵) بہرحال جو
بدبخت ہوئے ، پس وہ جہنم میں ہوں گے ، اُن کیلئے
اُس میں چیخنا چلانا ہوگا اور رونے کی آوازیں (۱۰۶) وہ ہمیشہ
رہنے والے ہوں گے اُس میں جب تک کہ آسمان اور
زمین ہوں گے ، مگر جو چاہے تیرا پروردگار ۔ بیشک تیرا پروردگار
کرنیوالا ہے اُسکو جو چاہے (۱۰۷) اور بہرحال وہ لوگ جو نیک بخت
ہوئے ، پس وہ جنت میں ہونگے ، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اسمیں
جبتک آسمان اور زمین ہونگے ، مگر جو چاہے تیرا پروردگار ، یہ ایسی بخشش ہے جو قطع
نہیں کی جائیگی (۱۰۸) پس نہ ہوں آپ شک میں اُس چیز
سے جس کی عبادت کرتے ہیں یہ لوگ ۔ نہیں عبادت کرتے
یہ مگر ایسے ہی جیسے کہ اِن کے آباؤ اجداد عبادت کرتے
تھے اس سے پہلے ۔ اور بیشک ہم پورا پورا دینے والے
ہیں اِن کو اِن کا حصہ جو کم نہیں کیا جائے گا (۱۰۹)

ربطِ آیات

فرعون اور اس کی قوم کا حال بیان ہو چکا ہے۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی طرف رسُول بنا کر بھیجا مگر فرعون اور اس کے سرداروں نے آپ کی بات کا انکار کیا۔ لوگوں نے فرعون کی بات کا اتباع کیا، حالانکہ وہ بالکل غلط مؤقف پر تھا اُن کے انجام کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن فرعون اپنی قوم کے آگے آگے چل رہا ہوگا اور سب کو دوزخ میں لے جائیگا۔ اللہ نے دُنیا میں بھی اُن کے پیچھے لعنت لگائی، اور قیامت کو بھی وہ اسی لعنت میں گرفتار ہوں گے۔ اللہ نے مختلف بستیوں کا حال بیان فرمایا کہ اُن میں سے بعض بالکل اجڑ چکی ہیں۔ اور بعض کے نشانات موجود ہیں اور آنے والے لوگوں کے لیے باعث عبرت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ ہم نے کسی نفس پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی سزا کے مستحق بنتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ لوگ جن معبودانِ باطلہ کی پرستش کرتے ہیں، قیامت والے دن ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے اور صرف ہلاکت ہی ان کے مقدر میں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی گرفت

ایسے ہی نافرمانوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى اور تیرے پروردگار کی پکڑ اسی طرح ہوتی ہے جب وہ بستیوں والوں کو پکڑتا ہے وَهِيَ ظَالِمَةٌ درآں حالیکہ وہ ظلم کرنے والے ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت صرف سابقہ اقوام نوح، عاد، ثمود، لوط، اصحاب ایکہ اور مدین اور قوم فرعون کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ جب بھی کوئی قوم ظلم و جور پر اُتر آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت بھی آجاتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کو بالآخر سزا مل کر رہتی ہے۔ ان اقوام کا ذکر اللہ نے نمونے کے طور پر کیا ہے، ورنہ اس کا قانون ساری مخلوق کے لیے ایک سا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا كَذٰلِكَ

نَجْزِی كُلَّ كَفُوْرٍ ہم ہر ناشکرگزار کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ اور کسی گنہگار کو چھوڑتے نہیں۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ مہلت دے دیتا ہے مگر آخر کار مجرم پکڑے جاتے ہیں۔ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ بیشک اللہ تعالیٰ کی پکڑ دردناک اور بڑی سخت ہے۔ اُس سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا۔

نشانِ عبرت

فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ بیشک اس میں نشانِ عبرت ہے اُس شخص کے لیے جو آخرت کے عذاب سے خوف کھاتا ہے۔ اُسے ڈر ہے کہ کہیں وہ بھی سابقہ قوموں کی طرح اللہ کی گرفت میں نہ آجائے۔ فرمایا آخرت کا دن ایسا ہے ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ کہ اس دن لوگوں کو اکٹھا کیا جائیگا وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ اور یہی حاضری کا دن ہے اس دن سب کے سب اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے اور کوئی بھی غیر حاضر نہیں ہوگا۔ اور پھر اس دن کے وقوع کے متعلق فرمایا وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ہم اس دن کو مؤخر نہیں کرتے مگر ایک مقررہ وقت تک۔ قیامت کا دن اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اس کی میعاد اور وقت مقرر ہے۔ ہر جاندار ور شجر و حجر تک کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ پھر اُسی طرح مجموعہ عالم کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے۔ یہ تمام اوقات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور وہ ان مقررہ اوقات پر ہر چیز کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح جب پوری کائنات کا مقررہ وقت آجائے گا تو قیامت واقع ہو جائے گی اور اسی دن کے لیے اسے مؤخر کیا گیا ہے۔ سورۃ انعام کی ابتداء میں بھی گزر چکا ہے کہ جسطرح ہر فرد کی عمر اور مدت مقرر ہے اسی طرح مجموعہ عالم کی بھی ایک عمر اور مدت مقرر ہے جب وہ مدت پوری ہو جائے گی تو یہ سارا سلسلہ تبدیل کر دیا جائے گا۔

موجودہ پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور اس کی جگہ دوسرا نظام قائم ہوگا۔ تو فرمایا کہ اس دن کو مؤخر کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے مطابق ہے۔ مجرم یہ نہ سمجھیں کہ وہ اس طرح ہمیشہ دندناتے پھریں گے اور ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں، بلکہ بتلایا یہ جا رہا ہے کہ اللہ کی حکمت کے مطابق جب وہ مقررہ دن آ جائے گا تو پھر سب کو اللہ کے حضور پیش ہو کر اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی۔

انسانوں کی زبان بندی

فرمایا یَوْمَ یَاْتِ جب وہ دن آ جائے گا لَا تَکَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِہٖ تو کوئی شخص کلام نہیں کر سکے گا مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے۔ آج تو لوگ طاقت اور اقتدار کے نشے میں سرشار بڑا شور مچاتے ہیں مگر اس دن کوئی شخص اس وقت تک لب کشائی نہیں کر سکے گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بولنے کی اجازت نہیں ملیگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس دن کوئی نہیں بول سکے گا سوائے انبیاء علیہم السلام کے اور ان کی پکار یہی ہوگی رَبِّ سَلِّمْ رَبِّ سَلِّمْ اے اللہ! آج کے دن بچالے، ایسا موقع ہوگا اور ایسی دہشت طاری ہوگی۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے اِنَّ اللّٰہَ لَیُمْلِیْ لِلظَّالِمِ حَتّٰی اِذَا اَخَذَہٗ لَمْ یُفْلِتْہُ بیشک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا رہتا ہے مگر جب پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔ تو فرمایا، آج یہ لوگ ظلم و زیادتی پر ڈٹے ہوئے ہیں مگر وہ دن بھی آنے والا ہے۔ جب بولنے کی طاقت بھی نہیں ہوگی۔

شقاوت و سعادت

جس دن کا ذکر ہو رہا ہے اس دن انسان دو گروہوں میں تقسیم ہوں گے فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ان میں سے بعض بدبخت ہوں گے اور بعض نیک بخت، اور آگے اللہ نے دونوں گروہوں کا انجام بھی بیان فرمایا ہے۔ یہ بدبختی اور نیک بختی دنیاوی لحاظ سے

بھی ہوتی ہے۔ دینی لحاظ سے بھی اور روحانی لحاظ سے بھی۔ اگر نیک بختی کو محض دنیاوی لحاظ سے شمار کیا جائے تو بہت سے کافر، مشرک، نافرمان، باغی، ظالم اور سرکش نیک بخت سمجھے جائیں گے کیونکہ انہیں صحت و تندرستی حاصل ہے، مال و دولت کی فراوانی ہے، کاریں اور کوٹھیاں ہیں، اولاد اور نوکر چاکر ہیں، جاہ اور اقتدار حاصل ہے مگر یہ حقیقی سعادت نہیں ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان کو حقیقی سعادت اُس وقت حاصل ہوگی جب وہ انسانِ اکبر کے نمونے کے مطابق ہوگا جو حظیرۃ القدس میں تمام انسانیت کے لیے موجود ہے۔ اس کو روحِ اعظم بھی کہتے ہیں۔ جو شخص اس نمونے کے زیادہ قریب ہوگا وہی سعادت مند ہوگا اور جو شخص اس نمونے سے جتنا دور ہوگا وہ اتنا ہی بدبخت ہوگا۔

حضرت شقیق بلخیؒ بڑے پائے کے بزرگ اور اولیاء اللہ میں سے ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں شقاوت کی علامت یہ ہے کہ ان کا دل سخت ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں خوفِ خدا اور خوفِ آخرت سے کبھی تر نہیں ہوتیں۔ ایسے شخص کا دل دنیا کی طرف ہی راغب رہتا ہے۔ وہ لمبی لمبی آرزوئیں باندھتا ہے، سکیمیں بناتا ہے کہ یوں کر دوں گا اور یوں کر دونگا مگر حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں کہ شقی آدمی بے حیائی کی طرف بھی مائل ہوتا ہے۔ اور سعادت مند آدمی وہ ہوتا ہے جو نرم دل ہو۔ خدا کے خوف سے اس کی آنکھیں پُرنم رہتی ہوں دنیا سے ایک حد تک نفرت کا اظہار کرتا ہو۔ نفسانی خواہشات سے بچتا ہو اور اس میں شرم و حیا کا مادہ موجود ہو۔

شقی و سعید کا انجام

فرمایا فَاَمَّا الَّذِیۡنَ شَقُوۡا فَفِی النَّارِ بہرحال جو بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں جائیں گے لَهُمْ فِیۡهَا زَفِیۡرٌ وَّشَهِیۡقٌ وہاں اُن کے لیے چیخنا چلانا اور رونے کی آوازیں ہونگی مفسرین کرام بیان

کرتے ہیں کہ زفیر گدھے کی اُس آواز کو کہتے ہیں جو ابتداء میں بڑی بلند ہوتی ہے اور شہیق وہ آواز ہوتی ہے جو آخر میں نرم پڑ جاتی ہے یا ایسی آواز ہوتی ہے جو سینے اور حلق سے غم واندوہ کی صورت میں نکلتی ہے تو فرمایا کہ بدبخت آدمی کے لیے دوزخ میں جا کر رونا پیٹنا اور چیخنا چلانا ہوگا خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ یہ لوگ وہیں دوزخ میں ہی رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں۔ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ مگر جو تیرا پروردگار چاہے۔ اگر اُس کی مشیت ہوگی تو حالات مختلف بھی ہو سکتے ہیں، وہ مالک ہے۔ جو چاہے کرے مگر عام قانون یہی ہے کہ شقی لوگ دوزخ میں دائمی طور پر رہیں گے۔ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ بے شک تیرا پروردگار کر گزرنے والا ہے جو چاہے۔ اس کو حق پہنچتا ہے کہ کسی بندے سے جیسا چاہے سلوک کرے۔

فرمایا وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ اور بہر حال وہ لوگ جو نیک بخت ہوئے، وہ جنت میں ہوں گے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وہ اسی میں مقیم رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں۔ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سوائے اس کے کہ جو تیرا پروردگار چاہے۔ وہ اگر کچھ اور فیصلہ کرنا چاہے، یا اس قانون میں کوئی استثناء کرنا چاہے تو وہ مختارِ کل ہے۔ ان جنتیوں کے متعلق فرمایا عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ جنتیوں کے جنت میں جانے کا یہ ایسا انعام ہے جو قطع نہیں کیا جائے گا یعنی ایسے لوگوں کو جنت سے محرومی کی کوئی صورت نہیں ہوگی اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

ابدیت کا ثبوت — اس آیت کریمہ میں دوزخیوں اور جنتیوں دونوں گروہوں کے لیے مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کے الفاظ آئے ہیں، یعنی

جب تک آسمان و زمین کا نظام قائم ہے دونوں گروہ اپنے اپنے مقام پر رہیں گے۔ ان الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کا قیام ابدی نہیں بلکہ زمین و آسمان کی موجودگی تک ہے۔ اور جب یہ نظام بدل جائے گا تو جنت یا دوزخ سے نکلنا پڑے گا۔ حالانکہ مشہور یہ ہے کہ جنت اور دوزخ ہمیشہ رہیں گے۔ اس اشکال کے جواب میں مفسرین فرماتے ہیں کہ عربی محاورے میں جب بلندی کا ذکر کرنا ہو تو آسمان سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ انسانی زمین میں آسمان بلند ترین جگہ ہے اور جب پستی کا ذکر مطلوب ہو تو زمین سے تشبیہ دی جاتی ہے تو اس سے پوری کائنات مراد ہوتی ہے جس میں کسی چیز کو استثناء حاصل نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے، زمین و آسمان کو دیکھ رہا ہے کہ ان میں کوئی تغیر و تبدل پیدا نہیں ہوتا لہٰذا اس کے دل میں ان کی ابدیت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور جب زمین و آسمان کے قیام کے حوالے سے کسی بات کا ذکر کیا جائے تو مراد یہی ہوتی ہے کہ زمین و آسمان کی طرح یہ چیز بھی ابدی ہے تو یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں دوزخی اور جنتی اپنے اپنے مقام میں رہیں گے۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ یہ لوگ ان مقامات پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے اور وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں مذکورہ آسمان و زمین سے مراد اس دنیا کے آسمان و زمین نہیں بلکہ آخرت کا آسمان اور زمین مراد ہے۔ آگے سورۃ ابراہیم میں آرہا ہے "یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" وہ دن آنے والا ہے جب کہ موجودہ زمین اور آسمان تبدیل کر دیے جائیں گے اور ان کی جگہ دوسری زمین اور دوسرا آسمان قائم ہو گا۔ ظاہر ہے کہ قیامت کے

بعد جو زمین و آسمان قائم کئے جائیں گے وہ ابدی ہوں گے۔ لہٰذا اس آیت میں آخرت کے زمین و آسمان مراد ہیں۔ جس طرح یہ زمین و آسمان ابدی ہوں گے اسی طرح جنتیوں اور دوزخیوں کا قیام بھی ابدی ہوگا۔

ماشاء اللہ کی توجیہات

یہاں پر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جنت اور دوزخ کا قیام ابدی ٹھہرا تو پھر ماشاء اللہ کے استثناء کا کیا مطلب ہے۔ بعض مکرم فرماتے ہیں کہ جنت اور دوزخ کے قیام کے علاوہ حشر کا جو عرصہ ہوگا اس میں نہ تو لوگ جنت میں ہوں گے اور نہ دوزخ میں تو اس عرصہ کو اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ پر ہی محمول کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ دوزخی لوگ جب جہنم میں جلتے جلتے کافی عرصہ گزاریں گے اور وہ شدید پیاس میں مبتلا ہوں گے، تو انہیں جحیم (گرم آگ) سے حمیم (گرم پانی) کی طرف لے جایا جائے گا تو یہ درمیانی عرصہ الا ماشاء اللہ کی استثنائی حالت میں ہوگا، کیونکہ اس وقفہ کے دوران دوزخی کم از کم دوزخ میں نہیں ہوں گے۔

ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جنتیوں کا جنت میں اور دوزخیوں کا دوزخ میں قیام اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اگرچہ بعض گمراہ فرقوں کا یہ خیال بھی ہے کہ خدا تعالیٰ جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں رکھنے پر مجبور ہے مگر یہ غلط نظریہ ہے حقیقت یہ ہے اللہ تعالیٰ کسی کام پر ہرگز مجبور نہیں ہے بلکہ وہ اپنی مشیت کے مطابق جو چاہے کرنے پر قادر ہے، لہٰذا جنت اور دوزخ میں رکھنے کا فیصلہ خالصتاً اس کی مرضی پر موقوف ہے، وہ جو چاہے فیصلہ کرے، اُس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بہرحال جہاں تک جنت اور دوزخ کی ابدیت کا تعلق ہے، یہ قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا بھی آئیگا

کہ موت کو ذبح کر دیا جائے گا اور جنت والوں سے کہا جائیگا خُلُوْدٌ وَّلَا مَوْتَ۔ تمہیں ہمیشہ رہنا ہے اور اب موت نہیں آئے گی پھر دوزخ والوں سے بھی یہی کہا جائے گا جس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جنت اور دوزخ ابدی ہیں اور وہاں پہنچنے والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہنا ہوگا۔ البتہ جنتیوں کے متعلق خاص طور پر فرما گیا ہے۔ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ جنت میں داخلہ ایک ایسی بخشش ہے جو منقطع نہیں ہوگی۔ سورۃ التین میں بھی اس قسم کے الفاظ آئے ہیں کہ اہل ایمان اور اعمال صالحہ کے مرتکبین کے لیے اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ نہ ختم ہونے والا اجر ہوگا۔

شرک کی مذمت اور اس کا بدلہ

آگے شرک کی مذمت بیان فرمائی فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ آپ اس چیز سے شک میں نہ پڑیں جس کی یہ لوگ پرستش کرتے ہیں، کیونکہ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ یہ بھی انہی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کی عبادت اس سے پہلے ان کے آباؤ اجداد کرتے آئے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے شرک کے ارتکاب میں آپ کو کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ پکی بات ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے کے مشرک یا موجودہ زمانے کے مشرک انہی معبودانِ باطلہ کی پوجا کر رہے ہیں جو ان کے بزرگوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو کوئی غیر اللہ کی پرستش کریگا وہ ہلاک ہو کر رہے گا۔ فرمایا وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ اور ہم ان کو پورا پورا بدلہ دینے والے ہیں۔ ان کو پوری پوری جزا ملے گی اور اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی کفر و شرک یا ظلم و زیادتی کرنے والے قطعاً یہ خیال نہ کریں کہ وہ کسی طرح اللہ کی گرفت سے بچ جائیں گے، بلکہ انہیں ان کے کیے کا مکمل

بدلہ ملے گا۔ اس سے یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں جو حصہ مقرر ہے، وہ پورا پورا دیا جائے گا۔ دنیا میں ہر نیک و بد کے لیے اللہ کے علم کے مطابق ایک ایک حصہ مقرر ہے جو لازماً ہر ایک کو ملے گا۔ اس دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے صحت، زندگی، مال اولاد، راحت جو کچھ بھی لوازمات زندگی کے طور پر مقرر کیا ہے، وہ سب کچھ مل کر رہے گا اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور جب یہ مقررہ حصے مکمل ہو جائیں گے تو پھر سزا کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا۔ گویا اپنا پورا حصہ حاصل کر لینے کے بعد اگلی منزل آئیگی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۗ وَلَوْلَا
كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَ
اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا
لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۗ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ
مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۗ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ:۔ اور البتہ تحقیق دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ۔ پھر اختلاف کیا گیا اُس میں ۔ اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو پہلے ہو چکی ہے تیرے پروردگار کی طرف سے تو البتہ فیصلہ کر دیا جاتا اُن کے درمیان ، اور بیشک وہ لوگ اس کی طرف سے تردد انگیز شک میں ہیں ﴿۱۱۰﴾ اور بیشک سب کے سب البتہ پورا پورا دے گا ان کو تیرا پروردگار اُن کے اعمال کا صلہ ۔ بیشک وہ جو کچھ بھی یہ عمل کرتے ہیں اس کی پوری طرح خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۱۱﴾ پس آپ سیدھے رہیں جیساکہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جنہوں نے توبہ کی آپ کے پاس اور حد سے آگے نہ بڑھو ۔ بیشک وہ جو کچھ بھی تم کام کرتے ہو ، اس کو دیکھنے والا ہے ﴿۱۱۲﴾

ربط آیات

پہلے اللہ نے مختلف نافرمان قوموں کا ذکر کیا کہ اللہ کے نبیوں نے انہیں کس طرح تبلیغ کی۔ پھر اُنکی نافرمانی کی بدولت اُن اقوام پر ہونے والے مؤاخذہ کا ذکر کیا۔ اِس دنیا میں دی گئی سزا کے علاوہ جو سزا اُن کو آخرت میں ملنے والی ہے اس کا بھی تذکرہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے کفر اور شرک کی تردید کی اور واضح کیا کہ کافر اور مشرک اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔ ہر ایک کو اپنے عقیدے اور عمل کا صلہ ملے گا اور اس ضمن میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔

نزولِ تورات

اسی یقین کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی۔ یہ عظیم الشان کتاب تورات ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں متعدد مقامات پر موجود ہے۔ تمام کتب سماویہ اور صحائف میں سے قرآن پاک کے بعد سب سے جامع کتاب تورات تھی۔ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے تاریخ انبیاء کے علاوہ نظامِ خلافت اور دیگر اجتماعی معاملات سے متعلق قوانین نازل فرمائے تھے جس کو بعد میں یہودیوں نے بگاڑ دیا۔ آج کل جو کتاب بائیبل کے نام سے موجود ہے اس میں کل انا ثیس (۳۹) صحیفے ہیں جن میں سے پہلے پانچ اب بائیبل تورات کا حصہ ہیں اور آخر میں عہد عتیق کے نام سے چار انجیلوں کو کتاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ انجیل بھی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ایک ہی کتاب تھی مگر عیسائیوں نے اس میں بھی گڑبڑ کر کے اسے چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

بہرحال تورات کا معنی ہی قانون ہے۔ یہ عبرانی یا سریانی زبان میں نازل ہوئی تھی۔ اب یہ اصل زبان میں تو کہیں بھی موجود نہیں، البتہ اس کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں میسر ہیں۔ جب فرعون اور اس کا لاؤ لشکر

بحرِ قلزم میں غرق ہوگیا تو بنی اسرائیل اُن کے شکنجے سے آزاد ہوگئے، تاہم وہ مصر واپس جانے کے بجائے صحرائے سینا میں ہی سرگرداں پھرتے رہے اس دوران انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ پہلے تو ہم فرعون کی غلامی میں تھے اور اس کے خود ساختہ قانون کے پابند تھے، مگر اب جب کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں تو زندگی گزارنے کے لیے ہمارے پاس کوئی قانون ہونا چاہیئے بنی اسرائیل کی اس فرمائش پر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں درخواست پیش کی تو حکم ہوا کہ کوہ طور پر چلے جاؤ، وہاں پر اعتکاف بیٹھو اور روزے رکھو تو تمہیں مطلوبہ کتاب دی جائیگی تو یہ تورات وہی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی۔

اختلاف فی الکتاب

فرمایا بنی اسرائیل کو کتاب تو مل گئی فَاخْتُلِفَ فِيهِ مگر اس میں اختلاف کیا گیا۔ حق تو یہ تھا کہ جس کتاب کو بنی اسرائیل نے خود طلب کیا تھا، اس پر عمل کرتے تاکہ اُن کو فلاح نصیب ہوتی، مگر انہوں نے اس کے احکام میں اختلافات پیدا کر دیے۔ کسی نے کسی حکم کو مان لیا مگر دوسرے سے انکار کر دیا۔ کسی نے غلط تاویلیں شروع کر دیں اور بعض نے بعض احکام کو بالکل ٹھکرا دیا۔ بعض لوگوں نے احکامِ الٰہی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اور بعض نے انہیں بالکل ہی بگاڑ دیا اور اس طرح یہ مقدس کتاب اختلافات کا شکار ہوگئی اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں دھڑے بندی شروع ہوگئی اور ان کے بہت سے فرقے وجود میں آگئے۔ افسوس کا مقام ہے کہ آج قرآن پاک جیسی مقدس و مطہر اللہ کی آخری کتاب کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں یہودیوں کی طرح مسلمانوں میں بہت سے فرقے معرضِ وجود میں آچکے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا اِفْتَرَقَتْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى ثِنْتَيْنِ

وَسَبْعِیْنَ یعنی بنی اسرائیل بہتر[۷۲] فرقوں میں بٹ گئے، ہر فرقہ کا علیحدہ علیحدہ اعتقاد اور علیحدہ علیحدہ مسلک ہے۔ ان کی فکر اور طریق کار بھی جدا جدا ہے حالانکہ کتاب تو ایک ہی تھی مگر اختلافات کی وجہ سے وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ یہودیوں کے بہتر فرقے بنے مگر میری امت کے تہتر ہوں گے جن میں سے صرف ایک ناجی ہوگا۔ جب کہ باقی سارے جہنمی ہوں گے صحابہ نے عرض کیا حضور! وہ ناجی فرقہ کون سا ہوگا۔ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا[۱] مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ ناجی فرقہ وہ ہوگا جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگا۔

بہر حال فرمایا کہ جو کتاب موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی اُس میں اختلاف کیا گیا اور پھوٹ ڈالی گئی حالانکہ اگر یہ لوگ اللہ کی مرضی کے مطابق چلتے تو ان کا فائدہ تھا۔ اللہ نے یہ کتاب ہدایت کے لیے نازل فرمائی تھی۔ اللہ نے قرآن پاک اور تورات دونوں کے متعلق فرمایا ہے کہ کوئی ایسی کتاب لاؤ جو ان دونوں سے بڑھ کر ہدایت کا راستہ بتلانے والی ہو فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ (القصص) تو فرمایا اللہ کی کتاب تورات تو راہنمائی کرنے والی ہے مگر ان لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا اور فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

قانونِ امہال و تدریج

اِس اختلاف کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو فوراً سزا نہیں دی بلکہ فرمایا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ اگر نہ ہوتی ایک بات جو پہلے واقع ہو چکی ہے مِنْ رَّبِّكَ تیرے پروردگار کی طرف سے لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ تو اُن کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، مگر یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اُس کا قانون یہ ہے، کہ

---

[۱] ترمذی ص ۳۷۹

دنیا میں لوگوں کو موقع دیا جاتا ہے۔ اُن کو مہلت دی جاتی ہے کہ اس عرصہ میں حق کو قبول کریں۔ اگر وہ تسلیم کر لیتے ہیں تو بچ جاتے ہیں، ورنہ خدا تعالیٰ کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ تاہم عام قانون یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے، پھر اگر اِس دنیا میں اُن کا فیصلہ کسی مصلحت کی بنا پر نہ ہو تو آگے چل کر ضرور ہو جاتا ہے۔ آگے اسی رکوع میں آرہا ہے "لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ" لوگ اختلاف کرتے رہیں گے "اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ" (السجدۃ) پھر تیرا پروردگار ان کے درمیان فیصلہ کر دیگا جس بات میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ سورۃ بقرہ میں موجود ہے۔ "قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" دنیا میں ہدایت اور گمراہی کی راہیں واضح ہو چکی ہیں، اس کے باوجود لوگوں نے اختلاف، جھگڑے اور فرقہ بندی کو ہوا دی، عقیدے خراب کیے، اللہ کی توحید کو کما حقہٗ تسلیم نہ کیا، مگر اِن سب اختلافات کا حتمی فیصلہ اللہ تعالیٰ آگے چل کر ہی کرے گا کیونکہ وہ اپنے قانونِ امہال و تدریج کے مطابق مہلت دیتا رہتا ہے اور فوری گرفت نہیں کرتا۔

کلام الٰہی میں تردد

فرمایا، بات تو بالکل واضح کر دی گئی ہے "وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ" مگر یہ لوگ اُس کی طرف سے تردد انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ مریب شک کی صفت ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اِن کا دل کسی طرف نہیں جمتا حالانکہ یہ خدا تعالےٰ کا کلام برحق ہے۔ جو انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اس پر یقین رکھنا چاہیے اور اپنی فکر و عمل اسی کے مطابق بنانی چاہیے شک کرنا منافق یا نافرمان لوگوں کا کام ہے۔ شک اِن کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ فرمایا، یاد رکھو! "وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا" اور بیشک سب کے سب،

لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ البتہ پورا پورا دیگا تیرا پروردگار اُن کے اعمال کا صلہ۔ صاحب کشاف کہتے ہیں کہ یہاں پر کُلًّا کی تنوین مضاف الیہ کے عوض میں آئی ہے اور مطلب ہے وَإِنَّ كُلَّهُمْ یعنی بیشک وہ سب کے سب۔ بعض فرماتے ہیں کہ پوری قرأت یوں ہے وَإِنَّ كُلًّا لَمَّا بُعِثُوا یہ سب کے سب جب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ تو ضروری بات ہے کہ ان کا پروردگار ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیگا۔ کیونکہ إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ بیشک وہ اُن کے ہر عمل کی پوری پوری خبر رکھتا ہے۔ اُس سے کوئی چیز غائب نہیں ہے، ذرہ ذرہ اُس کے علم میں ہے وہ ہر ایک کے ارادے اور نیت کو جانتا ہے، لہٰذا ان کے اعمال کا بدلہ ضرور دیگا۔

جزائے عمل اس دنیا میں نہیں بلکہ اگلے جہان میں ہے، لہٰذا یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ مجرموں کو فوری طور پر سزا کیوں نہیں دی جاتی اس کا قانون یہ ہے کہ جب جزائے عمل کا وقت آئے گا تو پھر وہ پورا پورا انصاف کریگا۔ اِس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی مثال بھی بیان فرمادی ہے اور حضور علیہ السلام اور آپ کے متبعین کو تسلی بھی دی ہے کہ وہ گھبرائیں نہیں، بلکہ اپنا مشن جاری رکھیں آگے جزائے عمل کا وقت آنے والا ہے جب سب کو پورا پورا صلہ ملیگا۔

استقامت کا حکم

آگے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے ایک بڑا سخت حکم نازل فرمایا ہے۔ ارشاد ہے فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ اے پیغمبر! آپ سیدھے رہیں جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ اور جن لوگوں نے توبہ کی ہے آپ کے ساتھ، یعنی کفر، شرک اور گندے عقیدے سے تائب ہو گئے ہیں اور ایمان اور توحید میں آپ

کے ہمسفر ہیں، اُن کو بھی یہی حکم ہے کہ وہ استقامت پر رہیں استقامت بہت بڑی بات ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان شک اور تردد میں نہ پڑے بلکہ اپنے ایمان پر پختہ رہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ اکثر لوگ استقامت سے محروم ہوتے ہیں۔ بزرگانِ دین کا قول ہے اُطْلُبُوا الْاِسْتِقَامَةَ وَلَا تَطْلُبُوا الْکَرَامَةَ یعنی استقامت تلاش کرو، کرامت کے پیچھے نہ پڑو۔ بعض لوگ کرامات کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کہیں نظر آئے تو صاحبِ کرامت کو ولی اللہ تسلیم کر لیں۔ فرمایا کرامت سے بلند تر چیز استقامت ہے، اُسے اختیار کرو۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ استقامت کا معنیٰ درست راستے پر ٹھیک ٹھیک قائم رہنا ہے۔

صحابی رسُول حضرت سفیان ابن عبداللہ ثقفیؓ نے ایک دفعہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا قُلْ لِّیْ فِی الْاِسْلَامِ قَوْلًا لَا اَسْئَلُ اَحَدًا بَعْدَكَ حضور! مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایسی بات بتلا دیں کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے حضور علیہ السلام نے فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ عَلَيْهَا کہو میں اللہ پر ایمان لایا، اُس کی وحدانیت کو تسلیم کیا اور پھر اس پر مستقیم رہو یعنی جم جاؤ۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد تمام مقتضیاتِ ایمان پر قائم رہو اور ان میں کسی قسم کا خلل نہیں آنا چاہیئے۔

عقیدے کی پختگی

امام بیضاویؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے استقامت عقیدے میں ہونی چاہیئے۔ اور عقیدے میں توحید کو اولیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر پختہ عقیدہ ہو، اور اس کے خلاف تمام عقائد خواہ وہ شرکیہ ہوں یا تشبیہ والے یا جبر والے، سب باطل ہیں

بعض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انسان خود مختار ہے اور اس پر کسی طاقت کا کنٹرول نہیں ہے ۔ یہ بھی گمراہی والا عقیدہ ہے ۔ بعض لوگ صفاتِ الٰہی کا انکار کر دیتے ہیں اور بعض اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گڑبڑ کر جاتے ہیں ۔ یہ سب باتیں استقامت سے دوری کی علامت ہیں ۔ استقامت یہ ہے کہ کہ عقیدہ بالکل پاک اور صاف ہو ، اس میں کسی باطل چیز کو دخل نہیں ہونا چاہیئے عبادات میں بھی استقامت پیدا کرنی چاہیئے ، ایسا نہیں ہے کہ کبھی کوئی عبادت کر لی اور کبھی چھوڑ دی بلکہ عبادت خواہ فرض ہو یا واجب سنت ہو یا مستحب ، اس پر مداومت ہونی چاہیئے اور یہ بات استقامت میں داخل ہے ۔

اعمال میں استقامت

تمام اعمال اور معاملات میں بھی استقامت ضروری ہے ۔ انسان حلال وحرام میں استقامت اختیار کرے اور حقوق میں بھی ثابت قدم رہے حق خواہ انسان کا اپنا ہو ، خدا تعالیٰ کا ہو یا بنی نوع انسان کا ، اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونی چاہیئے حتیٰ کہ شریعت میں جانوروں کے حقوق بھی متعین ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے ۔ معاشرے کے کمزوروں ، بیماروں محتاجوں ، مسافروں ، یتیموں اور اقرباء کے حقوق کو ادا کرنا استقامت میں داخل ہے ۔ جو شخص دوسرے کے حقوق ادا نہیں کرتا وہ استقامت سے دور ہے ۔ زندگی کے باقی معاملات مثلاً سیاست میں بھی استقامت یعنی اعتدال کی ضرورت ہے ، یہودیوں ، دہریوں اور کمیونسٹوں جیسی سیاست اختیار نہ کرو ، ہمیشہ ایمان اور اسلام کی سیاست اختیار کرو جو کہ اللہ کے نبیوں یا خلفائے راشدین کا طریقہ ہے ۔ ملکی آئین اور قانون میں استقامت کی ضرورت ہے اور یہ اس وقت حاصل ہوگی جب دین کے بتائے ہوئے قوانین اختیار کرو گے ۔ اگر مانگے تانگے کے غیر اسلامی قوانین اختیار کرو گے تو استقامت حاصل نہیں ہو سکے گی ۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور بعض دیگر صحابہ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ حضور! کیا بات ہے آپ کے بال سفید ہو رہے ہیں اور بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں آپ علیہ السلام نے فرمایا شَیَّبَتْنِیْ سُوْرَةُ الْهُوْدِ یعنی سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ بعض روایات میں سورۃ واقعہ، سورۃ تکویر، سورۃ نبا اور سورۃ مرسلٰت کا ذکر بھی آتا ہے کہ ان سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سورتوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے لیکر بہت سی نافرمان قوموں کا ذکر ہے اور ان پر اسی دنیا میں آنے والی سزا کا بیان ہے۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں جو انجام ہونے والا ہے، اس کا بھی اشارۃً ذکر کر دیا گیا ہے حضور نے فرمایا کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میری امت کا حشر بھی سابقہ امم جیسا ہی نہ ہو اور اسی خوف کی وجہ سے مجھ پر بڑھاپا طاری ہو رہا ہے۔

استقامت بطور سخت حکم

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے بعض بزرگان دین سے یہ بات بھی منقول ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ پر بڑھاپا سورۃ ہود میں آمدہ سخت حکم فَاسْتَقِمْ کی وجہ سے آیا ہے۔ مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ کہیں استقامت میں فرق نہ آجائے۔ نبی کی ذات تو اعلیٰ و ارفع ہے، اس کی استقامت میں تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، البتہ امت کے لیے یہ بڑا سخت حکم ہے، اگر استقامت سے ادھر ادھر ہو گئے تو گرفت میں آجانے کا ڈر ہے۔ حضور علیہ السلام اسی فکر میں مبتلا رہتے تھے۔

آج کے دور میں استقامت مفقود ہو چکی ہے۔ نہ عقیدے میں پختگی ہے، نہ اعمال میں اور نہ اخلاق میں۔ زندگی کے کسی شعبہ میں خواہ وہ سیاست کا ہو یا معیشت کا یا دیگر معالات کا، استقامت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی، بہرحال اللہ نے حکم دیا کہ جس طرح آپ کو حکم دیا

ترمذی ص۴۹۶، مستدرک حاکم ص۳۴۳ ج۲

گیا ہے اس کے مطابق آپ استقامت پہ رہیں وَلَا تَطْغَوْا اور حد سے آگے نہ بڑھیں معاملہ عقیدے کا ہو یا عمل کا، اخلاقیات ہوں یا حقوق، کسی بھی معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کریں بلکہ استقامت یعنی اعتدال کو قائم رکھیں، ورنہ گرفت میں آجائیں گے۔ کیونکہ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ تم جو بھی کام کرتے ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔ اس کے بعد جزائے عمل یقینی بات ہے، لہٰذا استقامت کو تلاش کرو تاکہ تمہارا ایمان، توحید، اعمال اور اخلاق صحیح سمت میں رہیں۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ :- اور مت جھکو اُن لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا، پس چھوئے گی تم کو آگ، اور نہیں ہوگا تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی مددگار۔ پھر تمہاری (کسی طرف سے بھی) مدد نہیں کی جائے گی ﴿۱۱۳﴾ اور قائم کرو نماز کو دن کے دونوں اطراف میں اور رات کی گھڑیوں میں۔ بیشک نیکیاں دُور کرتی ہیں برائیوں کو یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لیے ﴿۱۱۴﴾ اور آپ صبر کریں، بیشک اللہ تعالیٰ نہیں ضائع کرتا اجر نیکی کرنے والوں کا ﴿۱۱۵﴾

ربط آیات اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر توحید کا مسئلہ بیان فرمایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر عقائد یعنی رسالت، قیامت، جزائے عمل اور قرآن کی صداقت و حقانیت کا ذکر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک متعدد انبیاء اور اُن کی قوموں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جس میں دعوت الی التوحید کو مرکزی

حیثیت حاصل ہے۔ سورۃ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا ہے۔ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ ؕ لوگو! عبادت صرف اللہ کی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، اپنے گناہوں کو بخشواؤ اور خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو۔ یہی بات دوسرے انبیاء نے بھی فرمائی۔ اس کے جواب میں مختلف اقوام کے لوگوں میں جو ردِ عمل پیدا ہوا، اللہ نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ جن لوگوں نے نافرمانی کی، توحید باری تعالیٰ کا انکار کیا، انبیاء کی نبوت اور رسالت کو تسلیم نہ کیا بلکہ الٹا ان کو تکالیف پہنچاتے رہے، اُن کی توہین کرتے رہے، اللہ نے اُن کو اس دنیا میں بھی مختلف قسم کی سزاؤں میں مبتلا کیا اور پھر آخرت کا عذاب تو ان کے لیے دائمی ہوگا۔

تاریخ انبیاء کی آخری کڑی کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے کہ دیکھو! آپ کو اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان کتاب عطا فرمائی تاکہ لوگ اس سے ہدایت اور راہنمائی حاصل کریں مگر لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا، پاکیزہ عقائد کو بگاڑ کر مختلف فرقے بنا لیے۔ اللہ نے فرمایا کہ آگے جزائے عمل کی منزل آنے والی ہے جب ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملنے والا ہے۔

استقامت علی الدین

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا فَاسْتَقِمْ یعنی آپ اپنے دین پر مستقیم رہیں اور جن ایمانداروں نے آپ کے ساتھ توبہ کی ہے۔ وہ بھی دین پر سیدھے رہیں اور سرکشی اختیار نہ کریں۔ فلاح و کامیابی کا مرکزی اصول استقامت علی الدین ہے یعنی دین پر مضبوطی کے ساتھ جم جانا اور اس ضمن میں کسی قسم کی کمزوری یا بزدلی نہ دکھانا۔ حضور علیہ السلام اس اصول کی خاطر بڑے غمگین رہتے تھے کہ میری امت دین پر کس طرح مستقیم رہ سکے گی اہم

رازیؒ فرماتے ہیں کہ دین کے تمام شعبوں میں استقامت کی ضرورت ہے۔ عقیدہ، ایمان، سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات اور عبادات تمام معاملات میں پختگی کی ضرورت ہے حتیٰ کہ وضو بھی سنت میں بتائی گئی ترتیب کے مطابق کرو کیونکہ غیر مرتب وضو کرنا مکروہ اور خلاف سنت سمجھا جاتا ہے۔ غرضیکہ تمام امور میں استقامت کی ضرورت ہے

ظالم اور مظلوم میں کشمکش

اب ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَرْكَنُوٓا۟ إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ اور آپ نہ جھکیں یعنی نہ مائل ہوں اُن لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا۔ اگر ایسا کرو گے فَتَمَسَّكُمُ ٱلنَّارُ تو تم کو بھی جہنم کی آگ چھوئے گی مطلب یہ ہے کہ ظالموں کے ساتھ میلان رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اللہ نے ظالم کی حمایت کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ فرمایا آگے جب جزائے عمل کی منزل آئے گی وَمَا لَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ تو اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز اور مددگار نہیں ہو گا۔ تم سمجھتے ہو کہ اگر دنیا میں کسی کی حمایت کریں گے تو وہ اگلے جہان میں چھڑائے گا، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ بلکہ اللہ کے دربار میں کسی کو دم کشائی کی بھی ہمت نہیں ہوگی۔ ظالم اور مظلوم کی باہمی جنگ ہابیل اور قابیل کے وقت سے چلی آرہی ہے۔ دنیا کا عام مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر لوگ مظلوم کی بجائے ظالم کا ساتھ دیتے ہیں جس کی وجہ سے انسانی معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ اٰوٰى مُحْدِثًا جو مجرم کو پناہ دیتا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہے ظاہر ہے کہ جس شخص پر اللہ لعنت کرے اس کے حالات کیسے درست ہو سکتے ہیں اور انسانی معاشرہ کیسے سدھر سکتا ہے؟ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم صحابہؓ نے عرض کیا، حضور! ظالم کی مدد کیسے ہوگی؟ فرمایا اُس کو ظلم سے روک

دنیا ہی اُس کی مدد ہے۔ حضور کا یہ بھی ارشاد ہے عَوْنُ الضَّعِيْفِ وَنَصْرُ الْمَظْلُوْمِ یعنی کمزور آدمی کی اعانت کرو اور مظلوم کی مدد کرو۔ ہمارے دین کا یہ اہم اصول ہے لَا تَظْلِمُوْا وَلَا تُظْلَمُوْا نہ خود کسی پر ظلم کرو اور نہ ظلم کو برداشت کرو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيَهٗ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ قَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ جو آدمی ظالم کی تائید کے لیے چل کر جاتا ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ یہ ظالم ہے تو ایسا شخص اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

ایک موقع پر ایک شخص نے حضرت ابُوہریرہؓ کی موجودگی میں کہا الظالم لا یضر الا نفسہ' ظالم خود اپنا ہی نقصان کرتا ہے کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ اس پر حضرت ابُوہریرہؓ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو بلکہ ظلم کا اثر ہر چیز پر پڑتا ہے حتیٰ کہ درخت اور نباتات بھی ظلم سے محفوظ نہیں رہتے اور پرندے بھی ظلم کی وجہ سے اپنے گھونسلوں میں لاغر ہو کر مرتے ہیں۔ جب کوئی ناہنجار آدمی مرجاتا ہے تو درخت کہتے ہیں الحمد للہ یہ موذی انسان اس دُنیا سے چلا گیا۔ خود قرآن پاک میں موجود ہے "فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (الانعام) ظالموں کی جڑ کاٹ دی گئی اور سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔

یہی ظلم ہے جس کی وجہ سے دنیا بدامنی اور فتنہ وفساد کا گھر بنی ہوئی ہے۔ اکثر لوگ سرمایہ داروں، وڈیروں، ڈکٹیٹروں اور جاگیرداروں کا ساتھ دیتے ہیں اور مظلوم کی مدد کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر طرف ظلم وجور کا دور دورہ ہے۔

ظلم کی سیاست

پوری دنیا کی سیاست کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں، ظالم کی ہاں

ہیں ہاں ملائی ہمارہی ہے مگر مظلوم کا حال پوچھنے والا بھی کوئی نہیں افغان عوام کتنے سالوں سے روسی مظالم کی چکی میں پس رہے ہیں مگر کوئی پرسان حال نہیں۔ امریکہ اور روس جیسی سپر طاقتوں کے حمایتی تو میت مل جائیں گے مگر مغلوب کے حق میں آواز اٹھانے کی بھی جرأت نہیں کی جاتی۔ اگر سارے مسلمان ممالک ہی افغانستان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے تو معاملہ طے ہو سکتا تھا مگر یہاں تو ہر طرف منافقت کی حکمرانی ہے، زبان پر کچھ ہوتا ہے اور دل میں کچھ اور ہر طرف انسانیت کے ساتھ دھوکہ اور فریب ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ پاکیزہ اصول بتلا دیا ہے کہ ظالموں کی طرف مت مائل ہو۔ ظالم کی مدد سے معاشرہ پاک نہیں ہو سکتا۔ اگر دنیا کو امن وچین کا گہوارہ بنانا چاہتے ہو تو مظلوم کی مدد کرو اور ظالم کو اس کے ظلم سے روکو۔ ظلم میں کفر، شرک، بدعات اور گناہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ ان چیزوں کے مرتکبین ظالم ہیں جو کہ جہنم کا نشانہ بنیں گے اور پھر ان کی حمایت کرنے والے بھی ان کے ساتھ ہی جائیں گے۔ ان کا کوئی حامی و ناصر نہیں ہوگا ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ پھر ان کی مدد بھی نہیں کی جائے گی اور ایسے لوگ بے یار و مددگار رہ جائیں گے۔ اس قسم کے ظالموں اور ان کے حمائتیوں کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے۔ سورۃ فیل میں فرمایا ہے "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ" کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ سورۃ فجر میں ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ قوم عاد کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا اور اللہ نے انہیں کس طرح ہلاک کیا یہ سب کچھ ظلم کی وجہ سے ہوا، لہذا اللہ نے ظالموں کی طرف مائل ہونے سے منع فرما دیا۔

اقامت صلوٰۃ

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے ظلم سے منع فرمایا اور دوسری طرف حضور علیہ السلام کو خطاب کر کے عام لوگوں سے فرمایا وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ نماز قائم کرو دن کے دونوں اطراف میں وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اور رات کی گھڑیوں میں بھی استقامت علی الدین کے بعد اقامتِ صلوٰۃ دین کا اہم ترین اصول ہے دن کے دونوں اطراف سے مراد فجر اور عصر کی نمازیں ہیں جب کہ رات کی گھڑیوں میں مغرب اور عشا، آتی ہیں ۔بعض مفسّرین اسی آیت کو پانچوں نمازوں پر محمول کرتے ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں کہ دن کے پہلے کنارے سے پہلا پہر مراد ہے اور اس میں فجر کی نماز آتی ہے ۔جب کہ دوسرے کنارے سے پچھلا پہر مراد ہے جس میں ظہر اور عصر دونوں نمازیں آتی ہیں۔اس طرح اس آیت میں پانچوں نمازوں کی طرف اشارہ ملتا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سورۃ ہود مکی سورۃ ہے جب کہ پانچ نمازوں کی فرضیت معراج کی رات کو ہوئی جو کہ مکی دور کے بالکل آخری حصے کا واقعہ ہے اس لیے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت سے پانچ نمازیں نہیں بلکہ تین مراد ہیں یعنی فجر، عصر اور رات کی نمازیں اور اسلام کے ابتدائی دور میں نمازیں تین ہی تھیں جو کہ بعد میں پانچ کر دی گئیں ۔

نماز ایک ایسی عبادت ہے جس سے تعلق باللہ درست ہوتا ہے ۔پانچ وقتہ نماز تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے اگر انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہو جائے گا تو انسان ظلم سے بچ جائیں گے ، وہ تمام حقوق ادا کریں گے اور ظلم و زیادتی کا قلع قمع کر دیں گے ۔اس کے برخلاف اگر حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ضائع کیا گیا تو اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم نہیں رہ سکے گا ۔

اور ساری باتیں بگڑ جائیں گی، جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے، اس کے لیے دین کی باقی باتوں کو ضائع کرنا آسان ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے کہ لوگو! نماز قائم کرو تاکہ تمہارا تعلق باللہ درست رہے۔

برائی کے بعد نیکی

نماز جیسی عظیم نیکی کے ذکر کے بعد فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ نماز کے تمام ارکان طہارت، وقت، تلاوت، تسبیح، تہلیل، مناجات، دعا، قیام، رکوع، قعود اور سجود وغیرہ نیکیاں ہیں۔ یہ نیکیاں بجالاؤ گے تو برائیاں مٹتی چلی جائیں گی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے پیچھے نیکی لگا دو تاکہ وہ برائی مٹ جائے۔ نیز فرمایا خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔ برائیوں کو مٹانے کا یہ عمدہ نسخہ ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ترجمہ قرآن پاک کے حاشیے میں صرف ایک سطر میں کمال درجے کا مضمون باندھا ہے فرماتے ہیں کہ نیکیاں برائیوں کو تین طریقے سے ختم کرتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کے فرمان کے مطابق پہلی بات تو یہ ہے کہ جو نیکی کمرنگا اس کی برائیاں مٹ جائیں گی بشرطیکہ وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوں گی مَا اجْتُنِبَتِ الْکَبَائِرُ نہ ہو۔ کیونکہ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتا۔ دوسری جگہ فرمایا نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ ہم تمہاری برائیوں کو مٹا دیں گے حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ جمعہ کی نماز ادا کرنے والے کی ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کی خطائیں معاف فرما دیتا ہے بلکہ تین مزید دنوں کی خطاؤں کی بھی معافی مل جاتی ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ اللہ ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک کی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ ایک نماز سے دوسری نماز تک کے گناہ مٹا دیئے جاتے

ہیں۔ انسان جب وضو کے لیے ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب منہ دھوتا ہے تو منہ کے گناہ معاف اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں سے چل کر کئے گئے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ بہر حال فرمایا پہلی بات یہ ہے کہ جب انسان نیکی کرتا ہے اس کی برائیاں مٹا دی جاتی ہیں اور دوسری بات شاہ صاحبؒ نے یہ فرمائی ہے کہ جو نیکیاں اختیار کرے۔ اس سے خود برائیوں کی چھوٹے اور تیسری بات یہ کہ "جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو، وہاں ہدایت آئے اور گمراہی مٹے۔ اِن تینوں طریقوں سے برائیاں ختم ہوتی ہیں۔ مگر شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ برائیاں اُس وقت مٹیں گی جب نیکیوں کا وزن غالب ہوگا۔ کیونکہ جس قدر کپڑے میں میل زیادہ ہوتی ہے۔ اسی قدر صابن کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی نیکیاں ساٹھ فیصد ہیں تو اس کی چالیس فیصد برائیاں مٹ جائیں گی اور اگر برائیوں کا غلبہ ہوگا تو ان کے لیے مٹنا مشکل ہو جائے گا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جہاں نیکی کا ملکہ پیدا ہوگا۔ وہاں برائی مٹے گی، اسی لیے فرمایا کہ بیشک نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں۔ فرمایا ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ یہ نصیحت ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے جو شخص اِن نصائح کو قبول کرے گا، نماز ادا کرنے لگے گا۔ اللہ تعالےٰ نیکیوں کے بدلے میں اس کی برائیوں کو مٹا دے گا۔

صبر کا حکم

آگے حضور علیہ السلام کو خطاب کر کے پوری امت کو بات سمجھائی گئی ہے وَاصْبِرْ آپ صبر کریں۔ جو بھی نیکی کا کام کریگا اُسے تکالیف پہنچیں گی، تمام انبیاء اور اللہ کے نیک بندے اس آزمائش سے گزر چکے ہیں اور یہ دین کا زریں اصول ہے کہ سختی کو برداشت کریں۔ صبر ہمارے دین کے اہم اصولوں میں سے ایک ہے۔ باقی اصول اللہ

کا ذکر، توحید، شکر، تعظیم شعائر اللہ وغیرہ ہیں۔ اپنے اپنے مقام پر سب چیزیں ضروری ہیں۔ تو فرمایا آپ صبر کریں کیونکہ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے اجر کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ اگر دین پر استقامت اختیار کروگے، مظلوم کی حمایت کرو گے تو اس نیکی کا اجر ضرور ملیگا۔ جب اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوگا تو برائی کا جذبہ مضمحل ہو جائے گا یہی نیکی ہے، جس کا اجر ضائع نہیں ہوتا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ
يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ
اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ
وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى
بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ
لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾
اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ
رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

ترجمہ :- پس کیوں نہیں ہوئے اُن قوموں میں سے جو تم سے پہلے گزری ہیں، صاحبِ عقل وخرد، جو منع کرتے زمین میں فساد سے مگر بہت تھوڑے اُن میں سے جن کو ہم نے نجات دی۔ اور پیچھے چلے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا اس چیز کے جس خوشحالی میں ڈالے گئے تھے وہ اور وہ گنہگار تھے (۱۱۶) اور نہیں ہے تیرا پروردگار کہ ہلاک کرے بستیوں کو ظلم کی وجہ سے جب کہ وہاں کے رہنے والے اصلاح کرنے والے ہوں (۱۱۷) اور اگر چاہے تیرا پروردگار تو البتہ کردے ان لوگوں کو ایک ہی امت، اور ہمیشہ رہیں گے یہ اختلاف کرنیوالے (۱۱۸) مگر وہ کہ جس پر تیرے پروردگار نے رحم کیا، اور اسی واسطے اُنکو پیدا کیا ہے۔ اور پورا ہوگیا کلمہ تیرے رب کا کہ میں ضرور بھر دونگا جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے (۱۱۹)

ربط آیات

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کے بعض انبیاء کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کو تسلی بھی دی ہے۔ پہلے استقامت علی الدین کا مطالبہ کیا، ظلم اور تعدی سے بچنے کا حکم دیا اور تعلق باللہ کی استواری کی ترغیب دی۔ مصائب اور مشکلات کو برداشت کرنے اور صبر کا دامن تھامے رہنے کی تلقین کی۔ سابقہ امتوں کا حال بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے آخری امت کو بات سمجھائی ہے کہ ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کاربند رہیں۔ دین اور ایمان کے مقتضیات کو قائم رکھیں۔ کفر، شرک نافرمانی، ظلم اور تعدی سے بچتے رہیں۔

فساد فی الارض کی ممانعت

اب ارشاد ہوتا ہے فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ پس کیوں نہ ہوئے ان قوموں میں سے جو تم سے پہلے گزرے ہیں اُولُوْا بَقِيَّةٍ صاحب عقل و خرد لوگ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ جو منع کرتے زمین میں فساد کرنے سے۔ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ مگر ان میں سے بہت تھوڑے ہیں (جو فساد سے منع کرنے والے ہیں) جنہیں ہم نے نجات دی۔ یہاں پر قرن کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قرن کی جمع ہے۔ اور اس کا معنی جماعت، سنگت، نسل، قوم، طبقہ، صدی یا دور ہوتا ہے۔ اس مقام پر ان تمام معانی کا اطلاق ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے سابقہ اقوام اور ادوار میں بھی ایسا ہی ہوا کہ فساد سے روکنے والے بہت کم لوگ ہوئے ہیں۔ اُولُوْا بَقِيَّةٍ سے وہ لوگ مراد ہیں جن پر فساد سے روکنے کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے یعنی صاحب عقل، سمجھدار، سوچ بچار کرنے والے اصحاب الرائے لوگ۔ لوگوں کو فساد فی الارض سے منع کرنا ان لوگوں کا کام ہے مگر اللہ نے فرمایا کہ تم سے پہلے بہت تھوڑے

لوگ ہی ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے فساد کو ختم کرنے کی کوشش کی ورنہ اکثر و بیشتر لوگ فتنہ و فساد کے حمائتی بنے رہے ہیں اور انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔ اس میں در اصل امت مسلمہ کے لیے تسلی کا پہلو ہے کہ اگر لوگوں کی اکثریت کفر و شرک کا ارتکاب کرتی ہے ظلم و تعدی کی مرتکب ہوتی ہے یا معاصی میں غرق ہے تو تمہیں اس سے گھبرانا نہیں چاہیے تم سے پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ البتہ ان حالات میں کرنے کا کام یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا جائے۔ لوگوں کو فساد کرنے سے روکا جائے۔ دنیا میں سب سے بڑا فساد کفر، شرک اور ظلم و تعدی ہے۔ اصحاب عقل و خرد اور اصحاب جاہ و اقتدار کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو ہر قسم کے فساد سے روکیں۔ اگر ایسا نہیں کرینگے تو سب پر خدا کا قہر نازل ہوگا جس کے نتیجے میں تباہی اور بربادی آئے گی۔ اللہ کے نبی اور اُن کے پیروکار تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود اس کام کو انجام دیتے رہے ہیں اور وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے نجات دی اور باقی سب کو ہلاک کیا۔

متاعِ دنیا میں رغبت

فرمایا فساد فی الارض کو مٹانے والے تو تھوڑے لوگ رہے ہیں اور اُن کی اکثریت نے کیا کیا؟ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ ظالم لوگوں نے اُس خوشحالی کا اتباع کیا جس میں اُن کو ڈالا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو دُنیا میں آسودگی، آرام طلبی، خوشحالی عطا کی تھی، چنانچہ یہ لوگ انہی چیزوں کے پیچھے لگے رہے ظلم و فساد کو مٹانے کی کوشش نہ کی، اپنی عیاشی میں منہمک رہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ اور وہ گنہگار اور مجرم تھے۔ یہ لوگ حق کو قبول کرنے کی بجائے شرکیہ اور کفریہ رسومات کے پیچھے چلتے رہے، بدعات کو رواج دیتے رہے اور دنیا کا سامانِ عیش و راحت ہی اکٹھا کرتے رہے

انہوں نے فساد کرنے والوں کو منع تک نہ کیا۔ سورۃ الانعام میں مکے کے مشرکین کا بھی یہی حال اللہ نے بیان فرمایا ہے " وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ " وہ لوگوں کو قرآن پاک سے روکتے تھے اور خود بھی اس سے دور رہتے تھے۔ اس طرح وہ فساد فی الارض کی حمایت کرتے تھے۔ تو امت آخرالزمان کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ تم بھی سابقہ اقوام کی طرح نہ ہو جانا بلکہ خود بھی صحیح راستے پر چلنا اور دوسرے غلط راستے پر چلنے والوں کو بھی منع کرنا کہ وہ زمین میں فساد کے مرتکب نہ ہوں۔

فساد کے اثرات

سورۃ البقرہ میں منافقوں کا حال بیان کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے " وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ " جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو " قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ " تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں اس کی تفسیر میں امام بیضاوی ؒ نے فساد فی الارض کی تعریف میں لکھا ہے اَلْاِخْلَالُ بِالشَّرَائِعِ الْاِلٰهِيَّةِ یعنی اللہ کی نازل کردہ شریعت میں خلل ڈالنا اور اس کی خلاف ورزی کرنا فساد فی الارض ہے۔ امام شاہ ولی اللہ ؒ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے زمین میں اصلاح ہوتی ہے اور شریعت کے خلاف کرنے سے فساد پیدا ہوتا ہے۔ شاہ صاحب ؒ فرماتے ہیں پاکیزہ عقیدے، پاکیزہ عمل، خدا کے سامنے عاجزی اور عدل و انصاف کے قیام سے انسان کا مزاج درست رہتا ہے اور وہ فرشتوں کے مزاج سے سازگار رہتا ہے مگر جب انسان میں عقیدے کی نجاست آجاتی ہے اخلاق اور عمل کی نجاست پیدا ہو جاتی ہے۔ عاجزی کی بجائے غرور، احسان کی بجائے بد... کھسوٹ اور عدل کی بجائے ظلم لے لیتا ہے

تو پھر انسان کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اس کی مثال حلال جانوروں کی ہے جن کا ہم دودھ پیتے اور گوشت کھاتے ہیں۔ جب تک یہ جانور اونٹ گائے، بھینس، بھیڑ، بکری وغیرہ گھاس کھاتی رہیں گی ان کا مزاج درست رہیگا اور اگر ان میں سے کوئی جانور چارے کی بجائے گوشت کھانا شروع کر دے تو اس کا مزاج بگڑ جائے گا، پھر اس کا دودھ قابلِ استعمال رہیگا اور نہ گوشت، اس لیے شریعت میں گندگی کھانے والے جانور کا گوشت مکروہ تحریمی میں آتا ہے کیونکہ گندی چیزیں کھانے سے اس کا مزاج بگڑ جاتا ہے اور اس کا دودھ اور گوشت قابلِ استعمال نہیں رہتا۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ ایسے جانور کو کم از کم دس دن تک باندھ کر رکھو تاکہ وہ گندگی نہ کھائے اس دوران اسے پاک چارہ کھلاؤ، تب اس کا دودھ اور گوشت کھانے کے قابل ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ شریعتِ الٰہیہ کو قائم رکھنے سے انسان کا مزاج درست رہتا ہے اور جب وہ شرائع کی پابندی چھوڑ دیتا ہے تو مزاج بگڑ جاتے ہیں اور پھر تباہی و بربادی کے قریب ہو جاتا ہے۔

اسلام میں جبر نہیں

آگے ارشاد ہوتا ہے وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ تیرا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کے رہنے والوں کو ظلم و زیادتی کے ساتھ ہلاک کر دے وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ جب ان بستیوں کے رہنے والے اصلاح پسند ہوں۔ جب تک لوگ اصلاح کی طرف مائل رہیں گے، اللہ کی طرف سے عذاب نہیں آتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر والے، شرائع الٰہیہ پر چلنے والے اور قانونِ الٰہی کا احترام کرنے والے اللہ کے قہر سے محفوظ رہتے ہیں۔ اللہ نے سابقہ اقوام کے حالات اسی لیے بیان فرمائے ہیں

تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ اب آگے تسلی کا مضمون آرہا ہے کہ تمام کے تمام لوگ ایک راستے پر کبھی نہیں رہے۔ لہٰذا اختلاف سے دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی اُمت یعنی ایک ہی ایمان کے راستے پر ڈال دیتا اور کوئی شخص بھی شرائع الٰہیہ کی خلاف ورزی نہ کرتا۔ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے عین اختیار میں ہے مگر اس کے قانون کے خلاف ہے۔ وہ کسی کو زبردستی کوئی بات نہیں منوانا چاہتا۔ اُس نے ایک حد تک انسان کو عقل و شعور اور اختیار دیا ہے کہ وہ اچھے اور بُرے راستے میں سے جونسا چاہے اختیار کرے اور ساتھ حکم بھی دیا کہ ایمان اور نیکی کا راستہ اختیار کرو اور کفر و شرک اور معاصی سے بچ جاؤ۔ تم جو بھی طریقہ اختیار کرو گے اسی کے مطابق بدلہ پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرۃ) یعنی دین میں جبر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ اُسے موقع دیتا ہے۔ اور پھر ایمان اُسی کا معتبر ہوگا جو اپنی مرضی سے اسے قبول کریگا۔ اُس نے ہدایت اور گمراہی کا راستہ واضح کر دیا ہے اس کے لیے انبیاء کو مبعوث فرمایا ہے اور کتابیں نازل کی ہیں اور فرمایا فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف) جس کا جی چاہے ایمان قبول کرے اور جس کا جی چاہے انکار کرے۔ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا اور فرمایا تیری وجہ سے ہی میں مؤاخذہ کروں گا اور تیری وجہ سے ہی عطا کروں گا۔ اللہ نے جس کو عقل عطا نہیں کی اُس کا مؤاخذہ بھی نہیں ہے۔ جب تک بچہ سن شعور کو نہیں پہنچتا وہ مکلف نہیں ہوتا۔ پاگل اور دیوانے بھی اسی

لیے غیر مکلف ہیں کہ وہ عقل سے خالی ہیں۔ اللہ نے عقل بہت بڑا جوہر عطا کیا ہے، اس کے ساتھ جملہ سامانِ ہدایت عطا کیے ہیں۔ انبیاء مبعوث فرمائے، کتابیں نازل کیں۔ حواس ظاہرہ اور باطنہ عطا کر کے کھلا چھوڑ دیا کہ جس کا جی چاہے اطاعت اختیار اور جس کا جی چاہے کفر کا انتخاب کرے۔ اگر نیکی کو اپنائے گا تو اللہ تعالیٰ راضی ہوگا اور اگر کفر اور شرک کا راستہ اختیار کرے گا، تو گرفت میں آئے گا۔ کیونکہ اس کا فیصلہ ہے "وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ" (الزمر) اللہ اپنے بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ظالموں کو ایسے جہنم میں ڈالے گا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (الکھف) جسے آگ کی قناتیں گھیرے ہوں گی۔

دین میں اختلاف

فرمایا وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وہ لوگ برابر اختلاف کرنے والے ہوں گے، ہاں جس پر خدا تعالیٰ کی مہربانی ہوگی وہ کفر و شرک کے اختلاف سے بچ جائے گا۔ رحمتِ الٰہی اُس شخص کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو عناد اور ضد نہیں کرتا۔ ہر چیز کا ظاہری اور باطنی سبب ہوا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرتا ہے جو اس کا قائل ہو۔ مَنْ لَّا يَرْحَمِ النَّاسَ لَا يَرْحَمْهُ اللّٰهُ۔ جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ بھی اُس پر رحم نہیں کرتا۔ لہٰذا عنادی لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہتے ہیں۔

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ اللہ تعالیٰ نے انہیں اِسی واسطے پیدا کیا ہے۔ ذٰلِكَ کا مرجع اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور رحم بھی۔ اگر اختلاف مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے کر انسان کو مجبور پیدا نہیں کیا اُس نے تو انسان کو تمام صلاحیتیں اور راہنمائی کے تمام ذرائع مہیا کر دیے ہیں اس کے باوجود اگر کوئی اختلاف کرتا ہے تو کرتا رہے اُسے آگے چل کر اس کا نتیجہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ اور اگر تخلیق انسانی

کو رحم کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تو انسان کی تخلیق اس پر رحم کرنے کے لیے کی تھی، مگر یہ خود اپنے خالق اور مالک کی حکم عدولی کر کے سزا کا مستحق بنتا ہے۔ قرآن پاک میں انسانی تخلیق کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ" (الذریت) یعنی انسانوں اور جنوں کو محض اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اگر انسان مقصدِ تخلیق کو پورا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی صحیح طریقے سے عبادت کرے گا تو لازماً وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق بنے گا، اسی لیے فرمایا کہ انسان کی تخلیق کا مقصد سیر مہربانی کرنا ہے

جہنم بھر جائے گی

فرمایا اللہ تعالیٰ نے تو لوگوں کو رحم کے لیے پیدا کیا تھا مگر انہوں نے برابر اختلاف کیا، اور کرتے رہیں گے اور پھر ایک دن ایسا بھی آئیگا جب کہ "اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ" اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس بات میں جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔ یہ قیامت کا دن ہوگا جب تمام متنازعہ امور کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ پھر آگے فرمایا، وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ تیرے رب کی بات پوری ہو جائے گی، اور وہ یہ ہے کہ "لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ" میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے ضرور بھر دوں گا۔ جس نے بغاوت کی اور زمین میں فساد برپا کیا، کفر و شرک کا راستہ پکڑا، ظلم و تعدی کو اختیار کیا، اُن سب کو جہنم رسید کر دوں گا۔ اکثر و بیشتر انسان ہمیشہ اسی بیماری میں مبتلا رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ پوری دنیا کی پانچ ارب کی آبادی میں سوا چار ارب انسان کفر و شرک میں ہی مبتلا ہیں۔ کل آبادی کا پانچواں حصہ بھی خدا کی وحدانیت پر قائم نہیں اور پھر جنوں کی آبادی تو انسانوں سے بھی زیادہ ہے۔ آج وہ نظر

نہیں آتے مگر قیامت کو سب پردے اٹھ جائیں گے اور سب ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں گے تو ایسے ہی ناہنجاروں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ اقوام کا حال بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس امت محمدیہ کو خیال کرنا چاہیئے کہ کہیں وہ بھی اس بیماری کا شکار بن کر جہنم کے مستحق نہ ٹھہریں۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ
فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا
عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا
مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا
رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ع

ترجمہ :۔ اور تمام خبریں جو ہم بیان کرتے ہیں آپ پر رسولوں کی خبروں سے جن کے ذریعے ہم آپ کے دل کو ثابت رکھتے ہیں ۔ اور آیا ہے آپ کے پاس ان (خبروں) میں حق اور نصیحت اور یاددہانی ایمان والوں کے لیے ﴿۱۲۰﴾ اور آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر!) اُن لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے (اے لوگو!) تم کام کیے جاؤ اپنی جگہ پر ۔ بیشک ہم بھی کام کرنے والے ہیں ﴿۱۲۱﴾ پس انتظار کرو ۔ بیشک ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں ﴿۱۲۲﴾ اور اللہ کے پاس ہی ہے غیب آسمانوں اور زمین کا ۔ اسی کی طرف لوٹایا جائے گا سب معاملہ ۔ پس اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو ۔ اور نہیں ہے تمہارا پروردگار غافل ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿۱۲۳﴾

دلی تسلی کا مضمون

آج کے درس کی پہلی آیات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہؓ کے لیے تسلی کا مضمون ہے جب کہ آخری آیت میں سورۃ کا لب لباب دے دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے واقف ہے اور وہ انہی کے مطابق بدلہ دیگا۔ اس سورۃ مبارکہ میں گذشتہ انبیاء اور اُن کی اقوام کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں، ان واقعات سے انسان جان سکتا ہے کہ سابقہ امم نے کون کون سے جرائم کا ارتکاب کیا اور پھر انہیں کس قدر ذلت ناک سزا سے دوچار ہونا پڑا۔ اور پھر جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے اُن کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح نجات دی۔ اِن واقعات سے انسان جان سکتا ہے کہ جو شخص حق پر قائم رہتا ہے وہ بالآخر کامیاب ہوتا ہے اور اس سے اُسے تسلی حاصل ہوتی ہے۔ اور نافرمان لوگوں کے عذاب کے متعلق جان کر عبرت حاصل ہوتی ہے کہ جو شخص بھی حق کو تسلیم کرنے سے گریز کریگا، اللہ کے انبیاء کی مخالفت کریگا، وہ ضرور ناکام ہوگا۔

ارشاد ہوتا ہے وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ وہ تمام (خبریں) جو ہم آپ پر بیان کرتے ہیں رسولوں کی خبروں سے مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ جن کے ذریعے ہم آپ کے دل کو ثابت کرتے ہیں۔ عربی قاعدہ کے مطابق یہاں كُلًّا کے بعد مضاف الیہ نَبَاٍ محذوف مانا جاتا ہے اور مطلب ہوتا ہے كُلَّ نَبَاٍ بِكُلًّا کی تنوین مضاف الیہ کے قائم مقام ہی آئی ہے۔ یہی تسلی کا مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ہم نے انبیاء علیہم السلام کے جتنے واقعات بیان کئے ہیں۔

اے پیغمبر! ان میں آپ کے لیے اور آپ کے صحابہؓ کے لیے دلی تسلی کا سامان ہے۔ ان واقعات سے آپ کو علم ہو جائے گا

کہ اللہ کے پہلے نبیوں کے ساتھ بھی ایسے ہی واقعات پیش آتے رہے ہیں جیسے آپ کے ساتھ پیش آ رہے ہیں اور یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اللہ کے سارے نبیوں کو ایسے مشکل حالات سے گزرنا پڑا ہے اس طرح دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ تکالیف صرف ہمیں ہی نہیں آئیں بلکہ پہلے لوگ بھی اس قسم کے مصائب کو برداشت کرتے رہے ہیں لہٰذا ہمیں بھی تمام مشکلات کو خوش دلی سے برداشت کرنا چاہیئے جس کا انجام بالآخر اچھا ہوگا۔

حق کی آمد — فرمایا سابقہ انبیاء اور رسل کی خبروں کے ذریعے وَجَآءَكَ فِي هٰذِهِ الْحَقُّ آپ کے پاس حق آچکا ہے۔ یہاں هٰذِهٖ کا اشارہ اگر خبروں کی طرف ہو تو مطلب ہوگا کہ ان خبروں کے ذریعے آپ کے پاس حق آگیا ہے۔ اور اگر اس کا اشارہ سورۃ میں بیان کردہ واقعات کی طرف ہے تو یہ بھی پکی اور اٹل بات ہے اور اس سے مقصود نبی علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کو تسلی دلانا ہے، تاکہ وہ گھبرائیں نہیں بلکہ تبلیغ دین کے مشن کو دل جمعی کے ساتھ آگے بڑھاتے رہیں۔ بہر حال فرمایا کہ ان واقعات کی صورت میں آپ کے پاس حق بات آگئی ہے۔

وعظ و نصیحت — ان واقعات سے جو دوسری چیز حاصل ہوتی ہے وہ وَمَوْعِظَةٌ وہ نصیحت کی بات ہے۔ موعظت قرآن پاک کا ایک لقب بھی ہے اور یہ لفظ قرآن پاک میں بکثرت آیا ہے۔ وعظ و نصیحت اجزائے دین میں سے ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ[1] نے موعظت کی تعریف یوں کی ہے قَهْرُ الْمَدَارِكِ الظُّلْمَانِيَّةِ بِاَنْوَارِ الْمَعَارِفِ الْقُدْسَانِيَّةِ یعنی انسانوں میں موجود تاریکی والے علوم و خیالات کو مقدس علوم اور معارف کے ساتھ

[1] الخیر الکثیر ۲۶

مغلوب کرنے کا نام موعظت ہے۔ اس میں ترغیب اور ترہیب دونوں چیزیں آتی ہیں۔ کبھی انسان کو اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی ترغیب ہوتی ہے اور کبھی بُرے انجام سے ڈرایا جاتا ہے اور اس طرح انسانی نفس موعظت سے متاثر ہوتا ہے۔ وعظ و نصیحت کا مقصود کوئی گانا بجانا نہیں ہوتا بلکہ تاریک خیالات کو ذہنوں سے نکال کر وہاں پر پاکیزہ خیالات کو جگہ دینا ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں وہ پاکیزہ علوم و معارف موجود ہیں جن کی وجہ سے انسان کے دِل میں نورانیت پیدا ہوتی ہے اسی لیے قرآن پاک کا ایک اسم موعظت ہے تو اللہ نے فرمایا ہے کہ سابقہ امم کے واقعات میں تمہارے لیے وعظ و نصیحت کی باتیں بھی ہیں۔

یاد دہانی

فرمایا ان واقعات کے بیان کرنے میں جو تیسری حکمت ہے وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ وہ اہل ایمان کے لیے یاد دہانی ہے۔ قرآن کریم کا ایک نام تذکرہ بھی ہے "اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ" (الدھر) انسان بعض چیزیں فراموش کر دیتے ہیں تو قرآنِ پاک انہیں بار بار یاد دلاتا ہے بشرطیکہ انسان کا تعلق قرآنِ پاک کے ساتھ قائم ہو۔ جب بھی قرآن پاک کی تلاوت کی جائے گی اس سے مزید باتیں یاد آتی رہیں گی۔ جب کوئی شخص غفلت کی وجہ سے بعض باتوں کو فراموش کر دیتا ہے تو وہ تلاوتِ قرآن سے تازہ ہو جاتی ہیں، لہٰذا فرمایا کہ قرآنِ مجید میں بیان کردہ واقعات مومنوں کے لیے یاد دہانی کا کام بھی دیتے ہیں۔

خدائی فیصلے کا انتظار

فرمایا کہ ان تمام حقائق اور شواہد کے باوجود وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ جو لوگ ایمان نہیں لاتے آپ اُن سے کہہ دیں اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ تم اپنی جگہ پر کام کرتے رہو اِنَّا عٰمِلُوْنَ ہم بھی اپنا کام کرنے والے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لاتے ہوئے اپنا کام کریں گے۔ اور تم کفر و شرک پر ڈٹے ہوئے اپنا کام کرو،

اور پھر وَانْتَظِرُوْا تم بھی نتیجے کا انتظار کرو اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ بھر پتہ چل جائے گا کہ نتیجہ کس کے حق میں نکلتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایمان معرفت اور توحید کا نتیجہ اچھا نکلے گا، جب کہ کفر، شرک اور بُرائی کا انجام بُرا ہی ہوگا۔ یہ اُن لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو تعصب اور عناد رکھتے ہیں اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اڑے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں سورۃ الکافرون میں فرمایا ہے "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" یعنی تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔ اس کا حتمی فیصلہ آگے چل کر ہی ہوگا کہ کون سا دین سچا ہے اور کونسا جھوٹا ہے بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور اہل ایمان کو تسلی دی ہے کہ وہ نامساعد حالات سے گھبرائیں نہیں بلکہ اپنے مشن کو جاری رکھیں اور جو لوگ انکار پر اصرار کر رہے ہیں انہیں اُن کی حالت پر چھوڑ دیں۔

علمِ غیب

سورۃ ہٰذا کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے پوری سورۃ کا خلاصہ بیان فرمایا ہے۔ پہلی بات یہ فرمائی ہے وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ ہی کے پاس ہے غیب آسمانوں اور زمین کا۔ عالم الغیب والشہادۃ اس محسوس جہان کو کہا جاتا ہے۔ اس جہان میں بعض چیزیں مخلوق کے سامنے ہیں اور بعض اُس کی نظروں سے غائب ہیں۔ یہ غیب اور شہادت مخلوق کی نسبت سے ہے "ورنہ" وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ (یونس) تیرے پروردگار سے تو ذرے کے برابر بھی کوئی چیز غائب نہیں" وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ وہ تو ہر چیز پر حاضر ہے اور اُسے جانتا ہے۔ سورۃ ملک میں ہے " اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ" کیا وہ خدا تعالیٰ ہی کسی چیز کو نہیں جانے گا جس نے خود ہر

چیز پیدا کی ہے۔ جس ذات نے خود عناصر کو جوڑ کر کائنات کی ہر چیز تخلیق کی ہے۔ بھلا وہ ان سے کیسے غافل رہ سکتا ہے۔ اور وہ سب سے بھی نہایت باریک بین۔ اور خبردار۔ چنانچہ غیب دان صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ اس کے علاوہ ذرے ذرے کا علم رکھنے والی کوئی ذات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے جتنا علم چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے، اور وہ اتنی بات ہی جانتا ہے۔

علم غیب کی نفی میں اللہ کے مقدس پیغمبر بھی شامل ہیں۔ اسی سورۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے جب اللہ کے فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس انسانی صورتوں میں آئے تو وہ نہ جان سکے کہ یہ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں۔ چنانچہ آپ مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے فوراً ایک بچھڑا بھون کر لے آئے مگر مہمانوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ آپ کو حقیقت کا علم اُس وقت ہوا جب مہمانوں نے کہا "لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ" اے ابراہیم علیہ السلام! آپ خوف نہ کھائیں، ہم تو اللہ کے فرشتے ہیں جو قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ پھر یہی فرشتے مہمانوں کی شکل میں جب لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تو قوم کے لوگوں نے آپ کے گھر پر حملہ کر دیا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ اِن نوجوانوں کو ہمارے سپرد کر دو مگر لوط علیہ السلام اُن کا دفاع کر رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ یہ تو اللہ کے فرشتے ہیں اور اس قوم پر عذاب کرنے کے لیے آئے ہیں۔ بہر حال جب آپ کی تشویش بہت بڑھ گئی تو فرشتے کہنے لگے "یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ" ہم تو تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں اور اِن کی طرف عذاب کرنے کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں، لہٰذا آپ اپنی اہل کو لے کر رات کے آخری حصے میں بستی

سے نکل جائیں. سورۃ قمر میں آتا ہے کہ فرشتے نے ذرا سا پر ہلایا فَطَمَسْنَآ
اَعْيُنَهُمْ تو ان کی آنکھیں اچک لیں اور وہ اندھے ہو گئے اللہ
نے فرمایا فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ اب میرے عذاب کا مزا
چکھو. مطلب یہ ہے کہ غیب تو اللہ کے نبی بھی نہیں جانتے چہ جائیکہ
یہ صفت فرشتوں، جنات یا اولیاء اللہ میں مانی جاتی. جو شخص مخلوق
میں غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہے اس کا ایمان سلب ہو جاتا ہے.
اور وہ شرک میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جاتا ہے. چونکہ اس سورۃ کا مرکزی
مضمون توحید ہے، لہٰذا یہاں پر اللہ تعالیٰ کی اس صفت مختصہ کا ذکر
بھی کر دیا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو جاننے والا صرف
اللہ تعالیٰ ہے.

عبادت الٰہی

اس سورۃ کا دوسرا اہم مضمون معاد ہے. اور آگے اس کی طرف
اشارہ ہے. وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ تمام معاملات اسی
خدا تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے. محاسبے کا عمل واقع ہو کر
رہے گا. قیامت برپا ہو گی اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو
گی. سورۃ النازعات میں ہے اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ہر چیز کی
انتہا تیرے پروردگار کی طرف ہی ہونے والی ہے. فرمایا جب سب
کچھ اٹل ہے فَاعْبُدْهُ تو پھر عبادت بھی خالصتاً اسی کی کرو. اس
کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو. سورۃ کی ابتدا میں قرآن پاک کی حقانیت
اور صداقت بیان کرنے کے بعد خالص عبادت الٰہی کا ہی حکم دیا گیا ہے
اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اے لوگو! اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو.
عبادت اور تدبیری کے معاملے میں لوگ اللہ کا شریک بناتے ہیں. حالانکہ یہ دونوں
چیزیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہیں. اس سورۃ مبارکہ میں جن انبیاء علیہم السلام
کا ذکر کیا گیا ہے انہوں نے بھی اپنی اپنی قوموں کو توحید کی دعوت دی

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا، اے لوگو! میں تمہاری طرف ڈرسنانے والا بن کر آیا ہوں اور میری تعلیم یہ ہے اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ پھر ہود علیہ السلام کا بھی اپنی قوم کو یہی پیغام تھا یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ " اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو کہ اس کے بغیر تمہارا کوئی معبود نہیں آگے شعیب اور صالح علیہما السلام نے بھی اپنی قوم کو بالکل یہی تعلیم دی اس کے ساتھ ساتھ ان اقوام کی باقی خرابیوں کا ذکر بھی ہوتا رہا۔ لوط علیہ السلام کی قوم میں خلاف وضع فطری کی بیماری تھی۔ قوم شعیب ماپ تول میں کمی کرتی تھی۔ قوم عاد غرور و تکبر میں مبتلا تھی اور قوم ثمود میں اسراف کی بیماری تھی۔ ان انبیاء نے ایک تو ان انفرادی بیماریوں کا علاج تجویز کیا، اور دوسرے سب کو توحید کی مشترکہ دعوت دی کہ عبادت صرف اللہ کی روا ہے، اس کے علاوہ کسی دوسری ذات کو عبادت میں شریک نہ کرو۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے بھی اپنی قوم کو توحید ہی کی دعوت دی۔ اور پھر سورۃ کے آخر میں اللہ نے خلاصہ اور نچوڑ بیان کر دیا ہے وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اس کا کوئی شریک نہیں، اسی طرح اس کی صفات مختصہ میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ غیب بھی اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بہرحال آخر سورۃ میں اللہ نے ایمان، توحید، معاد قرآن پاک کی صداقت و حقانیت اور انبیاء کی نبوت و رسالت کا مضمون بیان کر دیا ہے جس میں ان کے حالات اور ان کی تبلیغ کا تذکرہ ہے قوم کا جواب اور پھر ان کا انجام بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

توکل علی اللہ

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر یہ آخری بات فرمائی ہے ا د '' ے -
وَتَوَکَّلْ عَلَیْہِ بھروسہ بھی اللہ پر ہی کرو، اس کے سوا کوئی ذات

مؤثر نہیں ہے۔ اسباب کو اختیار کرو مگر انہیں مؤثر نہ سمجھو بلکہ صرف
خدا کی ذات پر بھروسہ کرو۔ وہ چاہے گا تو اسباب میں اثر پیدا کر دے
گا، ورنہ ہر چیز دھری کی دھری رہ جائے گی۔ تمام قوت اور تصرف اللہ تعالیٰ
ہی کے ہاتھ میں ہے۔

لہٰذا بھروسہ صرف اسی پر کرو۔ اور پھر تنبیہ کے طور پر فرمایا وَمَا
رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ تم جو اعمال بھی کرتے ہو اللہ
ان سے غافل نہیں ہے۔ بلکہ سب کچھ اس کی نگاہ میں ہے تمہارے
اعتقادات، خیالات، تصورات اور اعمال سب اللہ تعالیٰ کے علم
میں ہیں اور آخر میں نتیجہ بھی انہی کے مطابق نکلے گا۔ جس قسم کے اعتقادات
اور اعمال ہوں گے۔ انہی کے مطابق جزا اور سزا ہوگی۔

سورۃ

یوسف

مکمل

درس اول ۱ آیت ۱ تا ۳

سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَّاحْدٰى عَشَرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا اِثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۃ یوسف مکی ہے اور یہ ایک سو گیارہ آیات اور اس میں بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾

ترجمہ: الٓرٰ ۔ یہ آیتیں ہیں کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی ﴿۱﴾ بیشک ہم نے اتارا ہے اس کو قرآن عربی زبان میں، تاکہ تم سمجھ لو ﴿۲﴾ ہم بیان کرتے ہیں تجھ پر بہت بہتر طرح بیان کرنا، اس واسطے کہ ہم نے وحی کی ہے آپ کی طرف اس قرآن کو، اور بیشک (شان یہ ہے کہ) تھے آپ اس سے پہلے البتہ ناواقفوں میں سے ﴿۳﴾

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سورۃ یوسف ہے۔ اس پوری سورۃ میں صرف حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، لہٰذا اس کا نام آپ کے نام پر سورۃ یوسف رکھا گیا ہے۔ پورے قرآن پاک میں دو سورتیں ایسی ہیں جن میں مکمل طور پر صرف ایک ایک نبی کا واقعہ بیان ہوا ہے ایک سورۃ یوسف ہے اور دوسری سورۃ نوح۔ سورۃ یوسف مکی دور میں نازل ہوئی۔ لہٰذا مکی سورۃ کہلاتی ہے۔ اس کی ایک

سو گیارہ^١١١ آیات اور بارہ^١٢ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۱۷۷۶ الفاظ اور ۷۹۹۶ حروف پر مشتمل ہے۔

مضامین سورۃ

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی: ادی حقائق توحید، رسالت قیامت، قرآن کریم کی حقانیت۔ انبیاء کی تبلیغ۔ قوموں کی نافرمانی اور پھر اس کے نتیجے میں سزا کا ذکر ہے۔ سابقہ سورۃ ہود کی طرح اس سورۃ میں بھی خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفاتِ مختصہ کا بیان ہوگا۔ گذشتہ سورۃ میں متعدد انبیاء کے واقعات بیان کیے گئے تھے جب کہ اس سورۃ میں ایک نبی اور رسول کا ذکر ہے۔ تاہم قرآنِ پاک کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ کسی واقعہ کو تاریخی لحاظ سے مکمل طور پر بیان نہیں کرتا ہے۔ بلکہ صرف وہی حصہ بیان کیا جاتا ہے جو سامعین کے لیے دنیا و آخرت میں مفید اور باعثِ عبرت ہو سکتا ہے

سورۃ ہود کی طرح مسئلہ توحید کو اس سورۃ میں بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ گذشتہ سورۃ میں مختلف انبیاء کے صبر و برداشت کا ذکر ہوا تھا۔ جب کہ اس سورۃ میں صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر و استقامت کی بات ہوگی۔ آپ کی فضیلت اور کمالات کے ذکر کے علاوہ ضمناً بہت سے دیگر مسائل بھی آگئے ہیں۔ جو عقیدے کی اصلاح اور دین و دنیا میں فلاح کے ضامن ہیں

حضور کا روشن مستقبل

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سورۃ یوسف کا موضوع دراصل حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے شاندار اور روشن مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔ یہ سورۃ مکی دور کے آخری حصے میں نازل ہوئی جب کہ حضور علیہ السلام کو کفار کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا تھا۔ آپ پریشان تھے مگر اللہ نے یہ سورۃ نازل فرما کر آپ کی کامیابی اور مشرکین کی ناکامی کی پیشگوئی فرما دی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا

ہے "اسرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" یعنی دوسروں کی بات کرکے اپنوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں پر بھی یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کرکے حضور علیہ السلام کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس طرح یوسف علیہ السلام کے برادران بالآخر ناکام ہوئے اور آپ کو بلندی اور کامیابی عطا ہوئی، اسی طرح حضور علیہ السلام کے بھائی بند بھی ذلیل و خاسر ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت رفعت عطا فرمائی اور نظامِ خلافت عمل میں آیا۔

حروف مقطعات

اس سورۃ کی ابتداء حروفِ مقطعات الٓر سے ہوئی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان حروف میں تو الف کا اشارہ اللہ کی طرف ہے۔ ل سے لطافت یا لطیف مراد ہے، اور را کا اشارہ رحیم یا رأفت کی طرف ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور رأفت و رحمت کا نمونہ اس سورۃ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ الف کا اشارہ اعلیٰ کی طرف۔ ل سے لِوَاءٌ (جھنڈا) اور را سے رفعت مراد ہے اور اس طرح الٓر سے رفعت و بلندی کا وہ جھنڈا مراد ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ تھمایا تھا۔ البتہ امام شاہ ولی محدث دہلویؒ ذوقی یعنی الہامی طور پر بیان کرتے ہیں کہ الٓر سے عالمِ غیب کی وہ مقدس چیزیں مراد ہیں جو اس عالمِ مادی میں متصل آتی جاتی رہتی ہیں اور اس جہان سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ اس سے مقاماتِ انبیاء کی طرف کنایہ ملتا ہے اور انبیاء کا مقام یہ ہے کہ ان کا نافرمان لوگوں کے ترار و فتن سے ہمیشہ تصادم رہتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو رفعت اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی میں ایک جیسے حالات سے

واسطہ پڑا۔ ر آن میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

حروفِ مقطعات کے بارے میں امام جلال الدین سیوطیؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ زیادہ اسلم (سلامتی والی) بات یہ ہے کہ ان حروف کے متعلق یہی اعتقاد رکھا جائے کہ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ ان کی حقیقی مراد اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے کہ وہ برحق ہے۔ ہر چیز کو جاننا ہمارے لیے ضروری نہیں اور نہ ہی انسان تمام چیزوں کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ بعض چیزوں پر بلا دلیل بھی ایمان لانا پڑتا ہے اور حروف مقطعات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ عوام کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ایسے معاملات میں زیادہ کرید نہ کیا کریں کیونکہ ایسا کرنے سے گمراہی پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ایک شخص ایسی باتوں میں کرید کرتا تھا۔ آپ نے اُس کو بلایا، اُس کے سامنے سورۃ یوسف کی پہلی دو آیات الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ پڑھ کر اُس شخص کو زور سے ایک کوڑا مارا۔ آپ نے تین دفعہ ان آیات کی تلاوت کی اور ہر دفعہ ایک ایک کوڑا مارا۔ اُس شخص نے عرض کیا کہ میرا قصور بتائیں تاکہ میں آئندہ محتاط رہوں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم حروف مقطعات جیسی مخفی چیزوں کے متعلق چھان بین کرتے ہو۔ میں تمہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا ہے جو اہل عرب اور اس کے اولین مخاطبین کی مادری زبان ہے۔ اس کے باوجود اس کی جن باتوں کی وضاحت نہیں کی گئی۔ انہیں کریدنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ ایسا کرنا گمراہی کا باعث ہوگا۔

قرآن اور عربی زبان

بہرحال اس سورۃ کی ابتدا حروف مقطعات الٓرٰ سے ہوئی ہے ارشاد ہوتا ہے تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یہ آیتیں

لہ جلالین صہ

ہر کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئے ہوئے احکام قوانین۔ نصائح اور دلائل کو قرآن پاک کھول کر بیان کرتا ہے۔ اس کی وجہ بھی خود ہی بتادی ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا بے شک ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں اتارا ہے لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے لیے عربی جیسی زبان کا انتخاب کیا جو تمام زبانوں سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ عربوں سے پہلے قوم عاد اور ثمود کی زبان بھی عربی تھی۔ عربوں کے تین دور تسلیم کیے جاتے ہیں یعنی عربِ بادیہ، عربِ عاربہ اور عربِ مستعربہ۔ قرآن کی زبان عربِ مستعربہ ہے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بنی جرہم کے ساتھ اختلاط سے پیدا ہوئی۔ یہ زبان ترقی کرتے کرتے حضور علیہ السلام کے زمانہ تک ترقی کے انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ یہ زبان دوسری زبانوں کی نسبت مختصر مگر جامع ہے اور اس کا گرامر بھی سائنٹیفک ہے۔ اللہ نے اس زبان کو دوسری زبانوں پر بڑی فوقیت عطا فرمائی ہے۔

مفسر قرآن صاحب روحانی المعانی نے امام بیہقیؒ، طبرانیؒ اور حاکمؒ کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثَةٍ عربوں سے تین وجوہات کی بنا پر محبت کرو۔ پہلی بات یہ ہے لِاَنِّیْ عَرَبِیٌّ کہ میں خود عرب قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِیٌّ قرآن پاک بھی عربی زبان میں ہے اور تیسری بات یہ کہ وَلِسَانُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِیٌّ جنتیوں کی زبان بھی عربی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل قرآن عربی زبان میں ہی ہے۔ اور اگر عربی کے علاوہ قرآن کو کسی دوسری زبان میں منتقل کیا جائے گا تو وہ قرآن نہیں کہلا سکتا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ہم نے قرآن پاک کو اس کے اولین مخاطبین

کی زبان عربی میں نازل فرمایا تاکہ وہ اس کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اگر قرآن کسی دوسری زبان میں اہل عرب پر نازل ہوتا تو اسے نہ سمجھ سکنے کا اعتراض ہو سکتا تھا۔

قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں

اس سے فقہائے کرام یہ بات بھی اخذ کرتے ہیں کہ قرآن عربی کا کسی دیگر زبان میں ترجمہ قرآن نہیں کہلا سکتا۔ قرآن عربی کے ان الفاظ کا نام ہے جو اپنے خاص معانی و مفہوم رکھتے ہیں۔ اللہ نے نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم دیا ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (المزمل) یعنی جتنا میسر ہو قرآن پاک میں سے پڑھو۔ لہذا نماز جبھی ہوگی جب کوئی شخص قرآن کے عربی الفاظ ادا کرے گا۔ اگر کوئی شخص محض ترجمہ قرآن پڑھ کر نماز ادا کرے تو نماز ادا نہ ہوگی۔ پرویزی قسم کے بعض گمراہ فرقے اس قسم کا حیلہ کرتے ہیں کہ قرآن عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہماری سمجھ سے بالا ہے لہذا اس کا ترجمہ پڑھ لینا ہی کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اصل متنِ قرآن کو نظر انداز کرکے محض ترجمے پر اکتفا کیا جائیگا تو قرآن پاک کی وحدت ختم ہو جائیگی۔ ہر کوئی اپنی پسند کا ترجمہ کریگا اور اس کے پیروکار وہی ترجمہ عام تلاوت کے طور پر اور پھر نماز میں بھی پڑھنے لگیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح متن کی عدم موجودگی میں محض تراجم کی بنا پر انجیلیں ایک سے ایک درجن[۱۰] بن گئی ہیں، اسی طرح قرآن پاک کا ہر ترجمہ ایک علیحدہ قرآن بن جائے گا۔ یہ تو تحریف کا دروازہ کھول دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے جب لاہور میں پہلی دفعہ چراغ کمپنی نے قرآن پاک کا ترجمہ بغیر عربی متن کے شائع کیا تو مفتی اعظم مولانا کفایت اللہؒ نے اس اشاعت پر حرمت کا فتویٰ لگایا تھا۔ آپ کا استدلال یہی تھا کہ اس طرح تو ہر ناشر الگ الگ قرآن شائع کرنے لگے گا اور پھر اس پر بند باندھنا مشکل ہو جائے گا۔ سارے تراجم ایک

سے نہیں ہوتے۔ ان میں صحیح بھی ہوتے ہیں اور بعض غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر اصل عربی عبارت ساتھ ہوگی تو ترجمے کی صحت اور اغلاط کا پتہ چل جائے گا۔

بعض لوگوں نے اپنے باطل عقائد کو تراجم قرآن کے ذریعے پھیلانے کی کوشش کی ہے جن میں مولوی احمد رضا خاں بریلوی بھی شامل ہے قادیانی اور منکرین حدیث عبداللہ چکڑالوی نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ پرویز نے بھی اپنے غلط مسلک کو ترجمہ قرآن کے ذریعے پیش کیا ہے بغیر متنِ قرآن پاک کا ترجمہ قرآن نہیں ہوسکتا، لہٰذا نماز میں عربی کے علاوہ کوئی قرأت قابل قبول نہیں اور عربی متن کے بغیر قرآن پاک کا ترجمہ شائع کرنا بھی جرم ہے

احسن القصص — فرمایا نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ ہم آپ پر اچھی طرح بیان کرتے ہیں۔ قصص کے دو معنی آتے ہیں۔ اگر مصدر کا معنی لیا جائے تو قَصَّ، يَقُصُّ، قَصًّا اور قَصَصًا کا معنی بیان کرنا ہوتا ہے اور احسن القصص کا معنی عمدہ طریقے سے بیان کرنا ہوگا۔ قصص کا دوسرا معنی واقعہ یا سرگزشت بھی آتا ہے۔ اس لحاظ سے معنی ہوگا کہ ہم آپ پر بہت اچھی سرگزشت بیان کرتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بلاشبہ ایک اچھی سرگزشت بھی ہے۔

اس واقعہ کو احسن القصص اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں بہت سے حقائق اور عجائبات موجود ہیں۔ صاحب روح المعانی نے کئی موٹی موٹی باتیں بیان کی ہیں۔ مثلاً اس واقعہ سے حاسد اور محسود کا انجام واضح ہوتا ہے۔ مالک اور مملوک کا معاملہ سمجھ میں آتا ہے اور پھر شاہد اور مشہود کا ذکر ہے۔ [illegible] میں حبس (قید خانہ) اور اطلاق (رہائی) کا [illegible] بھی آیا ہے اور قحط سالی اور خوشحالی کا ذکر بھی ہے۔ اسی طرح ذنب [illegible] معافی کا [illegible] بھی پیش آیا ہے اور پھر فراق [illegible] کے لمحات بھی آئے

رہیں۔ اس قصہ میں بیماری اور صحت اور سفر و حضر کے واقعات بھی پیش آگئے ہیں۔ اسی واقعہ میں عزت و ذلت اور قضا و قدر کے مسائل بھی سمٹ آئے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ بھی پتہ ملتا ہے کہ اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْخَیْرِ یعنی تمام خوبیوں اور کامیابیوں کی چابی صبر ہے۔ حدیث شریف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ معاملات کی اصلاح کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا عقلمندی کی نشانی ہے۔ یہ سب حقائق اور عجائبات اس ایک ہی واقعہ میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی توحید، ایمان اور اخلاق پر بھی بحث کی گئی ہے اور انہیں نہایت مؤثر انداز میں سمجھایا گیا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو احسن القصص کا لقب دیا ہے۔

واقعہ یوسف علیہ السلام بطور دلیل رسالت

فرمایا ہم آپ پر بڑی اچھی سرگزشت بیان کرتے ہیں جو حقائق و معارف پر مشتمل ہے۔ بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ ۔ اس وجہ سے کہ ہم نے اس قرآن کو آپ کی طرف وحی کیا ہے۔ یعنی یہ تمام بیان کردہ واقعات نہ تو آپ نے خود کسی تاریخی کتاب میں پڑھے ہیں اور نہ کسی سے سُنے ہیں۔ یہ تمام واقعہ یکایک بیان کر دینا آپ کی رسالت کی صداقت کی دلیل ہے کیونکہ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ اس سے پہلے آپ اِن حقائق سے بے خبر تھے یہ سب کچھ آپ کو وحی کے ذریعہ معلوم ہوا، اور جس پر وحی نازل ہوتی ہے وہ اللہ کا سچا رسول ہوتا ہے۔ اس سچے واقعہ کی تفصیلات جان لینے کے بعد مخاطبین قرآن کو سمجھ جانا چاہیئے تھا کہ حضور علیہ السلام اللہ کے سچے رسول ہیں جو تمام واقعات من وعن بیان کر رہے ہیں۔ یہاں پر غفلت سے مراد کسی چیز کی لاعلمی یا بے خبری ہے کہ نزولِ وحی سے پہلے آپ کو اِن واقعات کا علم نہیں تھا۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ ہم آپ پہ ایک نہایت اچھا واقعہ بیان کرتے ہیں۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ
كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿۴﴾
قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا
لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾
وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ
الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ
كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ
اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶﴾ ع

ترجمہ:۔ (اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ) جب کہا یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے ۔ اے باپ ! بیشک میں نے خواب میں دیکھا ہے گیارہ ستارے اور سورج اور چاند ، میں نے ان کو دیکھا ہے اپنے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے ﴿۴﴾ کہا انہوں نے اے بیٹے ! مت بیان کرنا اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کے آگے ۔ پس وہ تیری ضرر رسانی کے لیے تدبیر کریں گے ، بیشک شیطان انسان کے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۵﴾ اور اسی طرح برگزیدہ بنائے گا تجھ کو تیرا پروردگار اور سکھائے گا تجھ کو تاویل الاحادیث (باتوں کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ) اور پورا کرے گا اپنی نعمت کو تجھ پر اور آل

یعقوب پر بھی بیٹا کہ اس کو پورا کیا اُس نے تیرے باپ دادوں
پر اس سے پہلے یعنی ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام پر ۔ بیشک
تیرا پروردگار جاننے والا اور حکمت والا ہے ⑥

ربط آیات

سورۃ ہذا کی ابتدائی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کا صفت کھول کر بیان کرنے والی کتاب کے طور پر تعارف کرایا ۔ اپنے اولین مخاطبین کی سہولت کے لیے اسے عربی زبان میں نازل فرمایا ۔ پھر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا کہ ہم آپ پر اس قرآن پاک کو اچھے طریقے سے بیان کرتے ہیں یا یہ کہ ہم اچھی سرگزشت بیان کرتے ہیں ۔ کیونکہ یہ قرآن ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے اور آپ اس سے پہلے بے خبر تھے یعنی آپ کو اس کا علم نہیں تھا ۔

اس سورۃ مبارکہ میں کئی خاص باتیں بیان ہوئی ہیں مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی غیب دان نہیں اور دوسری بات یہ کہ حقیقی کارساز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس سورۃ کی تیسری اہم بات حضور علیہ السلام کی رسالت کی تصدیق ہے ۔ اللہ کے تمام نبیوں نے اپنے اپنے دور میں بڑی تکلیفیں برداشت کی ہیں ۔ اس سورۃ کو احسن القصص کا لقب اس لیے دیا گیا ہے کہ اس میں بہت سے حقائق بیان ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ خدا تعالیٰ کی تقدیر کو کوئی چیز روک نہیں سکتی ۔ جب خدا تعالیٰ کسی پر فضل کرنا چاہے تو سارا عالم مل کر بھی ہر قسم کی تدابیر اختیار کرے مگر وہ خدا کے فضل سے محروم نہیں کر سکتے ۔ دنیا کے تمام مقاصد صبر و استقامت کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں ۔ حسد اور عداوت خود حاسد کے لیے نقصان کا باعث بنتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل جیسا عظیم جوہر عطا کیا ہے جس سے فائدہ اٹھانا خود انسان کا کام ہے ۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے یہ تمام حقائق و معارف اسی ایک سورۃ میں یکجا کر دیے ہیں ۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ واقعہ یوسف علیہ السلام کو احسن القصص سے ملقب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس واقعہ کے افراد کو انسان کے ساتھ کمال درجے

کی مشابہت ہے۔ مثلاً انسانی جسم میں قلب کمال درجے کا عضو ہے جسے خود حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ انسانی جوہر روح کی مشابہت حضرت یعقوب علیہ السلام سے ہے۔ انسانی جوہر نفس حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیوی راحیل کے ساتھ مشابہ ہے۔ اور انسانی جسم کے تمام قویٰ اور حواس حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی مثال ہیں بہرحال اس واقعہ میں بڑے بڑے حقائق اور بنیادی عقائد موجود ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب

ارشاد ہوتا ہے اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ اُس واقعہ کو دھیان میں لاؤ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا۔ یہ یوسف علیہ السلام کے بچپن کا واقعہ ہے۔ اُس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ اس بارے میں مختلف آراء ہیں تورات کے بیان کے مطابق اُس وقت آپ کی عمر سترہ سال تھی جو کہ قرین قیاس نہیں۔ تورات کے بہت سے بیانات تحریف کی زد میں آکر یہودیوں کی کارگزاری پر نوحہ کناں ہیں تاہم عام مفسرین کرام نے خواب آنے کے وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر مبارک چھ، آٹھ یا دس سال بتائی ہے۔ بہرحال یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ یعقوب علیہ السلام سے کہا يٰٓاَبَتِ اے میرے باپ اِنِّيْ رَاَيْتُ میں نے یہ خواب میں دیکھا ہے اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند ہیں رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ جو میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں چونکہ یہ یوسف علیہ السلام کی کم سنی کا واقعہ تھا، اس لیے باپ نے بیٹے کو نصیحت آموز طریقے سے فرمایا قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ اے بیٹے! اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے ذکر نہ کرنا کیونکہ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا وہ تجھے نقصان پہنچانے کی تدبیر کریں گے۔ باپ اپنے

بیٹوں کی ذہنیت سے واقف تھے۔ انہیں یہ بھی واضح تھا کہ اُن کے بیٹے مختلف ماؤں سے ہیں اور ان کی آپس میں رقابت بھی ہے۔ اسی لیے انہوں نے بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ یہ بیان کی اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ اگر تم نے یہ خواب بیان کر دیا، تو وہ تیرے بھائیوں کے دلوں میں بُرے وسوسے ڈال کر تمہاری رقابت کو مزید تقویت دینے کا باعث ہوگا۔ بائبل کے بیان کے مطابق خواب بیان کرنے پر یعقوب نے یُوسف کو ڈانٹ پلائی تھی مگر یہ درست نہیں کیونکہ اگلی آیت میں آپ کی فضیلت اور برگزیدگی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

یُوسف علیہ السلام کا خاندان

حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔ آپ کی بیوی لیّہ سے آپ کے چھ بیٹے تھے اور باقی تین بیویوں سے دو دو اس طرح آپ کے کل بارہ بیٹے تھے۔ راحیل کے بطن سے یُوسف اور بن یامین تھے جب کہ باقی دو بیویوں بلہا اور زلفا سے بھی دو دو فرزند تھے۔ یوسف علیہ السلام اور بن یامین سب بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ بعض فرماتے ہیں کہ جب بن یامین کی پیدائش ہوئی تو ان کی والدہ راحیل وفات پا گئیں۔ بہر حال جب یوسف علیہ السلام نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا تو اس وقت یعقوب علیہ السلام کی صرف ایک ہی بیوی لیّہ موجود تھیں جسے یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل سے سخت رقابت رہی تھی جو اس وقت تک فوت ہو چکی تھی۔ یُوسف علیہ السلام بچپن سے ہی بڑے ہونہار دکھائی دیتے تھے اس لیے یعقوب علیہ السلام کو آپ سے پیار بھی بہت زیادہ تھا۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سے اللہ تعالیٰ نے نبوت صرف یوسف علیہ السلام

کو ہی عطا فرمائی البتہ بعض بیٹے تو سخت گنہگار تھے جنہوں نے یوسف کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو شکل و صورت بھی بے مثال عطا کی تھی۔ واقعہ معراج والی حدیث میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان موجود ہے کہ جب میں تیسرے آسمان پر گیا تو یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، فرمایا اِذْ ھُوَ اُعْطِیَ شَطْرُ الْحُسْنِ اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق میں سے آدھا حسن یوسف علیہ السلام کو اور باقی نصف ساری مخلوق پر تقسیم کیا تھا۔ اس واسطے بھی باپ کی شفقت اور مہربانی یوسف علیہ السلام پر زیادہ تھی۔

خواب کی اقسام

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ خواب کی ایک قسم انسان کے طبعی اخلاق پر منحصر ہوتی ہے انسان کے جسم میں جس قسم کے اخلاق ہوتے ہیں اُسی قسم کے اس کو خواب بھی آتے ہیں۔ دوسری قسم کا خواب شیطان کے وسوسوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس سے انسان کو غم اور پریشانی لاحق ہوتی ہے اس کو تحزین الشیطان کہتے ہیں اور تیسرا خواب رحمانی ہوتا ہے اور اللہ کے نبیوں کو آتا ہے۔ رُؤْیَا الْاَنْبِیَاءِ وَحْیٌ یعنی نبیوں کا خواب بھی وحی ہوتا ہے وحی کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض اوقات نبی کے قلب کا عالمِ بالا سے براہ راست تعلق ہوتا ہے اور فرشتہ وہیں پر نبی کے قلب پر القا کر دیتا ہے۔ بعض اوقات فرشتہ کسی ظاہری شکل میں وحی لے کر آتا ہے اور بعض اوقات اللہ کے نبی کو خواب کے ذریعے بتلا دیا جاتا ہے۔ بہرحال دو قسم کے خواب باطل ہیں اور تیسرا برحق ہے۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ یعنی نبوت کے اوصاف میں سے سچے خوابوں کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ سچے خواب مبشرات کہلاتے ہیں

اور کبھی یہ خود متعلقہ انسان دیکھتا ہے اور کبھی کوئی دوسرا مومن اسکے حق میں دیکھتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ بھی فرمان ہے اِذَا اقْتَرَبَ الزَّمَانُ لَمْ يَكَدْ يَكْذِبُ رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جب قیامت کا زمانہ قریب آجائے گا تو مومن کا خواب سچا ہوگا۔ بعض فرماتے ہیں کہ اقْتَرَبَ الزَّمَانُ کا مطلب یہ ہے کہ جب ایسا موسم ہو کہ جس میں دن رات برابر ہوں تو اکثر خواب سچا ہوتا ہے۔ یا صبح کے وقت آنے والا خواب بھی عام طور پر سچا ہوتا ہے۔ باقی خواب کے لیے دن یا رات کی کوئی پابندی نہیں دن اور رات میں سے کوئی بھی خواب سچا ہو سکتا ہے۔ مومن کے خواب کے متعلق طبرانی کی روایت میں آتا ہے رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ كَلَامٌ يُكَلِّمُ عَبْدَهُ رَبُّهُ[1] یعنی مومن کا سچا خواب حقیقت میں ایسا کلام ہوتا ہے جو مومن بندہ اپنے رب سے کرتا ہے۔

خواب کی حقیقت

باقی رہی یہ بات کہ شریعت میں خواب کا اعتبار کیا ہے تو بنیادی بات یہ ہے کہ خواب کوئی بے حقیقت چیز نہیں بلکہ شریعت میں اس کو تسلیم کیا گیا ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی قوت متخیلہ میں تمام چیزوں کی تصویریں جمع رہتی ہیں۔ جب انسان سوجاتا ہے۔ اور اُس کے ظاہری حواس معطل ہو جاتے ہیں تو باطنی حواس کا تعلق عالم مثال یا عالم ملکوت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ پھر سچے خوابوں کا تعلق عالم بالا سے ہوتا ہے جب کہ جھوٹے خوابوں کا تعلق اس عالم سے نہیں ہوتا فرماتے ہیں کہ خواب دیکھنے کی کیفیت اس طرح پیش آتی ہے۔ کہ انسان کی قوت متخیلہ میں جو چیزیں جمع ہیں وہ وہاں سے اٹھ کر حس مشترک کی تختی پر آجاتی ہیں۔ حس مشترک فلم کی طرح گردش کرتی ہے اور اس پر موجود تصویروں میں سے جو تصویر سامنے آجاتی ہے، وہی خواب میں نظر آتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ جب انسان کو

[1] مشکوٰۃ المصابیح ص۳۹۶

جاتا ہے تو اس کی روح یا نفس کا تعلق عالمِ مثال سے قائم ہو جاتا ہے جس طرح ہر انسان میں ایک قوتِ متخیلہ ہے اسی طرح مجموعہ عالم میں ایک خیالی قوت پائی جاتی ہے اور اس میں ہر قسم کی چیزوں مثلاً ملائکہ، جنات، موت، مصیبت، خوشی، غمی وغیرہ کے عکس پائے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی چیز متشکل ہو کر خواب میں نظر آ سکتی ہے۔ غرضیکہ روح کا تعلق عالمِ مثال سے ہونے کی بناء پر یہ حقیقتیں نظر آتی ہیں۔

خواب کی تعبیر

سند کے لحاظ سے اگرچہ یہ قوی روایت نہیں ہے تاہم مفسرین کرام حضور علیہ السلام کی حدیث بیان کرتے ہیں کہ اگر خواب میں عورت نظر آئے تو یہ بہتری کی علامت ہوتی ہے۔ خواب میں اونٹ کا نظر آنا جنگ یا سفر کی علامت ہے۔ دودھ فطرتِ سلیم کی نشانی ہے، اور سبزہ نظر آنا جنت کی طرف اشارہ ہے۔ کشتی سے مراد نجات ہے۔ اور کھجور سے فراخی رزق مراد ہوتی ہے۔ صحیح حدیث میں حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے اِنِّیْ اُحِبُّ الْقَیْدَ وَاُکْرِہُ الْغُلَّ یعنی میں طوق کو ناپسند اور بیڑی یا ہتھکڑی کو پسند کرتا ہوں۔ گلے میں طوق تذلیل کی نشانی ہے جب کہ ہتھکڑی دین میں پختگی کی علامت ہے۔ حضور کے الفاظ ہیں اَلْقَیْدُ ثَبَاتٌ فِی الدِّیْنِ۔ آپ علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میری تلوار ذوالفقار ٹوٹ گئی ہے۔ اس میں جنگِ احد کی طرف اشارہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ گائے کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی مصیبت کی علامت تھی کہ حضرت امیر حمزہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ شہید ہوں گے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی شکستہ تلوار کو دوبارہ ہلایا تو وہ ٹھیک ہو گئی جس کی تعبیر یہ تھی کہ آگے چل کر حالات درست ہو جائیں گے، چنانچہ واقعۃً

ایسا ہی ہوا۔ آگے اسی سورۃ میں شاہِ مصر کا خواب بیان ہو رہا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دُبلی۔ نیز سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک۔ دُبلی گائیں اور خشک خوشے قحط سالی کی نشانی ہے اور موٹی گائیں اور سبز خوشے خوشحالی کی علامت ثابت ہوئے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جو آدمی پریشان کُن خواب دیکھے اُسے چاہیئے کہ اپنی بائیں طرف تین دفعہ تھوک دے اور اللہ کی شیطان رجیم سے پناہ مانگے یعنی یوں کہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ یا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کہے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ جب سونے میں برا خواب دیکھے تو فرمایا وہ شخص اپنا پہلو بدل دے، اس کو نقصان نہیں ہوگا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی پریشان کُن خواب دیکھے اُسے لوگوں کے سامنے بیان نہ کرے۔ فرمایا اگر اچھا خواب دیکھے تو پھر بھی اس کا ذکر نہ کرے سوائے دو قسم کے آدمیوں کے۔ ایک حبیباً یعنی دوست آدمی۔ جو اس کا اچھا محمل بتائے گا اور دوسرا لَبِیْباً یا دانا آدمی ہو، اس کے سامنے ذکر کر سکتے ہو کسی بے وقوف آدمی سے ذکر کرنا نقصان دہ ہو سکتا ہے اور وہ شخص پریشان ہو سکتا ہے۔ فرمایا خواب کا معاملہ عجیب و غریب ہوتا ہے یہ رڈیا اس وقت تک ہوتا ہے جب تک اس کی تعبیر نہ دے دی جائے۔ جب تعبیر دے دی جائے تو پھر یہ واقعہ بن جاتا ہے۔ فرمایا جب تک اس کی تعبیر نہ دی جائے عَلٰی رِجْلِ طَآئِرٍ یہ پرندے کے پاؤں پر ہوتا ہے۔

خواب کی تعبیر بتانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ بعض آدمیوں میں فطرتاً بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ میں اللہ

نے یہ خصوصیت رکھی تھی۔ اُس کے بعد امام ابن سیرینؒ کا نام آتا ہے
برصغیر میں شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلویؒ خواب کی تعبیر بتاتے تھے ہمارے
بزرگوں میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا نام آتا ہے شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر
کو بھی اس سلسلہ میں کمال حاصل ہے۔ خواب اور اس کی تعبیر کے درمیان
کبھی تھوڑا فرق ہوتا ہے اور کبھی زیادہ حضرت یوسف علیہ السلام کے
خواب کی تعبیر چالیس سال کے بعد واقع ہوئی۔ بہر حال خواب ایک
حقیقت ہے، اسی لیے محدثین کرام نے اپنی اپنی کتابوں میں کتاب
الرؤیا کے نام سے باب باندھے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کی برگزیدگی

بہر حال حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو اپنا
خواب اپنے بھائیوں سے بیان کرنے سے اس لیے منع فرمایا کہ
وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی تدبیر کریں گے۔ فرمایا: وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ
اسی طرح تیرا پروردگار برگزیدہ کرے گا تجھے۔ بچپن کا خواب کوئی معمولی
بات تو نہیں تھی جس کے ذریعے اللہ نے آپ کو بہت بڑی برگزیدگی
عطا فرمائی اور زندگی کے اگلے میدان میں بھی اسی طرح اعلیٰ مقام عطاء
کرنے کی پیش گوئی فرمائی فرمایا وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ
اور اللہ تعالیٰ سکھلائے گا تمہیں باتوں کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ بھی
تاویل الاحادیث سے مراد خواب کی تعبیر کا علم بھی ہو سکتا ہے، اور
عام معاملات کو ٹھیک طریقے سے نپٹانے کا کام بھی کسی چیز کے
مخفی گوشوں کو سمجھنا، باریک باتوں کی تہ تک پہنچنا اور ان کے موقع
ومحل کو جاننے کے بعد اس کے متعلق ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا،
سب تاویل الاحادیث میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف
علیہ السلام کو یہ کمال علم عطا کیا تھا۔

آل یعقوب پر اتمام نعمت

فرمایا وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ اور اے یوسف علیہ السلام!

اللہ تعالیٰ اپنی نعمت تجھ پر پوری کریگا یعنی آپ کو اونچے مقام پر فائز کریگا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت و رسالت جیسے عظیم منصب پر فائز کیا اور پھر دُنیوی اعتبار سے بھی مصر کی حکمرانی عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو جاہ و اقتدار نصیب کیا اُس کی تفصیلات آگے اسی سورۃ میں آرہی ہیں فرمایا نہ صرف تم پر اتمام نعمت کریگا بلکہ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ یعقوب علیہ السلام کے پورے خاندان کو بھی اس نعمت میں شامل کرے گا۔ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ جس طرح کہ اُس نے اس سے پہلے تمہارے آباؤ اجداد حضرات ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام پر اس نعمت کو پورا کیا یعنی جس طرح اُن کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اس طرح تم کو بھی یہ نعمت دے گا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر یوسف علیہ السلام کے دادا اسحاق علیہ السلام اور پردادا ابراہیم علیہ السلام کا نام تو لیا گیا ہے مگر باپ یعقوب علیہ السلام کا نام نہیں لیا گیا۔ یعقوب علیہ السلام نے اپنا نام کسرِ نفسی کی بناء پر نہیں لیا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کسی شخص نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ کے لقب سے پکارا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ خیر البریہ یعنی تمام مخلوق میں بہترین شخصیت تو ہمارے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ آپ نے بھی کسرِ نفسی کی بناء پر اپنا نام نہیں لیا۔ اسی طرح یعقوب علیہ السلام نے اپنا نام نہیں لیا حالانکہ وہ اللہ کے عظیم الشان رسول تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے عرض کیا حضور! بہتر لوگ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا اَلْكَرِيْمُ ابْنُ الْكَرِيْمِ ابْنُ الْكَرِيْمِ ابْنُ الْكَرِيْمِ۔ یعنی یوسف ابن یعقوب ... ابن اسحاق ابن ابراہیم اللہ نے سب کو نبوت عطا فرمائی، سارے ہی بہتر لوگ ہیں۔ پیغمبر

صحابہ نے عرض کیا کہ ہم ان کے متعلق دریافت نہیں کرتے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا، تو پھر کیا تم عرب کے متعلق پوچھتے ہو؟ عرض کیا، ہاں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا خِیَارُکُمْ فِی الْجَاهِلِیَّةِ خِیَارُکُمْ فِی الْاِسْلَامِ تم میں سے جو لوگ جاہلیت کے زمانہ میں اچھے لوگ تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہوں گے، اگر انہوں نے دین میں سمجھ حاصل کرلی۔ غرضیکہ یہ کمال درجے کی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام اور آپ کے خاندان کو عطا فرمائی۔ اللہ نے اس خاندان کو پوری دنیا میں بزرگی عطا فرمائی۔ پھر یہ بھی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے اللہ نے چار ہزار انبیاء مبعوث فرمائے۔ آپ کو اتنا بڑا اعزاز بخشا۔ پھر خاندان ابراہیم کی دوسری شاخ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں اپنی آخری نبوت و رسالت بھی عطا فرمائی یعنی حضور علیہ السلام کو اپنا آخری نبی مبعوث فرمایا۔ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ تیرا پروردگار سب کچھ جاننے والا اور کمال حکمت کا مالک ہے۔ ہر چیز اس کی حکمت پر مبنی ہے۔

اب اگلی آیات میں اس خواب کے نتیجے میں برادران یوسف کے حسد کا ذکر اور پھر یوسف علیہ السلام کو اپنے راستے سے ہٹانے کے منصوبے کا بیان آرہا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ⑦
اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا
وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۚ ۖ ⑧
اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ
اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ⑨
قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ
غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ
كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ⑩

ترجمہ:۔ البتہ تحقیق حضرت یوسف علیہ السلام اور انکے بھائیوں کے واقعہ میں نشانیاں ہیں سوال کرنے والوں کے لیے ⑦ جب کہ انہوں نے کہا البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پسندیدہ اور پیارا ہے ہمارے باپ کے سامنے ہم سے حالانکہ ہم ایک طاقتور گروہ ہیں، بیشک ہمارا باپ البتہ صریح غلطی پر ہے ⑧ قتل کر ڈالو یوسف علیہ السلام کو یا پھینک دو اس کو کسی سرزمین میں تاکہ خالی ہو جائے تمہارے لیے تمہارے باپ کی توجہ۔ اور ہو جاؤ تم اس کے بعد اچھے لوگ ⑨ کہا ایک کہنے والے نے اُن میں سے۔ مت قتل کرو یوسف علیہ السلام کو، اور

ڈال دو اس کو کسی گہرے کنوئیں میں ۔ اٹھالیں گے اس کو بعض راستہ چلنے والے مسافروں میں سے ، اگر تم کچھ کرنے والے ہو ⑩

ربط آیات

اس سے پہلے خواب کا ذکر ہو چکا ہے جو یوسف علیہ السلام نے بچپن میں دیکھا تھا۔ جب اس کا ذکر اپنے باپ کے پاس کیا تو انہوں نے منع کیا کہ اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا کیونکہ وہ حسد کریں گے اور تمہیں ضرر پہنچائیں گے اس کے ساتھ باپ نے اپنے فرزند کو تسلی بھی دی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں برگزیدہ بنائے گا۔ اور تمہیں باتوں کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ بھی بتلائے گا۔ اس میں خواب کی تعبیر کا علم بھی شامل ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمتیں پوری کرے گا۔ جیسا کہ اس نے تمہارے آباؤ اجداد ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام پر اپنی نعمتوں کا اہتمام کیا۔ اب آگے اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔

واقعہ یوسف میں نشانیاں

ارشاد ہوتا ہے لَقَدْ كَانَ ـــــــ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ البتہ تحقیق یوسف علیہ السلام اور آپ کے بھائیوں کے واقعہ میں کئی نشانیاں ہیں سوال کرنے والوں کے لیے۔ ان میں سب سے پہلی نشانی حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی صداقت ہے آپ نے یہ واقعہ نہ کہیں پڑھا اور نہ کسی سے سنا مگر وحی الٰہی کے ذریعے اس کو صحیح صحیح بیان فرما دیا۔ یہ بات اللہ نے سورۃ کی ابتداء میں بھی فرمائی ہے " بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یہ واقعہ ہم آپ پر اچھی طرح بیان کرتے ہیں کیونکہ ہم نے اس قرآن کو آپ پر وحی کے ذریعے نازل کیا ہے تو گویا اس واقعہ میں ایک تو حضور کی رسالت کی نشانی ہے اور دوسری خود قرآنِ پاک کی صداقت کی نشانی ہے۔ اس کے علاوہ اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی بہت سی نشانیاں اور دلائل ہیں۔ آیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دیکھو حاسد کس طرح ناکام ہوتا ہے اور صبر و استقلال کا انجام کتنا اچھا ہوتا ہے۔ بھائیوں نے حسد کیا تو وہ نامراد ہوئے

جب کہ یوسف علیہ السلام نے صبر کیا تو کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں بھی جاہ و اقتدار عطا کیا اور آخرت کی کامیابی تو یقینی ہے۔ اس واقعہ میں یہ بھی ایک نشانی ہے کہ جس شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ سے درست ہوتا ہے اُس کے نتائج کیا نکلتے ہیں اور جس کا تعلق اللہ سے صحیح نہیں ہوتا، اُس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

سائلین کون تھے

اللہ نے فرمایا ہے کہ واقعہ یوسف علیہ السلام میں سوال کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ سوال کرنے والے کون لوگ تھے؟ اس کے متعلق شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کے کہنے پر قریش مکہ نے یہ سوال کیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو بابل سے چل کر شام و فلسطین میں پہنچے گئے تھے مگر بنی اسرائیل کا مصر کے ساتھ سلسلہ کیسے قائم ہوا تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کی کثیر تعداد نے مصر سے خروج کیا تھا اور پھر وہ بحر قلزم کو عبور کر کے صحرائے سینا میں پہنچ گئے تھے۔ اسی سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ یوسف نازل فرما کر حقیقت حال کو واضح فرما دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں بطور غلام فروخت ہوئے پھر اللہ نے آپ کو وہیں پر حکومت دی اور آپ وہاں پر ہی آباد ہو گئے۔ پھر آپ کا خاندان بھی وہیں آگیا اور چار پانچ سو سال کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا تو بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ مصر کو چھوڑ دیا۔ مطلب یہ کہ مصر میں بنی اسرائیل کے ورود کی ابتدا حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی تھی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ سائلین سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضور علیہ السلام سے دریافت کرتے تھے کہ آپ کا اور اسلام کا مستقبل کیا ہوگا۔ اللہ نے اس کے جواب میں یہ سورۃ نازل فرمائی۔ نزول سورۃ

کے زمانہ میں اہل ایمان نہایت پریشانی کے عالم میں تھے، مشرکینِ عرب و مکہ کی مخالفت حد سے بڑھ چکی تھی، تو ان حالات میں بعض مسلمانوں نے حضور سے یہ سوال کیا تھا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ یوسف نازل فرما کر مسلمانوں کو تسلی دی کہ جس طرح اللہ نے یوسف علیہ السلام کا مستقبل تابناک بنایا اسی طرح تمہارا مستقبل بھی شاندار ہے اللہ تعالیٰ تمہیں بھی عروج دیگا۔ جس طرح یوسف علیہ السلام کے بھائی مجرم تھے، پھر نادم ہوئے اور توبہ کی تو اللہ نے اُن کی توبہ بھی قبول فرمائی اس طرح پیچے کے مشرکین بھی بالآخر نادم ہوں گے اور توبہ کریں گے۔ بہرحال سورۃ یوسف کے بیان کردہ واقعہ سے حضور علیہ السلام اور اہل ایمان کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔ وقتی طور پر تکلیفیں آتی رہتی ہیں اور ہر نبی کو پیش آئیں مگر آخر کار کامیابی بھی انہی کے حصے میں آئی۔

برادرانِ یوسف کا صلاح مشورہ

بائیبل، تفاسیر اور تاریخ کی کتابوں میں اس واقعہ کی بہت سی تفصیلات بیان کی گئی ہیں مگر وہ ساری کی ساری صحیح نہیں ہیں۔ قصے کہانیوں کی کتابوں میں بہت سی غلط باتیں بھی جمع کر دی گئی ہیں۔ مگر قرآن پاک صرف وہی حقائق بیان کرتا ہے جن سے انسانوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، لوگوں کے سامنے ایک اچھا نمونہ آتا ہے اور وہ اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی ابتداء اسی طرح ہوتی ہے اِذْ قَالُوْا جب برادرانِ یوسف نے کہا، یعنی آپس میں مشورہ کیا۔ گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور بن یامین سب بھائیوں سے چھوٹے تھے، اور ایک ماں سے تھے جب کہ باقی بھائی تین ماؤں سے تھے۔ ایک کے چھ بیٹے تھے اور باقی دو کے دو دو تھے۔ یوسف علیہ السلام اور بن یامین کی ماں فوت ہو چکی تھی، اس لیے باپ کو ان چھوٹے بچوں سے زیادہ

پیار تھا جو بڑے بھائیوں پر گراں گزرتا تھا۔ تو بڑے بھائیوں نے مشورہ کیا اور کہنے لگے لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا کہ یوسف علیہ السلام اور اس کا بھائی بن یامین ہمارے باپ کو زیادہ محبوب ہیں۔ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ حالانکہ ہم ایک طاقتور جتھا ہیں۔ عصبہ اس پارٹی یا گروہ کو کہا جاتا ہے جس کے افراد کی تعداد دس سے پندرہ تک ہو۔ برادرانِ یوسف کی تعداد بھی دس تھی تو انہوں نے کہا کہ ہم دس بھائی بڑے طاقتور ہیں، باپ کے کام بھی آسکتے ہیں مگر یہ دو چھوٹے بھائی ابھی کسی کام کاج کے قابل نہیں مگر ہمارے باپ کو یہ ہم سے زیادہ عزیز ہیں، اور ان کی وجہ سے ہمارا باپ ہماری طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ انہی دو کو سب کچھ سمجھتا ہے إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ہمارا باپ تو صریح غلطی پر ہے۔ یاد رہے کہ یہاں پر ضلال سے مراد گمراہی یا کفر نہیں ہے کیونکہ مشورہ کرنے والے لوگ کافر نہیں بلکہ پیغمبر زادے ہیں اور جانتے تھے کہ ان کا باپ اللہ کا نبی ہے۔ البتہ اُن کا خیال تھا کہ ہمارا باپ چھوٹے بچوں سے زیادہ پیار کر کے اجتہادی غلطی کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اجتہاد میں ایک عام اُمتی کے علاوہ نبی سے بھی خطا ہو سکتی ہے۔ بیٹوں کا خیال یہ تھا کہ بڑے ہونے کی حیثیت سے ہم باپ کے لیے زیادہ کارآمد ہیں اور چھوٹے بچے ابھی اُس کے لیے زیادہ مفید نہیں، لہٰذا اُسے ہماری طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے اسی لیے انہوں نے کہا کہ ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے۔

قتل یا گمشدگی

بہرحال مشورہ انہوں نے یہ کیا اقْتُلُوا يُوسُفَ کہ یوسف علیہ السلام کو قتل کر ڈالو أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا یا پھینک دو اس کو کسی سرزمین میں یعنی کہیں دور دراز کسی کنوئیں یا گڑھے میں پھینک دو تاکہ یہ باپ کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ تو تمہارے باپ کی توجہ اور شفقت تمہارے واسطے خالی ہو جائے گی۔ یوسف

کی عدم موجودگی میں باپ تمہیں پیار کرنے لگے گا اور اس کی ساری توجہ تمہاری طرف مبذول ہو جائے گی۔ بغرضیکہ یوسف علیہ السلام کو راستے سے ہٹانے کے لیے ان کے سامنے دو تجویزیں یہ تھیں کہ اسے قتل کر دو یا کسی گہرے کنویں یا کھڈ وغیرہ میں ڈال دو۔ وَتَكُونُوا مِنۢ بَعۡدِهِۦ قَوۡمٗا صَٰلِحِينَ اور ہو جاؤ تم اس کے بعد اچھے اور نیک لوگ۔ بھائیوں کے دل میں یہ شیطانی فلسفہ آ رہا تھا کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ زیادتی کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لینا اور نیکوکاروں میں شامل ہو جانا مگر اس وقت یہ کام کرنا ضروری ہے۔ آج بھی بعض لوگ گناہ کو گناہ سمجھتے ہوئے کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بعد میں توبہ کر لیں گے۔ بنیادی طور پر یہ فلسفہ ہی غلط ہے ہمیشہ گناہ سے بچنا چاہیئے کیونکہ کسی کو علم نہیں کہ گناہ کے ارتکاب کے بعد توبہ کا موقع بھی ملے گا یا نہیں۔ یہ محض شیطانی تسویل ہے۔ قَالَ قَآئِلٞ مِّنۡهُمۡ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا لَا تَقۡتُلُوا يُوسُفَ یوسف علیہ السلام کو قتل نہ کرو۔ بے گناہ بچے کا خون اپنے سر پر نہ لو، یہ بہت بڑا ظلم ہے بلکہ وَأَلۡقُوهُ فِي غَيَٰبَتِ ٱلۡجُبِّ ڈال دو اس کو کسی گہرے کنویں میں۔ کسی گمنام گڑھے میں پھینک دو۔ يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ ٱلسَّيَّارَةِ اس کو کوئی قافلہ اٹھالے گا یعنی اس راستے پر آنے جانے والے قافلوں میں سے کسی کی نظر پڑ گئی تو کنوئیں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اور اس طرح یوسف اپنے باپ کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گا۔ کہنے لگا، ایسے ہی کرو إِن كُنتُمۡ فَٰعِلِينَ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو یہ تدبیر اختیار کرو۔ بہر حال اس قسم کا مشورہ طے پا جانے کے بعد برادرانِ یوسف نے اپنے بھائی کو لے جا کر ایک کنویں میں ڈال دیا اور پھر آگے سارے واقعات پیش آئے جن کا ذکر آگے آئے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں مماثلت

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام اور حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعات میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے خلاف قتل یا کہیں پھینک دینے کا مشورہ ہوا تو حضور علیہ السلام کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ مشرکین نے دارالندوہ میں یہی مشورہ کیا تھا کہ حضور علیہ السلام کو قتل کر دیا جائے یا قید میں ڈال دیا جائے یا پھر جلاوطن کر دیا جائے۔ پھر جس طرح یوسف علیہ السلام کے بھائی یہودا نے آپ کے قتل کے خلاف رائے دی تھی اسی طرح کفار میں سے بھی بعض آدمیوں نے حضور علیہ السلام کے فوری قتل کی مخالفت کی تھی۔ مگر ان کی بات نہ مانی گئی اور آپ کے قتل ہی کا منصوبہ پاس ہوا۔ وہ لوگ حضور علیہ السلام کے مکان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور اسی وقت حملہ آور ہونا چاہتے تھے مگر ایک شخص نے کہا کہ اس وقت حملہ نہ کرو بلکہ صبح تک انتظار کرو، جب حضور نماز فجر کے لیے باہر نکلیں گے تو یکبارگی حملہ کر دینا اس ہمدرد شخص کا خیال تھا کہ وقفہ ملنے سے ہو سکتا ہے کہ ان کی رائے بدل جائے یا اللہ کوئی اور سبیل پیدا کر دے۔ بہرحال وہ لوگ صبح تک انتظار کرتے رہے مگر حضور علیہ السلام مٹی کی مٹھی پھینکتے ہوئے اُن کے پاس سے گزر گئے اور انہیں خبر تک نہ ہوئی اور اس طرح کفار کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ یوسف علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کے واقعات میں یہ بھی مماثلت ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو قتل کے منصوبے سے بچا لیا۔ دوسری بڑی مماثلت یہ ہے کہ جس طرح یوسف علیہ السلام کا مستقبل روشن ہوا، اللہ تعالیٰ نے انہیں حکومت عطا فرمائی اور اذیت پہنچانے والے بھائیوں کو سرنگوں کیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو بھی غلبہ عطا کیا اور جن مشرکین کی اذیت ناکیوں کی وجہ سے آپ کو مکہ چھوڑنا پڑا تھا، وہی لوگ فتح مکہ کے دن سرنگوں ہوگئے۔ جس طرح یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں

کو معاف کر دیا تھا، اسی طرح حضور علیہ السلام نے بھی اپنے بھائی بندوں کو معاف کر دیا اور پھر ان میں سے بہت سے ایمان لے آئے۔

محبت کی وجوہات

مفسرین کرام نے یہ نکتہ بھی اٹھایا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو چھوٹے بیٹوں سے کیوں زیادہ محبت تھی حالانکہ سب کے ساتھ یکساں معاملہ ہونا چاہیئے تھا تو فرماتے ہیں کہ اس کی بعض وجوہات تھیں۔ مثلاً یہ کہ جب بن یامین پیدا ہوئے تو ان کی والدہ فوت ہو گئی اور یہ دونوں بھائی کم سنی میں والدہ کی محبت سے محروم ہو گئے جس کی وجہ سے باپ کو ان کی طرف توجہ دینی پڑتی تھی اس کے علاوہ یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام میں ایسے آثار نظر آئے تھے جو باقی بیٹوں سے نمایاں تھے جیسے خواب والا واقعہ، تو اس لحاظ سے آپ سمجھتے تھے کہ میرا یہ بیٹا بڑا لائق اور ہونہار ہے، لہٰذا آپ اس کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے۔ اس قسم کی مثال حضرت داؤد علیہ السلام کے حالات میں بھی ملتی ہے۔ آپ کے کل انیس ۱۹ بیٹے تھے جن میں سے سلیمان علیہ السلام سب سے چھوٹے تھے چونکہ آپ کے باقی بیٹے لائق نہیں تھے اس لیے صرف تیرہ سال کی عمر میں آپ کی نیابت بھی سلیمان علیہ السلام کے حصے میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ ذہانت اور عقل عطا فرمائی تھی اس لیے داؤد علیہ السلام کی توجہ آپ کی طرف زیادہ تھی اور یہ کوئی گناہ کی بات بھی نہیں ہے۔

مفسرین کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنی کم سنی کے باوجود باقی بھائیوں کی نسبت باپ کی خدمت بھی زیادہ کرتے ہوں۔ کیونکہ بڑے بھائی تو اکثر کام کاج اور شکار کے لیے باہر جاتے تھے اور یہ دونوں بھائی ہی بوقت ضرورت آپ کی خدمت بجا لاتے تھے۔ بعض اوقات باپ کی حسب منشا معمولی کام بھی اس کے لیے بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے اور بڑے سے بڑا کام بھی اگر بدلی

چاہتے تھے۔

درس چہارم ۴ آیت ۱۱ تا ۱۴

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَالَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ
لَنٰصِحُوْنَ ⑪ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَاِنَّا
لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑫ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ
وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ⑬
قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا
لَّخٰسِرُوْنَ ⑭

ترجمہ:۔ کہا انہوں (برادران یوسف) نے (اپنے والد سے)
اے ہمارے باپ ! کیا بات ہے کہ آپ ہمیں امین نہیں
سمجھتے یوسف علیہ السلام کے بارے میں۔ اور البتہ ہم تو
اُس کے حق میں خیر خواہی کرنے والے ہیں ⑪ بھیج دے
اس کو ہمارے ساتھ کل کھائی لے اور کھیل کود کرے، بیشک
ہم اس کی البتہ حفاظت کرنے والے ہیں ⑫ کہا اُس
(یعقوب) نے بیشک مجھے غم میں ڈالتی ہے یہ بات کہ
تم لے جاؤ اِس کو، اور میں خوف کھاتا ہوں کہ کہیں اس
کو بھیڑیا نہ کھا جائے، اور تم اس سے غافل ہو ⑬ کہنے
لگے (برادران) اگر اس کو بھیڑیا کھا جائے تو ہم ایک مضبوط
جماعت ہیں، بیشک ہم اس وقت البتہ بڑے نقصان
اٹھانے والے ہوں گے ⑭

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ نے فرمایا کہ یُوسف علیہ السلام کے واقعہ میں سوال کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ اس کے بعد یعقوب علیہ السلام کا اُن کے چھوٹے بیٹوں کے ساتھ محبت کا ذکر ہُوا اور بھائیوں کے حسد اور رشک کو بھی بیان کیا گیا۔ پھر بھائیوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ کسی طرح یُوسف علیہ السلام کو راستے سے ہٹانا چاہیئے تاکہ باپ کی توجہ اُن کی طرف مبذول ہو سکے منصوبہ یہ تھا کہ اس کو قتل کر دیا جائے یا کسی گہرے کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ کام کاج کرنے والے ہم ہیں جب کہ ہمارا باپ اِن چھوٹے بیٹوں سے زیادہ محبت کرتا ہے جو ابھی تک کوئی کام بھی نہیں کر سکتے۔ اُن بھائیوں میں سے ایک نے یہ مشورہ دیا کہ یُوسف علیہ السلام کو قتل نہ کرو بلکہ کسی کنوئیں میں پھینک دو، یہاں سے گزرنے والے قافلوں میں سے کوئی اُٹھا کر لے جائیگا اور اس طرح یہ باپ کی نظروں سے اوجھل ہو جائیگا اور تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ اب آج کے درس میں برادرانِ یُوسف کی اپنے باپ سے اُس بات چیت کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لیے کی۔

باپ سے درخواست

ارشاد ہوتا ہے قَالُوْا بھائیوں نے کہا یٰۤاَبَانَا مَالَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى یُوْسُفَ اے ہمارے باپ! کیا بات ہے کہ آپ ہمیں امین خیال نہیں کرتے یعنی یُوسف علیہ السلام کے بارے میں ہم پر اعتبار نہیں کرتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ جنگل میں سیر و سیاحت اور شکار وغیرہ کے لیے جایا کرے وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ حالانکہ ہم تو اس کے حق میں بڑے خیر خواہ ہیں۔ ہم یُوسف کے حق میں مخلص ہیں، اس کا بڑا خیال رکھنے والے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہماری طرح توانا اور مضبوط ہو۔ لہٰذا اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا آپ اسے کل ہمارے ساتھ بھیجیں تاکہ یَرْتَعْ وہ کھا پی سے

اور تفریح طبع کرے۔
رتع کا معنیٰ دراصل جانوروں کا گھاس وغیرہ چرنا ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِیَاضِ الْجَنَّۃِ فَارْتَعُوْا یعنی جب تم جنت کے باغوں میں سے گزرو تو چرچگ لیا کرو۔ صحابہ نے عرض کیا، حضور! جنت کے باغ کون سے ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا وہ اللہ کی مسجدیں ہیں اور وہاں سے چرنا چگنا یہ ہے کہ وہاں پر اللہ کا ذکر کیا جائے، تسبیح و تہلیل کی جائے سُبْحَانَ اللہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، اَللہُ اَکْبَرُ جیسے پاکیزہ کلمات، زبان سے ادا کیے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جنت میں تمہیں فراوانی کے ساتھ کھانے کو پھل میسر ہوں گے۔ گویا یہ مسجدیں جنت کے باغ ہیں اور ان میں خلوص کے ساتھ عبادت کرنا ان سے پھل کھانے کے مترادف ہے۔ غرضیکہ رتع کا معنیٰ کھانا پینا یا چرنا چگنا آتا ہے۔

کھیلوں کی حیثیت

برادرانِ یوسف علیہ السلام کو اپنے ہمراہ لے جانے کی دو وجوہات بیان کیں پہلی بات یہ تھی کہ یہ ہمارے ساتھ جنگل میں جا کر وہاں کے پھل وغیرہ بافراط کھا پی لے گا۔ اور دوسری بات یہ کہ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کھیل کودے گا بیشک ہم اس کی البتہ حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام کے سامنے کھیل کود کا ذکر کیا گیا مگر انھوں نے اسکو برداشت کیا حالانکہ کھیل کود تو ایک لغو چیز ہے اللہ کا نبی ایسی چیز کی اجازت کیسے دے سکتا ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عام طور پر کھیل کود بے ہودہ ہی ہوتے ہیں مگر بعض کھیلوں کو جائز بھی قرار دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان موجود ہے کہ ہر قسم کا کھیل باطل ہے مگر اپنی بیوی کے ساتھ دل لگی جائز ہے، گویا یہ حق کھیلوں میں سے ہے۔ اسی طرح گھوڑے

ل ترمذی ص۵۰۵

دوڑانا، ورزش کرنا اور تیر اندازی کرنا بھی العابِ حق پر مشتمل ہیں۔ باقی سب کھیل باطل ہیں۔ بیوی کے ساتھ دل لگی اس لیے جائز ہے کہ یہ حسنِ اخلاق میں داخل ہے اور گھوڑ سواری اور تیر اندازی دشمن سے مقابلے کے لیے بطور مشق ہے لہٰذا یہ بھی درست ہے۔

کھیلوں کی قباحت

ہمارے ہاں فضول کھیل رائج ہیں جن پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ وقت کا ضیاع اس کے علاوہ ہے۔ کھیلوں کی وزارتیں بنتی ہیں۔ اور پھر مختلف کھیلوں کی ٹیمیں غیر ممالک میں جا کر بین الاقوامی میچوں میں حصہ لیتی ہیں، یہ سراسر اسراف ہے جس کا قومی لحاظ سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ اولمپک گیمز یونانیوں کے جاری کردہ ہیں۔ ان کھیلوں میں مرد اور عورتیں سب شامل ہوتے ہیں۔ ہاکی، فٹ بال، ٹینس اور پھر سب سے بڑھ کر کرکٹ نے قوم کو بیکار کر کے رکھ دیا ہے۔ نہ صرف بین الاقوامی اور قومی میچوں میں لوگ ہفتہ بھر کے لیے بیکار بیٹھ جاتے ہیں بلکہ ہر گلی، بازار اور میدان میں نئی پود دن رات اسی کام میں مصروف نظر آتی ہے جو کہ سراسر قومی نقصان ہے اس کے علاوہ مردوں اور عورتوں کی مشترکہ گیموں میں عریانی اور فحاشی کو تقویت ملتی ہے۔ نیم برہنہ کھلاڑی عورتوں کو تمام مرد بھی دیکھتے ہیں جس کی وجہ سے اخلاقی طور پر بھی قوم تباہ ہو رہی ہے۔ یہ سب باطل ہے اور اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ کافروں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی ایسے کھیلوں کو اپنایا ہے۔ حکومتیں سرپرستی کر رہی ہیں۔ حالانکہ جہاد میں کام آنے والے کھیل کے سوا کوئی کھیل جائز نہیں ہے۔

یورپ اور امریکہ کی اندھا دھند تقلید ہمارے لیے کسی طرح مفید نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ غیر ممالک نے بڑی ترقی کر لی ہے حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اس عریانی، فحاشی اور عیاشی کے پس پردہ چوری، بدکاری، ڈکیتی اور قتل

کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ جہاں تک اخلاق اور تہذیب کا تعلق ہے۔ ان ممالک میں معکوس ترقی ہوئی ہے۔ زنا کی فراوانی کی وجہ سے نسل ہی بگڑ چکی ہے اور دین کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

بہرحال اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزندوں کو کھیل کود کی اجازت دیدی کیونکہ وہ تیر اندازی جیسے جائز کھیل میں دلچسپی رکھتے تھے، ورنہ کسی باطل کھیل کے لیے اللہ کا نبی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ تو اسی بات کی اجازت دے گا، جو دین اور عاقبت کے لیے مفید ہوگی

یعقوب علیہ السلام کی تشویش

جب بیٹوں نے کھانے پینے اور کھیل کود کے لیے یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی درخواست پیش کی قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، بیشک یہ بات مجھے غم میں ڈالتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ وَاَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ کھا جائے وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ اور تم اس سے غافل ہو یعنی تم کو پتہ ہی نہ چلے اور یوسف کو بھیڑیا کھا جائے مجھے اس بات کا ڈر ہے

اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام کے وطن کنعان میں بھیڑیے کثرت سے پائے جاتے تھے جو بھیڑ بکریوں کو نقصان پہنچاتے تھے اور موقع ملنے پر انسان پر بھی حملہ کر دیتے تھے۔ یہ ایسا موذی جانور ہے کہ انسان کا چھوٹا بچہ اس کی زد میں آجائے تو چیر پھاڑ کر کھا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف شیر سب سے طاقتور درندہ ہونے کے باوجود شریف جانور ہے جب تک اس سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے، یہ حملہ آور نہیں ہوتا مگر بھیڑیا ہر موقع پر حملہ کر دیتا ہے۔ قدرت نے اس جانور کو عجیب و غریب خصلت بخشی ہے۔ یہ اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ اگر کسی جگہ پر ہزار بھیڑ بکریاں بھی ہوں تو سب کو نقصان پہنچاتا ہے اور بھیڑ

تیز گام ہونے کی وجہ سے بھاگ بھی جاتا ہے۔ بھیڑیا اکیلا شکار کے لیے نہیں نکلتا بلکہ گروہ در گروہ نکلتے ہیں۔ زیادہ نہیں تو کم از کم جوڑی تو ضرور ہوتی ہے۔ عربوں کے ہاں مشہور ہے کہ بھیڑیا بڑا حراص جانور ہے، جب سوتا ہے تو ایک آنکھ کھلی اور ایک بند رکھتا ہے۔ پھر جب آدھی نیند پوری کر لیتا ہے تو پہلی آنکھ بند کر لیتا ہے دوسری کھول لیتا ہے

اقتدار کی جنگ

حضور علیہ السلام نے اپنے ایک فرمان میں بھیڑیے کی مثال اس طرح دی ہے کہ کسی آدمی کا چودھراہٹ اور برتری کی طرف راغب ہونا دین کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے، جس قدر بھوکا بھیڑیا ریوڑ کا نقصان کرتا ہے، جب اُسے بھیڑوں میں چھوڑ دیا جائے، چودھراہٹ کے جنون نے انسانی سوسائٹی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر کوئی من مانی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرے فریق کی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ تکبر اور عناد کی صورت میں نکلتا ہے۔ اخلاقی قدریں ختم ہو جاتی ہیں اور دین کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایران عراق جنگ محض چودھراہٹ کی جنگ ہے جو سال ہا سال سے دو مسلمان ملکوں کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ گذشتہ پانچ سال کے دوران اس جنگ میں پانچ لاکھ آدمی ہلاک ہو چکے ہیں۔ زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جس پر دونوں ملک اپنا اپنا حق جتلاتے ہیں اور اس معمولی ٹکڑے کی خاطر کھربوں روپیہ برباد ہو رہا ہے۔ دونوں ممالک پر شیطانی چودھراہٹ سوار ہے، ورنہ یہ مسئلہ افہام وتفہیم کے ذریعے آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔

بھائیوں کا اصرار

بیٹوں کی درخواست پر جب باپ نے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ کہنے لگے اگر یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا۔ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ تو ہم تو ایک مضبوط جماعت ہیں، بڑے طاقتور اور مرد میدان ہیں اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ہم تو پھر نہایت نکمے اور عاجز ٹھہرے۔

کی اجازت دے دی۔

واقعہ کا اگلا حصہ اب اگلی آیات میں بیان ہو رہا ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ
الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا
وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً
يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا
يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ
بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى
قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ
اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ
عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا
وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ
وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾
وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا
فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع

ع ۲ ۱۲

ترجمہ:- پس جب لے گئے وہ یوسف (علیہ السلام) کو اور
انہوں نے اتفاق کیا کہ ڈال دیں اس کو کنوئیں کی گہرائی میں
اور وحی کی ہم نے اُس (یوسف) کی طرف کہ تو ان کو

تبلائے گا ان کا یہ معاملہ اور وہ نہیں شعور رکھتے (۱۵)
اور آئے وہ اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت روتے
ہوئے (۱۶) انہوں نے کہا ، اے ہمارے باپ ! بیشک
ہم گئے اور ہم دوڑ لگاتے تھے ایک دوسرے سے آگے
اور ہم نے چھوڑا تھا یوسف علیہ السلام کو اپنے سامان کے
پاس ، پس اُس کو کھا لیا بھیڑیے نے ۔ اور تو نہیں تصدیق
کرنے والا ہماری اگرچہ ہم سچے ہوں (۱۷) اور لائے وہ اُس
کی قمیص پر جھوٹا خون ۔ کہا اُس نے (ایسا نہیں ہے) بلکہ
بنایا ہے تمہارے نفسوں نے معاملہ ، اَب میرے لیے صبر
ہی ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کی جا سکتی ہے
اُن باتوں کے خلاف جو تم کرتے ہو (۱۸) اُس طرف آیا
ایک قافلہ اور بھیجا انہوں نے پانی لانے والے کو ، پس
اُس نے ڈالا اپنا ڈول اور کہا ، اے خوشخبری ، یہ تو ایک
لڑکا ہے اور پوشیدہ کیا اِس کو پونجی کے طور پر ،
اور اللہ خوب جانتا ہے اُن چیزوں کو جو وہ کرتے ہیں (۱۹)
اور بیچا انہوں نے اُس کو تھوڑے پیسوں کے عوض ،
گنے ہوئے درہم ۔ اور تھے وہ اس میں بے رغبتی کرنے
والوں میں (۲۰)

ربطِ آیات گزشتہ درس میں برادرانِ یوسف کے منصوبے کا ذکر ہوا کہ وہ یوسف علیہ السلام کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے تاکہ باپ کی ساری توجہ اُن کی طرف ہو جائے چنانچہ انہوں نے باپ کو ہر طرح سے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہم یوسف علیہ السلام کے خیرخواہ ہیں ، آپ اسے ہمارے ساتھ جنگل میں جانے کی اجازت دے دیں ۔ یہ

وہاں پر کھا پی لے گا اور کھیل کود میں بھی حصہ لے لے گا۔ یعقوب علیہ السلام نے تشویش کا اظہار کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت کی وجہ سے یوسف علیہ السلام کسی حادثے کا شکار ہو جائے۔ مگر بھائیوں نے پھر یقین دلایا کہ ہم جیسے مضبوط اور طاقتور بھائیوں کی موجودگی میں ہمارے اس چھوٹے بھائی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو ہم تو پھر بالکل نکمے ثابت ہوئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ بہرحال یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ساتھ جانے کی اجازت دیدی۔

سپردِ چاہ فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ پھر جب بھائی یوسف علیہ السلام کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ راستے میں بھی انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا اور تذلیل وتحقیر کی اور پھر منزل مقصود پر پہنچ کر وَاَجْمَعُوْا انہوں نے اس بات پر اتفاق کیا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ کہ یوسف علیہ السلام کو کسی گہرے کنوئیں میں پھینک دیں۔ ان کی دوسری تجویز یہ بھی کہ آپ کو قتل ہی کر دیا جائے مگر یہودا کے مشورہ پر کنوئیں میں ڈال دینے کی تجویز پر اتفاق ہو گیا۔ چنانچہ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو ایک ہی رسی سے باندھ کر کنوئیں میں لٹکا دیا۔ جب کہ آپ نے کنوئیں کا نصف فاصلہ نیچے کی طرف طے کر لیا تو رسی چھوڑ کر آپ کو یکدم کنوئیں میں گرا دیا گیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کنوئیں میں پانی خشک ہو چکا تھا۔ لہٰذا نیچے پہنچ کر یوسف علیہ السلام ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ آپ کا کرتہ بھی بھائیوں نے گرانے سے پہلے ہی اتار لیا تھا۔ بائبل کی روایت کے مطابق یہ کرتہ بوقلمون کا تھا۔ جو باپ نے اپنے بیٹے کو بڑے شوق سے پہنایا تھا۔ بعض فرماتے ہیں کہ بھائیوں نے یہ بھی قصد کیا کہ اوپر سے پتھر مار کر یوسف علیہ السلام کو کنوئیں کے اندر ہی ختم کر دیا جائے مگر بعض بھائیوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ چنانچہ اس خیال

سے کہ کوئی قافلہ ادھر سے گزرے گا تو اس کو نکال کر اپنے ساتھ لے جائے گا اور اس طرح باپ کا یہ محبوب بیٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

وحی الٰہی کا نزول

جب یوسف علیہ السلام کنوئیں کے اندر پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی اور تسلی دی کہ اے یوسف علیہ السلام گھبرائیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہے اور ایک وقت آنے والا ہے لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا کہ آپ ان کو اس بات کے متعلق بتائیں گے۔ یہ لوگ جو ناشائستہ حرکات کر رہے ہیں، آپ سب کچھ ان کو جتلا دیں گے اور پھر ان کو شرمندہ ہونا پڑے گا۔

بچپن میں نزولِ وحی کے متعلق مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں بعض فرماتے ہیں کہ یہ وحی نبوت کی وحی تھی۔ امام حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کنوئیں کے اندر ہی وحی نازل فرما کر یوسف علیہ السلام کو نبوت کے عہدے پر سرفراز فرمایا تھا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ بچپن میں بھی نبوت عطا کر سکتا ہے حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو بچپن بلکہ پیدائش کے وقت ہی نبوت مل گئی تھی۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کو بھی بچپن میں نبوت مل جانا کچھ بعید نہیں تاہم اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ وحی نبوت کی وحی نہیں تھی بلکہ وہ بعد میں نازل ہوئی کیونکہ عام طور پر نبوت و رسالت چالیس سال کی عمر میں جا کر ملتی ہے اور کنوئیں کے اندر جس وحی کا ذکر کیا گیا ہے، یہ الہام کی وحی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو بھیج کر یوسف علیہ السلام کو تسلی دی کہ آپ ان مشکل حالات سے گھبرائیں نہیں بلکہ ثابت قدمی سے ان مصائب کو برداشت کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا مستقبل روشن کرے گا۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ ایسا ہی الہام تھا جیسا کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام

کی والدہ کی طرف کیا ہے۔ اسی قسم کے الہام کا ذکر سورۃ نحل میں شہد کی مکھیوں کی طرف بھی ملتا ہے وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کی طرف وحی کی کہ وہ پہاڑوں اور درختوں میں اپنا گھر بنائیں۔ پھر تمام پھلوں کا رس چوسیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں میں شہد جیسی مفید چیز پیدا کر دیگا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے یوسف علیہ السلام کو تسلی دی۔

یوسف علیہ السلام کی دعا

اس موقع پر یوسف علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی تھی مفسرین نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ نے عرض کیا یَا شَاهِدًا غَیْرَ غَائِبٍ یَا قَرِیبًا غَیْرَ بَعِیدٍ یَا غَالِبًا غَیْرَ مَغْلُوبٍ اِجْعَلْ لِیْ مِنْ اَمْرِیْ هٰذَا فَرَجًا وَّ مَخْرَجًا یعنی اے وہ ذات جو حاضر ہے اور غائب نہیں، جو قریب ہے اور دُور نہیں، جو غالب ہے اور مغلوب نہیں میرے لیے اس معاملے میں کشادگی پیدا کر دے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسی قسم کی دعا کی تھی حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ تو اللہ نے فرشتے کو بھیج کر آپ کو تسلی دی تھی۔ یہاں پر بھی اللہ نے فرشتے کو بھیج کر یوسف علیہ السلام کو تسلی دی کہ تم فکر نہ کرو، عنقریب تم انہیں ان کے اس غلط کام پر مطلع کرو گے وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ اور اس وقت ان کو پتہ بھی نہیں ہوگا، یعنی ان کو بالکل علم نہیں ہوگا کہ ان کا پول ظاہر ہونے والا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کو اس وقت پتہ نہیں کہ یوسف علیہ السلام کا مستقبل کتنا شاندار ہے وہ تو آپ کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تاکہ باپ کی توجہ ان کی طرف ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ اسی ذریعے یوسف علیہ السلام کو بامِ عروج تک پہنچانا چاہتا ہے

بھائیوں کی حیلہ سازی

بہرحال بھائی یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں پھینک کر واپس آئے وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ اور اپنے باپ کے پاس

عشاء کے وقت روتے ہوئے آئے، وہ جھوٹا رونا روتے آئے تاکہ ان کا قصور نہ ظاہر ہو جائے۔ رونا کئی قسم کا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خشیت سے رونا آتا ہے، اللہ کے عذاب کو یاد کر کے بھی انسان رو پڑتا ہے بعض دفعہ راحت کا رونا آتا ہے اور کوئی مکاری کا رونا بھی ہو سکتا ہے برادران یوسف کا رونا مکاری کا رونا تھا تاکہ باپ کے سامنے اپنی بیگناہی ثابت کر سکیں۔ امام اعمشؒ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی ایسی کہانی اور ایسے رونے کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ برادران یوسف نے رو کر دکھایا تھا۔ غرضیکہ وہ روتے ہوئے آئے قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ کہنے لگے۔ اے ہمارے باپ! بیشک ہم گئے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑتے تھے وَتَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا ہم نے یوسف علیہ السلام کو اپنے سامان کے پاس چھوڑا تھا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ پس اس کو بھیڑیے نے کھا لیا کہنے لگے ہمارے ساتھ یہ حادثہ پیش آگیا ہے۔ کہ یوسف علیہ السلام کو ایک بھیڑیا کھا گیا ہے اور پھر یقین دہانی کے لیے یہ بھی کہا وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ اور اے باپ! آپ ہماری بات کی تصدیق نہیں کریں گے اگرچہ ہم سچے ہی کیوں نہ ہوں۔ ایمان کا لغوی معنیٰ تصدیق کرنا ہوتا ہے اور اس مقام پر یہی معنیٰ مراد ہے۔ بہرحال برادران یوسف نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

خون آلود قمیص

وَجَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ اور لائے وہ یوسف علیہ السلام کی قمیص پر جھوٹا خون، کوئی بکری یا ہرنی ذبح کی اور یوسف کی قمیص اس کے خون سے آلودہ کر لی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کو تو بھیڑیا کھا گیا ہے مگر ان کی خون آلود قمیص بچ گئی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص کو دیکھا تو وہ بالکل صحیح سلامت

تھی، انہیں سے کٹی پھٹی بھی نہیں تھی، کہنے لگے یہ کہانی درست نہیں ہے، کیونکہ اگر بھیڑیا یوسف علیہ السلام کو کھا جاتا تو آپ کی قمیص کیسے صحیح سلامت بچ جاتی، قَالَ کہنے لگے بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا یہ تو تمہارے نفسوں نے کوئی معاملہ بنا لیا ہے۔ یعنی یہ کوئی من گھڑت کہانی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اب میں کیا کر سکتا ہوں فَصَبْرٌ جَمِيلٌ اب تو صبرِ جمیل کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ صبرِ جمیل اس صبر کو کہا جاتا ہے۔ جس میں مخلوق کے سامنے کسی قسم کا گلہ شکوہ نہ کیا جائے بلکہ انسان اللہ کی رضا پر راضی ہو جائے۔ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے فرمایا وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ اب تو تمہاری کارگزاری پر اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جا سکتی ہے۔ تم جو کچھ کر رہے ہو، میں اس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔ آپ نے کوئی حیل وحجت یا جزع فزع نہیں کی بلکہ اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش سمجھتے ہوئے قبول کیا اور صبرِ جمیل کا نمونہ بن کر خاموش ہو گئے۔

یہاں پر بائیبل کا بیان مختلف ہے۔ انجیل کے مطابق یعقوب علیہ السلام نے ٹاٹ پہنا، اپنے پٹکے کو اپنی کمر سے باندھا اور پھر واویلا بھی کیا، یعنی بیٹے کے غم میں بے صبری کا اظہار کیا۔ یہ بیان درست نہیں ہے بلکہ جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے، یعقوب علیہ السلام نے نہایت صبر کا مظاہرہ کیا اور اسے اللہ کی طرف سے ابتلاء سمجھتے ہوئے برداشت کیا۔

یوسف علیہ السلام کی برآمدگی اب بھائی تو یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈال کر چلے گئے اور ادھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یہ کرشمہ ظاہر ہوا وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ وہاں پر ایک قافلہ آگیا۔ یہ تجارتی قافلہ تھا جس کے ساتھ بہت سامانِ تجارت بھی تھا۔ امام بغوی اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ قافلہ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالنے کے تین دن بعد اس مقام پر

پہنچا۔ یہ تین یوم یوسف علیہ السلام نے کس طرح کنوئیں میں گزارے، اس کے متعلق کوئی صحیح روایت نہیں ہے، البتہ بعض تفسیری روایات کے مطابق آپ کا ہمارا بھائی یہودا آپ کو کسی نہ کسی طرح کنوئیں میں کھانا پہنچاتا رہا۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ برادرانِ یوسف کنوئیں کی مسلسل نگرانی کرتے رہے اور دیکھتے رہے کہ آگے کیا معاملہ پیش آتا ہے بہر حال صحیح علم تو اللہ کے پاس ہے تین دن کے بعد جب تجارتی قافلہ اُس علاقے میں اترا فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ تو انہوں نے پانی لانے والے کو بھیجا۔ یعنی قافلے والوں کا ایک آدمی پانی کی تلاش میں پھرتا پھراتا اسی کنوئیں پر پہنچ گیا جس میں یوسف علیہ السلام موجود تھے۔ اس نے سمجھا کہ کنوئیں میں پانی ہوگا۔ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ چنانچہ اس نے اپنا ڈول کنوئیں میں ڈال دیا۔ جب ڈول کو کنوئیں سے باہر کھینچا تو اس میں پانی کی بجائے بچے کو دیکھ کر حیران رہ گیا قَالَ يَٰبُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَٰمٌ کہنے لگا! اے خوش خبری! یہ تو لڑکا ہے۔ اُس وقت غلامی کا رواج پوری دُنیا میں رائج تھا۔ اور لونڈی غلام ایک قیمتی اثاثہ سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو مفت میں غلام مل گیا، اس کو فروخت کر کے پیسے کمائیں گے وَأَسَرُّوهُ بِضَٰعَةً "چنانچہ بچے کو برآمد کرنے والوں نے اسے پونجی کے طور پر چھپا لیا کہ باقی قافلے والوں کو بتلائے بغیر ہم خود ہی اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ادھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَٱللَّهُ عَلِيمٌۢ بِمَا يَعْمَلُونَ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی تمام کارروائیوں سے واقف بلکہ ہر نفس کے دلی ارادے کو بھی جانتا ہے کہ کوئی کس نیت اور ارادے سے کوئی کام انجام دے رہا ہے۔

یوسف علیہ السلام کی فروختگی

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے برادرانِ یوسف بھی کنوئیں کی نگرانی کر

رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد جب کنوئیں پر آئے تو وہاں اپنے بھائی کو نہ پایا، سمجھ گئے کہ قافلے والے نکال کر لے گئے ہیں۔ اُن کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ یہ ہمارا غلام ہے جو بھاگ کر آگیا ہے، اسے واپس کرو۔ یا اگر تم چاہو تو اسے حضرت بھی سکتے ہو۔ خوبصورت بچہ تھا، قافلے والے خریدنے پر بھی رضامند ہو گئے چنانچہ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو تھوڑی قیمت پر قافلے والوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اور وہ قیمت کیا تھی دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ چند گنے ہوئے درہم، یعنی بہت ہی معمولی قیمت کے بدلے یوسف علیہ السلام کو فروخت کر دیا۔ بائبل کی روایت میں آتا ہے کہ کل بیس درہم حاصل کیے جو دس بھائیوں نے دو دو درہم کے حساب سے آپس میں تقسیم کر لیے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف فروخت کی اس کارروائی کے دوران یوسف علیہ السلام نے کوئی کلام نہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی نہ کہا کہ میں غلام نہیں ہوں بلکہ میں ان کا بھائی ہوں۔ اس کی وجہ مفسرین یہ بتاتے ہیں کہ جب شرفا پر ابتلا آجاتی ہے تو بھرپور صبر و استقامت کا اظہار کرتے ہیں۔ تاکہ اُن کے خاندان پر کوئی حرف نہ آئے۔ اسی مصلحت کے تحت یوسف علیہ السلام نے بھی خاموشی اختیار کی۔ دوسری طرف اس بات کا بھی امکان تھا کہ اگر بھائیوں کو جھٹلانے کی کوشش کی تو وہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ جان سے ہی مار دیں، بہرحال بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو نہایت ہی ادنیٰ قیمت پر فروخت کر دیا وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ اور اس میں بہت بے رغبتی کرنے والے تھے۔ یعنی انہوں نے بھائی کو لاپرواہی سے معمولی داموں فروخت کر دیا۔ اُن کا مقصد محض یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کسی طریقے سے اپنے باپ کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں۔ اس طرح

انہیں کچھ پیسے بھی مل گئے اور ان کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔
دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ
اسی ذریعے سے یوسف علیہ السلام کو بام عروج تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ
قافلہ مصر جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر جو حالات پیش آئے ان کا ذکر اگلی
آیتوں میں آ رہا ہے

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ
عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۭ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا
لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ
وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَعْلَمُوْنَ ۲۱ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا
وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۲۲

ترجمہ :- اور کہا اُس شخص نے جس نے خریدا تھا اس (یوسف) کو مصر میں اپنی بیوی سے کہ عزت سے رکھنا اس کو شاید کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنا لیں۔ اور اسی طریقے سے ہم نے ٹھکانا دیا یوسف علیہ السلام کو زمین میں اور تاکہ ہم سکھلائیں اس کو باتوں کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ۔ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اپنے کام میں۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۲۱ اور جب پہنچے (یوسف) اپنی قوت تک تو دی ہم نے اُن کو حکمت اور علم۔ اور اسی طرح ہم بدلہ دیا کرتے ہیں نیکی کرنے والوں کو ۲۲

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں گرے ہوئے جب تین دن گزر گئے تو وہاں سے قافلے والوں نے آپ کو نکال لیا۔ یہ قافلہ مدین سے مصر جا رہا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ لوگ مدین کے باشندے تھے جبکہ روایات

بعض دوسرے اصحاب کہتے ہیں کہ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان کے لوگ تھے۔ بہرحال دورانِ سفر قافلے والوں کو کنعان سے یہ بچہ مل گیا۔ اُدھر بھائی بھی نگرانی کر رہے تھے۔ جب یُوسف علیہ السلام قافلے میں پہنچ گئے تو بھائی بھی وہاں پہنچے اور کہا کہ یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ اسے واپس کر دو یا اگر تم اسے خریدنا چاہو تو ایسا کر سکتے ہو۔ چنانچہ برادرانِ یُوسف نے بیس درہم کی حقیر رقم کے عوض یوسف علیہ السلام کو قافلے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

کنعان سے مصر تک

جس شخص نے بھائیوں سے یُوسف علیہ السلام کو خریدا تھا مفسرین کرام اُس کا نام مالک ابن ذعر بتاتے ہیں اور پھر اُس نے آگے مصر میں جا کر آپ کو فروخت کر دیا۔ تاریخی روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ کنعان سے مصر تک کے سفر کے دوران بعض اوقات آپ کو لیجانے والوں کے دل میں رقت پیدا ہوتی تھی مگر وہ آپ کو غلام سمجھ کر آپ سے مالی منفعت حاصل کرنے کی فکر میں رہے۔ راستے میں اُس شخص نے یُوسف علیہ السلام سے آپ کے وطن اور خاندان کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے بتایا کہ فلاں عظیم خاندان کا فرد ہوں تو اس شخص نے افسوس کا اظہار بھی کیا۔

صاحب روح المعانی اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات قصے کہانی کی کتابوں میں ملتے ہیں لہٰذا ان کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال مصر پہنچ کر وہ لوگ آپ کو غلاموں کی منڈی میں لے گئے، اُن کو نخاس بازار کہتے تھے جہاں غلام اور لونڈی فروخت ہوتے تھے۔

اُس زمانے میں لونڈی غلام کی خرید و فروخت عام تھی۔ یہ تو قریباً ایک صدی ہوئی ہے کہ غلام کا رواج ختم ہوا ہے ورنہ یہ قدیم زمانے سے پوری دنیا میں رائج تھا۔ جب اسلام کا دور آیا تو حضور علیہ السلام اور قرآن پاک نے غلاموں کے متعلق بہت سی اصلاحات کیں۔ اسلام نے غلامی کو غیر فطری

فعل قرار دیا کہ انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوتا ہے لہذا اُسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا خلافِ فطرت ہے۔

مصر میں قدر و قیمت

جب یوسف علیہ السلام مصر کے بازار میں پہنچے تو گاہکوں نے آپ کی مختلف قیمتیں لگائیں۔ اگرچہ اس معاملہ میں کوئی یقینی بات نہیں کی جا سکتی، تاہم بعض کہتے ہیں کہ آپ کی قیمت ہم وزن سونا لگائی گئی اور بعض کہتے ہیں کہ ہم وزن چاندی کی پیش کش ہوئی۔ اس کے علاوہ ہم وزن کستوری اور ہم وزن ریشم بھی لوگوں نے پیش کی۔ یہ بھی بڑی قیمتی چیزیں تھیں۔ بہر حال عام غلاموں کی نسبت یوسف علیہ السلام کی قیمت بہت لگائی گئی۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ قافلے والے جس شخص نے آپ کو خریدا تھا اُس نے بھی آپ کو سستے داموں ہی فروخت کر دیا۔ اُس نے آپ کے عوض بیس دینار، ایک جوڑا جوتے اور دو سفید کپڑے وصول کیے۔ یہ سب تاریخی روایات ہیں اور کوئی یقینی بات نہیں کیونکہ قرآن پاک ان جزئیات کے متعلق خاموش ہے۔

جس شخص نے مصر میں آپ کو خریدا اس سورۃ مبارکہ میں اُس کا نام تو ظاہر نہیں کیا گیا، البتہ اُس کا لقب عزیز آیا ہے۔ بائیبل کی روایت کے مطابق اس شخص کا نام فوطیفار تھا۔ بعض روایات میں فوطی مار بھی آیا ہے۔ یہ شخص حکومت کے بڑے عہدیداروں میں سے تھا وہ وزیر اعظم تو نہیں تھا، البتہ فنانس منسٹر (وزیر مالیات) یا خزانے کا انچارج تھا۔ یہودیو کی کتابوں میں یہ بھی آتا ہے کہ یہ شخص مصر کے بادشاہ فرعون کے باڈی گارڈوں کا انچارج تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ملک کی فوج بھی اسی کے تصرف میں تھی اور اس لحاظ سے یہ وزیر دفاع تھا۔ بہر حال اس شخص نے زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کر کے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

یوسف علیہ السلام کی عزت افزائی

ارشاد ہوتا ہے وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ

جس شخص نے یُوسف علیہ السلام کو مصر میں خریدا تھا اُس نے اپنی بیوی سے کہا اَکْرِمِیْ مَثْوٰىهُ اس کو عزت و آبرو کے ساتھ رکھنا۔ اس کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک روا نہ رکھنا عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ شاید کہ ہمیں فائدہ پہنچائے اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا یا ہم اسے منہ بولا بیٹا ہی بنالیں۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص بے اولاد تھا اور اس کی فراست بڑی صادق تھی۔ وہ یوسف علیہ السلام کی شکل و صورت، چال ڈھال، بول چال اور حرکات و سکنات سے بھانپ گیا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی آدمی ہے۔ اسی لیے اس نے محسوس کیا کہ یہ ہمیں مفید ثابت ہو سکتا ہے حتیٰ کہ ہم اسے متبنیٰ بھی بنا سکتے ہیں۔ مثوٰی دراصل ٹھکانے کو کہتے ہیں اور صاحب خانہ کے لیے ابو مثوٰی کا لفظ آتا ہے۔ مطلب یہی تھا کہ اس غلام کو اپنے گھر میں نہایت عزت و احترام کے ساتھ رکھو۔ کیونکہ ہم اس سے نفع حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ قلیل عرصہ میں یُوسف علیہ السلام کے جوہر کھل کر سامنے آگئے۔ وزارت کے علاوہ فوطیفار کا وسیع کاروبار بھی تھا۔ وہ جو کام بھی یوسف علیہ السلام کے سپرد کرتا، آپ اُسے کمال دانائی اور محنت سے انجام دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دن میں اُس شخص کی کاروباری آمدنی دگنی تگنی ہوگئی۔ وہ یُوسف علیہ السلام کی امانت اور دیانت کا بھی قائل ہو چکا تھا، غرضیکہ آپ کے متعلق اُس شخص کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ اللہ نے فرمایا وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ اور اس طریقے سے ہم نے یوسف علیہ السلام کے قدم زمین میں جما دیے یعنی انہیں باعزت ٹھکانا میسر آگیا اور اس طرح خاندانِ اسرائیل کے وردِ مصر کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ آپ کے بھائی تو آپ کو ذلیل و خوار کرنا چاہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ آپ کو بامِ عروج تک پہنچانا چاہتا تھا۔ لہٰذا یہ تمام مصائب و تکالیف منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلیے زینے بنتے چلے گئے۔

حاملین فراستِ صادقہ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تین شخصوں کو فراستِ صادقہ عطا کی ہے۔ ایک شخص تو یہی قطیفا ہے جس نے یوسف علیہ السلام کو خریدا تھا۔ دوسری صاحب فراست شخصیت حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھی جس نے باپ سے سفارش کی تھی کہ "یٰاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۚ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ" اے ابا! موسیٰ علیہ السلام کو ملازم رکھ لیں یہ مضبوط بھی ہے اور امین بھی۔ بیٹی نے بتایا کہ اس شخص نے پانی کا وہ ڈول اکیلے نکال لیا جو کئی کئی آدمی مل کر نکالتے ہیں، لہٰذا یہ بڑا طاقتور ہے۔ اور امین اس لحاظ سے ہے کہ جب میں اس کو بلانے کے لیے گئی تو میں آگے آگے تھی اور یہ پیچھے پیچھے آ رہا تھا ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے کپڑا اٹھ کر بے پردگی کا خطرہ تھا۔ لہٰذا اس شخص نے مجھے کہا کہ تم پیچھے ہو جاؤ اور میں آگے آگے چلتا ہوں تاکہ تم پر میری نظر نہ پڑے۔ غرضیکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی نے بڑی فراست کی بات کی۔ فرماتے ہیں کہ تیسری صاحب فراست صادقہ شخصیت حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جنہوں نے اپنی فراست سے یہ بات پالی تھی کہ امت میں ان کے بعد نظامِ خلافت چلانے والا حضرت عمرؓ سے بہتر کوئی آدمی نہیں، لہٰذا آپ نے اپنی وفات سے قبل خلافت کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کی نامزدگی کر دی تھی۔

تاویل الاحادیث کا علم

فرمایا ہم نے یوسف علیہ السلام کو زمین میں ٹھکانا دیا۔ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ اور تاکہ ہم آپ کی باتوں کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ سکھا دیں۔ اس سے مراد خواب کی تعبیر بھی ہے اور عام معاملات کو ٹھیک طریقے سے نمٹانے کی صلاحیت بھی مراد ہے۔ کسی معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر

اُس کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا ہر آدمی کا کام نہیں بلکہ ایسا ہی شخص کر سکتا ہے۔ جسے اللہ نے خاص صلاحیت بخشی ہو۔ فرمایا وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ اللہ تعالیٰ اپنے معاملات میں غالب ہے وہ جو چاہے کر ڈالے یا کسی کام کے ہو جانے کے لیے راستہ ہموار کر دے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے میں کوئی شخص دخل نہیں دے سکتا۔ اُس کی تدبیر تمام تدابیر پر حاوی ہے۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ سب سے بہتر تدبیر کنندہ ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے کیونکہ اُن کو علم ہو تو پھر ایسی ویسی باتیں نہ کریں۔ مشرکین مکہ نے بھی حضور علیہ السلام کو ختم کرنے کی بڑی بڑی تدبیریں کیں مگر انہیں ہر بار ناکامی ہوئی کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز پر غالب ہے اور اس کی تدبیر کے سامنے کسی دوسری ہستی کی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہی خالق، مدبر اور متصرف ہے اور وہی ہر کام میں غالب ہے۔

کمالِ حکمت وعلم

ارشاد ہوتا ہے وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اور جب پہنچے یُوسف علیہ السلام اپنی قوت کے زمانے یعنی شباب کو، مطلب یہ ہے کہ جب آپ کی عمر تیس ۳۰ یا تینتیس ۳۳ سال ہو گئی اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا تو ہم نے آپ کو حکمت اور علم عطا کیا۔ اس سے نبوت بھی مراد لی جا سکتی ہے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یحییٰ علیہ السلام کی طرح یُوسف علیہ السلام کو بھی بچپن میں ہی نبوت عطا ہو گئی تھی مگر بعض کہتے ہیں کہ آپ کو نبوت چالیس سال کے بعد ملی، البتہ اللہ نے آپ کو دانائی، حکمت اور صحیح فہم پہلے ہی عطا کر دیا تھا۔ امام ابن درید فرماتے ہیں كُلُّ كَلِمَةٍ وَّعَظَتْكَ اَوْ زَجَرَتْكَ اَوْ دَعَتْكَ اِلٰى مَكْرُمَةٍ اَوْ نَهَتْكَ عَنْ قَبِيْحٍ فَهِيَ حُكْمٌ وَّحِكْمَةٌ یعنی ہر ایسی بات جو تمہارے لیے

نصیحت کا باعث ہو یا تمہیں تنبیہ کرنے والی ہو یا تمہیں بزرگی کی طرف بلائے یا قبیح چیز سے منع کرے وہ حکم اور حکمت کہلاتی ہے۔ قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی، حکمت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں اَلْحِکْمَۃُ مَعْرِفَۃُ اَفْضَلِ الْاَشْیَآءِ بِاَفْضَلِ الْعُلُوْمِ یعنی سب سے افضل چیز کو افضل علم کے ساتھ جاننا حکمت کہلاتا ہے۔ سب سے افضل چیز خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں اور سب سے افضل علم علمِ حضوری یعنی مشاہدے کا علم ہے اور یہ ایسا بلند درجے کا علم ہے کہ جس کے ذریعے خدا تعالیٰ کی تجلیات منکشف ہوتی ہیں۔ یہ علم انبیائے کرام اور بلند ترین حکمائے ربانی کو حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال اللہ نے فرمایا کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو حکم اور علم عطا فرمایا۔

ایک غلط فہمی

بعض مفسرین، جن میں مولانا مودودی بھی شامل ہیں کہتے ہیں۔ کہ یوسف علیہ السلام کا خاندان دیہات میں رہتا تھا۔ بدویانہ زندگی میں گلہ بانی کرتا تھا اس لیے متمدن دنیا کے حالات سے بے خبر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو مصر جیسی متمدن سلطنت میں پہنچایا تاکہ آپ متمدن دنیا کے حالات سے تربیت حاصل کر سکیں۔ اس بات کو کسی خاص حد تک تو تسلیم کیا جا سکتا ہے مگر مکمل طور پر نہیں کیونکہ اللہ کے نبیوں کو تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اخلاقی لحاظ سے عوام الناس کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

بعض لوگ اخلاق سے بالکل خالی ہوتے ہیں ـــــــــــ

بعض میں اخلاق کا معمولی حصہ ہوتا ہے، بعض میں اخلاق کا وافر حصہ موجود ہوتا ہے اور بعض انسان اخلاق کے امام ہوتے ہیں اور وہ کسی دوسرے شخص

سے اخلاق نہیں سیکھا کرتے بلکہ باقی لوگ ان سے اخلاق کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس سے یہ نظریہ باطل ہو جاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو مصر میں تربیت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جسے خود اللہ تعالیٰ حکمت اور علم عطا فرمائے اُس کے لیے نظامِ حکومت چلانا مشکل نہیں رہتا۔ عام انسانوں کے لیے تو تربیت کا قانون درست ہے مگر اللہ کے انبیاء پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

یہیں سے ڈارون کی تھیوری بھی غلط ثابت ہوتی ہے جس نے یہ بات ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ انسان پہلے بندر تھے پھر ترقی کرتے کرتے انسانیت کے درجے پر پہنچ گئے۔ اس تھیوری کی تردید خود یورپ کے بیسیوں بڑے بڑے سائنسدانوں اور دانشوروں نے بھی کی ہے۔ قرآن پاک ایسی تھیوری کی مکمل نفی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو اپنا نبی بنایا اور نبی کے متعلق یہ قطعی بات ہے کہ وہ اعقل الناس یعنی تمام لوگوں سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ اس لیے اُسے دوسرے لوگوں سے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ لوگ نبی سے سیکھتے اور تربیت حاصل کرتے ہیں۔

نیکی کا بدلہ

فرمایا وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ اور ہم اس طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیکی کرنے والوں کو۔ اللہ تعالیٰ کا کامل درجے کا اطاعت گزار جو کبھی صبر کا دامن نہیں چھوڑتا محسن کہلاتا ہے اور اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ محسن کے بدلے کو ضائع نہیں کرتے بلکہ ایسے لوگوں کو باہم عروج تک پہنچاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے

کمال اطاعت اور صبر کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت اور علم عطا فرما کر اپنے کمال عنایات سے نوازا اور بام عروج تک پہنچایا۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ
الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ
رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٣﴾
وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ
رَبِّهِ ۚ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۚ إِنَّهُ
مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿٢٤﴾

ترجمہ:۔ اور پھسلایا اس (یوسف علیہ السلام) کو اس کے جی سے، اس عورت نے جس کے گھر وہ رہتے تھے۔ اور بند کر دیے اس عورت نے تمام دروازے۔ اور کہا اس نے ادھر آؤ جلدی کرو۔ کہا اس یوسف (علیہ السلام) نے پناہ بخدا۔ بے شک وہ میرا مالک ہے۔ اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنایا ہے۔ بے شک فلاح نہیں پاتے ظلم کرنے والے ﴿۲۳﴾ اور البتہ بہ تحقیق ارادہ کیا اس عورت نے یوسف (علیہ السلام) کے ساتھ (برائی کا) اور یوسف (علیہ السلام) نے بھی ارادہ کیا اس کے ساتھ۔ اگر نہ دیکھتا وہ برہان اپنے رب کا (تو شاید اس کا میلان اس کی طرف ہوتا) ایسا ہی ہوا۔ تاکہ ہم دور کر دیں اس سے برائی اور بے حیائی کی بات کو۔ بے شک وہ ہمارے منتخب بندوں میں سے تھا ﴿۲۴﴾

تشریح کلمات

هَیْتَ یا ھِیْتَ اصل میں سریانی، حورانی یا قبطی زبان کا لفظ ہے۔ اور عربی میں اس کا معنیٰ ھَلُمَّ لَکَ یا تَعَالِ بنتا ہے جو اسم فعل کے معنیٰ میں آتا ہے۔ آؤ۔ قریب ہو جاؤ کا مفہوم دیتا ہے برہان کا معنیٰ سند اور دلیل ہوتا ہے جس سے شک و شبہ یا ابہام وغیرہ ختم ہو جاتا ہے۔ سکون و یقین حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس مقام میں برہان کا معنےٰ اور مفہوم متعین کرنے میں مفسرین کرام کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ وغیرہم کے نزدیک برہان یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت کو دیکھا تھا۔ دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے۔ امام ولی اللہؒ بھی یہی کہتے ہیں۔ یعنی صورت یعقوب حاضر شد انگشت بدنداں گرفتہ (حاشیہ فتح الرحمٰن)

اور بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے سینہ پر ایک دھپا رسید کیا۔ جس سے ان کے تمام شہوانی خیالات گم ہو گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا آقا عزیز مصر جس کا نام فوطی فار یا قطفیر تھا۔ اس کی خیالی صورت سامنے آئی تھی اور بعض سلف سے یہ بھی منقول ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے سر اوپر اٹھایا تو چھت کی دیوار پر یہ لکھا ہوا دیکھا۔ "لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰیٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَّسَآءَ سَبِيْلًا" (ابن کثیر)

قَالَ جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدِنِ الصَّادِقُ اَلنُّبُوَّةُ الَّتِیْ اَوْدَعَ اللّٰهُ فِیْ صَدْرِهٖ حَالَتْ بَيْنَهٗ (مظہری ص $\frac{154}{5}$)

حضرت امام جعفر صادقؒ نے فرمایا ہے کہ برہان سے مراد نبوت ہے جو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے سینہ میں ودیعت رکھی ہوئی تھی وہی اس برائی کے درمیان حائل ہوئی

بعض مفسرین کرام نے ھَمَّ بِھَا کے جملہ کو لَوۡلَآ اَنۡ رَّاٰ بُرۡھَانَ رَبِّهٖ کی شرط کی جزا یا جواب میں داخل کیا ہے۔ لیکن نحوی حضرات نے اس پر اشکال کیا ہے کہ لولا حروف شرط کے حکم میں ہوتا ہے اور اس کا جواب اس سے متقدم نہیں آسکتا۔

لِاَنَّ لَوۡلَا فِیۡ حُکۡمِ	اس لیے کہ لولا آلات شرط کے
اَدَوَاتِ الشَّرۡطِ فَلَا یَتَقَدَّمُهَا	حکم میں ہے اس کا جواب اس سے
جَوَابُهَا وَجَازَ اَنۡ	متقدم نہیں آسکتا اور جائز ہے کہ
یَکُوۡنَ ھَمَّ بِھَا	ہم بہا جو کہ پہلے مذکور ہے اس شرط
الۡمَذۡکُوۡرُ قَبۡلَهَا دَلِیۡلًا	سے، وہ دلیل اور قرینہ ہو اس کے
عَلٰی جَوَابِهَا۔ یَعۡنِیۡ لَهَمَّ	جواب پر یعنی لھمّ بہا اور اس
بِهَا۔ وَمَعۡنَی الۡهَمِّ الۡمَذۡکُوۡرِ	طرح پر ھمّ مذکور کا معنی قریب
عَلٰی هٰذَا شَارَفَ الۡهَمَّ	ہونے کا ہوگا جس طرح اس محاورہ
فَهُوَ کَقَوۡلِهٖ قَتَلۡتُهٗ لَوۡلَمۡ	میں ہے کہ میں اس کو قتل کر دیتا
اَخَفِ اللّٰهَ تَقۡدِیۡرُهٗ شَارَفۡتُ	اگر اللہ کا خوف نہ رکھتا یعنی قریب
عَلٰی قَتۡلِهٖ لَوۡلَمۡ	تھا کہ میں اس کو قتل کر دیتا اگر اللہ تعالیٰ
اَخَفِ اللّٰهَ قَتَلۡتُهٗ	کا خوف مجھ میں نہ ہوتا۔

(مظہری ص ۱۵۱/۵۲)

بعض نے اس طرح معنی بیان کیا ہے کہ اس عورت نے یوسف علیہ السلام کا قصد کیا برائی کے ساتھ اور یوسف علیہ السلام نے قصد کیا اس سے بھاگنے کا۔

امام بیضاویؒ نے یوسف علیہ السلام کے ھم کو طبعی میلان اور خواہش کے ساتھ کشمکش کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اختیاری قصد نہیں مراد جس پر مواخذہ ہوتا ہے۔

قَالَ الشَّیْخُ اَبُوْمَنْصُوْرِ الْمَاتُرِیْدِیْ هَمُّ یُوْسُفَ بِهَا هَمُّ خَطِرَةٍ وَلَا صُنْعَ لِلْعَبْدِ فِیْمَا یَخْطُرُ بِالْقَلْبِ وَلَا مُؤَاخَذَةَ عَلَیْهِ۔

(تفسیر مظہری ص۱۵۳ ج۵)

اور حضرت امام شیخ ابو منصو ماتریدی نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا قصد اس عورت کے ساتھ دل میں کھٹکے کا قصد تھا اور اس میں بندہ کا کوئی اختیار نہیں ہوتا جو کھٹکا اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس پر اس بندہ سے کوئی مواخذہ بھی نہیں ہوتا، یہ غیر اختیاری ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ بُرْهَانَ رَبِّهٖ سے مراد حرمت زنا کا معاملہ جو یوسف علیہ السلام کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ نے مرتکز کر دیا تھا کہ یہ ایک فعل شنیع اور حرکت قبیح ہے جس کا ارتکاب کرنے والا ظالم اور بدکردار انسان ہی ہو سکتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جو نور کا پیکر اور خوبصورت ترین شخصیت کے مالک تھے۔ پاکیزہ ترین سیرت اور نزاہت اور طہارت کے ساتھ متصف تھے۔

اور ان کی اعلیٰ سیرت کا یہ مقام و مرتبہ بہت بلند تھا اللہ تعالے نے انہیں عصمت و حفاظت کے اس بلند ترین مقام پر فائز فرمایا تھا جو تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ترغیبات و تخریبات اور تخویفات و تکمیات کا کوئی شدید طوفان بھی اس ناقابل تسخیر چٹان کو اپنے مقام سے ہلا نہ سکا۔ انسانی سیرت و کردار کا جو اعلیٰ و ارفع مقام حضرت یوسف علیہ السلام نے پیش کیا، اور اس راستہ کی تمام مشکلات و مصائب کو جس صبر و استقامت سے

برداشت کیا وہ ہر انسان کے بس کا روگ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کہ بے شک اسی عورت نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ کیا۔ یہ ارادہ بُرے خیال کا تھا۔ لیکن یوسف علیہ السلام نے بھی ارادہ کیا اس عورت کے ساتھ اگر نہ دیکھا ہوتا اس نے برہان اپنے رب کا تو ممکن ہے کہ اس کے دل میں بھی اس کی طرف میلان ہوتا، لیکن برہان رب کا دیکھنا یوسف علیہ السلام کے لیے اس میلان سے مانع ہوا اس ھم میں عورت کا قصد و ارادہ تو یقیناً اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا تھا۔ لیکن یوسف علیہ السلام کے ہم اور قصد کی نوعیت کیا تھی۔ اس بارہ میں مفسرین کرام نے مختلف قسم کی توجیہات بیان کی ہیں۔ بعض مفسرین نے ھم سے پہلے مراد عزم یا قصد علی الفعل نہیں لیا۔ بلکہ عزم سے کمتر درجہ کے کھٹکے۔ خواطر یا حدیث النفس کے درجے کے جو خیالات ہوتے ہیں وہ مراد ہیں۔ جو قابل مؤاخذہ نہیں ہوتے۔ قابل مؤاخذہ صرف عزم ہوتا ہے۔ یعنی یوسف علیہ السلام کے قلب میں کچھ رغبت و میلان بے اختیار پیدا ہوا جس طرح روزہ دار انسان کو گرمی میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً رغبت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن نہ تو وہ پینے کا ارادہ کرتا ہے اور نہ یہ بے اختیار رغبت کچھ مضر ہے۔ لیکن باوجود طبعی رغبت کے اس سے قطعاً محترز رہنا مزید اجر و ثواب کا موجب ہے اسی طرح سمجھ لو کہ ایسے اسباب و دواعی قویہ کی موجودگی سے طبع بشری کے موافق بلا اختیار وارادہ یوسف علیہ السلام کے دل میں کسی قسم کی رغبت و میلان کا پایا جانا نہ عصمت کے منافی ہے نہ ان کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے۔ بلکہ صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ کی حدیث

میں ہے کہ اگر بندہ کا میلان کسی برائی کی طرف ہوا، لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس کے فوحسنات میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے اس نے باوجود رغبت و میلان کے میرے خوف سے اس برائی کو ہاتھ نہ لگایا بہر حال باوجود اشتراک لفظی کے زلیخا کے ہم اور یوسف علیہ السلام کے ہم میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے دونوں کے ہم کو ایک ہی لفظ میں جمع نہیں کیا اور نہ زلیخا کے ہم کی طرح یوسف علیہ السلام کے ہم پر لام اور قد داخل کیا گیا۔ بلکہ سیاق و سباق میں بہت سے دلائل یوسف علیہ السلام کی طہارت و نزاہت پر قائم فرمادیے۔ جو غور کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں (حضرت شیخ عثمانی رح بحاشیہ قرآن) اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی تربیت عجیب طریقے پر فرمائی تھی ایک طرف اگر عزیز کی بیوی زلیخا نے ان کے سامنے نہایت خطرناک مزلۃ الاقدام، پھسلنے کا موقع اور شدید قسم کا امتحان کھڑا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو تمام کائنات میں نصف حسن سے آراستہ و پیراستہ کیا تھا (اعطی شطر الحسن، مسلم، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج تیسرے آسمان پر میری ملاقات حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ان کو نصف حسن عطا کیا گیا ہے) اور ادھر زلیخا ان کے اس حسن وجمال پر مفتون تھی، اس نے دلکشی اور ہوشربائی کے سارے سامان جمع کر دیے اور چاہا کہ یوسف علیہ السلام کے دل کو ان کے قابو سے باہر کر دے۔ نفسانی جذبات کو پورا کرنے کے لیے ہر قسم کے عیش و نشاط کے سامان موجود تھے۔ یوسف علیہ السلام کا ہر وقت اس کے گھر میں موجود رہنا اور اس کا نہایت محبت و پیار سے رکھنا، پھر علیحدگی اور تنہائی کے وقت عورت کی طرف سے خواہش کا بے آبانہ اظہار اور کسی غیر کے آنے جانے کے

تمام راستے مسدود اور تمام دروازے بند۔ ادھر جوانی کی عمر، قوت کا زمانہ، امزاج میں اعتدال، تجرد کی زندگی ایسے تمام اسباب و دواعی تھے کہ عام حالات میں بڑے سے بڑے زاہد و متقی کا تقویٰ بھی ان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جس ہستی کو محسن قرار دیکر علم و حکمت کے رنگ میں رنگین کیا اور پیغمبرانہ عصمت کے بلند مقام پر پہنچایا، ممکن نہیں تھا کہ شیطان کا داؤ اس پر چلتا، یا کسی طرح وہ اس پر قابو پالیتا۔ اس نے ایک جملہ معاذ اللہ کہہ کر شیطان کے جال کے تمام حلقے توڑ ڈالے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی پناہ میں رکھا اس پر شیطان کا وار کس طرح چل سکتا تھا؟

اس نے کہا پناہ بخدا میں ایسی قبیح و رذیل حرکت کا ارتکاب کس طرح کر سکتا ہوں۔ (اس خیانت کا ارتکاب مجھ سے ممکن نہیں) عزیز تو میرا مربی ہے جس نے مجھے عزت و راحت سے رکھا ہے کیا میں ایسے محسن کے ناموس پر حملہ کروں؟ ایسی محسن کشی اور بے انصافی کرنے والے کبھی بھلائی اور کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے (شیخ عثمانی)

اس سے ظاہر ہے کہ انہ ربی کی ضمیر مجازی مربی کی طرف راجع ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبی کس طرح کسی انسان کو اپنا رب کہہ سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں۔ کیونکہ ربی جس طرح حقیقی مالک پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مجازی پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے اور رب کا معنیٰ مالک۔ آقا اور سید ہوتا ہے۔ اسی سورت میں آیت نمبر ۴۲ میں "اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ فَأَنْسَاهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ" میں بھی رب سے مراد مالک سید آقا اور بادشاہ ہے پھر اس مقام میں مجازی مالک کے مراد ہونے پر قرینہ بھی موجود ہے اِنَّهٗ اَحْسَنَ مَثْوَايَ جس نے

میرا اللہ کانہ اچھا بنایا ہے۔ وہ یقیناً عزیز مصر تھا۔ اس نے یوسف علیہ السلام کو خریدنے کے بعد ہی اپنی بیوی سے کہدیا تھا اکرمی مثواہ عسی ان ینفعنا او نتخذہ لہذا انہ ربی میں الک مجازی مراد ہے انہ ربی اگر حقیقی مالک (اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس) مراد لی جائے تو بھی درست ہے۔ کیونکہ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کے فضل و احسان کے نتیجہ میں واقع ہوا ہے لیکن پہلی تفسیر کی تغلیط درست نہیں کیونکہ ضمیر شان کے ساتھ لا محالہ کہ کے رب کا اطلاق کیا گیا ہے تو اس سے عزیز کا مراد لینا درست ہے۔ اور اس لیے بھی کہ رب ان صفات مختصہ میں سے نہیں جن کا اطلاق ہر حال میں غیر اللہ پر ناجائز ہو۔

واللہ اعلم بالصواب

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا
سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ أَرَادَ
بِأَهْلِكَ سُوْٓءًا إِلَّآ أَنْ يُّسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾
قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ
أَهْلِهَا ۚ إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ
وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٦﴾ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ
دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾ فَلَمَّا رَاٰ
قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۚ
إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾ يُوْسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا
وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ ﴿٢٩﴾

ترجمہ:- اور دوڑے وہ دونوں (یوسف اور عورت) دروازے کی طرف اور اُس نے پھاڑ دی اُس (یوسف) کی قمیص پیچھے سے اور پایا اُن دونوں نے اُس (عورت) کے خاوند کو دروازے کے پاس۔ کہنے لگی نہیں ہے سزا اُس شخص کی جس نے ارادہ کیا ہے تیرے اہل کے ساتھ برائی کا سوائے اس کے کہ اُس کو قید میں ڈالا جائے یا کوئی اور دردناک سزا دی جائے ﴿٢٥﴾ کہا (یوسف نے) اسی عورت نے مجھے پھسلانا چاہا ہے اپنے

بھی ہے۔ اور گواہی دی ایک گواہی دینے والے نے اس عورت کے لوگوں میں سے کہ اگر اس کی قمیص پھاڑی گئی ہے سامنے سے تو یہ سچ کہتی ہے اور یہ جھوٹا ہے (٢٦) اور اگر اسکی قمیص پھاڑی گئی ہے پیچھے سے تو وہ عورت جھوٹ کہتی ہے اور یہ سچا ہے (٢٧) پس جب دیکھا اُس (عزیز مصر) نے کہ قمیص پیچھے سے پھاڑی گئی ہے تو کہنے لگا۔ بیشک یہ تمہارے فریبوں میں سے ہے۔ بیشک تمہاری فریب کاریاں بڑی ہیں (٢٨) (اور اُدھر یُوسف سے کہا) اے یُوسف! درگزر کرو اس بات سے۔ اور (عورت سے کہا کہ) معافی مانگ اپنے گناہ کے لیے۔ بیشک تو ہی خطاکاروں میں سے ہے (٢٩)

قمیص کا پھٹنا

گذشتہ درس میں یُوسف علیہ السلام کی ابتلاء کا ذکر ہو چکا ہے کہ عزیزِ مصر کی بیوی نے آپ پر فریفتہ ہو کر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور بُرائی پر آمادہ کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی۔ جب اُس عورت نے دروازے بند کر لیے تو یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی اور عورت بھی آپ کے پیچھے بھاگی۔ اس واقعہ کو قرآن پاک نے اس طرح بیان کیا ہے۔ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ اور وہ دونوں (یُوسف اور زلیخا) دروازے کی طرف دوڑے۔ آگے آگے یُوسف علیہ السلام تھے اور پیچھے پیچھے عزیزِ مصر کی بیوی تھی۔ یُوسف علیہ السلام تو برائی سے بچنے کے لیے بھاگے جب عورت انہیں برائی پر آمادہ کرنے کے لیے پکڑنا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ عورت نے بھاگ کر پیچھے سے یُوسف علیہ السلام کی قمیص پکڑ لی ہوگی۔ اور یوسف علیہ السلام اسے چھڑانا چاہتے ہوں گے اس کھینچا تانی میں وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ اُس عورت نے یُوسف علیہ السلام کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زلیخا نے دروازے کو تالا لگا دیا تھا جو کہ درست نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے

کندا لگا دیا ہو جسے کھول کر یوسف علیہ السلام باہر نکلنا چاہتے تھے۔

یوسف علیہ السلام کی قمیص کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے جب کہ بھائیوں نے آپ کی خون آلود قمیص اس دعوے کے ساتھ باپ کے سامنے پیش کی تھی کہ آپ کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ یہاں پر آپ کی قمیص پھٹ جانے کا ذکر ہے اور آگے پھر آپ کی قمیص کا ذکر آنے گا جو آپ نے قاصد کے ہاتھ کنعان بھیجی تھی۔ اور جب وہ قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈالی گئی تو آپ کی بینائی لوٹ آئی تھی۔

بائبل اور قرآن میں تضاد

واقعہ یوسف علیہ السلام کے اس حصہ میں بائبل اور قرآن کے بیانات متضاد ہیں۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی پوری قمیص زلیخا کے ہاتھ میں رہ گئی۔ یہ بیان بالکل جھوٹ پر مبنی ہے اور یہودیوں کی تحریف کا نتیجہ ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ زلیخا کے کھینچنے سے یوسف علیہ السلام کی پوری کی پوری قمیص اُتر کر اس کے ہاتھ میں آگئی ہو اور آپ برہنگی کی حالت میں باہر کی طرف بھاگے ہوں۔ البتہ قرآن کا بیان مبنی بر صداقت ہے کہ آپ کی قمیص کھینچا تانی میں پھٹ گئی۔ دوسرا تضاد یہ ہے کہ بائبل کے بیان کے مطابق زلیخا نے قمیص دکھا کر عزیز مصر کو شکایت کی کہ تمہارا عبرانی غلام اس کردار کا مالک ہے جس نے میرے ساتھ برائی کا ارادہ کیا اور پھر قمیص چھوڑ کر بھاگ گیا اس پر وہ غصہ سے بھر گیا اور اس نے یوسف علیہ السلام کو گرفتار کر کے فوری جیل بھیج دیا۔ اس مقام پر بھی قرآن پاک کا بیان مختلف ہے کہ جب عزیز مصر نے دیکھا کہ قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے اور اس شیر خوار بچے نے یوسف علیہ السلام کی بیگناہی کی شہادت دی تو اس نے اپنی عورت سے کہا کہ یہ تیری فریب کاری ہے۔ تو یوسف علیہ السلام سے گناہ کی معافی مانگ اور اُدھر یوسف علیہ السلام سے بھی

کہا کہ اس معاملے کو یہیں دفن کر دو اور درگزر سے کام لو۔
یوسف علیہ السلام کے برائی سے بھاگنے کے حوالے سے فارسی کا ایک نہایت عمدہ اور سبق آموز شعر ہے۔ ؎

نیست رفتن گرچہ در عالم پدید
ہم چو یوسف خیرہ سر باید دوید

اگرچہ انسان کے لیے پورے جہان میں بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو پھر بھی اس کا فرض ہے کہ وہ یوسف کی طرح برائی سے بھاگنے کی پوری کوشش کرے۔

خاوند سے شکایت

فرمایا کہ اس عورت نے یوسف علیہ السلام کی قمیص کو پھاڑ دیا مگر اس کے باوجود آپ دروازے سے باہر نکل گئے، زلیخا بھی پیچھے آرہی تھی وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ تو پایا ان دونوں نے عورت کے خاوند یعنی عزیز مصر کو دروازے کے پاس۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ اس وقت عزیز مصر بھی کہیں قریب ہی تھا۔ جب زلیخا نے اپنے خاوند کو پایا کر اپنی برأت کے لیے فوراً پینترا بدلا اور الٹا یوسف علیہ السلام کو قصوروار ٹھہرانے کی کوشش کی قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا کہنے لگی، نہیں سزا اس کی جس نے تیرے اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا ہے إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ سوائے اس کے کہ اسے قید کیا جائے۔ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ یا کوئی دوسری سخت سزا دی جائے۔ یعنی پٹائی وغیرہ کی جائے۔ اس موقع پر یوسف علیہ السلام کی خاموشی عورت کی بات کی تصدیق کرنے کے مترادف تھی لہٰذا آپ نے اپنی صفائی پیش کرنے کا حق استعمال کیا قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي فرمایا کہ اس عورت کا بیان غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ اسی عورت نے مجھے اپنے نفس سے پھسلانا چاہا ہے۔ مجھے برائی پر آمادہ کرنا

یوسف علیہ السلام کی بیگناہی

چاہتی ہے جب کہ میں بالکل بے قصور ہوں

اس پر زلیخا نے اپنے دعوے کی تائید میں کچھ اور باتیں بھی کی ہوں گی اور اپنے خاوند پر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ جب عزیز مصر کے لیے حقیقتِ حال کو معلوم کرنا مشکل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے یہ انتظام فرمایا وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے یہ گواہی دی إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن قُبُلٍ اگر یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہے فَصَدَقَتْ تو زلیخا سچی ہے وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ اور یہ جھوٹا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اقدام کیا ہے اور عورت بچنا چاہتی ہے وَإِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ اور اگر آپ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے فَكَذَبَتْ تو عورت جھوٹی ہے وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ اور یوسف علیہ السلام سچے ہیں۔ آپ بھاگنا چاہتے تھے مگر زلیخا نے پیچھے سے پکڑنے کی کوشش میں قمیص کو پھاڑ دیا۔

قرائن کی یہ شہادت عزیز مصر کو پسند آئی فَلَمَّا رَأَىٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ پھر جب اُس نے دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے، تو فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا قَالَ إِنَّهُ مِن كَيْدِكُنَّ اپنی بیوی سے کہا، یہ تمہاری فریب کاریوں میں سے ہے۔ یعنی تیرا بیان جھوٹ پر مبنی ہے اور حقیقت یہ ہے إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ تم عورتوں کی فریب کاریاں بہت بڑی ہوتی ہیں۔

خاندانِ زلیخا میں سے گواہی دینے والا کون آدمی تھا؟ اس کے متعلق مفسرین کی دو رائیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک عاقل اور بالغ شخص تھا اور اس نے نہایت حکیمانہ گواہی دی جس کی بنا پر عزیز مصر

کو اصل واقعہ کا علم ہوگیا۔ البتہ اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ گواہ ایک شیر خوار بچہ تھا۔ اللہ نے اُس کو قوت گویائی عطا کی اور اُس نے ایسے پیرائے میں گواہی دی کہ براہ راست کسی کے خلاف نہ تھی بلکہ محض ایک قرینے کی نشاندہی کی گئی تھی جو کہ قابل فہم اور قابل عمل تھی، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ چھوٹے بچے کی گویائی کوئی واحد معجزہ نہ تھی بلکہ اس کے علاوہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے بھی بچپن میں ہی اپنی نبوت کی گواہی دی تھی کہ اللہ نے مجھے کتاب بھی دی ہے اور نبوت بھی عطا کی ہے اسی طرح ایک بزرگ حضرت جریج پر جب ایک فاحشہ عورت نے الزام لگایا تو آپ کی بریت کی گواہی بھی ایک شیر خوار بچے ہی نے دی تھی۔ اصحاب اخدود کے واقعہ میں بھی ایک شیر خوار بچے کے بولنے کا ذکر آتا ہے جبکہ اُس کی ماں سے چھین کر آگ میں پھینک دیا گیا تھا تو اس نے اپنی ماں کو تسلی دی تھی۔ فرعون کی بیٹی کو کنگھی کرنے والی عورت کے بیٹے کو آگ میں ڈالنے لگے تو اُس بچے نے بھی ماں کو صبر کی تلقین کی تھی اور کہا تھا کہ ماں تم حق پر ہو۔

علامت کی اہمیت

کسی مقدمہ میں علامت کی اہمیت کے متعلق مفسرین بحث کرتے ہیں کہ یہ مقدمہ میں کس حد تک اثر انداز ہو سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور آپ کے تمام شاگرد کہتے ہیں کہ اگرچہ علامت پر کسی کیس کا قطعی فیصلہ تو نہیں ہو سکتا مگر اس سے فیصلہ کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی ایک چیز کے دو دعویدار ہوں تو حاکم مجاز ہے کہ وہ کسی ایک فریق کی طرف سے محض علامت قبول کر کے اس کے حق میں فیصلہ دے دے، تاہم اگر دوسرا فریق مطمئن نہ ہو تو وہ گواہی پر فیصلہ دے گا۔

کیونکہ قطعی فیصلہ گواہی پر ہوتا ہے۔ بہرحال کسی چیز کی علامت

تصفیہ میں ممد ضرور ثابت ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر میاں بیوی میں کسی چیز کی ملکیت کے متعلق تنازعہ پیدا ہو جائے تو قاضی اس علامت پر بھی فیصلہ کر سکتا ہے کہ متنازعہ چیز دونوں میں سے کس کے استعمال کی ہے۔ اور اگر متنازعہ چیز مشترکہ استعمال کی ہے تو وہ خاوند کو دے دی جائیگی تا کہ دونوں استعمال کر سکیں۔

تابعین کے زمانے کے قاضی شریح بڑے مشہور قاضی ہوئے ہیں جنہوں نے ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ قضا کی، ان کی عدالت میں دو عورتیں پیش کی گئیں، جو بلی کے ایک بچے پر اپنا حق ملکیت جتلاتی تھیں۔ قاضی صاحب نے بلی کا متنازعہ بچہ منگوا کر ایک عورت کے سپرد کیا اور فرمایا ——— اگر یہ بچہ ٹک گیا، اس نے قرار پکڑا اور اس کے ارد گرد گھومنے لگا، انگڑائی لی تو یہ اس کی مانوسیت کی علامت ہو گا اور بچہ اسی عورت کی ملکیت سمجھا جائیگا۔ اگر هَرَّتْ فَرَّتْ وَاذْبَعَرَّتْ غرانے لگا بھاگنے لگا تو اس عورت سے غیر مانوسیت کی علامت ہو گا۔ اور اس کو نہیں دیا جائیگا۔

تابعین اور تبع تابعین کے دور میں قاضی ایاس بھی بڑے پائے کے قاضی ہوئے ان کے پاس کاتی ہوئی اون یا روئی کی ایک اَٹی لائی گئی جس کی ملکیت کی دعویدار دو عورتیں تھیں۔ قاضی صاحب نے دونوں عورتوں کو ایک ایک کر کے علیحدگی میں بلایا اور پوچھا کہ یہ سوت تم نے کس چیز پر لپیٹا تھا۔ ایک عورت نے تبلایا کہ اس نے یہ سوت روٹی کے ٹکڑے پر لپیٹا تھا، جب کہ دوسری عورت نے اخروٹ کا دانہ بتلایا۔ چنانچہ اس اَٹی کو آخر تک کھولا گیا اور اس میں سے جس عورت کے بیان کے مطابق چیز نکلی اس کے حق میں فیصلہ دے دیا گیا۔ گویا یہ فیصلہ بھی علامت پر ہی تھا۔

عورتوں کی مکاریاں

دوسری بات عورتوں کی مکاری کی ہے جس کی تصدیق عزیز مصر نے کی کہ عورتوں کی مکاریاں بہت بڑی ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں حضور

علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا فرمانِ مبارک ہے مَا رَأَیْتُ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّدِیْنٍ اَذْھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰکُنَّ عورتوں سے خطاب کے دوران فرمایا کہ تم عقل اور دین میں ناقص ہونے کے باوجود دانا آدمی کی عقل کو خراب کرنے والی ہو یعنی عقلمند آدمی کو بھی چکر دے جاتی ہو اگرچہ خود تمہاری عقل ناقص ہے. حضور کا یہ بھی فرمان ہے مَا تَرَکْتُ بَعْدِیْ فِتْنَۃً اَضَرَّ عَلَی الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ میں اپنے بعد مردوں کے حق میں عورتوں سے بڑھ کر کسی فتنے کو نہیں چھوڑ چلا. اکثر جھگڑے فساد عورتوں کی ذات یا ان کی کارگزاریوں کی وجہ سے ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض عورتوں کی وجہ سے عظیم سلطنتیں بھی آپس میں ٹکرا جاتی ہیں.

آج کی دنیا میں بھی عورتوں کا فتنہ عروج پر ہے. جدید تہذیب و تمدن نے عورت کو بڑی آزادی دی ہے حتیٰ کہ اسے اپنے اصل مقام سے ہی علیحدہ کر دیا گیا ہے. اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پورے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے. عریانی، فحاشی اور بے حیائی عام ہو چکی ہے عورتوں کو ایسے مناصب پر فائز کیا گیا ہے. جو اُن کی صنف کے خلاف ہیں. جب عورتیں فوج اور پولیس میں شامل ہوں گی، عوام الناس سے تعلق رکھنے والے دفاتر میں ملازمت حاصل کریں گی تو اس سے فتنے کے سوا کیا پیدا ہو گا؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اے لوگو! اللہ سے ڈرو بنی اسرائیل میں پہلا فتنہ عورتوں کی وجہ سے پیدا ہوا، قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ شیطان سے اتنا خوف نہیں آتا جتنا عورت سے آتا ہے کیونکہ شیطان کی فریب کاری کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا (نساء) یعنی شیطان کی مکاری تو کمزور ہے مگر عورتوں کی فریب کاری کے متعلق بیان

فرمایا گیا ہے اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ یعنی تمہاری مکاریاں بہت بڑی ہیں۔ اسی لیے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ عورتوں کی فریب کاری سے زیادہ چوکنا رہنا چاہیئے۔

عزیز مصر کی معاملہ فہمی

بہر حال عزیز مصر نے اپنی بیوی کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے فرمایا کہ تم نے یہ فریب کیا ہے اور عورتوں کی فریب کاریاں بہت بڑی ہوتی ہیں۔ اُدھر یوسف علیہ السلام سے کہا، یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ ھٰذَا کہ اے یوسف علیہ السلام! اس معاملہ سے درگذر کرو، معاف کر دو، چھوڑ دو۔ وہ یوسف علیہ السلام پر بالکل خفا نہیں ہوا کیونکہ وہ تو آپ کو بے گناہ سمجھ کر معذرت خواہانہ لہجے میں کہہ رہا ہے کہ اس واقعہ کو عام کرنے سے بدنامی ہوگی، لہٰذا اس کو یہیں ختم کر دو اور عورت کو معافی دے دو کہ اُس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔

اور اُدھر اپنی عورت سے کہا وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِکِ تم یوسف علیہ السلام سے اپنے گناہ کی معافی مانگو، کیونکہ اِنَّکِ کُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِیْنَ غلطی کا ارتکاب تم نے کیا ہے۔ تو نے اُس پر غلط الزام لگایا ہے اور اُس کو پھانسنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے، لہٰذا اس سے بھی معافی مانگو۔ اور اپنے گناہ کی تلافی کرو۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا
عَنْ نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۚ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ
وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ
سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗ اَكْبَرْنَهٗ
وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ
هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿٣١﴾

ترجمہ:۔ اور کہا کچھ عورتوں نے شہر میں کہ عزیز کی بیوی پھسلاتی ہے اپنے غلام کو اُس کے جی سے ۔ بیشک وہ اس کی محبت میں فریفتہ ہوگئی ہے ہم دیکھتی ہیں اس کو صریح غلطی میں ﴿٣٠﴾ جب اُس (عزیز کی بیوی) نے اُن (عورتوں) کی فریب کاری کی باتیں سنیں تو اُن کی طرف پیغام بھیجا اور تیار کی اُن کے لیے مجلسِ طعام اور دی اُس نے ہر ایک کو اُن میں سے ایک چھری ۔ اور اُس نے کہا یوسف سے کہ نکل آؤ اُن کے سامنے ۔ جب اُن عورتوں نے اس کو دیکھا تو اُس کو بڑا خیال کیا اور کاٹ ڈالے انہوں نے اپنے ہاتھ اور کہنے لگیں وہ پاک ہے اللہ تعالیٰ نہیں ہے یہ بشر مگر بزرگ فرشتہ ﴿٣١﴾

ربط آیات گذشتہ درس میں یوسف علیہ السلام کی ابتلاء کا ذکر ہوا ۔ عزیز مصر کی بیوی نے

آپ پر فریفتہ ہوکر آپ پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور برائی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو برائی سے محفوظ رکھا کیونکہ آپ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے، اُس عورت نے آپ کو کمرے میں داخل کرکے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو یوسف علیہ السلام باہر کی طرف بھاگے، اُس عورت نے پیچھے سے آپ کی قمیص پکڑ کر آپ کو روکنا چاہا جس سے قمیص پھٹ گئی۔ جب وہ دونوں باہر دروازے پر پہنچے تو وہاں عزیز مصر کو موجود پایا۔ عورت نے فوراً پینترا بدلا۔ اور یوسف علیہ السلام پر برائی کا الزام لگا دیا، یوسف علیہ السلام نے جواباً اپنی صفائی پیش کی۔ اس موقع پر عورت کے گھر والوں میں سے ایک شیر خوار بچے نے نہایت حکیمانہ گواہی دی کہ اگر یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو عورت کا بیان سچا ہے اور اگر پیچھے سے پھٹی ہے تو عورت جھوٹی اور یوسف علیہ السلام بے گناہ ہیں۔ چنانچہ جب قمیص کا جائزہ لیا گیا تو یوسف علیہ السلام سچے ثابت ہوئے۔ عزیز مصر نے بدنامی کے ڈر سے یوسف علیہ السلام سے ملتجیانہ طور پر کہا کہ جو کچھ ہو چکا اس سے درگزر کریں اور بیوی سے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور یوسف علیہ السلام سے معافی مانگے۔

محبت کے چرچے

عزیز مصر نے ہر چند اس واقعہ کو مخفی رکھنے کی کوشش کی مگر پھر بھی یہ بات کسی نہ کسی طرح ظاہر ہو گئی اور شہر میں اس واقعہ کے تذکرے ہونے لگے۔ عزیز مصر کی بیوی کی ہم مرتبت عورتوں میں یہ واقعہ خاص طور پر موضوعِ سخن بن گیا اور انہوں نے اس پر خوب ہے دے کی۔ آج کے درس میں اِسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ شہر کی کچھ عورتیں کہنے لگیں یعنی اُس عورت کی سوسائٹی کی عورتوں میں چرچا ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ عزیز مصر کی بیوی

کا تعلق شہر کی اونچی سوسائٹی سے تھا جس میں بڑے بڑے امراء اور وزراء کی بیویاں یا بیٹیاں شامل تھیں۔ انہوں نے آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ کہ زلیخا اپنے غلام کو اس کے نفس سے پھسلاتی ہے۔ اسے کیا ہو گیا ہے قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا بیشک یہ عورت اس کی محبت میں فریفتہ ہو گئی ہے۔ شغاف دراصل قلب کے اوپر والے غلاف کو کہتے ہیں۔ جب کسی کے دل میں محبت جاگزیں ہو جائے تو کہتے ہیں کہ محبت دل کے شغاف میں پڑ گئی ہے۔ تو شہر کی عورتوں نے بھی یہی کہا کہ زلیخا کنعانی غلام کو دل دے بیٹھی ہے۔ غلامی کا مرتبہ ویسے بھی بہت کم سمجھا جاتا تھا لہٰذا ایک اعلیٰ سوسائٹی کی عورت کا غلام پر فریفتہ ہونا زیادہ قابل ملامت تھا، تو اس کی ہمجولیوں نے کہا اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ہم تو زلیخا کو صریحاً غلطی میں دیکھتی ہیں۔

جب شہر میں زلیخا کے خلاف اس قسم کا پراپیگنڈا شروع ہو گیا، تو اس کو بھی کسی طرح سے خبر ہو گئی اور اس نے بھی اپنے دماغ میں تدبیر سوچی۔ ارشاد ہوتا ہے فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ جب عزیز مصر کی بیوی نے شہر کی عورتوں کی طرف سے طعن سنا۔ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ تو ان کی طرف پیغام بھیجا وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً اور ان کے لیے مجلسِ طعام کا اہتمام کیا۔ متکاً کا لغوی معنی "تکیہ گاہ" ہے یعنی ایسی نشستیں جن پر تکیے لگے ہوئے ہوں۔ عرب رواج کے مطابق معزز مہمانوں کو بٹھانے کا طریقہ یہ تھا کہ فرش پر قالین بچھا کر ہر مہمان کے لیے ایک ایک تکیہ رکھ دیا جاتا تھا جس سے ٹیک لگا کر مہمان بیٹھتے تھے۔ پھر ان کے سامنے چھوٹے میز رکھے جاتے جن کو "خوان" کہتے تھے۔ ان میزوں پر کھانا رکھا جاتا جو مہمان نیچے جھکے بغیر آسانی سے تناول کرتے۔ مطلب یہ کہ اس قسم کا

مجلس طعام کا انعقاد

انتظام اونچی سوسائٹی میں کیا جاتا تھا۔ چونکہ زلیخا بھی اعلیٰ سوسائٹی کا فرد تھی، لہٰذا اُس نے بھی مہمان عورتوں کی خاطر مدارت کے لیے نہایت اعلیٰ قسم کا اہتمام کیا۔

"خوان" کا ذکر حضور علیہ السلام کی حدیث میں بھی ملتا ہے۔ آپ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے یَاْکُلُ عَلَی الْاَرْضِ کہ آپ کھانا زمین پر بیٹھ کر تناول فرماتے اور یہ بھی کہ مَا اٰکَلَ عَلٰی خُوَانٍ یعنی آپ میز پر کھانا رکھ کر نہیں کھاتے تھے بلکہ کھانا کسی پلیٹ یا رومال وغیرہ میں رکھ کر اپنے سامنے زمین پر ہی رکھ لیتے اور تناول فرماتے۔ مطلب یہ کہ آپ سادگی پسند تھے اور میز پر رکھ کر کھانے کا تکلف نہیں فرماتے تھے۔ میز پر کھانے لگانا کوئی حرام تو نہیں ہے۔ البتہ اس کو فیشن کے طور پر لازمی سمجھ لینا مکروہ ہے۔ اگر نیچے بیٹھ کر کھانے کا انتظام ہو سکتا ہے تو اس کے باوجود تکلف کرنا مکروہ ہوگا۔

بہرحال زلیخا نے اپنی ہم مجلس اور ہم طبقہ عورتوں کے لیے دعوتِ طعام کا اہتمام کیا، اُن کے لیے اعلیٰ نشستوں کا اہتمام کیا اور نہایت باعزت طریقے سے اپنے گھر بلایا۔ دراصل اُس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان معترض عورتوں پر واضح کر سکے کہ جس پر دیسی پر وہ دل نثار کر چکی ہے، وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں بلکہ اُس کی جگہ وہ بھی ہوتیں تو ایسا ہی کرتیں۔ پھر جب تمام مہمان عورتیں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئیں تو ان کے آگے کھانا چنا گیا وَاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا تو میزبان نے ہر عورت کو ایک ایک چھری بھی دی۔ چھری کانٹے کا استعمال اُس زمانے میں بھی مصری تہذیب میں پایا جاتا تھا اور آج بھی انگریزی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ اس کے علاوہ یونانی اور رومی تہذیب میں بھی چھری کانٹے کا استعمال رائج تھا۔ تاہم اللہ کے سارے نبیوں نے ایسی تہذیب

کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے دائیں ہاتھ سے کھانے کا حکم دیا ہے مگر موجودہ انگریزی تہذیب میں تو کھانے کے لیے بیٹھنے کی گنجائش بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب تو مشرقی اور مغربی سب لوگ کھڑے ہو کر اور چل پھر کر کھانے کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ یہ تو بالکل ڈھور ڈنگروں کا طریقہ ہے۔ اس معاملے میں مسلمان بھی دوسری اقوام کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چل رہے ہیں۔ انہوں نے غیر اقوام کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں تو تقلید نہیں کی، البتہ غلط طور طریقوں اور غیر دینی تہذیب و تمدن، کھیل تماشے، عریانی اور فحاشی کو ضرور اپنا لیا ہے

بہر حال جب کھانا لگ گیا اور تمام مہمانوں کو چھریاں بھی مل گئیں یوسف علیہ السلام کا سامنے آنا
تو زلیخا نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے یہ تدبیر اختیار کی وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ اور یوسف علیہ السلام سے کہا کہ ان عورتوں کے سامنے آجاؤ۔ دعوت کا وسیع انتظام تھا کسی کام کے بہانے یوسف علیہ السلام سے کہہ دیا کہ ادھر آؤ۔ مالک کے حکم کی تعمیل میں یوسف علیہ السلام نہایت اطمینان کے ساتھ مہمان عورتوں کے سامنے گزر گئے اور کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ جب ان مہمان عورتوں کی نگاہ یوسف علیہ السلام پر پڑی تو وہ ششدر رہ گئیں۔ یوسف علیہ السلام کو بہت بڑی ہستی خیال کیا۔ تورات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام شرم حیا اور عصمت کی صفات کے ساتھ موصوف تھے اور آپ نور پیکر تھے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ معراج کی شب جب حضور علیہ السلام تیسرے آسمان پر پہنچے تو یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ صحیحین کی روایت میں یہ الفاظ ہیں اِذَا هُوَ اُعْطِیَ شَطْرُ الْحُسْنِ یعنی یوسف علیہ السلام کو دنیا کے کل حسن و جمال کا نصف حصہ دیا گیا اور باقی نصف باقی ساری مخلوق کو تقسیم کیا گیا ہے۔ بہر حال حسن و جمال،

وجاہت، عظمت اور شرافت کے پیکر کی حیثیت سے عورتوں کے سامنے سے گزرے۔ عورتیں اُن کی عظمت کی قائل ہوگئیں اور انہوں نے یوسف علیہ السلام میں شہوت کی کوئی علامت نہ پائی لہٰذا آپ کو صورت اور سیرت ہر لحاظ سے عظیم خیال کیا۔

ہاتھ کاٹ ڈالے

اُن عورتوں پر یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا اس قدر رعب طاری ہوا کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھیں اور چھری کے ساتھ پھل کاٹنے کی بجائے وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ انہوں نے اپنے ہاتھ ہی کاٹ ڈالے۔ ایسی مدہوش ہوئیں کہ اُن کی چھریاں خود انہی کے ہاتھوں پر چل گئیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مہمان عورتوں نے اپنے ہاتھ مدہوشی میں نہیں کاٹے تھے بلکہ انہوں نے دانستہ طور پر ایسا کیا تھا۔ اُن میں سے ہر ایک یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہو چکی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح آپ اُس کی طرف متوجہ ہوں۔ جب آپ نے بے اعتنائی کا اظہار کیا تو انہوں نے ہاتھ کاٹ لیے کہ شاید اُن کو زخمی دیکھ کر ہی یوسف علیہ السلام اُن کی مدد کے لیے آگے بڑھیں گے۔ کیونکہ وہ غلام ہیں اور خدمت پر مامور ہیں اور اسی طریقے سے انہیں آپ کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ مگر یوسف علیہ السلام تو بغیر نظر اٹھائے آگے نکل چکے تھے۔

فرشتہ صورت انسان

بہر حال مہمان عورتیں یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر کہنے لگیں۔ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ پاکی ہے اللہ تعالیٰ کے لیے۔ وہ ذات پاک ہے جس نے اتنا خوبصورت اور خوب سیرت انسان بنایا مَا هٰذَا بَشَرًا یہ تو انسان معلوم ہی نہیں ہوتا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ بلکہ یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اُن عورتوں نے تو فرشتوں کو دیکھا نہیں تھا۔ پھر انہوں نے

یوسف علیہ السلام کو فرشتے کے ساتھ کیسے تشبیہ دے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے انبیاء بھی جبرائیل علیہ السلام کو انسانی شکل میں ہی دیکھتے رہے ہیں۔ یہ صرف حضور علیہ السلام کو شرف حاصل ہے[1] کہ آپ نے جبرائیل علیہ السلام کو دو دفعہ اصلی صورت میں دیکھا۔ اس اشکال کا جواب مفسرین کرام اس طرح دیتے ہیں کہ انسانوں کے ذہن میں فرشتوں کی خوبصورتی اور شیطان کی بدشکلی راسخ ہو چکی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کسی خوبصورت انسان کو چاند کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ شیاطین کی بدشکلی کا ذکر قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ سورۃ صفٰت میں فرمایا کہ جہنمیوں کی خوراک تھوہر کے پودے ہوں گے "طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ" جن کے سرے شیطانوں کے سروں کی طرح ہوں گے گویا شیطان کی نسبت بدصورتی کی طرف ــــــــ کی گئی۔ شیاطین سے بعض لوگ سانپ بھی مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ شیاطین کا اطلاق سانپ پر بھی ہوتا ہے۔ جس طرح جن خوف اور ہیبت کی علامت سمجھا جاتا ہے اسی طرح شیطان بدصورتی اور فرشتہ خوبصورتی کی علامت ہے۔ اس لیے ان عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو اُن کے حسن و جمال کی نسبت سے فرشتے کا خطاب دیا۔

"فرشتہ" عربی ادب میں

عربی ادب میں بھی فرشتے کو حسن و جمال کا پیکر سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ عرب شاعر جب اپنی ممدوح قوم کی تعریف کرتا ہے، تو کہتا ہے

قَوْمًا اِذَا قُوْبِلُوْا كَانُوْا مَلٰٓئِكَةً حُسْنًا

وَاِنْ قُوْتِلُوْا كَانُوْا عَفَارِيْتًا

وہ ایسی قوم ہیں کہ اگر حسن و جمال کے لحاظ سے اُن کا مقابلہ کیا جائے تو وہ فرشتے ہیں اور جب وہ میدانِ جنگ میں مقابلہ کرتے ہیں تو خوفناک جن ہوتے ہیں۔ عفریت کا معنیٰ خوفناک یا خطرناک جن ہوتا ہے

[1] بخاری ص ۳/۱۴ و مسلم ص ۹۰/۱

مصر کا شوقی اقبال کی طرح قومی شاعر ہوا ہے، وہ کہتا ہے۔

صُوْنِیْ جَمَالَكِ عَنَّا اِنَّنَا بَشَرٌ
مِنَ التُّرَابِ وَهٰذَا الْحُسْنُ رُوْحَانِیْ

ہم سے اپنے جمال کو بچاؤ کہ ہم تو محض انسان ہیں اور یہ حسن وجمال روحانی چیز ہے۔ ہم اس کے کہاں قابل ہیں۔ اس شعر کو اتنا اعلیٰ سمجھا گیا ہے کہ مصر کے ایک دوسرے بڑے شاعر حافظ ابراہیم اس ایک شعر کے بدلے اپنا پورا دیوان دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

ایک اور شعر ہے ۔

اَوْفَابْتَغِیْ مَلَکًا نَاوِیْنَهٗ فَلَکًا لَمْ یَتَّخِذْ شَرَکًا فِی الْعَالَمِ الْفَانِیْ

اگر حسن کا مظاہرہ کرنا ہے تو آسمان میں جگہ بناؤ کسی ایسے فرشتے کو مدمقابل بناؤ جس نے اس مادی جہان میں کوئی شراکت پیدا نہ کی ہو کیونکہ مادی انسانوں میں یہ باتیں کہاں پائی جاتی ہیں۔

الغرض! کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حسن وجمال کی نسبت ملائکہ کی طرف کی جاتی ہے اور اسی بنا پر مصری عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو ایک نظر دیکھ کر کہا کہ یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ وہ آپ کی عظمت اور بڑائی کی قائل ہو گئیں۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ ۖ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهُ عَنْ
نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۖ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ
وَلَيَكُونًا مِّنَ الصّٰغِرِينَ ٣٢ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ
إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ
أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِينَ ٣٣ فَاسْتَجَابَ
لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ
الْعَلِيمُ ٣٤ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْاٰيٰتِ
لَيَسْجُنُنَّهُ حَتّٰى حِينٍ ٣٥ ع ۴ ۱۴

ترجمہ :- بولی وہ عورت (جس کے گھر میں یوسف علیہ السلام تھے) یہ وہی ہے کہ تم مجھے ملامت کرتی تھیں اس کے بارے میں اور البتہ تحقیق میں نے اس کو بے قابو کرنا چاہا تھا اس کے جی سے ، پس وہ بچ گیا ۔ اور اگر نہیں کرے گا وہ جو میں اُس کو کہتی ہوں ، تو ضرور وہ قید میں ڈالا جائے گا اور ہو جائے گا وہ بے عزت ۳۲ کہا (یوسف علیہ السلام نے) اے پروردگار ! قیدخانہ زیادہ اچھا ہے میرے نزدیک اس بات سے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں ، اور اگر تو نہیں پھیرے گا ان کی فریب کاری کو مجھ سے تو میں مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف ، اور ہو جاؤں گا میں نادانوں میں سے ۳۳

پس قبول کی اُس کے پروردگار نے اُس کی دُعا، پس پھیر دیا اس سے اُن کی فریب کاری کو، بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے (۳۴) پھر ظاہر ہُوا اُن کے لیے بعد اُس کے کہ انہوں نے دیکھ لی نشانیاں یہ کہ اس کو ضرور قید میں رکھیں ایک وقت تک (۳۵)

ربطِ آیات — جب مصر میں یہ مشہور ہوگیا کہ عزیزِ مصر کی بیوی نے اپنے غلام کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی ہے تو اپنے جلنے کی عورتوں نے زلیخا کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے جواب میں زلیخا نے ایک مجلس طعام کا اہتمام کیا جس میں تمام معززخواتین بیگمات اور امیرزادیوں کو مدعو کیا۔ اُس معاشرے کے رواج کے مطابق بڑی پُرتکلف دعوت کی گئی جس میں چھری کانٹا بھی استعمال کے لیے رکھا گیا۔ زلیخا کا مقصد یہ تھا کہ جس غلام کے نام پر یہ عورتیں اُسے بدنام کر رہی ہیں اُسے خود بھی ایک نظر دیکھ لیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں کہ میری مجبوری کیا ہے۔ جب وہ سب عورتیں کھانے کے لیے بیٹھ گئیں تو زلیخا نے کسی بہانے سے یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے سے گزار دیا جسے دیکھ کر تمام عورتیں ششدر رہ گئیں۔ یوسف علیہ السلام اس شان اور باوقار طریقے سے گزرے کہ کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اُن کی پاکبازی کے متعلق عورتوں کو ذرا کوئی شبہ نہ ہُوا، البتہ وہ نہایت حسین و جمیل، پاک صورت اور نورپیکر انسان کو دیکھ کر خود بے قرار ہو گئیں اور انہوں نے چھریوں سے پھل کاٹنے کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ کوئی انسان نہیں بلکہ بزرگ فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔

چھری کانٹے کا استعمال — اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے چھری کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے کہ اُس زمانے میں بھی چھری کانٹے کے استعمال کا رواج تھا اور لوگ پھلوں کے علاوہ بھنا ہوا گوشت بھی چھری سے کاٹ کاٹ کر کھاتے تھے۔ جب اسلام کا دور آیا تو حضور علیہ السلام نے اس مقصد کے لیے چھری کو معمول کے طور پر استعمال کرنے سے منع فرما دیا۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا تَقْطَعُوا اللَّحْمَ

بِالسِّكِّيْنِ فَاِنَّهٗ مِنْ صَنِيْعِ الْاَعَاجِمِ یعنی پکائے ہوئے گوشت کو چھری سے کاٹ کر نہ کھاؤ کیونکہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے آپ نے ہاتھ استعمال کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ خود حضور علیہ السلام نے بکری کی بونگ کو ہاتھ سے پکڑ کر اور دانتوں سے نوچ کر تناول فرمایا۔ البتہ آپ نے ضرورت کے وقت چھری کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ ترمذی شریف کی حدیث میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے کہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مہمان ہوا آپ نے مجھے کھانا کھلایا، اور آپ کَانَ یَحْتَزُّ چھری سے کاٹ کاٹ کر کھانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ اتنے میں حضرت بلالؓ آئے اور انہوں نے عرض کیا کہ حضور! نماز کا وقت ہوگیا ہے اس پر آپ ناراض ہوگئے اور اَلْقَی الشَّفْرَۃَ اور چھری ہاتھ سے پھینک دی۔ آپ نے بلالؓ سے فرمایا مَالَهٗ تَرِبَتْ یَدَاهُ کیا ہوگیا ہے۔ بلال اس کے ہاتھ خاک آلود ہوں جو ہمیں آکر نماز کی اطلاع دیتا ہے، کیا ہمیں نہیں پتہ کہ نماز ادا کرنی ہے۔ ہیں مہمان کی خاطر مدارت کر رہا تھا اور اس نے دخل در معقولات کا ارتکاب کیا۔ گویا اس حدیث میں چھری استعمال کرنے کا ذکر ہے۔ اگر پکے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بڑے ہوں اور ہاتھ سے نہ کاٹے جاسکیں تو چھری سے کاٹنا بھی درست ہے۔ یہ چیز اب بھی عربوں میں رائج ہے۔

سعودی مملکت کے بانی شاہ ابن سعود نے ایک امریکی کمپنی کے دس ہزار کے لگ بھگ سارے سٹاف کی دعوت کی۔ اس دعوت میں شاہ نے اونٹ سے لے کر انڈے تک کی تمام چیزیں مسلم روسٹ کر کے پیش کیں۔ کہتے ہیں کہ سالم روسٹ

کیے ہوئے اونٹوں کی تعداد چھیالیس تھی اور گائے، بیل، بھیڑ بکری، ہرن مرغ، بٹیر وغیرہ لاتعداد تھے۔ ظاہر ہے کہ بڑے بڑے جانوروں کا گوشت استعمال کرنے کے لیے چھری کی ضرورت ہوگی اور ایسے حالات میں اس کا استعمال جائز ہے۔ عربوں کے علاوہ افغانستان میں بھی بڑے جانور روسٹ کرنے کا رواج موجود ہے۔ تاہم چھری کانٹے کا استعمال بلا ضرورت تکلفاً درست نہیں۔

زلیخا کا اعتراف حقیقت

بہر حال دعوتِ طعام کے موقع پر جب مہمان خواتین نے یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر خود اپنے ہاتھ کاٹ لیے تو زلیخا کو حقیقت حال بیان کرنے کا موقع میسر آگیا۔ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ کہنے لگی یہی ہے وہ غلام جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔ اب بتلاؤ کہ میرا جذبا تی ہو جانا کس حد تک درست تھا۔ فارسی والے بھی اس حالت کے متعلق کہا کرتے ہیں۔ ؎

ایں است کہ خوں خوردہ و دل بردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

یہی ہے وہ کہ جس نے خون کھایا ہے اور دل لیا ہے۔ اگر کسی کو دیکھنے کی طاقت ہے تو آ کر اسے دیکھ لے۔ مقصد یہ کہ زلیخا نے کہا کہ میں اس غلام کو دل دینے پر مجبور ہوگئی تھی مگر تم نے اسے اور میری مجبوری کو دیکھے بغیر بدنام کرنا شروع کر دیا۔ پھر جب زلیخا نے بھانپ لیا کہ معزز خواتین اس کی بات سے متاثر ہو رہی ہیں تو اس نے مزید کھل کر بات کی، کہنے لگی وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ میں نے خود اس کو اس کے نفس سے پھسلانا چاہا تھا۔ یعنی یوسف نے تو کبھی کسی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا، بلکہ میں نے ہی اُسے پھانسنے کی کوشش کی مگر فَاسْتَعْصَمَ وہ بچ

گیا۔ اُس نے رغبت ملنے کے باوجود برائی کی طرف رغبت نہیں کی
یہ تمام حالات و واقعات جاننے کے بعد مہمان خواتین نے
زلیخا کو مجبور سمجھتے ہوئے اس کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کا فیصلہ
کر لیا۔ دراصل اُن کی اپنی حالت اس شعر کے مصداق ہو چکی تھی۔

لَا تَخَفْ مَا صَنَعَتْ بِكَ الْاَشْوَاقُ
وَاشْرَحْ هَوَاكَ فَكُلُّنَا عُشَّاقُ

اشواق نے جو کارگزاری تمہارے ساتھ کی ہے، اس سے مت
خوف کھاؤ، اور اپنے دل کی بات کو ظاہر کر دو کیونکہ ہم سب کی
حالت بھی تم جیسی ہو چکی ہے، اب ہم تمہیں ہرگز ملامت نہیں کریں
گی بلکہ تمہیں مجبور سمجھیں گی۔

لَا اَذْنُبُ الْبَارِیُ بَنَا اللّٰهُ هَيْكَلِي
صَنِيْعَةُ اِحْسَانٍ وَّ رِقٍّ حِسَانٍ

اللہ نے مجھے بنا کر احسان فرمایا، مجھے شکل و صورت عطا کی۔ میں اسی
احسان کا پروردہ ہوں، مگر اللہ نے اس کے ساتھ ساتھ مجھے حسینوں
کا غلام بھی بنا دیا ہے۔ حسن والوں کو دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہوں۔
بہرحال زلیخا نے اپنی مجبوری اور یوسف علیہ السلام کی عصمت کا
برملا اظہار کیا۔ آپ تو اللہ تعالےٰ کے مقدس بندے تھے۔ اگرچہ
اس وقت آپ کو نبوت عطا نہیں ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ اپنے
خاص بندوں کی ابتداء ہی سے اس طرح تربیت کرتا ہے کہ ان سے
معصیت کا ارتکاب ممکن نہیں ہوتا۔ انبیاء سے اگر کوئی معمولی
سی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ زلت کہلاتی ہے اور وہ عام لوگوں کی
نسبت سے گناہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ خلاف اولیٰ بات ہوتی ہے تاہم
انبیاء کو اس معمولی لغزش پر بھی تنبیہ ہو جاتی ہے۔

بہر حال زلیخا اپنے اعترافِ جرم اور یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی کے باوجود اپنے ارادے سے پیچھے ہٹنے والی نہ تھی۔ کہنے لگی وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ اگر اب بھی یوسف علیہ السلام نے میری بات نہ مانی لَيُسْجَنَنَّ تو اُسے ضرور قید میں ڈالا جائے گا وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ اور وہ ضرور بے عزت ہو جائے گا۔ زلیخا نے یہ دھمکی بھی دے دی۔

یوسف علیہ السلام کی دعا

زلیخا کی یہ دھمکی یوسف علیہ السلام نے بھی سُن لی اور اُدھر آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ زلیخا معزز خواتین کی ہمدردیاں بھی حاصل کر چکی ہے۔ اس صورتِ حال میں آپ نے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کی

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ اے پروردگار! مجھے قید میں جانا زیادہ پسندیدہ ہے اس بات کی نسبت جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں۔ اور ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ اے مولا کریم! وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اگر تو ان کی فریب کاری کو مجھ سے نہیں ہٹائے گا۔ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ اور نادانوں میں سے ہو جاؤں گا معصیت کا مرتکب اپنی نادانی ہی کی وجہ سے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اگر اس کا فہم اور عقل صحیح ہو تو ایسی بات نہ کرے۔

بہر حال یوسف علیہ السلام نے قید میں ڈالے جانے کو معصیت پر ترجیح دی کیونکہ قید خانہ کی تکلیف تو عارضی ہے، ختم ہو جائے گی مگر معصیت کے نتیجہ میں ہونے والا عذاب دائمی ہو گا جو بلاشبہ ناقابل برداشت ہے۔ سعدی صاحب نے ایک بزرگ کا ذکر کیا ہے کہ کسی چیتے نے انہیں زخمی کر دیا تھا اور وہ زخمی حالت میں دریا کے کنارے پڑے تھے، زخم گہرا تھا اور اچھا نہیں ہو رہا تھا۔ مگر وہ اللہ

کا بندہ ہر وقت خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اتنی تکلیف
کے باوجود اللہ تعالیٰ کا شکر کس طرح کرتے ہو، تو کہنے لگے کہ شکر اس
بات کا ہے کہ میں جسمانی تکلیف میں مبتلا ہوں، کسی گناہ کی مصیبت
میں گرفتار نہیں ہوں۔ اسی اصول کے پیش نظر یوسف علیہ السلام
نے بھی دعا کی کہ اے اللہ! معصیت کی دائمی تکلیف سے قید کی عارضی
تکلیف مجھے منظور ہے، لہٰذا مجھے گناہ سے محفوظ رکھنا۔

عرش کا سایہ

یوسف علیہ السلام نے جس پرہیزگاری اور بلند کرداری کا مظاہرہ
کیا اس کے اجر و ثواب کا ذکر حضور علیہ السلام کی حدیث میں بھی ملتا ہے
صحیحین کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے اللہ کے کامل الایمان
بندوں کا ذکر اس طرح کیا ہے سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیْ
ظِلِّهٖ يَوْمًا لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ یعنی سات قسم کے آدمی ایسے ہیں۔
جنہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ نصیب ہوگا کہ
اُس دن اس سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔

فرمایا پہلا آدمی اِمَامٌ عَادِلٌ ہے۔ عدل و انصاف کو قائم
کرنے والا حاکم قیامت والے دن اللہ کے عرش کے سائے میں جگہ پائے
گا۔ دوسرا شخص شَابٌ نَشَاَ فِیْ عِبَادَةِ اللّٰهِ ایسا نوجوان ہے
جس نے عبادت کے ماحول میں نشو و نما پائی، یعنی جس نے اپنی جوانی
کا زمانہ عبادت میں گزارا۔ تیسرا شخص رَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ
وہ ہے کہ جس کا دل مسجد میں لٹکا رہتا ہے حَتّٰى يَعُوْدَ فِيْهِ یہاں تک
پھر مسجد میں واپس جاتا ہے۔ مسجد کے ساتھ اس قدر محبت ہے کہ ایک
نماز کے بعد جب واپس آتا ہے تو دوسری نماز کے لیے مسجد میں جانے
کا خیال جاگزیں رہتا ہے۔ فرمایا چوتھی قسم کے وہ دو آدمی ہیں رَجُلَانِ
تَحَابَّا فِی اللّٰهِ جو آپس میں محض اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں

اُن کے پیش نظر دنیا کا کوئی مقصد نہیں ہوا اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ وہ اسی محبت کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور اسی پر جُدا ہوتے ہیں

فرمایا سایہ خداوندی کا پانچواں حقدار رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا صَنَعَتْ يَمِيْنُهُ وہ آدمی ہے جو صدقہ کرتا ہے اور اس کو اس قدر مخفی رکھتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔ چھٹے آدمی کے متعلق فرمایا دَعَتْهُ ذُوْ مَنْصَبٍ وَّجَمَالٍ کہ اُسے کوئی صاحب منصب اور حسن وجمال والی عورت معصیت کی طرف دعوت دے فَقَالَ إِنِّيْ أَخَافُ اللّٰهَ مگر وہ کہے کہ مجھے تو اللہ کا ڈر ہے۔ میں اس گناہ میں ملوث نہیں ہو سکتا۔

فرمایا ساتواں خوش نصیب رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ وہ شخص ہے جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے۔ تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکلیں۔

برائی کے وقت [illegible]

برائی کے ارتکاب کا موقع ملنے پر اللہ تعالیٰ کا خوف آجانا بہت بڑی بات ہے جس کی وجہ سے انسان گناہ سے بچ جاتا ہے۔ بخاری کی حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے تین آدمیوں کا ذکر کیا، جو ایک غار میں پھنس گئے تھے اور باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے کسی نیک کام کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ انہیں اس مصیبت سے رہائی مل جائے۔ چنانچہ اُن میں سے ایک شخص نے اپنا واقعہ اس طرح بیان کیا کہ میں اپنے چچا کی بیٹی سے محبت کرتا تھا مگر وہ مجھ سے تعلق قائم کرنے پر رضامند نہ تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ شدید قحط پڑ گیا اور وہ سخت محتاج ہو گئی، اُسے بیس دینار کی ضرورت تھی اور میں اس کی مجبوری

سے اپنی دیرینہ خواہش پوری کرنی چاہتا تھا۔ اس رقم کے عوض وہ راضی ہوگئی اور میں نے وہ ادا کر دی۔ پھر جب میں برائی کے خیال سے اس کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ عورت بولی اے اللہ کے بندے لَا تَفُضَّ الْخَاتِمَ اِلَّا بِحَقِّہٖ اس مہر کو حق کے بغیر نہ توڑ۔ وہ شخص کہتا ہے کہ اس موقع پر مجھ میں واقعی خوفِ خدا پیدا ہوگیا، میں اٹھ کھڑا ہوا، برائی کا ارادہ ترک کر دیا اور ادا شدہ رقم بھی واپس نہ لی۔

دعا کی قبولیت

بہرحال اس موقع پر یوسف علیہ السلام نے جسمانی تکلیف کے بدلے معصیت کو دور کرنے کی دعا کی۔ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ اور ان عورتوں کی فریب کاری کو یوسف علیہ السلام سے پھیر دیا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس موقع پر یوسف علیہ السلام نے دعا میں دو باتیں کی تھیں یعنی قید و بند کو ترجیح اور فریب کاری سے بچاؤ۔ اس سلسلہ میں شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ایک دعا قبول فرمائی اور آپ کو عورتوں کی فریب کاری سے محفوظ رکھا، باقی رہی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا، تو وہ ان کی قسمت میں تھا۔ اسی لیے فرماتے ہیں کہ آدمی کو تکلیف سے گھبرا کر اپنے حق میں برائی نہیں مانگنی چاہیے، بلکہ ہمیشہ بھلائی طلب کرنی چاہیئے اگرچہ ہو گا وہی جو قسمت میں لکھا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ گھبرا کر اپنے لیے موت بھی مت طلب کرو۔ اور کسی موقع پر اپنے بال بچوں کے لیے بددعا بھی نہ کرو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا قید کو پسند کرنا مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ معصیت کی برائی مقصود تھی کہ گناہ میں ملوث ہونے سے قید میں پڑنا آسان ہے بہرحال اللہ نے آپ کی دعا کو قبول فرمایا اور آپ سے عورتوں کے

مکر و فریب کو دُور کر دیا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ بیشک اللہ تعالےٰ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

قید بطور مصلحت

یہ واقعات پیش آنے کے بعد عزیز مصر کے خاندان کے لوگوں نے اس سارے معاملے کا تجزیہ کیا جسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ تمام نشانیاں دیکھنے کے بعد اُن پر ظاہر ہو گیا۔ یہاں پر جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے کہ اس میں عزیز مصر اور زلیخا کے خاندان والے سبھی لوگ شامل ہیں۔ انہوں نے بہت سی نشانیاں بھی دیکھ لی تھیں، قمیص کے پیچھے سے پھٹنے اور شیر خوار بچے کی شہادت سے ان پر یوسف علیہ السلام کی عصمت واضح ہو چکی تھی، یوسف علیہ السلام کا پورا کردار اُن کے سامنے تھا اور انہیں آپ کی پاک دامنی کا یقین ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود دونوں خاندانوں نے یہ مشورہ کر کے فیصلہ کیا لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ کہ یوسف علیہ السلام کو ایک خاص مدت تک جیل میں ڈال دیا جائے۔ وہ لوگ جان چکے تھے کہ زلیخا کی محبت کے چرچے پہلے ہی ہو رہے تھے، اب دعوت والی بات نکلے گی تو مزید مشہوری ہوگی لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کو کچھ وقت کے لیے قید میں ڈال دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب آپ نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے تو عورت کا فتنہ بھی کم ہو جائے گا اور اُدھر عوام الناس میں جو باتیں ہو رہی ہیں، وہ بھی دب جائیں گی۔ ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی جانور کے ساتھ ملوث ہو جائے تو اس مجرم کے ساتھ اُس جانور کو بھی مار ڈالنا چاہیئے اگرچہ جانور بے قصور ہے مگر اسکا نظروں سے دور ہو جانا اسلیے ضروری ہے کہ اسے دیکھ کر وہ قبیح حرکت یاد نہ آئے۔ اسی اصول کے پیش نظر ان لوگوں نے یہی مناسب سمجھا کہ یوسف علیہ السلام کو نظروں سے ہٹانے کے لیے کچھ عرصہ کیلیے قید میں رکھا جائے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ
اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ
فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ
اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا
طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ
يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ
قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ
مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ
فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

ترجمہ:- اور داخل ہوئے آپ (یوسف علیہ السلام) کے
ساتھ قید خانے میں دو نوجوان۔ تو اُن میں سے ایک نے کہا
کہ میں دیکھتا ہوں خواب میں کہ میں انگور کا شراب نچوڑ رہا
ہوں۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ میں اٹھا رہا
ہوں اپنے سر پر روٹیاں اور پرندے اس سے کھا رہے ہیں
تبلاؤ ہمیں اِن کی تعبیر، بیشک ہم دیکھتے ہیں آپ کو نیکی

کرنے والوں میں سے (٣٦) کہا یوسف (علیہ السلام) نے ، نہیں آئے گا تمہارے پاس کھانا جو تمہیں دیا جاتا ہے مگر میں تمہیں بتلا دوں گا ان کی تعبیر اس کے آنے سے پہلے ۔ یہ علم وہ ہے جو مجھے سکھایا ہے میرے پروردگار نے ۔ بیشک میں نے چھوڑ دیا ہے اس قوم کی ملت کو جو ایمان نہیں رکھتے اللہ پر ۔ اور آخرت کے ساتھ وہ انکار کرنے والے ہیں (٣٧) اور میں نے پیروی کی ہے اپنے باپ دادا کی ملت کی جو ابراہیم ، اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) تھے ۔ نہیں لائق ہمارے لیے یہ بات کہ ہم شریک ٹھہرائیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو ۔ یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے اور لوگوں پر بھی ، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں ادا کرتے (٣٨)

تبدیلی رائے

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ عزیز مصر اور اُس کی بیوی کے خاندان پر یوسف علیہ السلام کی عصمت اور بلند کرداری کی بہت سی نشانیاں ظاہر ہوئیں جس کی بناء پر انہیں یقین ہو گیا کہ قمیص پھٹنے کے واقعہ میں قصور زلیخا کا ہے ، اور یوسف علیہ السلام بالکل بے گناہ ہیں ۔ اس کے باوجود انہوں نے فیصلہ کیا کہ یوسف علیہ السلام کو کچھ عرصہ کے لیے قید کر دیا جائے ۔ اس مقام پر ثُمَّ بَدَا لَهُمْ کے الفاظ آئے ہیں ۔ بدا کے دو معنی آتے ہیں ۔ یعنی ظاہر کرنا اور رائے کا بدلنا یہاں پر دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں ۔ ان پر حقیقتِ حال بھی پوری طرح ظاہر ہو گئی کہ یوسف علیہ السلام بے گناہ ہیں مگر اس کے باوجود ان کی رائے بدل گئی اور انہوں نے آپ کو جیل میں ڈالنے کا فیصلہ کیا ۔

شیعہ مسلک میں بدا ایک اہم مسئلہ ہے ۔ اُن کے ہاں اللہ تعالیٰ پر بدا کا عقیدہ رکھنا جائز ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا فیصلہ کرنے کے بعد

اللہ تعالیٰ اپنی رائے بدل لیتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لاعلمی میں کوئی فیصلہ کر بیٹھا ہے پھر جب اس پر حقیقت واضح ہو جاتی ہے تو وہ اپنی رائے بدل لیتا ہے (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ ہر چیز کو ازل سے جانتا ہے اور اسی بنا پر اس نے ہر بات کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ ہاں اگر بندوں کی مصلحت اور اپنی حکمت کی بنا پر وہ کسی فیصلے کو تبدیل کرنا چاہے تو وہ قادرِ مطلق ہے۔ اس کے حکم میں کوئی چیز مزاحمت نہیں کر سکتی۔

قید و بند کی تاریخ

بلاوجہ قید و بند کے واقعات سے تاریخ عالم بھری پڑی ہے۔ یہ نہ صرف یوسف علیہ السلام کی سنت ہے بلکہ سنتِ انبیاء ہے اکثر انبیاء کو بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ خود حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم شعب ابی طالب میں تین سال تک نظر بند رہے۔ مشرکین نے راشن اور پانی تک کی فراہمی بند کر دی اور آپ کے گھر والوں کو سخت تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں جابر حکمرانوں خاص طور پر انگریزوں کے مظالم ہمیشہ تازہ رہیں گے۔ اپنی عمل داری کے دوران جس کسی نے بھی ان کے خلاف آواز اٹھائی اُسے یا تو جیل بھیج دیا یا ملک بدر کر دیا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کو مالٹا کے دور دراز جزیرے میں قید رکھا گیا۔ آپ کے کئی شاگرد وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے خادم حکیم سید نصرت حسینؒ جب مالٹا جیل میں فوت ہوئے تو انگریزوں نے انہیں غسل دینے کی بھی اجازت نہ دی، چنانچہ حضرت مولانا نے آپ کا تیمم کرا کے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی مولانا فضل حق خیر آبادیؒ بھی مالٹا میں فوت ہوئے۔ کاکوری کے ایک آدمی نے چوبیس سال کی طویل قید کاٹی۔ یو پی کے سید ظہیر حسنؒ بیالیس سال تک جیل میں رہنے کے بعد جب رہا ہوئے تو بالکل ضعیف ہو چکے تھے۔ ہمارے قریبی زمانہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ دس سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ مولانا ظفر علی خانؒ بارہ سال تک جیل میں رہے۔ پنجاب

اور یوپی کا کوئی جیل ایسا نہیں جہاں چوہدری افضل حق نے قید نہ کاٹی ہو۔ مولانا احمد سعید صاحب پندرہ سال کا عرصہ جیل میں رہے۔ مولانا ابوالکلامؒ، اور مولانا سید حسین احمدؒ مدنی بھی گیارہ گیارہ سال تک قید رہے۔ مولانا مدنیؒ کو دو ماہ تک کھڑی بیڑیوں والی سزا دی گئی اور اس طرح آپ کو مسلسل دو ماہ تک کھڑا رکھا گیا۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو جیل میں اس قدر جسمانی تکالیف دی گئیں کہ آپ کے جسم کو جگہ جگہ سے داغ دیا گیا اور اس کے نشانات آپ کو غسل دیتے وقت ملے۔ عبدالغفار خان نے انگریز کے زمانے میں اٹھارہ سال تک قید کی تکالیف برداشت کیں، جانباز شاعر نے بارہ سال کا عرصہ جیل میں گزارا اور تیس کوڑے بھی کھائے۔ یہ اب تک زندہ ہے اور مجلس احرار کی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔ شورش کاشمیریؒ نے دس سال قید کاٹی۔ احسن عثمانیؒ فاضل دیوبند چار سال تک جیل میں رہے۔ پھر تنگ آکر بھوک ہڑتال کر دی۔ آپ کو اس قدر اذیت دی گئی کہ مقعد میں نالی ٹھونک کر زخمی کر دیا گیا اور آپ اسی زخم کے دوران فوت ہوئے۔

دو شاہی ملزمان — الغرض! یوسف علیہ السلام کو بلاوجہ قید میں ڈال دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح شہر میں ہونے والا پراپیگنڈہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا، پھر اتفاق ایسا ہوا وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو دوسرے نوجوان بھی جیل خانے میں داخل ہوئے، یہ دونوں بھی بادشاہ کے ملزم تھے، اِن میں ایک بادشاہِ وقت ریان بن ولید کا ساقی تھا۔ یہ بادشاہ پرانی عرب اقوام عاد اور ثمود کے قبطی خاندان سے تھا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ شخص یوسف علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا اور اسی کے زمانہ میں یوسف علیہ السلام کو مصر میں مکمل اقتدار حاصل ہوا۔ جب یوسف علیہ السلام کی وفات ہوئی تو اس وقت دوسرا بادشاہ تھا اور وہ مومن نہیں تھا۔ بہرحال ان ملزمان میں سے ایک بادشاہ کو شراب پلانے پر مامور تھا جب کہ دوسرا

شخص روٹی پکانے والوں کا انچارج تھا۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے بادشاہ کے کھانے میں زہر ملانے کی سازش کی تھی۔ یہ سازش کسی طرح بے نقاب ہو گئی تو بادشاہ نے مکمل تحقیق ہونے تک انہیں جیل میں بند کر دیا۔ تاہم تالمود کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زہر ملانے والا بڑا الزام نہیں تھا بلکہ ان کی کوئی معمولی سی لغزش تھی جس کی بنا پر اس جابر بادشاہ نے انہیں قید کر دیا۔ یہودی روایت کے مطابق ساقی کا جرم یہ تھا کہ اس کی پیش کردہ شراب سے مکھی برآمد ہوئی تھی اور روٹیاں پکانے والے انچارج کا قصور یہ تھا کہ اس کی نگرانی میں پکائی گئی روٹی میں کرکراہٹ محسوس کی گئی تھی۔

قیدیوں کے خواب

اِن دو قیدیوں نے جیل میں قیام کے دوران علیحدہ علیحدہ خواب دیکھے، جن کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے۔ یہ چاہتے تھے کہ کسی صاحبِ علم شخص سے اِن خوابوں کی تعبیر معلوم کریں۔ سارے قیدی آپس میں ملتے جلتے تھے۔ کم از کم دِن کے وقت تو سب ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوں گے خواہ رات کو کوٹھڑیوں میں بند کر دیے جاتے ہوں۔ عام دستور یہی ہے کہ ایک ایک کمرے میں کئی کئی قیدی رکھے جاتے ہیں اور سوائے سخت خطرناک قیدیوں کے جنہیں قیدِ تنہائی میں رکھا جاتا ہے۔ باقی سب آپس میں بات چیت بھی کر سکتے ہیں۔ یہ دو قیدی کسی نیک اور صالح آدمی کی تلاش میں تھے جو انہیں خواب کی تعبیر بتا سکے۔ چنانچہ تمام قیدیوں میں سے ان کی نظرِ انتخاب یوسف علیہ السلام پر پڑی کیونکہ سب قیدی آپ کی عبادت گزاری، تقویٰ، راست گوئی، اعلیٰ اخلاق اور جذبۂ خدمت سے متاثر ہو چکے تھے چنانچہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے اپنے خواب اس طرح بیان کیے۔ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ان دو میں سے ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب

نچوڑ رہا ہوں ——— شراب نچوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پکے ہوئے انگوروں سے شیرہ نکال رہا تھا جس سے پھر شراب بنائی جاتی ہے اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ شراب نچوڑنے کا مطلب انگور نچوڑنا ہے۔ بعض یہ بھی فرماتے ہیں کہ عربی محاورہ میں خمر کا لفظ انگور پر بھی بولا جاتا ہے کیونکہ شراب کشید کرنے کے لیے انگور کو خام مال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ انگور کو کرم مت کہو کیونکہ کرم تو مومن کا دل ہے جس میں نورِ ایمان توحید اور فیاضی ہوتی ہے۔ عرب لوگ انگور کو اس لیے کرم کہتے تھے کہ اُن کے نزدیک شراب پینے والا سخی ہوتا تھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا یہ غلط تصور ہے لہٰذا انگور کو عنب کا نام دیا کرو، کرم مت کہو۔ بہرحال خمر کا معنی یہ ہے۔ مَا خَمَرَ الْعَقْلَ جو انسان کی عقل میں خلط ملط پیدا کر دے۔ شراب ہمارے دین میں قطعی حرام ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے وَالْخَمْرُ جِمَاعُ الْاِثْمِ شراب گناہوں کی جامع ہے جب انسان شراب کے نشے میں ہوتا ہے تو پھر بدزبانی بھی کرتا ہے۔ لڑائی اور دنگا فساد کا مرتکب ہوتا ہے اور بدکاری جیسے قبیح فعل میں بھی ملوث ہو جاتا ہے۔ شراب کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے آدمی چوری کرے گا۔ ملاوٹ کا مرتکب ہوگا، رشوت لیگا۔ اور دیگر حرام ذرائع سے روپیہ کمانے کی کوشش کرے گا۔ پھر اِن چیزوں کی وجہ سے عبادت سے بھی غافل ہو جائے گا، اسی لیے شراب کو ام الخبائث یعنی تمام برائیوں کی جڑ کہا گیا ہے۔ شراب نوشی واجب التعزیر ہے، اس کا بنانا اور بیچنا بھی ممنوع ہے۔ حضور علیہ السلام نے فتح مکہ والے سال عام اعلان کروا دیا تھا۔ اِنَّ الَّذِیْ حَرَّمَ شُرْبَھَا حَرَّمَ بَیْعَھَا جس ذات نے شراب پینے کو حرام قرار دیا ہے اُس نے اس کی تجارت بھی حرام

کردی ہے۔

بہر حال ایک قیدی نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ میں انگور سے شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے اپنا خواب اس طرح بیان کیا وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا کہ میرے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ اور اس میں پرندے نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام سے کہنے لگے نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ آپ ہمیں ان خوابوں کی تعبیر بتائیں اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ بےشک ہم آپ کو نیکوکاروں میں سمجھتے ہیں ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ پاکیزہ اطوار، نیک چلن، خوش اخلاق اور عبادت گزار آدمی ہیں، لہٰذا آپ ہمیں خوابوں کی تعبیر بتائیں۔

تعبیر خواب

یہاں پر تاویل سے مراد تعبیر ہے۔ ان قیدیوں کا اندازہ صحیح تھا اور انہوں نے تعبیر خواب کے لیے صحیح آدمی کا انتخاب کیا تھا۔ اس سورۃ کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گزر چکا ہے " وَیُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ" اور تیرا پروردگار تجھے باتوں کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ سکھلائے گا۔ اس میں خواب کی تعبیر بھی شامل ہے اور اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو یہ علم بطور خاص عطا فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر آدمی تو خواب کی تعبیر نہیں بتا سکتا۔ یہ تو وہی بتا سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس معاملہ میں ملکہ حاصل ہو اور یہ چیز یوسف علیہ السلام کو حاصل تھی ویسے بھی ہر آدمی کے سامنے خواب بیان کرنے کا حکم نہیں ہے لا تحدث الا حبیبا او لبیبا یعنی خواب کسی محب یا دانا آدمی کے سوا کسی اور سے ذکر نہ کرو، ورنہ غلط تعبیر کی وجہ سے تمہاری پریشانی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

جب ان قیدیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے اپنے اپنے خواب

بیان کیے تو آپ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ جو کھانا تمہیں دیا جاتا ہے، وہ تمہارے پاس ابھی نہیں پہنچے گا إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا کہ اس سے پہلے میں تم دونوں کو تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ قیدیوں کے پوچھنے پر یوسف علیہ السلام نے فوراً تعبیر نہیں بتلا دی بلکہ اس کے لیے کچھ وقفہ چاہا۔ یہاں پر اس بات کی تو وضاحت نہیں ہے کہ قیدیوں کے خواب بیان کرنے اور ان کے پاس کھانا آنے میں کتنا وقت تھا۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے یا تین گھنٹے جتنا بھی وقت تھا، یوسف علیہ السلام نے کہا کہ کھانا آنے سے پہلے پہلے میں تعبیر بتا دوں گا، کیونکہ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي تعبیر خواب وہ علم ہے جو اللہ نے مجھے خصوصی طور پر سکھایا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے یہ وقفہ اس لیے حاصل کیا تھا تاکہ اس دوران میں وہ اپنی حیثیت ان لوگوں پر واضح کر سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کمال علم سے نوازا ہے اور وہ فلاں معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تاکہ وہ لوگ آپ کی بات کو اچھے طریقے سے قبول کر سکیں پھر آپ اپنے پاکیزہ عقیدے کا اظہار کر کے فریضہ تبلیغ بھی ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس قسم کا تعارف ہر نبی نے کرایا۔ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ، لوگو! میں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا تھا يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ترجمہ، اے میرے ابا! میرے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا علم آ چکا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا لہٰذا میرا اتباع کرو، میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں۔ بہرحال یوسف علیہ السلام کو تبلیغ دین

کا ایک موقع میسر آچکا تھا جسے وہ نہایت حکیمانہ اور پر مؤثر طریقے سے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

فریضہ تبلیغ

اس وقت دنیا بھر کے مسلمان فریضہ تبلیغ کو فراموش کر چکے ہیں جس طرح یوسف علیہ السلام نے موقع ملتے ہی تبلیغ دین کے کام کو اولیت دی، اس طرح ہر مسلمان پر فرض عاید ہوتا ہے کہ آسے جب بھی چانس ملے فریضہ تبلیغ کو بطریق احسن انجام دے۔ ہمارے وزراء اور امراء بیرونی ممالک کے دوروں پہ جاتے ہیں۔ تاجر حضرات اپنے کاروبار کے سلسلے میں دیار غیر کے چکر لگاتے ہیں مگر تبلیغ کے فریضہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والے اندرون ملک اور بیرون ملک تبلیغ کا جو کام کرتے ہیں، وہ کافی ہے حالانکہ وہ تو اصل ضرورت کا ایک فیصدی بھی نہیں اور پھر ان میں اہل علم لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو بیرون ملک غیر مسلموں کو اسلام کی برکات سے متعارف کرا سکیں۔ اس لیے ہر صاحب علم و ثروت کیلیے ضروری ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام کے سامنے دین اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرے اور انہیں اسلام کی دعوت دے۔ مگر اس کے لیے پہلے خود نمونہ بھی بننا ہوگا۔ جو شخص خود ہوٹل یا کلب میں بیٹھ کر شراب نوشی کرتا ہے، وہ دوسروں کو اسلام کی کیا تبلیغ کرے گا۔ جو خود عریانی اور فحاشی کا دلدادہ ہوگا وہ دوسروں کو اسلامی نظام معاشرت کا کیا درس دیگا۔

اتباع ملت ابراہیمی

بہر حال یوسف علیہ السلام نے یہ موقع غنیمت جانا۔ پہلے ان قیدیوں سے علم کی بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تعبیر خواب کا علم عطا فرمایا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے عقیدے کا اظہار اس طرح کیا۔

اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّۃَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ میں نے اس

قوم کی ملت کو چھوڑ دیا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ اور وہ قیامت کا انکار کرنے والے ہیں فرمایا میں نے ایسے لوگوں کے دین کو ترک کر دیا ہے۔ اس زمانے میں مصر میں یہ دونوں بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ وہ لوگ نہ تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے تھے اور نہ ہی قیامت کے محاسبہ اعمال پر اُن کو یقین تھا۔ اس لیے یوسف علیہ السلام نے سب سے پہلے اصلاح عقیدہ کی طرف توجہ دی اور اُن کے غلط عقائد کی نشاندہی کرتے ہوئے ان سے اظہار بیزاری کر دیا۔

بعض لوگوں نے اس آیت میں آمدہ لفظ تَرَكْتُ پر اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تَرَكْتُ کا مطلب تو یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پہلے غلط عقائد میں ملوث تھے اور پھر انہوں نے چھوڑ دیا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ پہلے کوئی شخص شراب پیتا تھا، پھر اُس نے شراب پینا ترک کر دیا۔ یا کوئی رشوت لیتا تھا، سود کھاتا تھا یا کسی اور برائی میں ملوث تھا اور پھر اُسے چھوڑ دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کبھی بھی انکار توحید یا انکارِ معاد میں مبتلا نہیں ہوئے۔ آپ اللہ کے برگزیدہ نبی اور اس کی حفاظت میں تھے۔ لہٰذا آپ کا کسی بھی وقت غلط اعتقاد میں ملوث ہونا بعید از قیاس ہے۔ تو اس سلسلے میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر "ترک" کا معنی یہ ہے کہ میں ان باطل عقائد سے ہمیشہ کنارہ کش رہا ہوں اور میں نے ان سے اجتناب کیا ہے۔ امام محمد ابن ابوبکر عبدالقادر رازیؒ فرماتے ہیں کہ "ترک" دو قسم کا ہوتا ہے ایک ترک یہ ہے کہ کوئی شخص پہلے چیز میں ملوث ہو اور پھر اسے ترک کر دے اور دوسرا ترک ترکِ اعراض کہلاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ سے کسی کام سے معرض رہا ہے اور کبھی بھی اس میں

داخل نہیں ہوا۔ اس قسم کے ترک کی مثالیں قرآن پاک میں دوسرے مقامات پر موجود ہیں۔ سورۃ اعراف میں آتا ہے کہ فرعون کے حواریوں نے اس سے کہا کہ تم نے موسیٰ علیہ السلام کو کھلی چھٹی دیدی ہے کہ وہ زمین میں فساد کا بازار گرم کریں "وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ" اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ یہاں پر بھی ترک معنی اعراض ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے کبھی بھی فرعون یا اس کے معبودوں کے لیے نرم گوشہ اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح شعیب علیہ السلام کی قوم کے متکبرین نے آپ سے کہا تھا کہ ہم نہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے "اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا" اور اگر یہاں رہنا چاہتے ہو تو ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔ یہاں بھی واپس آنے سے یہ مراد نہیں کہ شعیب علیہ السلام پہلے انہی کے دین پر تھے پھر انہوں نے دین حق قبول کر لیا اور ان کی قوم انہیں پہلے دین پر واپس لانا چاہتی تھی۔ یہاں پر عود کا معنی اعراض ہی ہے یعنی آپ کبھی بھی باطل عقائد میں ملوث نہیں رہے۔

اس کے بعد یوسف علیہ السلام نے اپنا عقیدہ قیدیوں کے سامنے اس طرح بیان کیا "وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ" میں نے تو اپنے آباؤ اجداد ابراہیم اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کی ملت کا اتباع کیا ہے جو کہ دین حق پر تھے۔ یہاں پر بھی یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے مختلف مقامات پر آباؤ اجداد کی تقلید سے منع فرمایا ہے جب کہ یہاں پر یوسف علیہ السلام اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کو ہی راہ حق سے تعبیر کر رہے ہیں تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جس اتباع سے قرآن نے منع کیا ہے، وہ دوسری نوعیت کا ہے جیسے سورۃ بقرہ میں ہے "وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا"

اَوَلَوْكَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ
جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قرآن کی اتباع کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ واجداد کو پایا، اگرچہ ان کے آباؤ اجداد نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہی راہ ہدایت پر ہوں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بے عقل، بے علم اور غیر ہدایت یافتہ آباؤ اجداد کی اتباع سے منع فرمایا ہے، جبکہ اہل علم لوراست باز آباؤ اجداد کا اتباع تو قابل فخر بات ہے اور یہی چیز یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھی قیدیوں کے سامنے بیان کی۔

عقیدہ توحید پر استقامت

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ہمارے سے یہ بات ہرگز لائق نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں۔ اللہ کے علاوہ کسی فرشتہ، جن یا انسان یا پتھر اور شجر کو خدا کا شریک بنانا نہایت قبیح بات ہے۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے میں کمال ہے۔ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ یہ پاک عقیدہ ہم پر اور دوسرے ایمانداروں پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ مگر افسوس کی بات ہے کہ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی اس بے پایاں نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے جب کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو ایمان اور توحید کا اقرار کرتے ہیں اور جونہی آسائش حاصل ہوتی ہے تو پھر شرک اور بدعت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر رسومات باطلہ کا شکار ہو کر اللہ کی توحید کو فراموش کر دیتے ہیں ایسے لوگ اللہ کے ناشکر گزار ہیں۔

یہاں تک یوسف علیہ السلام نے تمہید کے طور پر اپنی حیثیت اور اپنے عقیدے کا ذکر کیا ہے۔ اب اگلی آیات میں آپ نے

قیدیوں کو باقاعدہ دعوتِ توحید دی ہے اور اس کو مدلل طریقے سے
اُن کے سامنے پیش کیا ہے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ
الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ
الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ
الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾ يٰصَاحِبَيِ
السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا
الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ
الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾ وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ
اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ
ع الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

ترجمہ :- (یوسف نے کہا) اے میرے قید خانے کے دو رفیقو! کیا بہت سے جدا جدا معبود بہتر ہیں یا اللہ جو اکیلا اور زبردست ہے (۳۹) تم نہیں عبادت کرتے اُس کے سوا مگر نام ہیں جو تم نے رکھ لیے ہیں اور تمہارے آباؤ اجداد نے ۔ نہیں اتاری اللہ نے اِس کے بارے میں کوئی دلیل ۔ نہیں ہے حکم مگر اللہ کے لیے ۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ نہ عبادت کرو ، اُس کے سوا کسی کی ، یہی ہے مضبوط دین ،

مگر اکثر لوگ نہیں جانتے (۴۰) اے میرے قیدخانے کے دو
ساتھیو ! تم میں سے ایک ، پس وہ پلائے گا اپنے مالک کو
شراب اور دوسرا کو سولی پر لٹکایا جائے گا اور کھائیں گے
پرندے اس کے سر سے ۔ فیصلہ کیا گیا ہے اُس بات کا
جس میں وہ دونوں پوچھ رہے تھے (۴۱) اور کہا (یوسف نے)
اس شخص کے لیے جس کے بارے میں ان کو یقین تھا کہ وہ
نجات پانے والا ہے دونوں میں سے کہ میرا ذکر کرنا اپنے
مالک کے پاس ، پس بھلا دیا اُس کو شیطان نے اس کے
مالک کے پاس ذکر کرنے سے ۔ پس ٹھہرے رہے یُوسف
علیہ السلام قیدخانے میں کئی سال تک (۴۲)

ربط آیات

گزشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ یُوسف علیہ السلام کے ساتھ دو دوسرے قیدی بھی تھے جن میں سے ایک نانبائیوں کا انچارج اور دوسرا شراب پلانے والا تھا۔ یہ قیدی یُوسف علیہ السلام کے ساتھ آپ کے حسن سلوک ، زہد اور تقویٰ کی بنا پر مانوس ہو گئے اور پھر انہوں نے آپ سے اپنے اپنے خواب کی تعبیر بھی پوچھی ۔ بعض فرماتے ہیں کہ مذکورہ قیدیوں کو خواب نہیں آیا تھا بلکہ وہ خواب کی تعبیر کی آڑ میں یُوسف علیہ السلام کا امتحان لینا چاہتے تھے ، تاہم راجح بات یہی ہے کہ انہوں نے خواب دیکھا تھا ۔ البتہ بائبل کی روایت ہے کہ قیدخانے کا افسر بھی یُوسف علیہ السلام سے مانوس ہو گیا تھا ، وہ آپ پر اعتماد کرتا تھا اور اس نے جیل کا سارا نظام یُوسف علیہ السلام کے سپرد کر رکھا تھا ۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب ان دو قیدیوں نے یُوسف علیہ السلام سے اظہار محبت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو کیونکہ جب بھی مجھ سے محبت کی گئی ، مجھ پر ابتلا ہی آئی ۔ فرمایا بچپن میں میری پھوپھی نے مجھ سے محبت کی تو اس وقت بھی

ہیں آزمائش میں پڑ گیا تھا۔ پھر میرے والد نے مجھ سے محبت کی تو کنوئیں میں گرا دیا گیا۔ اس کے بعد عزیز مصر نے محبت کا اظہار کیا تو اس کے نتیجے میں آج جیل میں پڑا ہوں، لہٰذا تم مجھ سے محبت کا اظہار نہ کرو مبادا میں کسی دوسری آزمائش میں مبتلا ہو جاؤں۔ بشار ابن برد نے کہا ہے ؎

هَلْ تَعْلَمِيْنَ وَرَاءَ الْحُبِّ مَنْزِلَةً
تُدْنِيْ اِلَيْكِ فَاِنَّ الْحُبَّ اَقْصَانِيْ

محبت کے علاوہ کوئی اور بات بتاؤ جو تمہارے قریب کر دے کیونکہ محبت نے تو مجھے پہلے ہی دور پھینک دیا ہے۔

بہرحال یوسف علیہ السلام نے موقع کو غنیمت جانا اور خواب کی تعبیر بیان کرنے سے پہلے قیدیوں سے اپنا تعارف کرایا، خاندانی تکریم کا ذکر کیا، اپنے عقیدے اور دین کا اظہار فرمایا اور ساتھ یہ تسلی بھی دی کہ کھانا آنے سے پہلے پہلے تمہارے خوابوں کی تعبیر بھی بتا دوں گا، تاہم اس سے پہلے مجھ سے بڑی اہم بات بھی سن لو جس کا تعلق عقیدہ توحید کے ساتھ ہے چنانچہ آج کے درس میں یوسف علیہ السلام کی طرف سے عقیدہ توحید کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد دونوں قیدیوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بھی بیان کر دی گئی ہے۔

واحد معبود برحق — یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھی قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اے میرے قید خانہ کے دو ساتھیو! بھلا یہ تو بتلاؤ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ کیا جدا جدا معبود بہتر ہیں اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ یا اللہ بہتر ہے جو اکیلا ہے اور قہار ہے، گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ مصر کے لوگ ایک تو اللہ کی وحدانیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور دوسرے معاد کا انکار کرتے تھے، انہوں نے مختلف کاموں کے لیے مختلف معبود بنا رکھے تھے کیونکہ مشرک کا دل کسی

ایک جگہ پر نہیں ٹکتا، وہ کبھی کسی کے پاس جاتا ہے اور کبھی کسی کی طرف دیکھتا ہے۔ مشرک لوگ بہت سے حاجت روا اور مشکل کشا بنا لیتے ہیں اور پھر خود ہی تصور کر لیتے ہیں کہ بیماری سے شفایابی کے لیے فلاں قبر پر جانا چاہیئے اور مقدمہ سے بری کرانے کے لیے فلاں آستانہ مجرب ہے اولاد حاصل کرنا ہو تو فلاں کی نیاز دینا ہو گی اور کاروبار میں ترقی کے لیے اُس قبر کا طواف ضروری ہے۔ غرضیکہ جتنے کام اور جتنی ضروریات ہیں سب کے لیے الگ الگ حاجت روا اور مشکل کشا مقرر کر لیتے ہیں حضرت شعیب اور ہود علیہما السلام کی قوموں میں بھی یہی بیماری تھی انہوں نے بھی ہر ہر کام کے لیے جدا جدا معبود بنا رکھے تھے۔ اللہ نے سارے نبیوں نے لوگوں کو اللہ کی وحدانیت کی دعوت دی۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام بھی قیدیوں کو بتانا چاہتے تھے کہ تم نے جو الگ الگ معبود بنا رکھے ہیں اِن میں سے کسی کو بھی کوئی اختیار حاصل نہیں۔ نہ تو وہ کسی کے حالات کو جانتے ہیں اور نہ انہیں قدرت حاصل ہے کہ تمہارے کام بنا سکیں۔ ذرا عقل سے کام لے کر بتاؤ کہ یہ الگ الگ معبود بہتر ہیں یا وہ اکیلا ہی بہتر ہے جو ہر چیز پر غالب ہے۔ قہار کا معنیٰ غالب یعنی جس کا کنٹرول ہر چیز پر ہے " هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ " (الانعام) وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ وہ خالق اور مالک ہے، وہ زبردست ہے۔ اس کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ وہ سب پر غالب ہے ——

—— اور اس پر کوئی غالب نہیں " لِلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا " معاملات سارے کے سارے اُس کے حکم کے تابع ہیں۔ " لِلّٰهِ الْقُوَّةُ جَمِیْعًا " ساری طاقت اور اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اسی لیے یوسف علیہ السلام نے کہا کہ یہ چھوٹے چھوٹے متفرق معبود اچھے ہیں یا اللہ واحد جو سب پر غالب ہے۔

خود ساختہ نام

یوسف علیہ السلام نے شرک کے متعلق فرمایا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَا تم نہیں عبادت کرتے اس کے سوا مگر چند نام ہیں جو تم نے رکھ لیے ہیں مطلب یہ کہ اللہ کے سوا تم نے مختلف ناموں پر معبود بنا رکھے ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ تم نے بتوں، استھانوں اور قبروں کو خود ہی بعض نام دے کر ان کے ذمے کام لگا رکھے ہیں کہ یہ فلاں کام کرتا ہے اور وہ فلاں حاجت برآری کرتا ہے، حالانکہ حقیقت کچھ بھی نہیں، بس نام ہی نام ہیں جو تم نے خود ہی ان معبودوں کو دے رکھے ہیں۔ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ اور بعض کو تمہارے آباؤ اجداد نے بعض ناموں سے موسوم کر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اللہ تعالیٰ نے تو ان باطل معبودان کے حق میں کوئی سند یا دلیل نہیں اتاری۔ اللہ تعالیٰ نے تو نہیں کہا کہ فلاں کی عبادت کرو یا فلاں سے حاجتیں طلب کرو بلکہ یہ تو تمہارے خود ساختہ نام ہیں جو تم نے ان معبودوں کو دے رکھے ہیں اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ حکم اور اختیار تو سارا اللہ ہی کا ہے۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنا عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ تمام صاحب عقل و دانش اور حکمائے ربانی کی تعلیم کے بھی خلاف ہے۔ اللہ نے تو ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری بلکہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ بلکہ اس کا فرمان تو یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو کیونکہ اس کے سوا عبادت کے کوئی لائق نہیں اللہ کے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں کسی کے بارے میں یہ عقیدہ مت رکھو کہ وہ مافوق الاسباب مشکل کشائی کر سکتا ہے۔ ہر قسم کی تعظیم رکوع، سجود اور دست بستہ قیام صرف اللہ ہی کے لیے روا ہے فرمایا ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ یہی مضبوط دین ہے جس کے اصول و ضوابط پکے، نیز عقل اور فطرت کے مطابق ہیں یہی سراط مستقیم ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ مگر اکثر لوگ بے علم ہیں۔ وہ سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے اور پھر تعصب کا شکار ہو کر راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں یا جہالت کا شکار ہو کر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں بہرحال یوسف علیہ السلام نے نہایت اختصار کے ساتھ عقیدۂ توحید کی وضاحت کی اور شرک کی مذمت بیان فرمائی۔

تبلیغ کی ضرورت

کفر و شرک کی بیماری قدیم زمانے سے لے کر آج تک دنیا میں موجود ہے انسانی آبادی کا بیشتر حصہ اسی بیماری میں آج بھی ملوث ہے گزشتہ سورۃ کا خاص موضوع بھی یہی تھا اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ حضرت نوح، ہود، صالح، ابراہیم اور لوط علیہم السلام سب نے اپنی اپنی اقوام کو توحید کی دعوت دی اور شرک سے منع کیا۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اپنی توجہ اسی نقطہ پر مرکوز رکھی کہ لوگو! شرک سے بچ جاؤ، یہ قبیح بیماری ہے۔

جیسا کہ میں نے گزشتہ درس میں بھی عرض کیا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی طرف سے قیدخانے میں تبلیغ ہمارے لیے بھی بطور نمونہ ہے۔ ہر صاحب فہم مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جہاں بھی موقع پائے نہایت حکیمانہ طریقے سے توحید کی دعوت دے۔ یہ دین کی بنیاد ہے اور اس سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ اس برصغیر میں اسلام کی شمع اسی تبلیغ کے نتیجے میں روشن ہوئی۔ پہلے زمانے کے بزرگ تجارت کے لیے جزائر شرق الہند پہنچے اور جاوا سماٹرا وغیرہ میں حق تبلیغ ادا کیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ بمبئی اور مدراس وغیرہ میں عرب تاجر اپنے ساتھ اسلام کی روشنی لائے۔ انہوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ حق تبلیغ بھی ادا کیا۔ پہلی صدی کے مسلمان دنیا کے جس خطے میں بھی گئے انہوں نے تبلیغ دین کو اولیت دی۔ یہ انہی کی کاوش ہے

کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے کونے کونے میں اسلام کی روشنی نظر آرہی ہے۔

آج کی دنیا میں مسلمانوں کی باون ریاستیں موجود ہیں مگر تبلیغ دین کا کام صفر کے برابر ہے۔ ہر ملک میں کھیل تماشے کی وزارتیں موجود ہیں مگر تبلیغ دین کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں۔ ان کے پاس وسائل موجود ہیں مگر استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ دراصل مسلمان بڑی طاقتوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں، خود عقل کو بروئے کار لانے کی بجائے اپنی ہر ضرورت کے لیے اغیار کی طرف دیکھنے کے عادی بن چکے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے فرائض سے غافل ہو چکے ہیں۔ دنیا پرستی میں پڑ کر آخرت کو بھول چکے ہیں اور ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔

خواب کی تعبیر

الغرض! یوسف علیہ السلام نے حق تبلیغ ادا کرنے کے بعد اپنے قیدی ساتھیوں کو حسب وعدہ خواب کی تعبیر بھی بتائی فرمایا یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ اے میرے قیدی ساتھیو! آپ نے خطاب کرتے وقت کسی کا نام نہیں لیا بلکہ طرز کلام ایسا اختیار کیا کہ جس سے کسی کے ذہن میں تکدر بھی پیدا نہ ہو اور حقیقت کا اظہار بھی ہو جائے۔ فرمایا اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسۡقِىۡ رَبَّهٗ خَمۡرًا ۚ خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم دونوں میں سے ایک آدمی اپنے مالک کو شراب پلائے گا۔ یعنی وہ بری ہو کر اپنی ڈیوٹی پر بحال ہو جائے گا۔ وَاَمَّا الۡاٰخَرُ فَيُصۡلَبُ فَتَاۡكُلُ الطَّيۡرُ مِنۡ رَّاۡسِهٖ ؕ اور دوسرے شخص کو جرم ثابت ہونے پر سولی پر لٹکا دیا جائے گا اور پرندے اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ چنانچہ اس تعبیر کے بیان کرنے کے تین دن بعد ایسا ہی ہوا ساقی بحال ہو گیا اور نانبائیوں کے انچارج کو سولی پر لٹکانے کا حکم ہوا۔ اس زمانے میں رواج تھا کہ سولی پر لٹکا کر لاش کو چند دن کے لیے لٹکا چھوڑ دیتے تھے تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت حاصل ہو۔ اس دوران جانور وغیرہ

لاش کو نوچنا شروع کر دیتے تھے۔ چنانچہ خواب کی تعبیر بالکل وہی نکلی جو یوسف علیہ السلام نے بتائی تھی، پرندوں نے اُس شخص کے سر کو نوچ نوچ کھایا اور دوسرا شخص بادشاہ کو شراب پلانے پر دوبارہ مامور ہو گیا۔ فرمایا۔ فَقُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ اُس بات کا فیصلہ کر دیا گیا جس کے متعلق وہ دونوں قیدی استفسار کر رہے تھے اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ایسا ہی ہونا تھا۔

یوسف علیہ السلام کی لغزش

آگے اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی ایک لغزش کا ذکر کیا ہے جو اس موقع پر اُن سے سرزد ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا جس شخص کے متعلق یوسف علیہ السلام نے یقین کیا تھا کہ وہ بچ جائے گا، اس سے یہ بات کی۔ لفظ ظن ذومعنی ہے۔ اس میں گمان اور یقین دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ اس مقام پر یقین والا معنی زیادہ موزوں ہے، یعنی جس شخص کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ یہ بری ہو جائے گا، اس سے کہا اُذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ واپس جا کر اپنے مالک یعنی شاہِ مصر کے سامنے میرا ذکر کرنا، یعنی اُس کو سفارش کے طور پر کہنا کہ تم نے ایک بے گناہ شخص کو قید میں ڈال رکھا ہے، اس کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ مگر ہوا یہ کہ جب اُن دو قیدیوں میں سے ایک یعنی ساقی بری ہو کر دربارِ شاہی میں واپس پہنچا فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ تو شیطان نے اسے اپنے مالک کے پاس یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا فراموش کرا دیا۔ یوسف علیہ السلام کی بات اس کے ذہن سے ہی نکل گئی۔ نہ اُس نے بادشاہ کے سامنے ذکر کیا اور نہ یوسف علیہ السلام کا معاملہ زیرِ غور آیا۔ لہٰذا فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ آپ سالہا سال تک جیل میں پڑے رہے اِس کی تفسیر میں مفسرین نے بہت سی باتیں کی ہیں۔ مثلاً بعض

فرماتے ہیں کہ اس حصہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نے یوسف علیہ السلام کو اپنے پروردگار کی طرف دھیان کرنے سے بھلا دیا۔ انہیں قید سے رہائی کے لیے رب العزت کی طرف نگاہ کرنی چاہیئے تھی مگر آپ نے ایک ساتھی قیدی کی سفارش کا سہارا تلاش کیا۔ یہی لغزش تھی۔ خدا تعالیٰ ہی ہے جس نے یوسف علیہ السلام کی محبت آپ کے باپ کے دل میں ڈالی۔ پھر اسی خداوند کریم نے آپ کو کنوئیں سے نجات دی۔ پھر عزیز مصر کے دل میں آپ کی محبت پیدا کی اور آپ کو برائی کے ارتکاب سے بچایا۔ شیطان نے اس پروردگار کی طرف سے یوسف علیہ السلام کو غفلت میں ڈال دیا، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا معاملہ پیش کرنے کی بجائے اس قیدی پر انحصار کیا۔

شیطان کی طرف سے فراموش کرا دینے کا تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی آتا ہے۔ جب آپ اپنے خادم کے ہمراہ جا رہے تھے اور آپ نے اس سے کھانا طلب کیا تو وہ کہنے لگا کہ جب ہم نے پتھر کے قریب آرام کیا تھا تو میں مچھلی وہیں بھول گیا "وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَهٗ (الکہف)" اور مجھے اس کا آپ سے ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔ شیطان ایسی باتوں پر خوش ہوتا ہے اور وسوسہ اندازی بھی کرتا ہے، اسی لیے اس قسم کے واقعات شیطان کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اگر نماز کی حالت میں عورت کو حیض آ جائے یا کسی نمازی کی نکسیر پھوٹ پڑے تو شیطان بڑا خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا اس کی نماز میں خلل واقع ہو گیا۔ بہرحال یوسف علیہ السلام کو اس لغزش پر تنبیہ ہوئی تو آپ رونے لگے مگر اس لغزش کے نتیجے میں

آپ کی ابتلا کا عرصہ بڑھ گیا اور آپ کو سات سال جیل میں بند رہنا پڑا۔

دنیا دارا سباب میں اعانت

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بوقت ضرورت عالم اسباب میں دوسروں سے مدد لینا بالکل جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدۃ) یعنی نیکی اور تقوے کی بات میں اعانت کیا کرو۔ کوئی مظلوم پھنسا ہوا ہے اور کسی کی سفارش طلب کرتا ہے تو ایسا کرنا درست ہے مگر انبیاء علیہم السلام کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔ اس لیے اتنی معمولی لغزش بھی یوسف علیہ السلام کے شایان شان نہ تھی، اور اس کے نتیجے میں آپ کئی برس تک جیل میں رہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے ہی آپ کی خلاصی ہو جاتی۔ بہرحال آپ نے اس لغزش کا احساس ہونے پر اپنے پروردگار کے سامنے عرض کیا کہ مصائب کے آنے کی وجہ سے میرا ذہن فوری طور پر ادھر متوجہ نہ ہو سکا۔ غرضیکہ مفسرین نے یہاں یہ دونوں معنی بیان کیے ہیں کہ شیطان نے اس قیدی کو فراموش کرا دیا کہ وہ یوسف علیہ السلام کا ذکر بادشاہ کے پاس کرتا یا یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتے۔

بعض مفسرین یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ ابتلاء تو یوسف علیہ السلام کی اپنی دعا کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے آئی تھی۔ پیچھے گزر چکا ہے آپ نے کہا تھا رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ "پروردگار! یہ عورتیں جس مقصد کی طرف مجھے بلاتی ہیں اس سے تو یہ قید خانہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی، آپ کو برائی سے بچا لیا اور جیل میں ڈلوا دیا۔ یوسف علیہ السلام بڑے صابر و شاکر تھے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔ تو یہ مفسرین فرماتے ہیں کہ قید کی طوالت کسی لغزش کے نتیجہ میں نہیں ہوئی تھی، بلکہ یہ خود آپ کا انتخاب تھا۔

شاہی دربار میں تبلیغ

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ سے مراد ذکر یا سفارش نہیں بلکہ اس سے تبلیغِ دین مراد ہے اور یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھی قیدی سے یہ کہا تھا کہ بادشاہ کے پاس پہنچ کر تُو سے اسی بات کی تبلیغ کرنا جو میں نے تمہیں سمجھائی ہے "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ" اس کی بات دربارِ شاہی میں کرنا کہ ایک قیدی اسی طرح کہتا ہے کہ حکومت صرف اللہ کی ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ مطلب یہ کہ یوسف علیہ السلام کو اس قیدی کو تبلیغِ دین کا ذریعہ بنانا چاہا تھا مگر وہاں پہنچ کر یہ بات اس کے ذہن سے ایسی نکلی کہ اس نے یوسف علیہ السلام کا ذکر تک نہ کیا۔

باقی رہی یہ بات کہ یوسف علیہ السلام کتنا عرصہ قید میں رہے۔ حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ آپ نے چودہ سال کا عرصہ جیل میں گزارا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے بارہ سال کی روایت منقول ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں پانچ، سات، نو اور بارہ سال کی روایات بھی ملتی ہیں۔ عام طور پر مفسرین نو یا بارہ سال کا ذکر کرتے ہیں مگر شاہ صاحبؒ کے نزدیک راجح بات سات سال کی ہے۔ ویسے عربی زبان میں بضع کا لفظ تین سے نو تک کے عدد پر ہوتا ہے، تو اس لحاظ سے بھی سات سال کا عرصہ قرینِ قیاس ہے، واللہ اعلم۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ
سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ
يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا
تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ
بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ﴿٤٤﴾ وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا
وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٤٥﴾
يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ
سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ
خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا
حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا
تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ
يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾
ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ
ع ۶ ۱۶ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٤٩﴾ ع

ترجمہ :- اور کہا بادشاہ نے : بیشک میں دیکھتا ہوں خواب

میں سات گائیں موٹی تازی، کھاتی ہیں اُن کو سات دبلی پتلی گائیں
اور سات خوشے سرسبز اور دوسرے خشک۔ اے دربار والو! بتلاؤ
مجھے میرے خواب میں، اگر تم خواب کی تعبیر کرتے ہو (۴۳)
انہوں نے کہا، یہ پریشان خواب ہیں اور ہم پریشان خوابوں
کی تعبیر جاننے والے نہیں ہیں (۴۴) اور کہا اُس شخص نے
جو اُن دونوں میں سے بچ گیا تھا اور اُس نے یاد کیا ایک
مدت کے بعد (یُوسف کو) میں تمہیں بتلاؤں گا اس کی تعبیر
پس تم مجھے بھیجو (۴۵) (وہ یوسف کے پاس گیا اور کہنے لگا
اے یوسف! اے راستباز انسان! ہمیں بتلاؤ سات موٹی تازی
گائیوں کے بارے میں کہ ان کو کھاتی ہیں سات دبلی پتلی
گائیں۔ اور سات خوشے ہیں سرسبز اور دوسرے خشک ہیں۔
تاکہ میں واپس جاؤں لوگوں کے پاس، شاید کہ وہ جان
لیں (۴۶) کہا (یوسف نے) تم کھیتی باڑی کرو گے سات
سال عادت کے مطابق جم کر۔ جو تم نے کاٹ لیا اُس کو
چھوڑ دینا اس کے خوشوں کے اندر ہی مگر بہت تھوڑا جس
کو تم کھاؤ گے (۴۷) پھر آئیں گے اُس کے بعد سات سال
سخت، جو کھا جائیں گے اُس چیز کو جو تم نے آگے ان کے
لیے رکھا ہے، مگر بہت کم جس کی تم حفاظت کرو گے (۴۸)
پھر آنے گا اس کے بعد ایک سال جس میں لوگوں پر بارش
برسائی جائے گی اور اس میں لوگ شیرہ وغیرہ نچوڑیں گے (۴۹)

بادشاہ کا خواب — گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھی قیدیوں کو ان کے خوابوں

کی بالکل سچی تعبیر بتائی۔ پھر جو شخص بری ہو کر اپنی ڈیوٹی پہ واپس جانے والا تھا اُس کو بادشاہ سے سفارش کے لیے بھی کہا، مگر وہ شاہی دربار میں پہنچ کر یوسف علیہ السلام کی بات کو فراموش کر بیٹھا۔ پھر سات، نو یا بارہ سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بادشاہِ مصر کو ایک خواب آیا جس سے وہ پریشان ہو گیا اور اس نے اپنے درباریوں سے اُس خواب کی تعبیر دریافت کی درباری اس کی تعبیر سے عاجز آ گئے اور کہنے لگے کہ یہ بے معنی خواب ہے اس قسم کے پریشان خواب اکثر آیا کرتے ہیں مگر بادشاہ کی تسلی نہ ہوئی۔ اسی دوران میں قید سے رہائی پانے والے شخص کو یوسف علیہ السلام کی بات یاد آ گئی، اُس کا خیال فوراً یوسف علیہ السلام کی طرف گیا کہ وہ شخص تعبیرِ خواب کا ماہر ہے اور اس طرح بادشاہ کا یہ عجیب و غریب خواب یوسف علیہ السلام کی رہائی کا سبب بن گیا۔

سات گائیں

آج کی آیات میں بادشاہِ مصر کے خواب کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ اور بادشاہ نے کہا بیشک میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں موٹی تازی يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ کھاتی ہیں اُن کو سات دبلی پتلی گائیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے سمندر سے موٹی تازی گائیں نکلتی ہوئی دیکھی تھیں جنہیں لاغر گائیں کھا رہی تھیں مگر اُن کی صحت پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا، وہ ایسی کی ایسی مریل ہی تھیں۔

یہ ایک حیرت انگیز خواب تھا اور دیکھنے والا شاہِ مصر اُس وقت مومن بھی نہیں تھا۔ بعد میں یہ خواب سو فیصدی سچا ثابت ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ سچا خواب دیکھنے کے لیے مومن ہونا شرط نہیں، نیز یہ کہ خواب ایک حقیقت ہے اور یہ سچا بھی ہو سکتا ہے

اور جھوٹا بھی، خواب مبنی بر حقیقت بھی ہو سکتا ہے اور شیطانی خیالات اور غذا کا اثر بھی۔ خواب مومن کو بھی آتا ہے اور کافر کو بھی اور کسی کافر کا خواب سچا بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی۔ بعض اوقات کوئی خواب کسی کافر کے ایمان لانے کا سبب بھی بن سکتا ہے جیسا کہ شاہِ مصر اور بعض دوسرے لوگوں کا ذکر ملتا ہے۔

سات خوشے

بہر حال بادشاہ کے خواب کا پہلا حصہ یہ تھا کہ سات فربہ گائیں ہیں جنہیں سات لاغر گائیں نگل رہی ہیں اور دوسرا حصہ یہ کہ وَسَبۡعَ سُنۡۢبُلٰتٍ خُضۡرٍ سات سرسبز خوشے یا بالیاں ہیں وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ اور دوسرے سات خشک ہیں جو سرسبز خوشوں کے ساتھ لپٹ رہے ہیں اور ایسا کرنے سے سرسبز خوشوں کی رونق ختم ہو رہی ہے مطلب یہ کہ جس طرح دبلی گائیں موٹی گایوں کو نگل رہی تھیں اسی طرح خشک خوشے سرسبز خوشوں کو کھا رہے تھے۔

سنبلہ خوشے یا بالی کو کہتے ہیں جس کے اندر گندم، جو یا دھان وغیرہ کے دانے ملفوف ہوتے ہیں۔ خوشوں کا ذکر سورۃ بقرہ میں بھی آیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی مثال "کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ" اُس دانے کی سی ہے جس سے سات خوشے اگیں اور ہر خوشے میں سو سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کی راہ میں خرچ کرنے والے کے اجر و ثواب کو بھی کئی گنا زیادہ کرتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے انسانی خوراک کے لیے مختلف اجناس کو پیدا فرمایا ہے اور ان کے دانوں کی نہایت حکیمانہ طریقے سے حفاظت فرمائی ہے، ہر دانے کو چھلکے میں بند کر کے محفوظ کر دیا ہے تاکہ انسان اسے ضرورت کے وقت اپنی خوراک بنا سکیں۔ ہر خوشے میں سو دانے کی تعداد اللہ نے مثال کے طور پر بیان فرمائی ہے تاہم

یہ تعداد مختلف اجناس میں کم و بیش بھی ہوسکتی ہے، خاص طور پہ دھان کے دانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے

تعبیر کی تلاش

یہ خواب دیکھ کر شاہِ مصر پریشان ہوگیا، اُس نے فوراً اپنے تمام مصاحبین کو طلب کیا جن میں وزیر، امیر، کرسی نشین اور بڑے بڑے عہدیدار شامل تھے مفسرین فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے اپنے درباریوں کے علاوہ بڑے بڑے نجومیوں اور کاہنوں کو بھی طلب کر لیا۔ پھر جب سب جمع ہوگئے تو بادشاہ نے انہیں خطاب کیا يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اے درباریو! مجھے میرے خواب کی تعبیر بتلاؤ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ اگر تم خوابوں کی تعبیر جاننے والے ہو۔ خواب کی تفصیل سُن کر قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ وہ سب لوگ کہنے لگے کہ یہ تو پریشان خواب ہیں۔ ایسے خوابوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ اور ہم تو ایسے پریشان خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔ یہ تو محض وہم اور خیالات ہیں جو اکثر انسانوں کو سوتے میں آتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ وہ لوگ خواب کی تعبیر بتانے سے عاجز آگئے اور انہوں نے جھوٹی تسلی سے بادشاہ کو ٹالنے کی کوشش کی۔

اضغاث، ضغث کی جمع ہے اور ضغث اُس مُٹھے کو کہا جاتا ہے جو گھاس پھونس اور لکڑیاں وغیرہ جمع کر کے بنایا گیا ہو۔ چونکہ اس گٹھے میں مختلف قسم کی چیزیں ہوتی ہیں اس لیے ضغث کہلاتا ہے۔

درباریوں نے بادشاہ کے خواب کو بھی اسی قسم کے گٹھے سے تشبیہ دی کہ یہ مختلف قسم کے پریشان کُن خیالات کا مجموعہ ہے، اس کی کوئی اصلیت نہیں اور بادشاہ کو وہم میں نہیں پڑنا چاہیئے۔

اِن درباریوں میں یوسف علیہ السلام کا ساتھی قیدی بھی تھا جسے یوسف علیہ السلام نے خواب کی ٹھیک ٹھیک تعبیر تبلائی تھی اور پھر

وہ تیسرے رہا ہو کر بادشاہ کو شراب پلانے پر مامور ہو گیا تھا۔ اب اُس شخص کا ذکر آ رہا ہے وَقَالَ الَّذِىْ نَجَا مِنْهُمَا اور کہا ان دو میں سے ایک شخص نے جو بچ گیا تھا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اور اس نے ایک مدت کے بعد یوسف علیہ السلام کو یاد کیا۔ اتنا عرصہ تو وہ یوسف علیہ السلام کو فراموش کیے رہا اور شیطان نے اس کو بھلا دیا، یہ بات اُس کے ذہن ہی سے نکل گئی کہ یوسف علیہ السلام نے اُسے شاہی دربار میں آپ کا ذکر کرنے کے لیے کہا تھا۔ اب جب کہ بادشاہ کو عجیب و غریب خواب آیا تو اسکا دھیان فوراً یوسف علیہ السلام کی طرف گیا۔ جنہوں نے اسے خواب کی تعبیر بتائی تھی اور وہ بادشاہ کا درباری بن گیا تھا۔ بہرحال جب اس کو یوسف علیہ السلام کا خیال آیا تو کہنے لگا اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتلاؤں گا فَاَرْسِلُوْنِ تم مجھے بھیجو یعنی اجازت دو تاکہ میں فلاں شخص سے خواب کی تعبیر پوچھ کر آؤں۔

امۃ کثیر المعانی لفظ ہے اور قرآن پاک میں اس کے چار مختلف معانی آئے ہیں۔ مثلاً اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (المومنون) میں امت کا معنیٰ دین اور مذہب ہے اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا (النحل) میں امت کا معنیٰ امام ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (آل عمران) میں امت کا معنیٰ جماعت ہے اور یہاں پر بَعْدَ اُمَّةٍ میں امت کا معنیٰ مدت آیا ہے۔

یوسف علیہ السلام کی خدمت میں

الغرض! بادشاہ سے اجازت ملنے پر وہ شخص جیل میں یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور اس طرح گویا ہوا يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اے راست باز یوسف! صدیق انتہائی درجے کے سچے انسان کو کہا جاتا ہے اور فضیلت کے لحاظ سے انبیاء کے بعد دوسرا درجہ صدیقوں

کا ہے قرآن پاک میں حضرت مریمؑ کو صدیقہ کہا گیا ہے۔ وَاُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ (المائدہ) اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کا لقب صدیق ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ایک انسان برابر سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کی تلاش میں رہتا ہے حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَ اللّٰہِ صِدِّیْقًا یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک اُسے صدیق یعنی راست باز لکھ لیا جاتا ہے۔

بہرحال اُس شخص نے کہا، اے سچے یوسف! اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ آپ ہمیں اس خواب کی تعبیر بتائیں کہ سات موٹی تازی فربہ گائیں ہیں یَّاْکُلُھُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ جنہیں سات دُبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ اور سات سرسبز خوشے ہیں اور دوسرے خشک ہیں اور خشک خوشے سرسبز خوشوں کے ساتھ گویا لپٹ کر اُن پر غالب آتے ہیں۔ آپ بتائیں لَّعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ تاکہ میں لوگوں کی طرف واپس جاؤں لَعَلَّھُمْ یَعْلَمُوْنَ شاید کہ وہ جان لیں یعنی ان کو بھی اس خواب کی تعبیر معلوم ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس خواب کی تعبیر بتانے سے شاید کہ لوگوں کو آپ کے مرتبے کا بھی علم ہو جائے لوگوں کو پتہ چل جائے کہ کتنی شان والا ایک بیگناہ آدمی جیل میں پڑا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا علم عطا کیا ہے جس کے ذریعے آپ اس قدر پوشیدہ چیزوں کو بھی پہچان لیتے ہیں۔

اس مقام پر مفسرین بحث کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا اخلاق بلند تھا کہ آپ نے تعبیر دریافت کرنے والے سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ اُسے ٹھیک ٹھیک بتا چکے تھے اور بادشاہ کے ہاں اپنا ذکر کرنے کے لیے بھی کہا، مگر وہ شخص بھول گیا اور اس نے بادشاہ کے پاس آپ کی کوئی بات نہ کی۔ بہرحال اُس شخص کے سوال

کے جواب میں نہ صرف اسکو خواب کی تعبیر تبلائی بلکہ وہ باتیں بھی بتائیں جو پورے ملک کی معیشت کے لیے نہایت کارآمد تھیں۔ گویا آپ نے ہمدردی اور خیر خواہی کا پورا پورا حق ادا کیا۔

یوسف علیہ السلام کا جواب

یوسف علیہ السلام نے خواب کا بیان سُنا اور اسکی تعبیر اس طرح بیان کی قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا فرمایا تم کھیتی باڑی کرو گے سات سال تک عادت کے مطابق جم کر، جس کے نتیجے میں پیداوار خوب ہوگی اور تمہیں وافر اناج حاصل ہوگا۔ اس عرصہ میں فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖ جو بھی تم فصل کاٹو گے اُسے اُس کے خوشوں میں ہی بند رہنے دینا، اُن سے اناج باہر نہ نکالنا کیونکہ جب اناج خوشوں سے باہر آجائے تو پھر وہ زیادہ عرصہ تک محفوظ نہیں رہتا بلکہ اُس میں کیڑا وغیرہ لگ جاتا ہے اور اناج ضائع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اُسے طویل عرصہ تک قابلِ استعمال رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُسے خوشوں سے نہ نکالنا بلکہ خوشوں ہی میں محفوظ کر لینا، اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ سوائے تھوڑے حصے کے جو تم نے استعمال کرنا ہے۔ باقی سارا محفوظ کر لینا۔

فرمایا ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ پھر اس کے بعد سات سال بڑے سخت آئیں گے یعنی ملک میں قحط پڑ جائے گا، بارش نہیں ہوگی، اناج پیدا نہیں ہوگا تو پہلے سات سالوں میں تمہارا بچایا ہوا غلہ ان سات سالوں میں تمہارے کام آئے گا۔ اس قحط سالی میں یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ قحط زدہ سال تمہارے بچائے ہوئے غلے کو کھا جائیں گے۔ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ سوائے اُس تھوڑے سے حصے کے جسے تم محفوظ کر لوگے، محصن دراصل پاک دامن کو کہتے ہیں جو اپنے

شہوانی جذبات پر کنٹرول کر کے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔ تو یہاں بھی مراد یہی ہے۔ کہ قحط سالی میں سارا اناج ختم ہو جائے گا سوائے تمہارے محفوظ شدہ تھوڑے حصے کے۔

تاریخِ عالم میں قحط سالی کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے، دنیا کے مختلف خطوں میں بڑے بڑے قحط پڑے۔ اس برصغیر میں انگریزوں کے زمانے سے پہلے اور پھر اُن کے ابتدائی دور میں زبردست قحط پڑا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایسا وقت بھی آیا جب لوگوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ذبح کر کے خود کھا لیا۔ اس صدی کے آغاز میں بھی پہاڑی علاقوں میں سخت قحط نمودار ہوا تھا، پانی اور اناج ختم ہو گیا۔ لوگ دوسرے مقامات کی طرف ہجرت کرنے لگے اور بے شمار لوگ اثنائے سفر میں ہی لقمۂ اجل بن گئے۔ مکے والوں پر بھی بڑا سخت قحط نازل ہوا تھا جس میں ہر چیز فنا ہو گئی تھی۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا اور لوگ سوکھا چمڑا اور مردار کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

پندرواں سال

خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے یوسف علیہ السلام نے پہلے سات خوشحالی کے سالوں کا ذکر کیا اور پھر سات قحط زدہ سالوں کی بات کی۔ یہ چودہ سال ہو گئے۔ پھر آپ نے پندرہویں سال کی بات کی ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ پھر اس کے بعد ایک اور سال آئے گا فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ جس میں لوگوں پر خوب بارش برسے گی۔ سبزی، پھل اور اناج کی فراوانی ہو جائے گی اور قحط سالی کا عرصہ ختم ہو جائے گا۔ یغاث، غیاث سے ہے جس کا معنی بارش ہوتا ہے اس کا مادہ غوث بھی ہے جس کا معنی فریاد رس ہوتا ہے مطلب یہ کہ اس خوشحالی کے سال میں لوگوں کی تکالیف کو دور کر دیا جائے گا۔ گویا اُن کی فریاد رسی کی جائے گی۔ درحقیقت غوث یا فریاد رس تو

صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے مگر افسوس ہے کہ لوگ مخلوق کو بھی غوث کا لقب دے دیتے ہیں۔

بہرحال فرمایا کہ اس سال خوب بارش ہوگی وَفِیْہِ یَعْصِرُوْنَ اور لوگ پھلوں سے رس نچوڑیں گے مطلب یہ ہے کہ پھل بکثرت پیدا ہوں گے اور پھر انگور یا کھجوروں سے رس نچوڑ کر شراب یا شیرہ تیار کریں گے جو دیر تک کام آتا رہے گا۔ تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر کے ساتھ ساتھ وہ تدابیر بھی تجویز کر دیں جن پر عملدرآمد سے عوام الناس کی پریشانیاں کم ہوں گی اور لوگ اس سے خوب فائدہ اٹھائیں گے چنانچہ مصریوں نے اِن نصائح پر من وعن عمل کیا جس کی وجہ سے نہ صرف وہ خود خوشحال رہے بلکہ قحط کے زمانے میں مصر کے اطراف کے لوگوں کی بھی خوب مدد کی۔ اس کا ذکر آگے تفصیل کے ساتھ آرہا ہے

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ
ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ
أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾ قَالَ مَا
خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ
حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ
الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن
نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٥١﴾ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ
أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ
الْخَائِنِينَ ﴿٥٢﴾ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ
بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٣﴾

ترجمہ :- اور کہا بادشاہ نے لاؤ اُس (یوسف) کو میرے پاس
پس جب پہنچا اُس کے پاس قاصد، تو کہا (یوسف علیہ السلام نے)
واپس چلے جاؤ اپنے مالک کے پاس اور اُس سے پوچھو کہ کیا ہے
حال ان عورتوں کا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ بیشک میرا
پروردگار ان کے مکر کو خوب جاننے والا ہے ﴿۵۰﴾ (بادشاہ نے
ان عورتوں سے) کہا، کیا ہے حال تمہارا جب کہ تم نے پھسلایا
یوسف علیہ السلام کو اس کے نفس سے۔ تو اُن عورتوں نے کہا،

پاکی ہے اللہ کے لیے ، ہم نے نہیں معلوم کی اُس میں کوئی برائی ۔ کہا عزیز کی بیوی نے ، اب بات بالکل واضح ہوگئی ہے میں نے ہی پھسلایا تھا اس کو اس کے جی سے اور بیشک وہ سچا ہے (۵۱) یہ بات میں نے اس لیے کی ہے تاکہ وہ جان لے کہ میں نے نہیں خیانت کی اُس کے ساتھ پس پشت ۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ نہیں کامیاب کرتا خیانت کرنے والوں کو (۵۲) اور میں نہیں پاک کرتا اپنے نفس کو ، بیشک نفس بہت حکم دیتا ہے برائی کا ، مگر وہ جس پر رحم کرے میرا پروردگار ۔ بیشک میرا پروردگار بہت بخشش کرنے والا اور مہربان ہے (۵۳)

ربطِ آیات

یوسف علیہ السلام سالہا سال تک قید میں پڑے رہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کے خواب کو اُن کی رہائی کا سبب بنا دیا ، بادشاہ کو خواب آیا ، اُس نے درباریوں سے تعبیر پوچھی مگر وہ سب عاجز آگئے ۔ پھر جیل سے رہا ہونے والے ساقی نے پیشکش کی کہ وہ ایک قیدی سے خواب دریافت کر سکتا ہے ۔ بادشاہ کی اجازت سے یُوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی تو انہوں نے نہ صرف تعبیر بتا دی بلکہ آنے والے حالات سے متعلق نہایت مفید مشورے بھی دیے ۔ یہ تعبیر پاکر بادشاہ کی تسلی ہوگئی کیونکہ یہ خواب منجانب اللہ تھا اور یوسف علیہ السلام نے اللہ کے عطا کردہ علم کے ذریعے اس کی تعبیر بتائی تھی ۔ بہرحال بادشاہ یُوسف علیہ السلام کے علم وفضل ، زہد وتقویٰ ، فہم ودانش اور اخلاقِ حسنہ کا سن کر دل ہی دل میں آپ کا معتقد ہوگیا اور اُس نے حکم دیا کہ ایسے قابل آدمی کو دربار میں حاضر کیا جائے ۔ آج کے درس کی ابتداء اسی بات سے ہو رہی ہے ۔

شاہی دربار سے پیغام

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖ بادشاہ نے کہا کہ یُوسف علیہ السلام کو میرے

پاس للاؤ۔ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ پھر جب پہنچا آپ کے پاس بادشاہ کا فرستادہ یعنی قاصد اور اس نے کہا کہ بادشاہ آپ کو بلا رہا ہے تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ اپنے مالک یعنی بادشاہ کے پاس واپس لوٹ جاؤ اور فَسْئَلْهُ اس سے پوچھو مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِىْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ اِنَّ رَبِّىْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ بیشک میرا پروردگار ان کی فریب کاری کو خوب جانتا ہے یوسف علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ مجھ پر جو الزام لگایا تھا، پہلے اس کی تحقیق کر لی جائے اور میرے متعلق ان عورتوں کی شہادت لے لی جائے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، اس کے بعد میں جیل سے باہر آؤں گا۔ آپ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مذکورہ معاملہ میں قصور سارا ان عورتوں کا تھا اور میں بالکل بے گناہ تھا۔ آپ اپنی بیگناہی کو ثابت کیے بغیر مصر کے معاشرے میں واپس نہیں آنا چاہتے تھے، کیونکہ ایسا کرنے سے لوگوں کے دلوں میں آپ کے متعلق شکوک و شبہات باقی رہ سکتے تھے۔ چنانچہ قاصد نے واپس آکر بادشاہ سے یہی بات کی تو بادشاہ کو بھی یہ بات پسند آئی اور وہ یوسف علیہ السلام کے اخلاقِ حمیدہ سے مزید متاثر ہوگیا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر یوسف علیہ السلام بادشاہ کے پیغام آنے پر جیل سے باہر آجاتے تو یہ کوئی بری بات نہ تھی بلکہ ایسا کرنا بالکل جائز تھا مگر یوسف علیہ السلام چونکہ لوگوں کے مقتدا تھے۔ اس لیے انہوں نے باہر آنے سے پہلے اپنی پوزیشن کی وضاحت کو ضروری خیال کیا۔ آگے چل کر آپ بحیثیت نبی اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے والے تھے اور لوگوں کی اصلاح کا مشن شروع کرنے والے تھے

اس لیے آپ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی شخص آپ کے کردار پر انگلی اٹھا سکے اور اس طرح آپ کے مشن میں رکاوٹ پیدا ہو۔

یوسف علیہ السلام کا صبر

صحیحین کی روایت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر کی تعریف فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد مبارک ہے۔ لَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ طُولَ لَبْثِ يُوسُفَ لَأَجَبْتُ الدَّاعِيَ یعنی اگر یوسف علیہ السلام کی طرح میں لمبا عرصہ قید میں رہتا تو بلانے والے کی بات کو فوراً قبول کر لیتا بمگر یوسف علیہ السلام نے بڑا ہی صبر کیا جنہوں نے رہائی پانے کے باوجود جیل سے باہر آنے کیں جلدی نہ کی بلکہ نہایت ہی صبر و استقامت کا ثبوت دیا اور اپنی رہائی کو اپنی بریت کے ساتھ مشروط کر لیا۔ محدثین کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں حضور نبی کریم علیہ السلام نے جہاں یوسف علیہ السلام کے صبر کی تعریف فرمائی ہے۔ وہاں نہایت لطیف پیرائے میں اپنی عبدیت کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ اس جملے سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ میں تو مقام عبدیت میں ہوں اور اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ بادشاہ کی پیش کش کی قبولیت میں تاخیر نہ کی جاتی۔ بحقیقت یہ ہے کہ عبدیت کا آنا بھی اپنے اختیار میں ہیں اور جانا بھی اختیار میں نہیں۔ اس دنیا میں آنے بھی اسی کے منشاد کے مطابق تھے اور جانا بھی اُسی کی رضا سے ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
نہ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہر حال یہ لطیف پیرائے میں عبدیت کا اظہار بھی ہے۔

بندی وزیر کا زیر

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی پوزیشن کے

متعلق ابہام کی صورت میں اگرچہ چہ میگوئیاں بھی ہوتیں تو اس سے آپ کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا کیونکہ اگر کوئی بے گناہ آدمی کے خلاف الزام تراشی کرتا ہے تو وہ گنہگار ہوگا اور معصوم کے درجات بلند ہوتے رہیں گے۔ اسی لیے جو لوگ شاہ اسماعیل شہیدؒ اور علمائے دیوبند پر اتہام لگاتے ہیں، ان کی برائی بیان کرتے ہیں۔ وہ خود مجرم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اِن بزرگوں کی بلندیٔ درجات کیلئے یہ سلسلہ قائم کردیا ہے
——— اُن کے درجات کے لیے یہ سلسلہ قائم کر دیا ہے کہ اُن کے درجات مرنے کے بعد بھی مسلسل بلند ہوتے ہیں۔ لوگ اِن بزرگوں پر کفر اور توہینِ رسالت کا الزام لگاتے ہیں جو کہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اِن کے درجات بلند ہوتے ہیں۔

بادشاہ کی طرف سے تحقیق

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش کے مطابق بادشاہ نے آپ کے خلاف لگائے گئے الزام کے متعلق تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا، اُس نے اُن تمام بیگمات کو مع عزیز کی بیوی کے طلب کیا۔ جب وہ سب اکٹھی ہوگئیں تو بادشاہ نے پوچھا قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ تمہارا کیا حال ہے جب کہ تم نے پھسلایا یوسف علیہ السلام کو اُن کے جی سے۔ یوسف علیہ السلام نے تحقیقات کا مطالبہ کرتے ہوئے کسی ایک عورت کا نام نہیں لیا تھا کہ فلاں عورت کے بارے میں تفتیش کی جائے جس نے میری قمیص پھاڑ دی تھی بلکہ کسی کو ذاتی نشانہ بنانے کی بجائے آپ نے سب عورتوں کا ذکر نہایت لطیف پیرائے میں کیا کہ ان سب کے متعلق تحقیق کی جائے قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ اسی طرح بادشاہ نے بھی اُن خواتین کے حفظِ مراتب کے پیشِ نظر سب کو اکٹھا خطاب کیا مَا خَطْبُكُنَّ کہ تمہارا

کیا حال ہے۔ بعض مفسرین اس بات پر بڑا اصرار کرتے ہیں کہ ان عورتوں نے ہاتھ سچ مچ نہیں کاٹے تھے، بلکہ انہوں نے خود دانستہ اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ اس کی دلیل وہ قَطَّعْنَ کے لفظ کو بناتے ہیں جو باب تفعیل کا مادہ ہے اور قصد کا معنیٰ دیتا ہے۔ وہ تمام عورتیں یوسف علیہ السلام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتی تھیں اور اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تاکہ یوسف علیہ السلام ان کے بہانے سے ان کے قریب آسکیں، اگر ایسا ہوتا تو پتہ چل جاتا کہ یہ عورتیں اس کی گرویدہ ہیں۔ تاہم یہ بات زیادہ مشہور ہے کہ مکر کرنے والی واحد عورت عزیز کی بیوی تھی اور باقی عورتیں اس کی معاون نہیں، چنانچہ دعوت کے بعد انہوں نے یوسف سے کہا کہ اپنی مالکن کی بات کو مانو اور اسے پریشان نہ کرو۔ اس موقع پر بھی یوسف علیہ السلام نے واحد کی بجائے جمع کا صیغہ ہی استعمال کیا تھا وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ پروردگار! اگر تو مجھ سے ان کے فریب کو دور نہیں کرے گا تو ممکن ہے میں ان کی طرف مائل ہو کر نادانوں میں سے بن جاؤں۔

بعض فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کا نام صراحتاً اس لیے نہیں لیا کہ آپ نے اس کے گھر میں پرورش پائی تھی اور آپ کو اس کا احترام ملحوظ خاطر تھا۔ اسی طرح بادشاہ نے بھی کسی ایک عورت سے خطاب نہیں کیا بلکہ جمع کا صیغہ استعمال کیا تاکہ وہ انکار نہ کر سکیں تو جب بادشاہ نے ان عورتوں سے یوسف علیہ السلام کے متعلق دریافت کیا قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ تو وہ کہنے لگیں پاکی اور تنزیہ ہے اللہ کے لیے۔ ہم نے تو یوسف علیہ السلام میں کسی قسم کی برائی نہیں

دیکھی۔ تمام عورتیں جو اس معاملہ میں ملوث تھیں، سب نے اقرار کیا کہ یوسف علیہ السلام بالکل پاک صاف ہیں اور اس طرح یوسف علیہ السلام کا دامن بالکل صاف ہو گیا۔

زلیخا کا اقرار حق

یہ بات تو تمام مدعو عورتوں نے بالاتفاق کی مگر اس سارے معاملہ کی اصل ذمہ دار زلیخا تھی جس نے ابتدا میں یوسف علیہ السلام پر الزام لگایا تھا مگر اب اس کا ذہن پختہ ہو چکا تھا اور وہ یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کا برملا اعلان کرنا چاہتی تھی۔ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ عزیز کی بیوی نے کہا اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اب حق ظاہر ہو گیا ہے اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ میں نے ہی اسے اس کے جی سے پھسلانا چاہا تھا وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ اور یوسف علیہ السلام تو بالکل سچے ہیں۔ اب زلیخا نے اپنی محبت کا برملا اظہار کر دیا کیونکہ جب وہ محبت میں پختہ ہو گئی تو اسے بدنامی کا ڈر بھی نہ رہا اور اس نے اپنے قصور اور یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کا واضح طور پر اعلان کر دیا۔

حصص کا معنی واضح ہونا یا ظاہر ہونا آتا ہے۔ بال مونڈنے کو حصحص الشعر کہتے ہیں کہ یعنی بال اس طریقے سے مونڈے گئے کہ نیچے سے کھال ظاہر ہو گئی ہے۔ عرب لوگ کہتے ہیں حصحص المخوذۃ یعنی خود (HELMET ہلمٹ) نے بال اڑا دیئے اور گنجاپن ظاہر ہو گیا حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے سر کے بال جنگوں میں مسلسل خود پہننے کی وجہ سے اڑ چکے تھے۔ بہرحال حصحص کا معنی واضح ہو جانا، کھل جانا یا ظاہر ہو جانا ہے اور جب تمام عورتوں نے یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی گواہی دے دی تو زلیخا کہنے لگی کہ اب معاملہ واضح ہو گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام سچے ہیں اور گنہگار میں ہی تھی۔

یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی

آگے ارشاد ہوتا ہے ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ

یہ بات اس لیے ہے تاکہ وہ جان لے کہ میں نے اس کی پس پشت خیانت
نہیں کی۔ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ مقولہ یوسف
علیہ السلام کا ہے یا زلیخا کا۔ اگر اسے زلیخا کے ساتھ منسوب کیا جائے تو معنیٰ
یہ ہوگا کہ زلیخا نے کہا کہ میں نے یہ اقرارِ حق اس لیے کیا ہے تاکہ میرے
خاوند کو معلوم ہو جائے کہ میں نے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی ہے
میں نے برائی کا ارادہ ضرور کیا اور اس کے لیے تگ و دو بھی کی مگر
یوسف علیہ السلام اپنی پاکدامنی کی وجہ سے بچ گئے۔ تاہم اکثر مفسرین کرام
فرماتے ہیں کہ یہ مقولہ یوسف علیہ السلام کا ہے اور ان کا مطلب یہ تھا کہ
عزیزِ مصر جس کا میں پروردہ تھا اور غلام تھا، وہ جان لے کہ میں نے
پس پشت اس کی خیانت نہیں کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اِنَّ
اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے
والوں کی مکاری کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان
ہے اَلْمَکْرُ وَالْخَدِیْعَۃُ وَالْخِیَانَۃُ فِی النَّارِ یعنی
مکاری، دھوکہ اور خیانت جہنم میں لے جانے کا باعث ہے خاص
طور پر اپنے مالک کی ناموس میں خیانت کرنا تو بہت بڑا جرم ہے، تو
مراد یہ ہے کہ خائنوں کی تدبیر کبھی کامیاب نہیں ہوتی، بلکہ وہ ہمیشہ رسوا ہوتے ہیں

یوسف علیہ السلام کی انکساری

اب اگلی آیت کریمہ میں یوسف علیہ السلام کی عجز و انکساری کا ذکر ہے
اور یہ چیز کاملین بارگاہِ ایزدی میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے
وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اس معاملہ میں میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا
یعنی میں نہیں سمجھتا کہ برائی سے بچ جانا میرا ذاتی کمال ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ
کی خاص مہربانی ہے کہ اس نے مجھے برائی سے بچالیا کیونکہ اِنَّ
النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ بیشک نفس برائی کا بہت زیادہ
حکم دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کا نفس اسے برائی کی طرف مائل

کرے مگر اس سے بچاؤ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ممکن ہے پیچھے
اسی سورۃ میں گزر چکا ہے کہ اُس عورت نے یوسف علیہ السلام کی طرف
ارادہ کیا اور یوسف علیہ السلام بھی اس کی طرف ارادہ کرتے اگر وہ اپنے
پروردگار کی دلیل نہ دیکھ لیتے کَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ
وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ اسی طرح
تاکہ ہم دُور کر دیں اس سے برائی اور بے حیائی کو کیونکہ یوسف علیہ السلام
ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔ اُدھر اللہ کا یہ فرمان بھی ہے وَلَا
تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ اپنی پاکیزگی خود مت بیان کرو، بلکہ اگر برائی
سے بچ جاؤ تو اللہ کا شکر ادا کرو۔ یہ تمہارا کمال نہیں بلکہ اللہ کی مہربانی ہے
اگر وہ اعانت نہ کرتا تو معصیت میں مبتلا ہو جاتے۔ غرضیکہ یوسف علیہ السلام
نے برائی سے بچ جانے پر عاجزی کا اظہار کیا کیونکہ آپ اللہ کے مخلص بندے تھے
فرمایا میں نے اپنے نفس کو پاک قرار نہیں دیا کیونکہ نفس تو برائی کی
طرف مائل کرتا ہے اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ہاں اگر میرا پروردگار
رحم فرمائے تو برائی سے بچ سکتا ہے۔ محدثین کرام نفس کی تین حالتیں
بیان کرتے ہیں۔ عام طور پر انسان کا نفس نفسِ امارہ ہوتا ہے جو اُسے
برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ سے توفیق کا طالب
ہو اور برائی سے بچ جائے تو اس کا نفس نفسِ لوامہ ہوتا ہے جو اُسے
برائی پر ملامت کرتا رہتا ہے۔ اور جب کوئی نفس اطاعتِ خداوندی
بجا لا کر ترقی کر جاتا ہے اور معاد میں پیش آنے والے حالات میں اطمینان
حاصل کر لیتا ہے تو وہ نفسِ مطمئنہ بن جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ
کسی پر مہربانی فرماتا ہے اور اپنے خاص بندوں پر خاص توجہ فرماتا ہے
تو اس کا اعلان ہے اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ
(بنی اسرائیل) وہ شیطان کو اپنے بندوں پر دخیل نہیں ہونے دیتا، وہ اُن

کی حفاظت کرتا ہے اور وہ نفس مطمئنہ کے حاملین بن جاتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام نے عجز و انکساری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا، بیشک نفس برائی کا حکم دیتا ہے مگر وہ جس پر میرے پروردگار نے رحم فرمایا اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ بیشک میرا پروردگار بہت بخشش کرنے والا اور از حد مہربان ہے یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مہربان ہے برائی سے بچا لینا اسی کا کمال ہے، اس میں میرا ذاتی کوئی کمال نہیں ہے

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا
كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾
قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ
عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ
يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا
مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ
الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

ترجمہ:- اور کہا (بادشاہ نے) لاؤ اُس شخص کو میرے پاس ۔ میں اُس کو خاص کر لوں گا اپنے نفس کے لیے۔ پس جب (بادشاہ نے) کلام کیا اُن سے تو کہا بیشک تم آج کے دن سے ہمارے پاس قدر والے اور امانت والے ہو ﴿۵۴﴾ کہا (یوسف نے) مقرر کر دو مجھے زمین کے خزانوں پر۔ میں حفاظت کرنے والا اور جاننے والا ہوں ﴿۵۵﴾ اور اسی طرح ہم نے ٹھکانا دیا یوسف علیہ السلام کو زمین میں۔ وہ جگہ پکڑتے تھے جہاں چاہتے تھے پہنچاتے ہیں ہم اپنی مہربانی جس کو چاہیں اور نہیں ضائع کرتے ہم نیکی کرنے والوں کے بدلے کو ﴿۵۶﴾ اور البتہ آخرت کا بدلہ بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور جو پرہیزگاری کرتے ہے ﴿۵۷﴾

ربطِ آیات

یوسف علیہ السلام کے مطالبے پر بادشاہ وقت نے ان تمام عورتوں کو جمع کیا جو زلیخا کی دعوت میں شریک تھیں اور جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ بادشاہ نے اُن سے یوسف علیہ السلام کے کردار کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بالاتفاق آپ کی طہارت اور پاکیزگی کا اقرار کیا۔ عزیز مصر کی بیوی جو یوسف علیہ السلام کو پھسلانے کی اصل ذمہ دار تھی۔ اُس نے بھی صریح الفاظ میں آپ کو راستباز اور نیک انسان تسلیم کیا، اور خود اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ یوسف علیہ السلام کے علم و فضل، تقویٰ اور پرہیزگاری سے تو بادشاہ تعبیرِ خواب کی وجہ سے پہلے ہی گرویدہ ہو چکا تھا، اب جب کہ اُن عورتوں نے بھی آپ کی تعریف کی تو بادشاہ پر یوسف علیہ السلام کا اعتقاد مزید پختہ ہو گیا اور اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس قدر قابل آدمی سے ضرور کوئی بہتر خدمت لینی چاہیے۔

یوسف علیہ السلام شاہی دربار میں

اس مقصد کے لیے وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ بادشاہ نے کہا کہ اُس شخص کو میرے پاس لاؤ، ایسے آدمی کو جیل میں بند رکھنا انصاف کے خلاف ہے۔ چنانچہ آپ کو لانے کے لیے بادشاہ نے آدمی بھیجے پھر جب یوسف علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ اُن کے خلاف لگایا گیا الزام دھل چکا ہے اور تمام عورتوں نے آپ کی بے گناہی کی شہادت دی ہے اور اب اُن کی تبلیغ کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تو آپ جیل سے باہر آ گئے۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ رہائی کے بعد انہوں نے غسل کیا، مہیا کردہ لباس پہنا اور شاہی دربار میں پہنچ گئے آپ نے اپنے طریقہ پر "السلام علیکم" کہہ کر بادشاہ کو سلام کیا، تو بادشاہ نے اس طریقہ کی تفصیلات معلوم کرنا چاہی آپ نے فرمایا، ہمارے آباؤ اجداد ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا یہی طریقہ ہے

جوکہ سارے اللہ کے برگزیدہ بندے تھے ۔ مفسرین یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ جب دوسرے قیدیوں کو یوسف علیہ السلام کی رہائی کا علم ہوا تو وہ سخت مغموم ہوئے کیونکہ داروغہ جیل نے آپ کو قیدیوں کا حاکم بنا رکھا تھا اور آپ اِن کے ساتھ نہایت رحیم وشفیق تھے ، تمام قیدی آپ کے حُسنِ اخلاق کے مداح تھے لہذا آپ کی جدائی سے اُن پر گریہ طاری ہوجانا فطری امر تھا ۔ تاہم یوسف علیہ السلام نے اُن کو تسلی دی کہ وہ شاہی دربار میں پہنچ کر اُن کی خیر خواہی کا حق ادا کرتے رہیں گے اور اُن کے لیے ہر ممکن سہولت کا بندوبست بھی کریں گے ۔

بہرحال بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو اُن کے دربار میں لایا جائے أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي میں انہیں اپنی ذات کے لیے خاص کرلوں گا یعنی آپ جیسے صاحب علم ، صاحب خلق ، ہمدرد اور پاکباز انسان کو اپنا مصاحب مشیر یا وزیر بنالوں گا ۔ یہ بات تو اس وقت تک تھی ۔ جب تک بادشاہ کی یوسف علیہ السلام سے ملاقات نہیں ہوئی تھی ۔ پھر جب آپ دربار میں آگئے فَلَمَّا كَلَّمَهُ اور بادشاہ نے آپ سے گفتگو کی ، تو وہ آپ کی شخصیت سے مزید متاثر ہوگیا اور اس نے اُسی وقت اعلان کردیا قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ کہ آج سے تم ہمارے پاس صاحب مرتبت اور صاحب قدر ومنزلت ہو اور امانت دار بھی ہو ۔ ہم تمہیں ملک وقوم کا خیرخواہ اور امین سمجھتے ہیں ۔ لہذا ہم تمہارے ہر مشورے پر صاد کریں گے ۔ اب تم غلام نہیں ہو بلکہ بادشاہ کے مصاحبین میں شامل ہو ۔ غرضیکہ بادشاہ نے عزیز مصر کے تمام اختیارات یوسف علیہ السلام کو سونپ دیے

وزارت خزانہ کا مطالبہ

یہ اعزاز پانے کے بعد قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے ملکِ مصر کے خزانوں پر

مقرر کردو۔ یہاں پر ارض سے مراد مصر ہے۔ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ
یعنی ان کی حفاظت کرنے والا اور جاننے والا ہوں، مطلب یہ کہ آپ
نے یقین دلایا کہ اگر میں شاہی خزانے کی پوری پوری حفاظت کروں گا اور
اسے برمحل خرچ کروں گا، جس سے مخلوق کو فائدہ پہنچے۔
یہاں پر مفسرین ایک اشکال پیش کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام
تو اللہ کے نبی اور کمال درجے کے زاہد تھے اور ایسے بندوں کو آخرت
کی طرف زیادہ رغبت ہوتی ہے مگر یوسف علیہ السلام نے دنیا کا ایک
عہدہ خود طلب کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کی ایک یہ صفت
بھی بیان کی ہے "اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (ص)
ہم نے ان کو آخرت کے ذکر کے ساتھ خالص کر لیا ہے۔ وہ دنیا
کی طلب نہیں رکھتے۔
حضرت عبدالرحمن ابن سمرۃؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام
کی خدمت میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حاضر ہوئے۔ آپ کے ساتھ آپ
کے قبیلے کے دو اور آدمی بھی تھے۔ جب وہ آپ کی خدمت میں
پہنچے تو اُن دو آدمیوں نے حضور علیہ السلام سے کوئی عہدہ طلب کیا،
چونکہ ابوموسیٰ اشعریؓ کو اُن کی نیت کا علم نہیں تھا، اس لیے وہ
اپنے ساتھیوں کا سوال سن کر پریشان ہو گئے۔ آپ نے حضور علیہ السلام
کی خدمت میں معذرت کی کہ اُن کے ساتھیوں نے ایسا مطالبہ کیا
اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا، اِنَّا لَا نُوَلِّیْ عَلٰی هٰذَا مَنْ
اَرَادَهٗ اَوْ حَرَصَ عَلَیْهِ یعنی جو شخص خود طالب ہوتا ہے ہم اسے مطلوبہ
کام پر مقرر نہیں کرتے، چنانچہ آپ علیہ السلام نے وہ عہدہ اُن دو
آدمیوں کی بجائے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو دے دیا جنہوں نے اس
کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا۔ یہ حدیث عہدہ قضا اور دیگر عہدوں سے متعلق

بھی ہے کہ جو شخص خود کسی عہدہ کا طالب ہو آپ نے اللہ تعالیٰ کی تائید سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور جس کو خود کوئی عہدہ پیش کیا جائے اس کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام نے وزارت خزانہ کی ذمہ داری کے لیے خود اپنے آپ کو پیش کیا، تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص کسی دنیاوی مفاد کے لیے کوئی عہدہ طلب کرتا ہے، وہ تائید الٰہی سے محروم ہو جاتا ہے، مگر طالب کے پیش نظر اگر دین کا مفاد اور مخلوق خدا کی بہتری ہو تو پھر اقتدار کا سوال کرنا جائز ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ اگر یہ عہدہ میں نے طلب نہ کیا تو اس پر کوئی غیر مستحق آدمی متمکن ہو جائے گا جس کی وجہ سے لوگ ظلم کا شکار ہوں گے تو پھر ایسا عہدہ خود طلب کرنا جائز ہے اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ غرور و تکبر ناپسندیدہ فعل ہے مگر بعض مواقع پر یہی تکبر اللہ کے نزدیک محمود ہو جاتا ہے۔ جب دشمن کے ساتھ مقابلہ ہو تو وہاں اکڑ اور تکبر کا اظہار دشمن کی بددلی کا سبب بن سکتا ہے جنگ خیبر کے موقع پر حضرت علیؓ نے بعض فخریہ اشعار کہے تھے جو کہ موقع کی مناسبت سے تھے اور بالکل جائز تھے۔

؎ أَنَا الَّذِیْ سَمَّتْنِیْ أُمِّیْ حَیْدَرَا
كَلَيْثِ غَابَاتٍ كَرِيْهِ الْمَنْظَرَا

میں وہ ہوں کہ جس کا نام ماں نے حیدر رکھا ہے جنگل کے شیر کی مانند ہوں جو دیکھنے والے کو دہشت زدہ کر دے مطلب یہ کہ بعض اوقات تکبر کرنا اور خود عہدہ طلب کرنا بھی جائز ہوتا ہے۔ اور اگر محض دنیا کے مفاد کے لیے یا لوگوں پر ظلم و زیادتی کے لیے عہدہ طلب کیا جائے تو یہ ناجائز ہوگا اور ایسا کرنے والا تائید ایزدی سے محروم ہوگا۔

اسی اصول کے پیش نظر بعض اوقات قاضی یا جج بننا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص مناسب علم اور صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی عدم موجودگی میں کسی فاسق، فاجر اور ظالم آدمی کے قاضی بننے کے مواقع موجود ہوں تو باصلاحیت آدمی کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ خود اپنی خدمات پیش کر دے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنگ موتہ کے موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجاہدین کی قیادت کے لیے تین آدمی مقرر فرمائے تھے۔ یعنی زید بن حارثہؓ، جعفر طیارؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ۔ آپ نے فرمایا تھا کہ حوادث کی صورت میں یہ تین سپہ سالار یکے بعد دیگرے فوج کی کمان سنبھالیں گے۔ میدانِ جنگ میں پہنچ کر واضح ہوا کہ دشمن کی تعداد ایک لاکھ یا پونے دو لاکھ ہے۔ جب کہ ان کے مقابلے میں مجاہدین صرف تین ہزار کی تعداد میں تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو مذکورہ تینوں جرنیل یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے خود آگے بڑھ کر فوج کی قیادت سنبھال لی۔ آپ نے اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر نہ صرف دشمن کو مرعوب کیا بلکہ اسلامی لشکر کو بحفاظت نکال لائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خلا پیدا ہو جائے تو بعض حالات میں حصولِ اقتدار لازم ہو جاتا ہے مگر ہمارے ہاں مسئلہ بالکل الٹ ہے۔ دینِ اسلام اور مخلوقِ خدا کی خدمت کے جذبے سے اگر کوئی مولوی الیکشن میں کھڑا ہو جائے تو آوازے کسے جاتے ہیں۔ یہ تو روٹیاں مانگ کر کھانے والے ہیں۔ انہیں سیاست میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اپنی نمازوں سے غرض رکھیں اور ملکی نظام دوسروں کے سپرد کر دیں۔ بہر حال یوسف علیہ السلام کے پیش نظر دین اور مخلوق کی خدمت تھی آگے ملک قحط کا شکار ہونے والا تھا، اس لیے ملکی معیشت کا باصلاحیت اور دیانتدار ہاتھوں میں

آ ضروری تھا، اس لیے یوسف علیہ السلام نے خزانے کی ذمہ داری خود اٹھانے کی پیش کش کر دی اور آپ کا یہ اقدام بالکل درست تھا

غیر مسلم کی ملازمت

یہاں پر کئی دوسرے مسائل بھی جنم لیتے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ کیا کافر حکومت کا عہدہ قبول کرنا درست ہے۔ اس واقعہ کے تناظر میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ بادشاہ وقت ریان ابن ولید مسلمان ہو چکا تھا لہٰذا اس کی ملازمت درست اقدام تھا مگر محدثین کے نزدیک اس ضمن میں کوئی صحیح روایت نہیں ملتی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایمان لے آیا ہو۔ اگر ایمان نہ بھی لایا ہو تو بھی یوسف علیہ السلام کے حق میں وہ بہر حال اچھا تھا اور اس نے آپ کو جس عہدے پر فائز کیا اس کے مکمل اختیارات بھی آپ کو سونپ دیے۔ تھے بائبل کی روایت میں آتا ہے کہ بادشاہ نے خود اپنے تمام اختیارات بھی یوسف علیہ السلام کے حوالے کر دیئے تھے، آپ کو تخت پر بٹھا کر آپ کے سر پر تاج بھی رکھا اور بادشاہ نے اپنی انگوٹھی اتار کر دے دی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تاج کا پہننا تو ہمارے لیے غیر متعلقہ بات ہے البتہ نظام حکومت کو چلانے کے لیے انگوٹھی بطور مہر ضرور استعمال ہوتی رہی ہے۔ غرضیکہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو کلی اختیارات دے دیے اور خود برائے نام بادشاہ رہ گیا۔ یہودیوں کی کتابوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی خود مختاری بادشاہ کی کونسل کے مشورے سے عمل میں آئی تھی اور سب نے بالاتفاق اس امر کی منظوری دی تھی۔ بہر حال محدثین اور مفسرین فرماتے ہیں کہ اگر کسی عہدے دار کو خلاف شرع کسی کام پر مجبور کیا جائے تو ایسا عہدہ قبول نہیں کرنا چاہیے اور اگر ایسی کوئی مجبوری نہ ہو تو کافر حکومت میں بھی عہدہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

انگریزی دور میں مسلمانوں کو بڑی بڑی جاگیریں اور عہدے دے کر ان سے غلط کام کرائے گئے۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے قتل کرایا گیا مسلمان ملک پر حملہ کے لیے مسلمانوں کو بھیجا گیا اور شریعت کی خلاف ورزی کے دوسرے کام کرائے گئے، جو قطعاً روا نہ تھے اسی لیے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور دوسرے بزرگان فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں غیر مسلم حکومت میں عہدہ قبول کرنا جائز نہیں علمائے کرام نے انگریزی فوج میں بھرتی کے خلاف فتویٰ دیا کیونکہ انگریز مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑانا چاہتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے ذریعے عراق پر حملہ کرا کے وہاں کے مسلمانوں کی خوب پٹائی کرائی، عربوں اور ترکوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ چنانچہ فوجی بھرتی کے خلاف فتوے کی پاداش میں علماء کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد علیؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ، پیر غلام محمد سندھیؒ، جیسے اکابرین ملت نے بڑے مصائب اٹھائے حتیٰ کہ مولانا مدنیؒ کو دو سال تک کھڑی بیڑیوں کی سزا بھگتنی پڑی۔ تاہم اگر غلط کام نہ لیا جائے تو پھر غیر مسلم حکومت میں بھی عہدہ قبول کرنا روا ہے۔ یوسف علیہ السلام کے عمل میں باقی لوگوں کے لیے اسوہ موجود ہے۔

یوسف علیہ السلام کا حصول اقتدار

الغرض! یوسف علیہ السلام کی خواہش پر بادشاہ وقت نے آپ کو خزانوں کا نگران مقرر کر دیا جیسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ اور اس طرح ہم نے زمین میں یوسف علیہ السلام کو اقتدار دیا۔ اللہ نے آپ کو ایسا موقع فراہم کیا کہ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ آپ جہاں بھی چاہتے جگہ پکڑتے، انہیں کسی جگہ آنے جانے میں

کوئی رکاوٹ نہ تھی، ملک میں بادشاہ کا سا اعزاز حاصل تھا۔ اللہ نے فرمایا نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ ہم اپنی مہربانی جسے چاہتے ہیں، پہنچاتے ہیں۔ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ اور نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ یوسف علیہ السلام محسنین میں سے تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی جسمانی اور ذہنی تکالیف برداشت کیں تو اللہ نے انہیں دنیا میں بھی جاہ و اقتدار عطا کیا مگر آخرت کا اجر تو بہت زیادہ ہے۔

> بہ دنیا و عقبیٰ کسے قدر یافت
> کہ او جانبِ صبر و تقویٰ شتافت

دنیا اور عقبیٰ دونوں مقامات پہ مرتبہ وہی پاتا ہے جو صبر اور تقویٰ کی طرف دوڑ کر جاتا ہے۔ یوسف علیہ السلام میں یہ دونوں چیزیں بدرجۂ اتم موجود تھیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں بھی اعلیٰ منصب عطا فرمایا اور آخرت کا درجہ تو بہرحال اللہ کے ہاں موجود ہے۔

زلیخا سے نکاح

کسی صحیح روایت میں تو اس بات کا ذکر نہیں ہے مگر تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام منصب شاہی پر فائز ہو گئے تو انہی دنوں میں قطیفار عزیز مصر فوت ہو گیا اور بادشاہ نے زلیخا کا نکاح یوسف علیہ السلام سے کر دیا۔ امام ابن کثیرؒ اور بعض دیگر مفسرین نے بھی اس نکاح کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہ زلیخا سے یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے افراہیم اور منشا بھی پیدا ہوئے۔ پھر افراہیم سے نون پیدا ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع کے والد ہیں۔ افراہیم کے ہاں ایک بیٹی بھی پیدا ہوئی جس کا نام رحمت تھا اور جو ایوب علیہ السلام کی زوجہ تھیں۔ کہتے ہیں کہ نکاح کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا سے کہا، کیا یہ بات اُس سے بہتر

نہیں ہے جبکی طرف تو مجھے دعوت دیتی تھی۔ اس پر زلیخا نے معذرت کی اور کہا، اے اللہ کے نبی! میرا خاوند کمزور اور بے رغبت تھا۔ جب کہ میں جوان تھی اور تمہارے حسن وجمال کو دیکھ کر بے قابو ہوگئی۔ تفسیری روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ بادشاہ سے اعزاز ملنے کے بعد جب یوسف علیہ السلام راستے سے گزر رہے تھے تو زلیخا آپ کی شان وشوکت کو دیکھ رہی تھی فضیل بن عیاضؒ کا مقولہ ہے کہ اس وقت زلیخا نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ عَبِیْدًا مُّلُوْکًا بِطَاعَتِہٖ سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے غلاموں کو اپنی اطاعت کی وجہ سے بادشاہ بنادیا وَالْمُلُوْکَ عَبِیْدًا بِمَعْصِیَتِہٖ اور بادشاہوں کو انکی معصیت کی وجہ سے غلاموں سے بھی بدتر بنادیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ البتہ آخرت کا اجر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔ آخرت کے مراتب اور درجات کہیں بڑھ کر ہیں اس سے جو کچھ انہیں اس دنیا میں نصیب ہوا۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ
وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٥٨﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ
قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ
اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿٥٩﴾ فَاِنْ لَّمْ
تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿٦٠﴾
قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿٦١﴾ وَقَالَ
لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٢﴾

ترجمہ:۔ اور آئے یوسف (علیہ السلام) کے بھائی اور انکے پاس داخل ہوئے
تو آپ نے انکو پہچان لیا۔ اور وہ آپ کو نہیں پہچانتے تھے ﴿۵۸﴾
اور جب تیار کرکے دیا اُن کو اُن کا سامان تو کہا (یوسف نے)
لاؤ میرے پاس اپنے باپ شریک بھائی کو۔ کیا تم نہیں دیکھتے
کہ میں پورا پورا دیتا ہوں اناج اور میں بہتر مہمان نوازی کرنے
والا ہوں ﴿۵۹﴾ پس اگر تم اُس کو نہ لاسکے میرے پاس تو
میرے پاس تمہارے لیے کوئی اناج نہیں ہوگا اور پھر میرے قریب

بھی نہ آنا (۶۰) وہ کہنے لگے کہ ہم مزید اُس کو اس کے باپ سے پھسلائیں گے ، اور بیشک ہم ایسا کرنے والے ہیں (۶۱)
اور کہا (یُوسف نے) ، پنے خدمت گاروں سے کہ ڈال دو ان کی پونجی ان کے سامان میں ، شاید کہ یہ اس کو پہچان لیں جب یہ اپنے گھروں کو واپس لوٹیں ، اور شاید کہ یہ پھر واپس آئیں (۶۲)

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب شاہِ مصر کو اُس کے خواب کی تعبیر مل گئی تو اُس نے یوسف علیہ السلام کو بلوا بھیجا مگر آپ نے اپنے خلاف لگائے گئے الزام کی صفائی تک جیل سے باہر آنے سے انکار کر دیا ۔ پھر بادشاہ نے مصر کی معزز خواتین کو طلب کر کے یوسف علیہ السلام کی بے گناہی کے متعلق تسلی کر لی تو آپ جیل سے نکل کر شاہی دربار میں پہنچے ۔ بادشاہ آپ کے علم و فہم اور عقل و دانش کا تو پہلے ہی معترف ہو چکا تھا ، جب اُس نے آپ سے گفتگو کی تو مزید گرویدہ ہو گیا ، اور آپ کو اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا ۔ یُوسف علیہ السلام نے خود امورِ خزانہ کی ذمہ داری اٹھانے کی پیش کش کی جسے بادشاہ نے منظور کر لیا اور آپ کو وزیرِ خزانہ کا منصب سونپ دیا ۔

یُوسفؑ کی حسنِ تدبیر

اِسی اثنا میں بادشاہ کے خواب کے مطابق ملک میں خوشحالی کے سات سالوں کا آغاز ہو گیا ۔ یُوسف علیہ السلام نے اپنی حسنِ تدبیر کے ساتھ وافر غلہ کو محفوظ کرنا شروع کر دیا ۔ چنانچہ ہر سال جتنا اناج ضرورت سے زیادہ ہوتا آپ اُس کے خوشے ہی سٹور کرتے رہے تاکہ یہ محفوظ شدہ غلہ قحط کے اگلے سات سالوں میں کام آ سکے ۔

جب فراوانی کے سات سال ختم ہو گئے تو یوسف علیہ السلام کے پاس کثیر مقدار میں غلہ جمع ہو چکا تھا ۔ اس کے بعد قحط کا زمانہ شروع ہو گیا ، بارش بند ہو گئی ، زمین کا پانی بھی خشک ہو گیا ۔ جب پانی ہی نہ رہا تو غلہ کیسے پیدا ہوتا ۔ نہ صرف ملکِ مصر بلکہ اردگرد کا پورا خطہ بھی زبردست قحط کا شکار ہو گیا ۔ کنعان ، فلسطین اور یروشلم کے علاقے بھی قحط

کی زد میں آگئے اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ اس دوران میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ شاہِ مصر کے پاس وافر غلہ موجود ہے، بادشاہ نہایت رحمدل اور انصاف پسند ہے جو بھی اُس کے پاس چلا جائے وہ اُسے اناج دیکر لوٹاتا ہے، چنانچہ غلہ حاصل کرنے کے لیے مدین، شام، فلسطین اور کنعان وغیرہ سے لوگ مصر کی طرف جانے لگے۔

عالمی قحط

تاریخ عالم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے خوفناک قحط پڑے حتیٰ کہ یورپ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں تو بہت سے قحطوں کا پتہ چلتا ہے۔ انگریزی دور کے آخری زمانے یعنی ۴۶-۱۹۴۵ء میں بنگال میں زبردست قحط رونما ہوا - جس سے نوے ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ اس وقت پنجاب اور سرحد وغیرہ کے لوگوں نے بنگالیوں کی حسب توفیق مدد کی۔ تاہم وہاں پر اشیائے ضرورت کی اس قدر قلت پیدا ہوگئی تھی کہ ایک من چاول یا ایک سا ڑھی پانچ سو روپے میں بھی دستیاب نہ تھی۔ اس صدی کی ابتدا میں بھی برصغیر میں بڑے بڑے قحط پڑے شمالی علاقہ جات کوہستان، الائی، نندھار وغیرہ جو اس وقت آزاد علاقے تھے، خوفناک قحط کا شکار ہوگئے بہت سے لوگ ان علاقوں سے نقل مکانی کرتے ہوئے راستے میں ہی دم توڑ گئے ہماری اپنی بستی کے قریب سے عام شاہراہ گزرتی تھی۔ والدہ مرحومہ نے ہمیں بتایا کہ قحط کے زمانے میں لوگ اس راستے سے گزرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ اسی دوران کوئی چھ سات فٹ قد کی لمبی تڑنگی عورت راستہ چلتے ہمارے گھر آگئی۔ بیچاری بھوک اور بیماری سے نڈھال ہو رہی تھی حتیٰ کہ وہ کچھ بولنے سے بھی عاجز آچکی تھی۔ والدہ نے اسے چاولوں کی ایک پلیٹ پیش کی۔ اُس نے ایک لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈالا تو بیہوش ہوکر گر پڑی اور اُسکی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ہماری بستی کے

قریب ہی ایک ٹیلے پر بہت سی قبریں تھیں، ہمیں بتایا گیا کہ یہ قحط کے دوران سفر کرنے والوں کی قبریں ہیں۔

ابن بطوطہ آٹھویں صدی کا عظیم سیاح گزرا ہے۔ یہ دنیا بھر میں واحد سیاح ہے جس نے ستائیس برس تک سیاحت کی اور دنیا کے گوشے گوشے میں پھرا۔ یہاں برصغیر میں بارہ برس تک پھرتا رہا، اس کے علاوہ وہ جزائر شرق الہند، چین، سیام اور تھائی لینڈ وغیرہ گیا۔ اب تو تیز رفتار سواریاں میسر ہیں جن کی وجہ سے دنیا بھر کی سیاحت نہایت آسان ہو گئی ہے مگر ابن بطوطہ کے زمانے میں سفر بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ اس شخص نے اپنے سفر نامے میں کئی قحطوں کا ذکر کیا ہے کہتا ہے کہ بعض مقامات پر ایک دینار میں ایک روٹی یا پانی کا ایک گلاس بھی بمشکل میسر آتا ہے۔ گانے کی ایک بیری ایک سو دینار میں نہیں ملتی تھی۔ یہ شخص مراکش کا رہنے والا تھا اور اپنی عمر کے آخری حصے میں وہیں پہنچ کر فوت ہوا۔

قیمت پر کنٹرول

بہرحال جب مصر میں قحط پڑ گیا اور بیرونی ممالک کے لوگ بھی غلہ لینے کے لیے مصر کی طرف آنے لگے تو ملک میں غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے ایک طرف اندرونِ ملک اناج کی مسلسل فراہمی کا مسئلہ درپیش تھا اور دوسری طرف دوسرے ممالک کو بھی مناسب مقدار میں غلہ کی فراہمی مطلوب تھی۔ یوسف علیہ السلام نے ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دو نہایت اہم فیصلے کیے۔ آپ نے اندرون ملک غلے کی قیمتیں مقرر کر دیں تاکہ کوئی شخص مہنگے داموں غلہ فروخت نہ کر سکے اور ملکی ضروریات بلا روک ٹوک پوری ہوتی رہیں۔ آپ نے دوسرا فیصلہ یہ کیا کہ غیر ممالک سے آنے والوں کے لیے ایک مقدار مقرر کر دی کہ اس سے زیادہ کوئی شخص اناج حاصل نہیں کر سکے گا چنانچہ باہر سے آنے والے ہر شخص کو آپ نے ایک سواری اونٹ، خچر وغیرہ کے بوجھ کے برابر غلہ

دینے کا حکم دیا اور اس طرح کوئی شخص ایک بوجھ سے زیادہ اناج حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اندرون ملک بھی غلے کی قیمتیں معقول سطح پر رہیں اور بیرون ملک بھی اناج زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچتا رہا۔ جس سے ملک کا خزانہ بھی بھر گیا۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں[1] کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد تو عقیدہ توحید، ایمان، نیکی اور اخلاق کی تعلیم ہے، مگر ان کی بعثت کا ایک اہم مقصد لوگوں سے ظلم کو دور کرنا بھی ہے۔ اسی لیے جب کسی علاقے میں غیر معمولی حالات پیدا ہو جائیں اور یہ خطرہ لاحق ہو کہ لوگوں سے من مانی قیمت وصول کر کے ان پہ ظلم کیا جائے گا، تو ایسی صورت میں حکومت کے لیے اشیائے صرف کی قیمتوں پہ کنٹرول کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ عام حالات میں جب کہ اشیائے صرف کی فراوانی ہو، حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ تجارت کو کھلا چھوڑ دیا جائے اور کسی چیز کی قیمت پہ کنٹرول نہ کیا جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور علیہ السلام سے بھاؤ مقرر کرنے کی درخواست کی گئی تو آپ نے انکار کر دیا، اور فرمایا تجارت کو آزاد چھوڑ دو تا کہ کسی پہ زیادتی نہ ہو۔ فرمایا اگر میں قیمت مقرر کر دوں اور اس سے کسی پر زیادتی ہو، تو یہ درست نہیں۔

امام محمدؒ کے مطابق اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ جب لوگوں پہ ظلم ہو رہا ہو تو اس ظلم کو دور کرنے کے لیے قیمتوں پہ کنٹرول کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

گرانی کا حل

بہر حال یوسف علیہ السلام نے قحط کے دوران اناج کی بہم رسانی کا بہترین انتظام کیا جس کی بدولت مخلوقِ خدا سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا۔ نویں صدی کے بزرگ امام محمد ابن محمد یوسف المتوفی ۸۴۳ھ نے وعظ و نصیحت کے موضوع پر "الزہر الفائح" (مہکنے والی خوشبو) نامی کتاب لکھی ہے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۳۳

جس میں لکھتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے پاس ایک محتاج آدمی غلہ لینے کے لیے آیا۔ آپ نے اُس کو ایک عام صاع (تقریباً چار سیر) غلہ عطا فرمایا۔ اُس نے عرض کیا، حضرت! اس سے تو میری ضرورت پوری نہیں ہوگی، اس لیے کچھ مزید دیجئے۔ اس پر آپ نے اسے ایک صاع مزید دے دیا۔ پھر وہ شخص کہنے لگا کہ اگر آپ مجھے جانتے ہوتے تو یقیناً ———— آپ مجھے راضی کرتے
یوسف علیہ السلام کے دریافت کرنے پر اُس شخص نے بتایا کہ وہ وہی شخص ہے جس نے صرف چار ماہ کی عمر میں آپ کی پاکدامنی کی گواہی دی تھی۔ جب زلیخا نے آپ کی قمیص پھاڑ دی تھی تو میں نے ہی بول کر کہا تھا کہ اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو زلیخا قصوروار اور یوسف بے گناہ ہے۔ چنانچہ اس بات سے یوسف علیہ السلام بہت خوش ہوئے اور آپ نے اُس شخص کو ایک سو اردب اناج اور ایک سو دینار بھی دینے کا حکم دیا۔ ایک اردب بیس صاع کے برابر ہوتا ہے اور اس طرح آپ نے اُس شخص کو دو سو من غلہ عطا کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے یوسف! جس شخص نے آپ کے حق میں ایک گواہی دی آپ اُس پر اتنا خوش ہوئے کہ اُسے ایک سو اردب اناج دے دیا اور جو شخص صبح شام میری توحید کی گواہی دیتا ہے اور میرے نبی کی نبوت کی شہادت دیتا ہے میں اُس پر کتنا خوش ہوتا ہوں۔

برادرانِ یوسف کی مصر آمد

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر اسی واقعہ کو بیان فرمایا ہے کہ قحط کے زمانے میں جب لوگ دُور دُور سے غلہ لینے کے لیے مصر آنے لگے تو یہ خبر کنعان بھی پہنچی اور پھر شاہِ مصر کی فیاضی کا چرچا سُن کر برادرانِ یوسف بھی مصر آئے۔ ارشاد ہوتا ہے وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوسُفَ اور یوسف علیہ السلام کے

بھائی بھی سینکڑوں میل کا سفر کر کے آپ کے پاس غلہ لینے کے لیے حاضر ہوئے۔ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ وہ یوسف علیہ السلام کے پاس داخل ہوئے۔ فَعَرَفَهُمْ تو آپ نے بھائیوں کو پہچان لیا۔ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ اور بھائی آپکو نہ پہچان سکے۔ اُن کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ جس بھائی کو انہوں نے پہلے کنوئیں میں گرایا، پھر قافلے والوں کے ہاتھوں سستے داموں فروخت کر دیا، وہ ملک مصر کا خود مختار حاکم بھی ہو سکتا ہے اور وہ اسی کے سامنے غلے کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں۔ حکومتی آداب کا تقاضا تھا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی آپ کے زیادہ قریب بھی نہ جا سکتے تھے۔ برخلاف اس کے یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو ایک نظر میں ہی پہچان لیا مگر اپنا تعارف نہیں کرایا۔ ظاہر ہے کہ تب سے ۳۸ تا ۴۰ سال پہلے یوسف علیہ السلام بھائیوں سے جدا ہوئے تھے تو بھائی اس وقت بھی جوان تھے اور اتنے عرصہ کے بعد بھی ان کی شکل وصورت میں کوئی خاص تغیر واقع نہیں ہوا تھا، لہٰذا آپ نے ان کو آسانی سے پہچان لیا۔ آپ نے بھائیوں سے ان کے اور ان کے ملکی حالات دریافت کیے مگر زیادہ تفصیل کے ساتھ بات نہ کی۔

جیسا کہ اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ یوسف علیہ السلام بیرون ملک سے آنے والے تمام لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے اور انکو اعزاز کے ساتھ ٹھہراتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے بھائیوں کو بھی پورا پورا اعزاز دیا اور ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اہل شہر کا فرض ہے کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں سے بھی حسن سلوک سے پیش آئیں۔ اگر ایسا کریں گے تو باہر سے زیادہ تاجر آئیں گے جس سے

ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا۔ اشیاء صرف کی فراوانی ہوگی۔ اور ملک ترقی کے راستے پر گامزن ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر تاجروں کیساتھ بدسلوکی کی جائے گی، ان کے ساتھ دھوکہ اور فریب کیا جائے گا۔ اُن کا مال چھین لیا جائیگا تو وہ دوبارہ اس طرف آنے کی غلطی نہیں کریں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ غیر ملکی تجارت کمزور پڑ جائے گی۔ اشیائے صرف کی قلت پیدا ہوگی اور اس طرح ملک تنزل کی طرف جائے گا۔ شاہ صاحب نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ معاشرے کے غریبوں، محتاجوں، اور یتیموں سے اچھا سلوک کرو۔ تاکہ تمہارا معاشرہ ترقی کرے۔ اس طرح معاشرتی مسائل کم ہوں گے اور ملک آسودگی کی طرف پیشقدمی کریگا۔

بن یامین کو لانے کی فرمائش

بہر حال یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی خوب خاطر مدارت کی اور پھر انہیں دستور کے مطابق غلہ بھی دیا۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جب اُن کا سامان تیار ہوگیا، اور اپنے وطن واپس جانے لگے تو یُوسف علیہ السلام نے اُن سے الوداعی ملاقات میں فرمایا قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ میرے پاس لے آنا اپنے بھائی کو جو تمہارے باپ میں شریک ہے۔ یوسف علیہ السلام کی مراد اپنے سگے بھائی بن یامین سے تھی جس کا ذکر خود آپ کے بھائی کر چکے تھے کہ وہ باپ کی خدمت کے لیے کنعان میں ہے اور ہمارے ساتھ نہیں آسکا۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ برادرانِ یُوسف نے اپنے حصے کا غلہ لینے کے بعد یوسف علیہ السلام سے گذارش کی تھی کہ اُن کے نابینا باپ اور چھوٹے بھائی کا حصہ بھی انہیں دیا جائے وہ بوجہ ہمارے ساتھ نہیں آسکے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کا حصہ بھی بھائیوں کو دے دیا تھا، تاہم آئندہ کے لیے یہ شرط عائد کی تھی کہ جب دوبارہ آؤ تو اپنے گیارہویں بھائی کو بھی ساتھ لانا ورنہ سمجھا جائے

گا کہ تم نے دروغ سے کام لے کر اس کا حصہ ناجائز طور پر وصول کر لیا ہے فرمایا اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْکَیْلَ یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ میں پورا پورا دیتا ہوں یعنی کسی کو مایوس نہیں لوٹاتا وَاَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ اور میں بہتر مہمانداری کرنے والا ہوں۔ میں نے تمہیں عزت کے ساتھ رکھا ہے، تمام ضروریات پوری کی ہیں۔ لہٰذا اگلی دفعہ تم اپنے بھائی کو ضرور ہمراہ لانا۔ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ اور اگر تم اسے ساتھ نہیں لاؤ گے فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ تو تمہارے لیے میرے پاس کوئی اناج نہیں ہو گا، یعنی تمہیں بھی کچھ نہیں دوں گا، لہٰذا وَلَا تَقْرَبُوْنِ پھر میرے قریب بھی نہ آنا، ورنہ تمہیں مایوس لوٹنا پڑے گا۔ یوسف علیہ السلام نے یہ سخت شرط عائد کر دی۔

یہاں پر جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ جہاز سامان کو کہتے ہیں اور جہیز بھی اسی مادے سے نکلا ہے۔ شادی کے موقع پر بچی کو جہیز دینا نہ تو فرض ہے۔ نہ واجب اور نہ سنت مؤکدہ، بلکہ حسب استطاعت مستحب ہے مگر ہمارے ہاں اس جہیز نے لعنت کی صورت اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اکثر شادیاں بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی التواء میں پڑی رہتی ہیں اور جس کی وجہ سے معاشرے میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگر کوئی صاحب استطاعت ہے تو بیٹی کو جہیز دے، اسمیں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کے برعکس اگر ہر غریب آدمی بھی بھاری بھر کم فرنیچر، فریج اور ٹیلیویژن جیسی لغویات دینے کی کوشش کرے گا، تو معاشرتی خرابیوں کا باعث ہو گا اور یہی جہیز ایک لعنت بن کر رہ جائیگا ایسا کرنا محض رواج اور نبیوں کی تعلیم کے خلاف ہے۔

پونجی کی واپسی

بہرحال ایک طرف تو یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے کہا کہ وہ آئندہ بن یامین کو ساتھ لائیں اور دوسری طرف جب ان کا غلہ بھرا جا رہا

تھا تو آپ نے وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ اپنے خدام سے کہہ دیا کہ ان کی پونجی بھی اِن کے کجاووں یعنی ان کے سامان میں ہی رکھ دو۔ وہ جو بھی درہم یا دینار لائے تھے، فرمایا! اس احتیاط سے ان کے سامان میں رکھ دو کہ انہیں علم نہ ہوسکے۔

لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ تاکہ یہ اسے پہچان لیں جب کہ اپنے گھروں کو واپس لوٹیں، اور لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ اور شاید اسی وجہ سے یہ لوگ دوبارہ مصر آئیں۔ اس پونجی کی بنا پر واپس آنے کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ جب یہ لوگ واپس جاکر اپنی رقم واپس پائیں گے تو سمجھیں گے کہ غلطی سے آگئی ہے لہذا دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ اُسے واپس لوٹایا جائے اور اسی بہانے سے دوبارہ مصر آجائیں گے۔ وہ اُسے اپنی ایمانداری کا امتحان بھی سمجھ سکتے ہیں اور رقم واپس لوٹا کر اس امتحان میں پورا اُتر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوبارہ آنے کے لیے ان کے پاس کوئی پیسہ نہ ہو اور اپنی رقم دوبارہ اپنے پاس پاکر اُن کی حوصلہ افزائی ہوگی اور وہی رقم لے کر دوبارہ آجائیں گے برادران یوسف کے دِل میں یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ اُس شخص نے ہمارے ساتھ بڑی فیاضی کا ثبوت دیا ہے لہذا دوبارہ جاکر اُس سے مزید فائدہ اٹھانا چاہیئے لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ میں ان ساری باتوں کی طرف اشارہ ہے بہرحال خدام نے برادران یوسف کی رقم بھی اُن کے سامان میں واپس رکھ دی اور وہ لوگ اپنے وطن کو روانہ ہوگئے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ
فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾
قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى
اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ
الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا
بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ هٰذِهٖ
بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ
اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾
قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا
مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ
اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

ترجمہ:- پس جب وہ (برادران یوسف) واپس لوٹے اپنے
والد کے پاس تو انہوں نے کہا ، اے ہمارے باپ ! روک
دیا گیا ہے ، ہم سے اناج ، پس بھیج دے ہمارے ساتھ
ہمارے بھائی کو تاکہ ہم ماپ کر لائیں (اناج) اور بیشک
ہم اس کے لیے البتہ حفاظت کرنے والے ہیں ﴿۶۳﴾ کہا اس
(یعقوب) نے نہیں ۔ نہیں اعتبار کرتا تمہارا اس پر مگر جیسا کہ

میں نے اعتبار کیا تھا تمہارا اس کے بھائی پر اس سے پہلے پس اللہ ہی ہے بہتر حفاظت کرنے والا اور وہ سب سے بڑھ کر مہربان ہے (۶۴) اور پھر جب انہوں نے کھولا اپنے سامان کو تو پایا انہوں نے اپنی پونجی کو کہ لوٹا دی گئی ہے اُن کی طرف، تو کہنے لگے، اے ہمارے باپ! ہم کیا تلاش کرتے ہیں؟ ہماری یہ پونجی بھی لوٹا دی گئی ہے ہماری طرف، اور ہم اناج لائیں گے اپنے گھر والوں کے لیے اور حفاظت کریں گے اپنے بھائی کی۔ اور ہم زیادہ لائیں گے ایک اونٹ کا بوجھ۔ یہ اناج تو بہت تھوڑا ہے (۶۵) کہا (یعقوب علیہ السلام نے) میں ہرگز نہیں بھیجوں گا اس کو تمہارے ساتھ یہاں تک کہ دے دو تم مجھ کو خدا کا پختہ عہد کہ تم ضرور اس کو لاؤ گے میرے پاس، سوائے اس کے کو گھیر لیے جاؤ۔ جب دے دیا انہوں نے پختہ عہد تو کہا (یعقوب نے) اللہ تعالیٰ اس بات پر نگہبان ہے جو ہم کہتے ہیں (۶۶)

ربطِ آیات قحط کے زمانے میں جب برادرانِ یوسف غلہ لینے کے لیے مصر پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے اُن کو پہچان لیا اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ اُن کی مہمان نوازی کی۔ پھر جب وہ واپس جانے لگے تو اُن کی لائی ہوئی پونجی بھی اُن کے سامان میں رکھ دی کہ یہی پونجی اُن کے دوبارہ مصر آنے میں مددگار ثابت ہو۔ یوسف علیہ السلام نے اُن کو تاکید کی کہ جب دوسری دفعہ مصر آئیں تو اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ہمراہ لائیں ورنہ دوبارہ مصر آنے کی کوشش نہ کریں، انہیں اناج نہیں دیا جائے گا۔ تورات کے حوالے سے مفسرین کرام یہ بھی لکھتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں میں سے شمعون کو روک لیا تھا جو اُن کے بارے میں سب سے بہتر

کے لیے رکھتا تھا، اور یہ بھی کہ آپ نے بن یامین کے حصے کا غلہ باقی بھائیوں کو نہیں دیا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ جب اُس کو لاؤ گے تو اس کا غلہ ملے گا۔ بہر حال یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر سے غلہ لے کر اپنے وطن واپس آ گئے۔

بن یامین کے لیے فہمائش

اب بات آگے چلتی ہے فَلَمَّا رَجَعُوٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ پھر جب وہ لوٹے اپنے باپ کی طرف تو اس سے سارا ماجرا اس طرح ذکر کیا قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ کہنے لگے اے ہمارے باپ ہم سے اناج روک دیا گیا ہے فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا لہٰذا ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیں نَكْتَلْ تاکہ ہم ماپ کر اناج لائیں وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں کہنے لگے کہ مصر کے بادشاہ نے ہمیں واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ اگر اپنے بھائی کو ساتھ نہیں لاؤ گے تو تمہیں بھی اناج نہیں ملے گا۔ اناج اور پانی انسان بلکہ ہر جاندار کی بنیادی ضروریات میں سے ہے اور اس کے لیے ہر انسان جدوجہد کرتا ہے کیونکہ بقائے حیات کیلئے جدوجہد (STRUGGLE سٹرگل) ضروری ہے۔ جو شخص ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کے لیے کوشش نہیں کرتا وہ خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے جو کہ قطعی حرام ہے۔ کہنے لگے بقائے حیات کے لیے اناج کی ضرورت ہے۔ اور وہ بن یامین کو ساتھ لے جائے بغیر حاصل نہیں ہوگا، لہٰذا آپ ضرور اسے ہمارے ساتھ بھیج دیں، ہم اس کی اچھی طرح نگہداشت کریں گے۔

باپ کا جواب

اس فرمائش کے جواب میں قَالَ یعقوب علیہ السلام نے کہا هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ میں نہیں امین سمجھتا تم کو یا نہیں اعتبار کرتا تم پر اس بچے کے متعلق مگر اسی طرح کہ جس طرح میں نے اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے متعلق کیا تھا مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں تم نے

میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی، تم نے اُس کی بھی حفاظت کا ذمہ اٹھایا تھا مگر اُس کو نجانہ سکے اور یوسف علیہ السلام کو ضائع کر دیا، اب اسی قسم کا اعتماد میں بن یامین کے بارے میں بھی کرتا ہوں، یعنی دوسرے لفظوں میں میں تم پر اعتماد نہیں کرتا کیونکہ تم پہلے ایک دفعہ ناکام ہو چکے ہو۔ اس سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ جس شخص نے کوئی غلطی کی ہو اُسے اُس غلطی سے آگاہ کر دینا چاہیے تو یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کی سابقہ غلطی اُن کو یاد دلا دی اور بتا دیا کہ تم پہلے ہی قصور وار ٹھہرائے جا چکے ہو، لہذا اب میں تم پر کیسے اعتماد کر سکتا ہوں تاہم خاندان کی ضروریات کے لیے چونکہ زیادہ غلے کی ضرورت ہے اس لیے میں بن یامین کو تمہارے ساتھ بھیجنے پر مجبور ہوں ورگرنہ میں تم پر اعتماد کھو چکا ہوں۔ اس کے باوجود میں اُسے سپردِ خدا کرتا ہوں فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا اللہ ہی بہتر حفاظت کرنے والا ہے، میں اسی کی سپرد داری میں نیچے کر دیتا ہوں وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ اور وہ سب سے بڑھ کر مہربانی کرنے والا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان بھی ہے۔ اَلْمُؤْمِنُ لَا يُلْدَغُ مِنْ جُحْرٍ مَّرَّتَيْنِ یعنی مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا۔ چونکہ یعقوب علیہ السلام کو بیٹوں کی طرف سے بداعتمادی پیدا ہو چکی تھی، اس لیے وہ بن یامین کو خوشی خاطر سے بھیجنے پر آمادہ نہ تھے۔

بیٹوں کی طرف سے اصرار

یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کے درمیان یہ مکالمہ اُن کے واپس پہنچتے ہی شروع ہو گیا۔ جب کہ انہوں نے ابھی تک مصر سے لایا جانے والا سامان کھولا بھی نہیں تھا وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ تو پائی انہوں نے اپنی پونجی واپس لوٹائی ہوئی۔ انہوں نے دیکھا

کہ غلے کی قیمت کے طور پر جو رقم وغیرہ انہوں نے مصر کے خزانے میں جمع کرائی تھی، وہ ان کے سامان میں موجود ہے۔ اس پر انہیں باپ کو قائل کرنے کے لیے ایک اور دلیل میسر آگئی۔ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا کہنے لگے، اے ہمارے باپ! مَا نَبْغِیْ ہم اور کیا چاہتے ہیں۔ دیکھو! هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا یہ رہی ہماری پونجی جو ہمیں واپس لوٹا دی گئی ہے۔ شاہِ مصر نے ہمیں غلہ بھی دے دیا ہے اور قیمت بھی وصول نہیں کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاہ نے دانستہ طور پر اُن کی رقم واپس کی ہے عزت و احترام سے ٹھہرایا ہے۔ مہمان نوازی کی ہے اور غلہ بھی دیا مگر قیمت بھی نہیں لی۔ چونکہ بادشاہ ہم پر اتنا مہربان ہے آپ ضرور ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیں تاکہ ہم دوبارہ اناج لا سکیں۔ اور دوسری بات یہ ہے وَنَمِیْرُ اَهْلَنَا اور ہمیں اپنے خاندان کے لیے اناج کی ضرورت بھی ہے لہٰذا ہم دوبارہ اناج لائیں گے وَنَحْفَظُ اَخَانَا اور اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ اور ایک اونٹ کا بوجھ غلہ ہم زیادہ بھی لائیں گے۔ جب ہمارا چھوٹا بھائی بھی ہمارے ساتھ ہوگا تو اس کے حصے کا غلہ بھی لے گا۔ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ یہ اناج جو اب ہم لائے ہیں۔ یہ ہماری ضروریات سے کم ہے۔ اب ہم دوبارہ اسی صورت میں مصر جا سکتے ہیں کہ چھوٹے بھائی کو بھی ہمراہ لے جائیں اور اپنے علاوہ اس کا اونٹ بھر غلہ بھی لے کر آئیں۔

اس واقعہ سے یہ قرینہ ملتا ہے کہ اگر کسی شخص کے سامان سے کوئی ایسی چیز مل جائے جس میں کسی غیر کا حق متعلق نہیں ہے تو پھر ایسی چیز میں تصرف کرنا روا ہوگا۔ بادشاہ کا حسن سلوک، مہمان نوازی اور مہربانی اس بات کا قرینہ تھیں کہ بادشاہ نے یہ پونجی از خود واپس کی ہے، لہٰذا اس کا دوبارہ استعمال جائز تھا۔ البتہ اگر کسی چیز کے متعلق شبہ ہو کہ یہ

سہواً آگئی ہے تو اس کی تحقیق ضروری ہوگی۔ ایسی چیز کا استعمال بغیر حقیقت معلوم کیے روا نہیں ہوگا۔

ضمانت کا مطالبہ

بیٹوں کی یہ باتیں سن کر یعقوب علیہ السلام بن یامین کو بھائیوں کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ تو ہو گئے مگر انہوں نے بیٹوں سے پختہ عہد اور ضمانت کا مطالبہ کیا۔ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ میں اُسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ یہاں تک تم مجھے اللہ کی طرف سے پختہ عہد و پیمان دے دو، یعنی خدا کی قسم اٹھاؤ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖ کہ تم اُسے ضرور میرے پاس واپس لاؤ گے اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ سوائے اس کے کہ تم گھیر لیے جاؤ یعنی راستے میں کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے کہ نہیں رکنا پڑ جائے، مغلوب ہو جاؤ یا سارے کے سارے ہلاک ہی ہو جاؤ۔ ایسی صورت میں تو کچھ نہیں ہو سکے گا، البتہ عام حالات میں تم اپنے بھائی کو واپس لانے کے پابند ہو گے۔ بائیبل کی روایت میں ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ پہلے یوسف، پھر شمعون مصر میں رک گیا، اب اگر باقی بیٹوں کو کچھ ہو گیا تو پھر میں تو بے اولادوں جیسا ہو گیا۔ بہرحال یہودا نے پوری ضمانت دی کہ وہ بن یامین کو ضرور واپس لائے گا، اور اگر نہ لا سکا تو بے شک میرے دونوں بیٹوں کو قتل کر دیا جائے۔ اُس نے اتنی بڑی ضمانت کی پیشکش کر دی۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی معاملہ میں ضمانت لینی جائز ہے۔ ضمانت دو قسم کی ہوتی ہے ایک مال کی اور دوسری جان کی۔ مالی ضمانت کے متعلق تمام فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ یہ جائز ہے۔ کوئی شخص عہد کرتا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ تک فلاں شخص فلاں چیز واپس نہیں کرے گا تو میں ادا کر دوں گا۔ البتہ شخصی ضمانت کے متعلق امام مالکؒ قائل نہیں۔ باقی تمام آئمہ کرام فرماتے ہیں کہ کسی کی شخصی ضمانت بھی دی جا

سکتی ہے یعنی اگر فلاں شخص فلاں تاریخ اور فلاں مقام پر حاضر نہ ہوا تو اس کے بدلے میں ضامن ماخوذ ہوگا۔

اسباب اور توکل

فرمایا، فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ جب بیٹوں نے باپ کو پختہ عہد دے دیا اور بن یامین کی واپسی کے ضامن بن گئے قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ تو یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ ہماری اس بات چیت پر اللہ ہی نگہبان ہے۔ ہم تو تمام احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے ہیں مگر اختیار سارا اُسی کا ہے، ہوگا وہی جو وہ چاہے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عہد و پیمان اور ضمانت تو لی جا سکتی ہے مگر اعتماد صرف خدا کی ذات پر ہی ہو سکتا ہے۔ پیغمبرانہ توکل اور ایمان کا یہی تقاضا ہے کہ اسباب مباح ہیں، انہیں اختیار کرنا چاہیئے۔ مگر بھروسہ صرف خدا کی ذات پر ہی ہونا چاہیے۔ قرآن پاک میں توکل علی اللہ کی بڑی تاکید آئی ہے جیسے اگلی آیت میں ہی آرہا ہے وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ "توکل کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں" وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ (ابراہیم) "اور کیا ہے ہمیں کہ ہم اللہ کی ذات پر بھروسہ نہ کریں"۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران) "مومن صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں"۔ بہر حال تمام انبیاء کا مشن اور طریقہ یہی ہے کہ ہر کام میں ضروری اسباب اختیار کرو مگر ان پر بھروسہ نہ کرو کیونکہ کامیابی کا دار و مدار اسباب پر نہیں بلکہ مشیتِ ایزدی پر ہے لہٰذا بھروسے کے لائق وہی ہے یہی بات یعقوب علیہ السلام نے بھی اس موقع پر فرمائی۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدۡخُلُوۡا مِنۡۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادۡخُلُوۡا
مِنۡ اَبۡوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ‌ ؕ وَمَاۤ اُغۡنِىۡ عَنۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ
مِنۡ شَىۡءٍ‌ ؕ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ‌ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ‌ ۚ
وَعَلَيۡهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ﴿۶۷﴾ وَلَمَّا دَخَلُوۡا
مِنۡ حَيۡثُ اَمَرَهُمۡ اَبُوۡهُمۡ ؕ مَا كَانَ يُغۡنِىۡ
عَنۡهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ اِلَّا حَاجَةً فِىۡ نَفۡسِ
يَعۡقُوۡبَ قَضٰٮهَا‌ ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ لِّمَا عَلَّمۡنٰهُ
وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۸﴾ ع ۸

ترجمہ :- اور کہا (یعقوب علیہ السلام نے) اے میرے بیٹو! نہ داخل ہونا ایک دروازے سے اور داخل ہونا جُدا جُدا دروازوں سے ، اور میں نہیں بچا سکتا تم کو اللہ کے سامنے کسی چیز سے ۔ نہیں ہے حکم مگر اللہ کے لیے ۔ اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی پر چاہیئے کہ بھروسہ کرنے والے لوگ بھروسہ کریں ﴿۶۷﴾ اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کو حکم دیا تھا ان کے باپ نے ، نہیں تھے وہ کہ بچا سکتے ان کو اللہ کے سامنے کسی چیز سے ۔ نہیں تھی مگر ایک بات یعقوب علیہ السلام کے جی میں جس کو انہوں نے پورا کیا ، اور بیشک وہ علم والے تھے اس

وجہ سے کہ ہم نے اُن کو سکھلایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (۶۸)

رابطہ آیات — حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کا حال بیان ہو رہا ہے وہ مصر سے اناج لے کر اپنے باپ کے پاس واپس کنعان آئے تو سفر کی ساری داستان سنائی اور یہ بھی بتایا کہ جب تک آپ ہمارے چھوٹے بھائی کو ہمراہ نہیں بھیجیں گے، آئندہ اناج نہیں ملے گا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے پریشانی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ پہلے بھی تم میرے ایک بیٹے کو ساتھ لے جا کر ضائع کر چکے ہو اور اب دوسرے کو بھی لے جانا چاہتے ہو۔ تاہم چونکہ مجبوری ہے، اناج بھی لانا ہے۔ اس لیے میں اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہوئے چھوٹے بیٹے کو بھیجنے پر آمادہ ہوتا ہوں، وہی اس کی حفاظت کرے گا اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

روانہ کرنے سے پہلے یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے عہد و پیمان لیا اور اُسے ضرور واپس لانے کی ضمانت بھی لی۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کا ایک بیٹا شمعون تو پہلے ہی مصر میں ٹھہر گیا تھا۔ باقی نو بھائی سب سے چھوٹے بھائی بن یامین کو لے کر دوبارہ مصر کی طرف روانہ ہوئے اور باپ کی نصائح پر عمل کرنے کا عہد بھی کیا۔

متفرق دروازوں سے داخلہ — منجملہ دیگر نصائح کے یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو ایک نصیحت بھی کی وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ فرمایا اے میرے بیٹو! شہر مصر میں کسی ایک ہی دروازے سے مت داخل ہونا وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔ قدیم زمانے میں شہروں کے گرد فصیل بنانے کا رواج ہوتا تھا اور شہر میں داخلے کے لیے اس کی مختلف سمتوں میں بڑے بڑے گیٹ بنائے جاتے تھے۔ یہ گوجرانوالہ چھوٹا سا شہر ہے جس کی زیادہ تر آبادی رنجیت سنگھ کے زمانہ میں شروع ہوئی۔ تاہم اس شہر کے چاروں طرف

بھی فصیل تھی جس میں لاہوری دروازہ، سیالکوٹی دروازہ، گجراتی دروازہ،
کھیالی دروازہ وغیرہ کے نام سے مختلف گیٹ تھے اور شہر میں داخلہ انہی
دروازوں سے ہوتا تھا۔ اس قسم کے انتظامات کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ کوئی بیرونی
حملہ آور یا چور ڈاکو شہر میں آسانی سے داخل نہیں ہو سکتے تھے، رات کو دروازے
بند کر دیئے جاتے تھے اور چاروں طرف فصیل کے اوپر چوکیدارہ نظام ہوتا تھا
اب شہری آبادی کا نظام یکسر تبدیل ہو چکا ہے تنگ مکانوں، تنگ بازاروں
اور تنگ گلیوں کی بجائے اب کھلی آبادی کو پسند کیا جاتا ہے، نیا شہر آباد کرتے
وقت سینکڑوں سال کی پیشگی منصوبہ بندی کر کے کھلی سڑکیں اور کھلے پلاٹ
رکھے جاتے ہیں۔ اب شہروں کی حفاظت کا انتظام بھی یکسر تبدیل ہو چکا ہے
اور تمام کام سائنسی بنیادوں پر کیے جاتے ہیں۔
بغداد بھی اپنے دور میں بہت بڑی آبادی کا شہر تھا منصور عباسی کے
زمانے میں جب اس کی تعمیر ہوئی تو اس کے ارد گرد دو بڑی بڑی فصیلیں
بنائی گئیں اور داخلے کے لیے مختلف اطراف میں گیٹ بنائے گئے۔ آج
تو دنیا بھر میں شہروں کی آبادی کروڑوں تک پہنچ چکی ہے، جاپان کا ٹوکیو،
چین کا بیجنگ اور شنگھائی اور انگلینڈ کے لندن کی آبادی ایک کروڑ سے
تجاوز کر چکی ہے۔ برصغیر میں کلکتہ اور بمبئی بڑے شہر ہیں۔ ہمارے ہاں
کراچی کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ لاہور تو بہت پرانا شہر ہے۔
بدھ کا دور آج سے تین ہزار سال پہلے کا دور ہے اور لاہور کے نشانات
اس سے بھی ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے ملتے ہیں۔ یہ تمام شہر بہت دور
دور تک پھیل چکے ہیں اور ان کے پھیلاؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔
لہٰذا اب فصیل کا نظام قابلِ عمل نہیں رہا، البتہ پرانے وقتوں میں فصیل
اور گیٹ کا نظام تھا۔ مصر بھی اس زمانے میں ایسا ہی شہر تھا۔ اس لیے
یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو نصیحت کی کہ سارے اکٹھے ہی دروازے

سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔

توکل برخدا

فرمایا یہ نصیحت میں تمہیں ظاہری اسباب کو اختیار کرنے کے لیے کر رہا ہوں، ورنہ حقیقت یہ ہے وَمَآ اُغْنِىْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ میں نہیں بچا سکتا تمہیں اللہ کے سامنے کسی چیز سے یعنی اگر مشیت الٰہی میں تمہیں کوئی حادثہ پیش آنا ہے تو اس کو میں نہیں ٹال سکتا، کیونکہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ حکم تو سارے کا سارا اللہ ہی کا ہے، وہ جیسے چاہے کرے، اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ میں بھی اسی پر بھروسہ کرتا ہوں وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ اور تمام بھروسہ کرنے والے بھی اسی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ میں تو محض حفاظتی تدابیر بتا رہا ہوں، ان کو اختیار کرنا مگر بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہی کرنا کیونکہ ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے اور اس کی تقدیر کو کوئی روک نہیں سکتا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا یُغْنِیْ حَذَرٌ عَنْ قَدَرٍ یعنی کوئی تدبیر تقدیر کو روک نہیں سکتی۔ چنانچہ آگے آ رہا ہے کہ جس چھوٹے بیٹے کے لیے باپ نے اس کے بھائیوں سے عہد و پیمان اور ضمانت لی۔ اسی کو مصر میں روک لیا گیا۔ اسی لیے یعقوب علیہ السلام نے پہلے ہی کہہ دیا کہ میں تمہیں اللہ کے سامنے کسی چیز سے بچا نہیں سکتا۔

اس نصیحت کی وجوہات

مفسرین نے مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی کئی وجوہات بیان کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سارے بھائی جوان، وجیہہ، خوبصورت اور طاقتور تھے اور ان سب کو ایک جتھے کی صورت میں دیکھ کر مقامی لوگ پریشانی میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ کہیں یہ اہل شہر کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں دوسری بات یہ ہے کہ جب یہ بھائی پہلی دفعہ آئے تھے تو شاہِ مصر

نے اِن کی بڑی آؤ بھگت کی تھی اور اب ان کی پھر خاطر مدارت ہوگی۔ اس خیال سے لوگوں کے دلوں میں اِن کے خلاف حسد بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ اور یعقوب علیہ السلام نہیں چاہتے تھے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہو خود بادشاہِ وقت کو بھی خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ لوگ اُس کے خلاف کوئی سازش یا جاسوسی نہ کریں۔ چنانچہ پہلی دفعہ جب آپ کے بھائی مصر میں آئے تھے تو یُوسف علیہ السلام نے اُن کے ساتھ دانستہ بے رُخی سے بات کی تھی اور آپ کی زبان سے یہ بھی نکلا تھا کہ تم کیسے یہاں آئے ہو، کہیں جاسوس تو نہیں۔ اس پہ بھائیوں نے جواب دیا تھا کہ ہم تو ایک معزز خاندان کے افراد اور نبی کے بیٹے ہیں اور ہمارا باپ نابینا ہو چکا ہے۔ بہر حال اس قسم کے خدشات کے پیشِ نظر یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی کہ ایک دروازے سے شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔ اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اتنے خوش شکل، نوجوان، اور وجیہہ بھائیوں کو دیکھ کر اہلِ شہر میں سے کسی کی نظرِ بد نہ لگ جائے، لہٰذا اکٹھے نہ داخل ہونا۔

مسئلہ نظر — بعض گمراہ یا اپنی ناقص عقل پہ انحصار کرنے والے لوگ نظر کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ برحق ہے اور اس کو شریعت تسلیم کرتی ہے اور یہ بھی کہ نظر لگ جانے سے نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ نظر لگنا یعنی زخمِ چشم برحق ہے اور یہ قدرت کی باتوں میں سے ایک بات ہے۔ بعض آدمیوں کی نظر لگ جانے سے اُس کے اثرات فوراً ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ درجہ اوّل کی صحیح حدیث میں ہے اَلْعَیْنُ حَقٌّ نظر حق ہے اور تقدیر سے سبقت کرنے والی کوئی چیز ہے تو وہ نظر ہے۔ اور پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس کا علاج بھی بتایا فرمایا اِذَا اسْتُغْسِلْتُمْ فَاغْسِلُوْا جب تم سے

غسالہ طلب کیا جائے تو فوراً دے دو۔ اس سے اللہ تعالیٰ شفا دیتا ہے مؤطا امام مالک میں یہی روایت موجود ہے کہ صحابی رسول حضرت سہیل ابن حنیف رضی اللہ عنہ کرتہ اتار کر اور تہ بند باندھ کر غسل کر رہے تھے تو ایک دوسرے صحابی عامر ابن ربیعہ رضی اللہ عنہ دیکھ کر کہنے لگے، کتنا خوبصورت جسم ہے، میں نے تو اتنا خوبصورت بدن کسی عورت کا بھی نہیں دیکھا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ حضرت سہیل رضی اللہ عنہ کو بخار ہو گیا اور وہ تڑپنے لگے۔ کسی نے آکر حضور علیہ السلام کو یہ خبر دی تو آپ نے حضرت عامر کو ڈانٹا اور فرمایا اَرْ مَا یَقْتُلُ اَحَدُکُمْ اَخَاہُ تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کو اس طرح ہلاک نہ کرے۔ تم نے اس کے لیے برکت کی دعا کیوں نہیں کی معلوم ہوا کہ جس شخص کی نظر لگ جاتی ہو تو اُسے یوں کہنا چاہیئے۔ بَارَکَ اللّٰہُ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دے۔ اگر ایسا کہے گا تو نظر کے بڑے اثرات ظاہر نہیں ہوں گے۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جس شخص کی نظر لگ گئی ہو وہ مریض کو اپنا غسالہ دے تاکہ اسے شفا حاصل ہو۔

عربوں میں غسالے کا طریقہ قبل از اسلام بھی رائج تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ جس شخص کی نظر لگ جائے اس کو پانی کا ایک پیالہ دیا جاتا ہے کہ اس پیالے میں اپنا ہاتھ دھوئے، پھر وہی پانی منہ میں ڈال کر اسی پیالے میں کلی کرے۔ پھر دایاں ہاتھ دھوئے۔ پھر بایاں۔ پھر دایاں گھٹنا دھوئے اور پھر بایاں۔ پھر سر نہ دھوئے اور اتنا عرصہ پیالہ ہاتھ میں پکڑے رکھے۔ نیچے زمین پر نہ رکھے۔ اس کے بعد اس پیالے کا سارا پانی اس شخص پر ڈال دیا جائے جس کو نظر لگ چکی ہے اس طرح اللہ کے حکم سے شفا ہو جاتی ہے حضور نے اس طریقہ کی تائید فرمائی ہے۔

نظر لگ جانا متعلقہ شخص کے جسمانی اثرات کی بنا پر ہوتا ہے اس کی

مثال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان میں ملتی ہے کہ مکھی کے دو پروں میں سے ایک میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے۔ اگر مکھی کسی مشروب میں گر پڑے تو وہ اپنا بیماری والا پَر اس میں ڈبوتی ہے جسکی وجہ سے ایسے مشروب کو استعمال کرنے سے بیماری لاحق ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے اس کا علاج یہ بنایا کہ جب مکھی گر پڑے تو اس کے دوسرے پَر کو بھی مشروب میں ڈبو کر مکھی کو باہر پھینک دو اور مشروب کو استعمال کرلو۔ اس طرح بیماری کے پَر کا اثر زائل ہو جائیگا۔

بشناک جسے کالی تھری بھی کہتے ہیں، ایک جنگلی جڑی بوٹی ہے۔ جس کے کھانے سے انسان اور جانور ہلاک ہو جاتے ہیں۔ جہاں یہ بوٹی پائی جائے اس کے قریب ہی اسی شکل وصورت کی دوسری جڑی بوٹی ہوتی ہے جو بشناک کا تریاق ہوتی ہے۔ تجربہ کار حضرات تبلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو اتنی سمجھ دے رکھی ہے کہ اگر وہ زہریلی بوٹی کھا لیں تو فوراً دوسری شفایاب بوٹی بھی کھاتے ہیں تاکہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کے جسم میں ایسی تاثیر رکھی ہے کہ ان کی نظر لگ جاتی ہے اور پھر اگر اس شخص کا غسالہ مریض کو دیا جائے تو اللہ تعالیٰ شفا بھی دے دیتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے نظر کی یہ دُعا بھی سکھلائی ہے اُعِیذُکَ بِکَلِمٰتِ اللّٰہِ التَّامَّۃِ مِنْ شَرِّ کُلِّ شَیْطٰنٍ وَّھَامَّۃٍ وَّمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّامَّۃٍ میں اللہ تعالیٰ کے کلماتِ تامہ کے ساتھ شیطان کے شر سے، موذی جانور کیڑے مکوڑے کے شر سے اور نظرِ بد کے شر سے پناہ پکڑتا ہوں۔

علم اور عمل

بہرحال برادرانِ یوسف باپ سے عہد و پیمان کر کے اور اس کی نصیحت سے کر مصر پہنچ گئے۔ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ

أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ پھر جب وہ داخل ہوئے جہاں سے اُن کے باپ نے انہیں حکم دیا تھا۔ یعنی وہ ایک دروازے سے داخل ہونے کی بجائے مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوئے، اور حقیقت یہ تھی مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ تو یعقوب علیہ السلام ان کو اللہ کے سامنے کسی چیز سے بچا تو نہیں سکتے تھے اِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ مگر صرف یعقوب کے جی میں ایک بات تھی قَضٰهَا جس کو انہوں نے پورا کیا۔ اور وہ یہی حفاظتی تدبیر تھی جس کی تشریح عرض کر دی گئی ہے کہ بیٹوں کو کہیں نظر نہ لگ جائے یا وہ کسی حادثہ کا شکار نہ ہو جائیں۔ اور یعقوب علیہ السلام نے یہ بات اس لیے کی وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ کہ وہ صاحبِ علم تھے اس وجہ سے کہ ہم نے انہیں علم سکھایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم کی دولت عطا فرمائی تھی۔ آپ اللہ کے نبی اور صاحبِ وحی تھے اور اسی علم کی بنا پر انہوں نے نظرِ بد سے بچاؤ کی تدبیر کی تھی۔ مگر اس کے باوجود بن یامین کو مصر میں روک لیا گیا جس کی وجہ سے یعقوب علیہ السلام کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا کیونکہ ابھی ابتلا کا دور باقی تھا اور آپ کو اس سے گزرنا تھا۔

امام سفیان ثوریؒ کا قول ہے مَنْ لَّا يَعْمَلُ بِمَا يَعْلَمُ لَا يَكُوْنُ عَالِمًا یعنی جو شخص علم رکھنے کے باوجود اُس کے مطابق عمل نہیں کرتا، وہ حقیقت میں عالم کہلانے کا حقدار نہیں۔ حضور علیہ السلام نے دعا میں بھی سکھایا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ اے اللہ! میں ایسے علم سے پناہ چاہتا ہوں جو مفید نہ ہو۔ غیر مفید علم کی مثال كَمَثَلِ كَنْزٍ لَا يَنْفَعُ ایسے خزانے کی ہے جسے خرچ ہی نہ کیا جائے۔ یہ تو بخل ہے جو بدترین بیماری ہے۔ بہر حال

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىٓ
اَنَا اَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۶۹﴾
فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِىْ
رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ
لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾
قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ
بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ
مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾
قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ
مَنْ وُّجِدَ فِىْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِى
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

ترجمہ:- اور جب وہ داخل ہوئے یوسف علیہ السلام کے پاس
تو جگہ دی انہوں نے اپنے پاس اپنے بھائی کو، اور اس سے کہا کہ
بیشک میں تیرا بھائی ہوں، پس تو غمگین نہ ہو ان باتوں پر جو یہ
کیا کرتے تھے ﴿۶۹﴾ پھر جب تیار کر کے دیا اُن کو ان کا
سامان تو رکھ دیا پانی پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں پھر
اعلان کیا ایک اعلان کرنے والے نے، اے قافلے والو! بیشک

تم البتہ چور ہو (۷۰) انہوں نے کہا اور وہ متوجہ ہوئے ان پر ، تم کیا چیز گم پاتے ہو (۷۱) انہوں نے کہا ہم گم پاتے ہیں بادشاہ کا پیمانہ ، اور جو شخص اس کو لائے گا اُس کے لیے ایک بوجھ اونٹ کا ہو گا (اناج) اور میں اس کا ذمہ دار ہوں (۷۲) کہنے لگے وہ اللہ کی قسم البتہ تم جانتے ہو کہ ہم نہیں آئے یہاں تاکہ ہم فساد کریں زمین میں ۔ اور نہیں ہم چوری کرنے والے (۷۳) انہوں نے کہا ، کیا ہوگا بدلہ اس کا اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے (۷۴) تو انہوں نے کہا کہ اس کا بدلہ یہ ہے کہ جس کے سامان میں پایا گیا ، وہی اس کا بدلہ ہوگا۔ اسی طریقے سے ہم بدلہ دیتے ہیں ظلم کرنے والوں کو (۷۵)

ربط آیات

حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کا ذکر ہو رہا ہے ۔ دوسری دفعہ مصر جانے کے لیے انہوں نے باپ کو آمادہ کر لیا کہ وہ سب سے چھوٹے بھائی بن یامین کو بھی ہمراہ لے جائیں گے کیونکہ اس کی عدم موجودگی میں عزیز مصر انہیں اناج نہیں دیگا۔ چنانچہ باپ سے عہد و پیمان کیے کہ وہ بن یامین کو بھی ضرور واپس لائیں گے ، چلتے وقت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو بعض حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی نصیحت بھی کی کہ مصر میں داخل ہوتے وقت کسی ایک دروازے سے سب کے سب اکٹھے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا ۔ مقصد یہ تھا کہ اکٹھے داخل ہونے کی صورت میں کوئی حادثہ پیش نہ آجائے یا کسی کی نظر نہ لگ جائے ۔ اب آج کے درس میں برادرانِ یوسف کے مصر میں داخلے اور وہاں پیش آنے والے بعض واقعات کا ذکر ہے ۔

بن یامین سے تعارف

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی دوبارہ مصر پہنچے اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ تو آپ نے اپنے بھائی بن یامین کو اپنے پاس پناہ دی ۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ برادرانِ یوسف جب دوسری مرتبہ مصر پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ ہم

آپ کی نصیحت کے مطابق چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لائے ہیں تاکہ دوبارہ اناج حاصل کرسکیں۔ یوسف علیہ السلام نے پہلے سے بھی بڑھ کر ان کی عزت افزائی کی۔ پھر آپ نے ایک وسیع دعوتِ طعام کا انتظام کیا جس میں سارے بھائیوں کو مدعو کیا اور دو دو بھائیوں کو ایک ساتھ مل کر کھانا کھانے کے لیے کہا۔ چنانچہ دس بھائی تو جوڑا جوڑا بیٹھ گئے، مگر بن یامین اکیلا رہ گیا۔ اس کو پریشان دیکھ کر یوسف علیہ السلام نے اسے اپنے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کے لیے کہا۔ اور اس طرح بن یامین کو بادشاہ کے ساتھ کھانا کھانے کا موقع مل گیا جو کہ بہت بڑا اعزاز تھا۔

اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب برادرانِ یوسف آپ کے پاس داخل ہوئے تو آپ نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی۔ پھر آپ نے اپنے بھائی سے اس کا نام پوچھا تو اس نے بن یامین بتایا۔ آپ نے فرمایا اس نام کا معنی کیا ہے تو بن یامین نے کہا کہ اس کا معنی ہے "گم کردہ کا فرزند" (والہ المشکل) کہنے لگا کہ جب میری ولادت ہوئی تو میری والدہ فوت ہوگئی تھی اگم ہوگئی تھی، اس لیے میرا یہ نام رکھا گیا۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا، کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ میں تمہارا گمشدہ بھائی تمہارے حق میں ہو جاؤں۔ تو چھوٹا بھائی کہنے لگا اے بادشاہ! آپ جیسا بھائی کس کو مل سکتا ہے، جس بھائی کو ہم نے گم پایا ہے وہ تو یعقوب اور راحیل نے جنا تھا مگر آپ تو ان کے فرزند نہیں ہیں۔ لہذا آپ جیسا بھائی تو کسی خوش بخت کا ہو سکتا ہے۔ اس پر یوسف علیہ السلام پر گریہ طاری ہو گیا، آپ نے بن یامین کو سینے سے لگا لیا، قَالَ إِنِّىٓ أَنَا۠ أَخُوكَ میں ہی تمہارا بھائی ہوں۔ اور پھر اس کو تسلی بھی دی فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ پس تم نہ غم کھاؤ ان باتوں پر جو تمہارے دوسرے بھائی کرتے تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ یا تمہارے

ساتھ جو بھی سلوک کیا اس کو دل سے نکال دو۔ بھائیوں نے جس طرح یوسف علیہ السلام کو سخت تکالیف پہنچائیں اسی طرح وہ بن یامین کی بھی تحقیر کرتے تھے، اُس کو طعن کرتے اور طرح طرح کی اذیت پہنچاتے تھے، تو یوسف علیہ السلام نے اُس کو تسلی دی، اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اپنے بھائیوں کے سامنے میرا تعارف نہ کرانا کیونکہ ابھی اس بات کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آئے گا تو میں خود اپنے آپ کو ظاہر کردوں گا۔

برادرانہ تعلقات

بھائیوں کا رشتہ بڑا اہم رشتہ ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے عزت اور قوتِ بازو بنتے ہیں۔ فارسی والے کہتے ہیں ۔

ہر کہ برادر نہ دارد   قوتِ بازو نہ دارد

جس کا بھائی نہیں ہوتا وہ قوتِ بازو سے خالی ہوتا ہے۔ اسی طرح مقولہ ہے۔ ہر کہ مادر نہ دارد، شفقت نہ دارد۔ جس کی ماں نہیں وہ شفقت سے محروم ہوتا ہے۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان بھی ہے اَلْمَرْءُ کَثِیْرٌ بِاَخِیْہِ آدمی بھائیوں کے ساتھ ہی زیادہ ہوا کرتا ہے۔ اس کے باوجود سوتیلے پن کی وجہ سے علاتی بھائیوں میں حسد، بغض اور عداوت بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو تکلیف بھی پہنچاتے ہیں۔ یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹوں کی چھوٹے بھائیوں سے عداوت اسی بنا پر تھی۔ اور پھر بعض اوقات بڑے بھائی چھوٹوں کے ساتھ بدسلوکی بھی کرتے ہیں، اُن کی حق تلفی کرتے ہیں۔ اُن کو اذیت پہنچاتے ہیں اور تحقیر آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اسی لیے فارسی والے کہتے ہیں "سگ باش، برادرِ خورد مباش" یعنی کتا بن جاؤ مگر چھوٹا بھائی نہ بن کیونکہ بعض اوقات محض چھوٹا ہونے کی وجہ سے تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ عربوں میں بھی یہ بیماری موجود تھی کہ بڑا

بھائی باپ کی ساری جائداد پر قابض ہو کر چھوٹے بھائیوں کو محروم کر دیتا تھا۔ بہر حال بھائی بھائی کا تعلق ایک لحاظ سے تو بڑا قیمتی ہے مگر بعض اوقات یہی تعلق حسد اور بغض کو جنم دیتا ہے۔ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر سورۃ مائدہ میں فرمایا ہے، وہ بھی تو حقیقی بھائی تھے مگر ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ یہاں بھی یوسف علیہ السلام کے تمام بھائی باپ میں شریک ہیں مگر ماں مختلف ہونے کی بنا پر چھوٹے بھائیوں سے سخت بدسلوکی سے پیش آئے۔ مکے کے مشرکین کا بھی یہی حال تھا۔ حضور علیہ السلام اُن کے بھائی، برادری والے اور قریبی رشتہ دار تھے، کوئی چچا تھے کوئی چچا زاد تھے مگر انہوں نے آپ کے ساتھ نہایت بُرا سلوک کیا۔ بہر حال یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی بن یامین کو تسلی دی کہ غمگین نہ ہو، میں ہی تیرا گمشدہ بھائی یوسف ہوں۔

بردرانِ یوسف کچھ دن آپ کے پاس ٹھہرے رہے اور مہمان نوازی کا لطف اٹھاتے رہے اور بالآخر ان کی واپسی کی تیاری ہو گئی اور ہر بھائی کو ایک ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ دے دیا گیا۔ اگلی آیت میں اسی واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جب ان کا سامان ان کو تیار کر کے دیا جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ تو پانی پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا۔ رحل کا لفظی معنی کجاوہ ہوتا ہے اور مراد سامان ہے جو کجاوے میں رکھا جاتا ہے۔ بہر حال غلہ بھرتے وقت پانی پینے کا پیالہ یا غلہ ماپنے کا پیمانہ بن یامین کے سامان میں رکھ دیا ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ پھر ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ اے قافلے والو! تم تو چور ہو۔

پیمانے کی گمشدگی

یہاں پر مؤذن کا لفظ آیا ہے جس کا معنی اعلان کرنے والا ہوتا ہے

اور اذان کا معنی اعلان ہے۔ ہر اعلان پر اذان کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر شرعی اصطلاح میں "اذان" مخصوص الفاظ کے ساتھ اور مخصوص مقصد یعنی نماز کے لیے منادی کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو فرشتے نے حضور کے ایک صحابی کو خواب میں تبلائے تھے اور کہا تھا کہ ناقوس وغیرہ بجانے کی بجائے نماز کا اعلان اِن الفاظ کے ساتھ کر لیا کرو۔ پھر حضور علیہ السلام نے اس کی تصدیق بھی فرمائی اِنَّ رُؤْیَا حَقٌّ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ یعنی اللہ نے چاہا تو یہ خواب برحق ہے۔ آپ نے فرمایا یہ الفاظ بلند آواز والے حضرتِ بلال ؓ کو تبلاؤ تاکہ وہ اِن الفاظ کے ساتھ نماز کی منادی کرے۔

جب برادران یوسف نے چوری کا یہ اعلان سُنا تو ششدر رہ گئے قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَیْهِمْ اُن اعلان کرنے والوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے مَاذَا تَفْقِدُوْنَ تم کیا چیز گم پاتے ہو؟ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ انہوں نے کہا، ہم بادشاہ کا پیمانہ گم پاتے ہیں۔ اور ساتھ پیمانہ تلاش کرنے والے کے لیے انعام کا اعلان بھی کیا، کہنے لگے وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِیْرٍ جو کوئی وہ پیمانہ تلاش کر کے لائے گا اُسے ایک اونٹ کا بوجھ بطور انعام دیا جائے گا۔ اور ساتھ یہ بھی وَاَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ اور میں اس بات کا ذمہ دار ہوں کہ انعام ادا کرنے میں دیر نہیں کی جائیگی۔

چوری کا الزام

اس واقعہ میں مفسرین کرام یہ اشکال پیش کرتے ہیں کہ جَعَلَ السِّقَایَةَ کی ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پانی کا پیالہ یا پیمانہ خود یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا اور پھر خود ہی بھائیوں پر چوری کا الزام لگایا۔ یہ اتہام ہے اور کبیرہ گناہ میں شامل ہے۔ اگر آپ کا کوئی کارندہ یہ کام کرتا تو مختلف بات ہوتی مگر یہ کام تو خود آپ نے کیا اور بھائیوں کو اس کا علم تک نہیں، تو خدا کے برگزیدہ نبی سے یہ کام کیسے سرزد ہوا؟ اس اشکال کی مفسرین کرام مختلف توجیہات پیش کرتے

ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ اِنَّکُمْ لَسٰرِقُوْنَ الزام نہیں بلکہ استفہام ہے یعنی بھائیوں سے دریافت کیا کہ کیا تم چور ہو ؟ اور استفسار غلط بیانی کی زد میں نہیں آتا۔

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ بھائیوں کے سامان میں برتن تو یوسف علیہ السلام نے رکھا تھا مگر اعلان کرنیوالے حکومت کے کارندے تھے جنہیں واقعی علم نہ تھا کہ برتن کیسے گم ہوا ہے اسلئے کارندوں کی طرف سے چوری کا الزام یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ مگر چونکہ اعلان کرنے والے حکومت کے حکم پر ایسا کر رہے تھے، لہذا حکومت اس الزام میں بالواسطہ شریک ہے اور اسے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ اس معاملہ میں اکثر مفسرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اِنَّکُمْ لَسٰرِقُوْنَ کے الفاظ چوری کا الزام نہیں بلکہ توریہ ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بات کرنے والا اپنی بات کا کوئی دُور کا مطلب لیتا ہے جبکہ سننے والا اُس کو عام فہم اور قریبی معنوں میں سمجھتا ہے۔ اس کو جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔ یہ تعریض یا توریہ ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ اِنَّ فِی التَّعَارِیْضِ لَمَنْدُوْحَةً یعنی بیشک تعریض میں انسان کے لیے بچاؤ کا سامان ہوتا ہے اور بعض مواقع پر توریہ کو اختیار کرنا جائز ہوتا ہے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں آتا ہے۔ کہ جب آپ کی قوم نے آپ کو اپنے ساتھ میلے میں لے جانا چاہا تو آپ نے فرمایا اِنِّیْ سَقِیْمٌ" (۳۷ - ۸۹) میں بیمار ہوں۔ اس سے آپ کا مطلب کچھ اور تھا مگر قوم نے سمجھا کہ آپ کسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہیں۔ پھر جب آپ وطن سے ہجرت کر کے مصر پہنچے تو آپ نے اپنی زوجہ محترمہ کے لیے اُختی یعنی بہن کا لفظ استعمال کیا۔ اس سے بھی سُننے والوں نے حقیقی بہن سمجھا جب کہ آپ کی مراد مختلف تھی۔ اس قسم کی بات کو توریہ کہا جاتا ہے۔ یہ صریح جھوٹ نہیں ہوتا، اور اس کی اجازت ہے۔ تو اس موقع پر اِنَّکُمْ لَسٰرِقُوْنَ کے الفاظ

کو یوسف علیہ السلام کی طرف بھی منسوب کیا جائے تو یہ توریہ ہوگا کیونکہ آپ کی مراد یہ تھی کہ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو سیر و تفریح کے بہانے باپ سے حاصل کیا اور پھر قافلے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جو کہ صریح چوری ہے۔ یوسف علیہ السلام کی مراد وہ سابقہ چوری تھی جب کہ آپ کے بھائی اسے پیمانے کی چوری پر محمول کر رہے تھے۔

خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہجرت کے واقعہ میں آتا ہے کہ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ محو سفر تھے کہ ایک ایسا شخص ملا جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو تو جانتا تھا لیکن حضور علیہ السلام کا روشناس نہیں تھا۔ ان دنوں حالت یہ تھی کہ مشرکین مکہ نے حضور علیہ السلام کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر سوا ونٹ کا انعام مقرر کر رکھا تھا اور اس انعام کے لالچ میں لوگ چاروں طرف دوڑ رہے تھے۔ ایسی حالت میں اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کا تعارف اس شخص سے کرا دیتے تو آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ تمہارے ساتھ کون ہے تو آپ نے جواب دیا رَجُلٌ یَّهْدِیْنِی السَّبِیْلَ ایک آدمی ہے جو میری راہنمائی کر رہا ہے۔ وہ شخص سمجھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوئی راستہ بتانے والا یعنی بدرقہ ہے حالانکہ آپ کی مراد یہ تھی کہ میرے ساتھ اللہ کا راستہ بتانے والا ہے بہر حال اس موقع پر یوسف علیہ السلام کا بھائیوں سے یہ کہنا کہ تم چور ہو، پیالے کے چور نہیں تھا بلکہ خود یوسف علیہ السلام کے چور ہونا مراد تھی اور ایسا کہنے پر کوئی الزام نہیں آسکتا کیونکہ تعریض اچھی تھی۔

اس آیت کریمہ میں گم شدہ چیز کو صواع کا نام دیا گیا ہے۔ صواع اور صاع ایک ہی چیز ہے۔ اس میں سقایہ کا لفظ بھی آیا ہے جس کا معنیٰ پینے کا پیالہ ہوتا ہے۔ اور صاع چار سیر کا ایک پیمانہ ہوتا ہے جس

سے غلہ وغیرہ ماپتے ہیں۔ دراصل گمشدہ چیز چاندی کا بنا ہوا ایک برتن تھا ہو سکتا ہے کہ اُس میں پانی بھی پیتے ہوں، اس لیے اُسے سقایہ کہا گیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس برتن کے ساتھ لوگوں کو غلہ ماپ کر دیتے ہو اور اس لحاظ سے یہ صواع یا صاع کہلاتا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ قحط کے دنوں میں یہ برتن ایک معیاری پیمانہ تھا جس کے ساتھ اناج ماپ کر دیا جاتا تھا۔ اور یہی برتن برادران یوسف کے سامان میں رکھ دیا گیا اور پھر اس کی گمشدگی کا اعلان بھی کیا گیا۔

برادران یوسف کا انکار

بہرحال جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر چوری کا الزام لگایا گیا قَالُوْا تَاللّٰہِ تو وہ کہنے لگے، اللہ کی قسم لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ تم جانتے ہو کہ ہم زمین میں فساد کرنے کے لیے نہیں آئے وَمَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ اور ہم چور بھی نہیں ہیں۔ چوری کو فساد فی الارض کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے شریعت میں خلل واقع ہوتا ہے۔ تمام آسمانی ادیان میں چوری واجب التعزیر ہے اور تمام سابقہ شرائع میں اس کی سزا مقرر رہی ہے۔ بعض شریعتوں میں جرمانے کی سزا مقرر تھی اور بعض میں قید کر لے گی۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور ہماری شریعت میں چور کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر ہے یہ فساد فی الارض اور کبیرہ گناہ ہے۔ چوری کا ارتکاب تو مسلمانوں کی شان کے بالکل خلاف ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مشرقی ممالک خصوصاً اسلامی ممالک میں چوری کی وبا عام ہے۔ اس کے علاوہ قتل و غارت اغوا اور بدکاری جیسی بیماریاں غیر مسلموں کی نسبت مسلمانوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ بھکاری بھی مسلمانوں میں زیادہ ہیں۔ یورپ کے بڑے چھوٹے چھوٹے ملک ہیں، مگر کوئی شخص بھیک مانگتا نظر نہیں آتا۔ حکومت کا مناسب انتظام ہے۔ اگر بیمار ہو گیا تو مفت علاج کی سہولت میسر ہے

اور کسی وجہ سے بیکار ہے تو حکومت بیکاری الاؤنس دیتی ہے۔ لہٰذا بھیک مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہمارے ہاں گلی کوچے، شہر اور بازار بھکاریوں سے بھرے پڑے ہیں۔ کسی پبلک مقام پر چلے جائیں کہیں سفر کرنا ہو۔ خریداری کرنا ہو، ہر جگہ بھکاری آپ کا استقبال کریں گے حالانکہ ہمارے دین میں گداگری حرام ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ چوری، ڈکیتی، قتل، اغوا، دھوکہ وغیرہ جیسے ناجائز پیشوں میں گداگری بھی شامل ہے۔

چوری کی سزا

بہر حال برادران یوسف نے کہا کہ ہم چور نہیں ہیں اور نہ زمین میں فساد برپا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس کے بعد قَالُوْا حکومت کے کارندوں نے کہا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو اس کی سزا کیا ہوگی یعنی اگر گمشدہ پیمانہ تمہارے سامان سے برآمد ہوگیا تو پھر تمہارے لیے کیا تاوان ہوگا قَالُوْا برادران یوسف کہنے لگے جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ جس کے سامان سے پیمانہ برآمد ہوا، وہ اس کا بدلہ ہوگا۔ یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں چور کی سزا یہ تھی کہ اُسے مالک کا ایک سال کے لیے غلام بن کر رہنا پڑتا تھا۔ ایسا شخص سال بھر مال مسروقہ کے مالک کی خدمت کرتا تھا تو پھر اُس کی جان چھوٹتی تھی۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو یقین تھا کہ انہوں نے تو چوری نہیں کی۔ لہٰذا انہوں نے کنعان کا قانون بتلا دیا کہ وہاں پر چور کو ایک سال تک غلامی کرنا پڑتی ہے۔ کہنے لگے كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ہم تو ظلم کرنے والوں کو یہی بدلہ یعنی سزا دیتے ہیں۔

بہر حال اس طریقے سے یوسف علیہ السلام کو ایک بہانہ میسر آگیا کہ وہ اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک سکیں۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا
مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ
لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ
دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾
قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا
يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ
شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا
الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ
اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ
نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا
لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ ع ۹/۲

ترجمہ:- پس شروع کیا (یوسف علیہ السلام نے تلاشی لینا) اُن کے سامان کی اپنے بھائی کے سامان سے پہلے۔ پھر اُس پیمانے کو نکالا اپنے بھائی کے سامان سے۔ اس طریقے سے ہم نے تدبیر کی یوسف علیہ السلام کے لیے۔ نہیں تھے وہ کہ لے لیتے اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون میں مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم بلند کرتے ہیں درجے جس کے چاہتے ہیں اور ہر علم والے کے اُوپر ایک جاننے والا ہے (۷۶) کہا (اِن بھائیوں نے)

اگر چوری کی ہے اس نے تو بیشک چوری کی تھی اس کے بھائی نے بھی اس سے پہلے ۔ پس پوشیدہ رکھا اس بات کو یوسف (علیہ السلام) نے اپنے جی میں اور ظاہر نہیں کیا اس کو ان کے سامنے ، اور کہا کہ تم لوگ بدتر ہو درجے میں ، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم بیان کرتے ہو (۷۷) تو وہ کہنے لگے اے عزیز ! بیشک اس کا باپ بہت بوڑھا ہے ، پس لے لے ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ ۔ تحقیق ہم خیال کرتے ہیں تیرے بارے میں کہ تو احسان کرنے والوں میں سے ہے (۷۸) کہا یوسف نے پناہ خدا اس بات سے کہ ہم لے لیں مگر اسی کو کہ جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے ۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو بیشک ہم اس وقت البتہ ضرور زیادتی کرنے والوں میں ہوں گے (۷۹)

ربط آیات گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ پانی پینے کا پیالہ بن یامین کے سامان میں رکھ دیا گیا ، اور پھر ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا کہ اے قافلے والو تم چور ہو ۔ برادران یوسف نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ نہ تو ہم زمین میں فساد برپا کرنے کے لیے آئے ہیں اور نہ ہی ہم چور ہیں ۔ پھر بادشاہ کے کارندوں نے کہا کہ اگر چوری ثابت ہو جائے تو چور کی سزا کیا ہے تو بھائیوں نے کہا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت کے مطابق چور کو ایک سال تک مسروقہ مال کے مالک کی غلامی کرنا پڑتی ہے ۔ اب آج کے درس میں بھائیوں کے سامان کی تلاشی اور پیالہ برآمد ہونے کا ذکر آ رہا ہے ۔

سامان کی تلاشی ارشاد ہوتا ہے فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ پس یوسف علیہ السلام نے سب بھائیوں کے سامان کی تلاشی شروع کی اپنے بھائی کے سامان سے پہلے ۔

وِعَا کا معنی ظرف یا برتن ہوتا ہے، تاہم اس کا اطلاق ہر اس بوری، توڑے یا تھیلہ وغیرہ پر بھی ہوتا ہے جس میں کوئی چیز رکھ کر اُسے بند کر دیا جائے۔ تو اس سے مراد وہ بوریاں ہیں کہ جن میں غلہ بند کر کے برادرانِ یوسف کو دیا گیا تھا۔ اب گمشدہ پیمانے کی بازیابی کے لیے غلے کی بوریاں کھول کر تلاشی لی گئی۔ اور یوسف نے بن یامین کے علاوہ باقی بھائیوں کی تلاشی پہلے شروع کی۔ جب اُن سب کے سامان کی تلاشی لی جا چکی اور گمشدہ پیمانہ برآمد نہ ہوا تو آخر میں بن یامین کا سامان کھولا گیا۔ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَاءِ اَخِيْهِ پھر اُس پیمانے کو نکال لیا اپنے بھائی کی بوری سے۔ جب گمشدہ مال برآمد ہو گیا تو برادرانِ یوسف مجبور ہو گئے اس سے پہلے وہ خود چور کی سزا بھی بتا چکے تھے اور اب بن یامین چور ثابت ہو چکا تھا۔

بھائیوں کا ردِعمل

اس موقع پر بھائیوں کا فوری ردِعمل یہ تھا قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ کہنے لگے اگر بن یامین نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کا بھائی یوسف بھی چوری کا ارتکاب کر چکا ہے۔ دراصل بڑے بھائی کا سارا بوجھ چھوٹے بھائیوں پر ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دینا چاہتے تھے۔ مگر وہ یہ بات بھول گئے کہ اس سے پہلے وہ "وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ" کہہ کر سب کی برأت کر چکے تھے مگر اب نہ صرف بن یامین کی چوری کی تصدیق کی بلکہ اُس کے بے گناہ بھائی یوسف علیہ السلام پر چوری کا مزید الزام لگا دیا۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ بھائیوں نے بن یامین کو ڈانٹ پلائی اور کہنے لگے، راحیل کے بیٹو! تمہاری وجہ سے ہم پر بھی مصیبت آئی ہے۔ بنیامین بھی اپنے بھائی یوسف علیہ السلام سے متعارف ہونے کے بعد حوصلہ مند ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً بھائیوں کو جواباً کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ ہماری وجہ سے تم پر مصیبت نہیں آئی بلکہ تم نے ہمیشہ ہمیں اذیت پہنچائی ہے۔ یوسف علیہ السلام کو

ساتھ سے کر جنگل میں گم کر دیا، باپ کو سخت اذیت پہنچائی اور میرے ساتھ بھی ہمیشہ بدسلوکی کرتے رہے۔ لہٰذا تم گنہگار ہو۔ بھائیوں نے کہا کہ چور تو ہے کیونکہ پیالہ تیرے سامان سے نکلا ہے۔ بن یامین نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ مجھے کیا علم ہے کہ میرے سامان میں یہ پیالہ کس نے رکھ دیا ہے۔ شاید یہ اُسی شخص نے رکھ دیا ہو جس نے پہلے موقع پر تمہارے سامان میں تمہاری پونجی رکھ دی تھی اور پھر واپس جا کر آپ سے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا یہ ہے ہماری پونجی جو ہمیں واپس لوٹا دی گئی ہے۔ اُس وقت تم تم نے اپنے آپ کو چور ثابت نہیں کیا۔ اب مجھے اور میرے بھائی دونوں کو چور ثابت کرنے پر تُلے بیٹھے ہو۔ اب بھائی لاجواب ہو گئے کیونکہ وہ ایک بات جلد بازی میں بغیر سوچے سمجھے کر چکے تھے۔

بھائیوں نے یوسف علیہ السلام پر چوری کا الزام لگایا، اس کے متعلق مفسرین مختلف روایات بیان کرتے ہیں۔ پہلی رائے یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام چوری کے کسی معاملے میں کبھی ملوث نہیں ہوئے اور بھائیوں کی الزام تراشی محض اپنے آپ کو پاک قرار دینے کا ایک ذریعہ تھا۔ البتہ دوسری رائے یہ ہے کہ بچپن میں یوسف علیہ السلام کے ساتھ بھی اس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا جس طرح کا واقعہ بن یامین کے ساتھ مصر میں پیش آیا اور جس کی بناء پر اس پر چوری کا الزام لگایا گیا۔ اپنی والدہ کی وفات کے بعد یوسف علیہ السلام اپنی پھوپھی کی کفالت میں چلے گئے۔ اس دوران میں پھوپھی آپ سے بہت مانوس ہو گئی۔ پھر جب کچھ عرصہ بعد باپ نے یوسف علیہ السلام کو واپس بلانا چاہا تو پھوپھی کی محبت آڑے آئی۔ وہ آپ کو جدا نہیں کرنا چاہتی تھی مگر یعقوب علیہ السلام اس پر مصر تھے۔ اس پر پھوپھی نے یہ تدبیر بنائی کہ اپنا ایک پٹکا یوسف علیہ السلام

یوسف علیہ السلام پر الزام

کی کمر سے باندھ دیا۔ پھر خود ہی پٹکے کی گمشدگی کا اعلان کر کے اِدھر اُدھر تلاش شروع کر دی اور بالآخر اُسے یوسف علیہ السلام کی کمر سے برآمد کر لیا۔ اس وقت کے قانون کے مطابق سارق کو مال مسروقہ کے مالک کے پاس ایک سال تک رہ کر خدمت کرنا ہوتی تھی، لہٰذا اس بہانے سے پھوپھی نے یوسف علیہ السلام کو اپنے پاس روک لیا۔ یہ تھا وہ سرقہ جس کا انکشاف برادرانِ یوسف نے مصر میں جا کر کیا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے بن یامین کو اپنے پاس روک رکھنے کے لیے جو تدبیر اختیار کی تھی۔ بن یامین کو اس سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا اور بنیامین نے اس تدبیر سے اتفاق کا اظہار کیا تھا۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کی پھوپھی نے آپ کے ساتھ جو کارروائی کی تھی وہ بھی آپ کی رضامندی سے کی تھی۔ اِن دونوں واقعات کو ظاہراً تو چوری پر محمول کیا جا سکتا ہے اور ان پر قانون بھی جاری ہو سکتا ہے مگر حقیقت میں دونوں واقعات چوری کے ارتکاب نہ تھے اور نہ دونوں پر چوری کی سزا عائد ہوتی تھی۔

یہاں پر غلامی کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ دونوں واقعات میں یوسف علیہ السلام کی پھوپھی نے یوسف علیہ السلام اور خود یوسف علیہ السلام نے بن یامین کو غلام بنایا حالانکہ انفرادی طور پر کسی آزاد کو غلام بنانا قطعی حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ قدیم زمانے میں جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنایا جاتا تھا اور اس بات کا فیصلہ بھی حکومتِ وقت کرتی تھی، کسی فردِ واحد کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی، مگر اِن دونوں بھائیوں کو غلام کیسے بنا لیا گیا؟ اس ضمن میں بھی مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ دونوں واقعات میں نہ تو چوری کا ارتکاب ہوا اور نہ ہی کسی کو غلام بنایا گیا بلکہ یہ تو محبت کی وجہ سے اپنے پاس روک لینے کے بہانے تھے۔ بہر حال یوسف علیہ السلام

نے کبھی چوری نہ کی تھی اور آپ کے بھائیوں کا الزام محض اپنی پاکدامنی کی تائید میں تھا۔

یوسف علیہ السلام کے تاثرات

جب یوسف علیہ السلام پر آپ کے بھائیوں نے چوری کا الزام عائد کر دیا فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ تو یوسف علیہ السلام نے اس بات کو اپنے دل میں چھپائے رکھا وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ اور اسے اپنے بھائیوں پر ظاہر نہ کیا (اس الزام کی اصل حقیقت کیا ہے) بلکہ صرف اتنا کہا قَالَ أَنْتُمْ شَرٌّ مَكَانًا کہ تم بہت برے درجے پر ہو جو بگیا ہوں کو چور تبلاتے ہو اور خود اپنی کرتوتوں پر پردہ ڈال رہے ہو۔ یوسف علیہ السلام کے بچپن میں ایک تو پٹکے والا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آپ پر الزام ایک مرغی کی وجہ سے آیا تھا جو آپ نے گھر سے اجازت لیے بغیر کسی محتاج کو دے دی تھی۔ بہر حال پٹکے کا مسئلہ تھا یا مرغی کا، اس پر تھوڑے بہت مال کی چوری کا ہی الزام تھا۔ اور اُدھر بن یامین کے خلاف بھی پیالے کی گمشدگی کا معاملہ تھا اور اس کا تعلق بھی مال ہی سے تھا۔ اس کے برخلاف یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حال یہ تھا کہ انہوں نے جیتے جاگتے ایک آزاد انسان کو چند ٹکوں کے عوض فروخت کر دیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے "وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ" کیا معمولی سے مال میں تصرف کر لینا زیادہ جرم ہے یا باپ کے محبوب ایک آزاد شخص کو معمولی قیمت پر فروخت کر دینا زیادہ قبیح ہے؟ تم تو چوروں سے بھی زیادہ بڑے مجرم ہو جو ایک عظیم باپ کی اذیت کا باعث بنے۔ یوسف علیہ السلام نے مزید فرمایا، وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم بیان کر رہے ہو یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے جھوٹ اور سچ ہر چیز سے واقف ہے۔

تدبیرِ خداوندی

اُدھر جب بن یامین کے سامان سے شاہی پیمانہ برآمد ہو کر آپ کو روک لینے کا انتظام ہو گیا تو اللہ نے فرمایا کَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ اسی طریقے سے ہم نے یوسف علیہ السلام کے لیے تدبیر کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس تدبیر کو اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ ہم نے آپ کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ اس طریقے سے تم اپنے بھائی کو اپنے پاس روک سکتے ہو، کیونکہ صورتِ حال یہ تھی مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ بادشاہِ مصر کے قانون (LAW لاء) کے مطابق یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو نہیں روک سکتے تھے۔ کیونکہ مصری قانون کے مطابق چور کو کوڑے لگائے جا سکتے تھے یا جرمانے کی سزا دی جا سکتی، اُسے روکا نہیں جا سکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے یہ بندوبست کر دیا کہ خود برادرانِ یوسف نے کنعانی قانون کے مطابق سال بھر تک روک لینے کی سزا کا ذکر کر دیا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ہم نے تدبیر کی۔ اور پھر یہ ہے کہ تدبیر مطلقاً بھی ہوتی ہے۔ اور تدبیر برائی کے لیے بھی ہوتی ہے۔ کَید کا معنی تدبیر بھی ہے اور مکر بھی جیسے سورۃ طارق میں فرمایا "اِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ٥ وَأَكِيدُ كَيْدًا" وہ بھی تدبیر کرتے ہیں اور میں بھی تدبیر کرتا ہوں۔ تو فرمایا بن یامین کو ملکی قانون کے مطابق روکا نہیں جا سکتا تھا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ جب اللہ کی مشیت ہوئی تو اس نے اس تدبیر کے ذریعے بن یامین کو روک لینے کا بندوبست کر دیا۔

علم کی فضیلت

اللہ نے فرمایا نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاءُ ہم بلند کرتے ہیں درجات جس کے چاہتے ہیں وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اور ہر اہلِ علم کے اوپر ایک دوسرا علم والا ہوتا ہے۔ اور اس کی انتہا یہ ہے کہ تمام علم والوں کے اُوپر علیمِ کل ہے جو واحد ذاتِ خداوندی ہے ساری مخلوق کا علم محدود ہے جب کہ علیمِ کل کا علم لامحدود ہے۔ کمال حاصل

کرنے کا ذریعہ علم ہے اور اسی کے ذریعہ انسان خدا تک رسائی حاصل کرتا ہے پوری انسانیت علم ہی کی روشنی میں ترقی کرتی ہے اور حقیقی علم وہ ہے جو وحی الٰہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ علم کی اصل تین چیزیں ہیں۔ آیاتِ محکمہ، سنتِ قائمہ اور فریضہ عادلہ۔ آیاتِ محکمہ سے مراد قرآن پاک سنت قائمہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور فریضہ عادلہ وقضا یا فیصلہ (JUDGMENT ججمنٹ) جس کے ذریعہ تنازعاتِ امور کو نپٹایا جاتا ہے۔ یہ تین علوم اصلی ہیں اور باقی تمام علوم خواہ وہ کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، زائد ہیں اور درجہ دوم میں آتے ہیں۔ مخلوق میں سے کسی کا علمِ ذاتی نہیں بلکہ اُس کے پاس عارضی ہے۔ ذاتی علم فقط ذاتِ خداوندی کا ہے جس کے تقاضے سے وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

حیلہ سازی کی شرعی حیثیت

یوسف علیہ السلام نے جو تدبیر اختیار کی وہ حصولِ مقصد کے لیے ایک حیلہ تھا۔ شریعت نے بعض حیلوں کو جائز قرار دیا ہے اور بعض کو ناجائز اور حرام۔ کل میں نے ابراہیم علیہ السلام کی حیلہ سازی کا ذکر کیا تھا اور یوسف علیہ السلام کا حیلہ بھی ایسا ہی تھا۔ اسے توریہ یا تعریض بھی کہتے ہیں جو حیلہ صریح جھوٹ یا حرام کام سے بچنے کے لیے اختیار کیا جائے، وہ جائز ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی قسم کا حیلہ حضرت ایوب علیہ السلام کو بھی سکھایا تھا۔ آپ اپنی بیوی سے کسی وجہ سے ناراض ہو کر قسم اٹھا بیٹھے کہ اُسے سو کوڑے ماروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی نازل فرمائی کہ یہ عورت تو بے قصور ہے، اس کی غلطی اتنی سنگین نہیں کہ اسے سو کوڑے مارے جائیں اُدھر ایوب علیہ السلام نے قسم بھی اٹھا رکھی تھی، اگر وہ پوری نہ کرتے تو گنہگار ہوتے۔ چنانچہ ایوب علیہ السلام کو حانث ہونے سے بچانے کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے یہ تدبیر بتلائی اور فرمایا وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ (ص)

سو تنکوں کا ایک گٹھا لیں اور بیوی کو ایک ہی دفعہ مار دیں۔ اس سے کوڑوں کی قسم پوری ہو جائے گی اور آپ حانث نہیں ہونگے، مطلب یہ کہ یہ ایک حیلہ تھا جس کے ذریعے ایک بےگناہ کو سزا سے بچانا مطلوب تھا۔

اس قسم کا حیلہ خود حضور علیہ السلام نے ایک موقع پر بتایا تھا۔ آپ نے ایک عامل کو کھجوریں لانے کے لیے خیبر بھیجا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے اعلیٰ درجے کی کھجوریں حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا خیبر میں ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں اس شخص نے جواب دیا ایسا تو نہیں ہے بلکہ وہاں ادنیٰ قسم کی کھجوریں بھی ہوتی ہیں مگر ہم یہ کرتے ہیں کہ ادنیٰ قسم کی دو یا تین صاع کھجوروں کے بدلے اعلیٰ قسم کی ایک صاع حاصل کر لیتے ہیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا بڑے افسوس کی بات ہے۔ ذٰلِکَ عَیْنُ الرِّبٰوا یہ تو عین سود ہے۔ کیونکہ کسی ایک جنس کا تبادلہ اسی جنس کے ساتھ برابری کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر اجناس مختلف ہوں تو پھر کمی بیشی جائز ہے، مثلاً گندم کے عوض جو یا باجرہ یا کھجور کے عوض کشمش کم و بیش وزن سے لے سکتے ہو مگر ہم جنس چیزوں میں ایسی کمی بیشی جائز نہیں ہے۔ ایسی اشیاء کے تبادلے کی نسبت ایک اور چارہی ہو سکتی ہے مگر جو کام تم نے کیا ہے۔ یہ جائز نہیں ہے وہ شخص پریشان ہو گیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حرام سے بچنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ بیع الجمع بالدراھم تمام کھجوروں کو درہم و دینار کے بدلے میں بیچ دو اور پھر اس پونجی کے ساتھ اعلیٰ قسم کی کھجوریں خرید لو۔ اگر نقد رقم میسر نہ ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک جنس کے بدلے دوسری جنس حسب منشا بھاؤ سے خرید لو اور پھر اس جنس سے اپنی مطلوبہ قسم کی شے لے لو۔ یہ بھی درست ہے۔ گویا آپ نے حرام سے بچنے کا ایک حیلہ بتا دیا۔

حرام حیلہ

البتہ حرام اور ناجائز حیلہ وہ ہے جو کسی فرض یا واجب کو ساقط کرنے کے لیے اختیار کیا جائے۔ مثلاً خاوند پر کسی مال کی زکوٰۃ قریب الادا ہے۔ یعنی کچھ عرصہ بعد اُس مال پر سال پورا ہو کر زکوٰۃ واجب الادا ہو جائے گی تو فرض کی اس ادائیگی سے بچنے کے لیے خاوند وہ مال اپنی بیوی کو ہبہ کر دیتا ہے۔ پھر بیوی وہ مال سال کا بیشتر حصہ اپنے پاس رکھ کر پھر خاوند کو ہبہ کر دیتی ہے۔ اس طرح اُس مال پر نہ کسی کے پاس سال پورا ہوتا ہے اور نہ وہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے، تو ایسا حیلہ قطعی حرام ہوگا۔ بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اُن کے پاس رقم موجود ہے جس پر سال پورا ہونے والا ہے تو وہ سال پورا ہونے سے پہلے اُس رقم سے کوئی ایسی چیز خرید لیتے ہیں جس سے زکوٰۃ سے بچ جائیں حالانکہ انہیں اتنی جلدی وہ چیز خریدنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ بھی غلط ہے۔ تو بہر حال حیلہ وہ جائز ہے جو گناہ سے بچنے کے لیے اختیار کیا جائے جیسے ابراہیم، یوسف اور ایوب کے حیلوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور جس حیلے سے فرض یا واجب کو ساقط کرنا مقصود ہو وہ حرام ہے۔

برادران یوسف کی عاجزی

مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی بڑے جوان اور طاقتور تھے۔ جب یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو روک لینے پر اصرار کیا تو بھائیوں نے بڑا جوش وخروش دکھایا اور بن یامین کو زبردستی چھڑانے کی دھمکی بھی دی۔ اس پر یوسف علیہ السلام نے ایک بڑے طاقتور بھائی کو ایک ہی ٹھوکر سے گرا دیا اور اُن کو پتہ چل گیا کہ یہاں پر اُن کی طاقت بھی کام نہیں آسکتی۔ جب اس طرف سے ناکام ہو گئے تو عاجزی پہ اُتر آئے اور یوسف علیہ السلام کی منت سماجت کی قَالُوا يَٰٓأَيُّهَا الْعَزِيزُ کہنے لگے، اے عزیز! بھائیوں کا یہ خطاب عہدے کے لحاظ سے تھا کیونکہ جس عزیز مصر کے گھر میں پرورش پائی تھی اسکی

وفات کے بعد یوسف علیہ السلام اسی عہدے پر متمکن ہوئے تھے۔ البتہ بادشاہ مصر نے آپ کو عزیز سے کہیں زیادہ اختیارات دے کر خود مختار بنا دیا تھا۔ بہر حال بھائیوں نے آپ کو عزیز کے خطاب سے ہی مخاطب کیا، کہنے لگے، اے عزیز! اِنَّ لَهٗ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا بنیامین کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے، خدا کے لیے فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ اس کی بجائے ہم میں سے کسی ایک کو روک لے اور اسے چھوڑ دے ورنہ باپ کو بڑی پریشانی ہوگی۔ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ہم آپ کو نیکی والے دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے پہلے ہی ہم پر بڑے احسان کیے ہیں۔ ہماری مہمان نوازی کی، شاہی مہمان بنایا اور مفت اناج دیا، آپ بڑے محسن ہیں، اب ہماری یہ درخواست بھی قبول کر لیں کہ بن یامین کو ہمارے ساتھ ہی جانے دیں اور اس کے بدلے میں ہم میں سے کوئی ایک آدمی روک لیں۔ اس کے جواب میں یوسف علیہ السلام نے کہا قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ پناہ بخدا یعنی میں خدا تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ کہ ہم اس شخص کے سوا دوسرے کو روک لیں جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے۔ ہم تو اپنے ملزم ہی کو روکیں گے، اس کے بدلے میں کسی بے گناہ کو سزا نہیں دے سکتے، کیونکہ ملت ابراہیمی کا اصول یہی ہے "اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى" (النجم) جو کرے وہ بھرے، ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا جاتا۔ فرمایا اگر ہم بے قصور کو پکڑ لیں گے اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ تو ہم زیادتی کرنے والوں میں ہو جائیں گے لہٰذا ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ملزم کو چھوڑ کر ایک بے گناہ کو غلام بنا لیں۔ اس جواب پر سارے بھائی لاجواب ہو کر خاموش ہو گئے۔

اس واقعہ کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ چالیس سال تک اس

طویل عرصہ میں یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ یعقوب علیہ السلام کی لمبی جدائی کو کبھی بھی پیشِ نظر نہیں رکھا۔ اس کی وجوہات آگے ذکر ہوں گی۔ انشاء اللہ۔

فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۖ قَالَ كَبِيرُهُمْ
أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْثِقًا
مِنَ اللَّهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُمْ فِي يُوسُفَ ۖ فَلَنْ أَبْرَحَ
الْأَرْضَ حَتَّىٰ يَأْذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي ۖ وَهُوَ خَيْرُ
الْحَاكِمِينَ ﴿٨٠﴾ ارْجِعُوا إِلَىٰ أَبِيكُمْ فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ
ابْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا
لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ ﴿٨١﴾ وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا
وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿٨٢﴾
قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ
عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ
الْحَكِيمُ ﴿٨٣﴾

ترجمہ:- پس جب وہ یُوسف علیہ السلام سے مایوس ہو گئے تو الگ ہوئے مشورہ کرتے ہوئے۔ اُن میں سے بڑے نے کہا، کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے والد نے تم سے پختہ عہد لیا تھا اللہ کا۔ اور اس سے پہلے بھی جو تم نے کوتاہی کی یُوسف علیہ السلام کے بارے میں۔ پس میں نہیں ٹلوں گا اس زمین سے یہاں تک کہ اجازت دے مجھے میرا باپ یا

فیصلہ کرے اللہ تعالیٰ میرے حق میں ، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (۸۰) تم واپس چلے جاؤ اپنے والد کے پاس اور کہو اے ہمارے باپ ! بیشک تیرے بیٹے نے چوری کی ہے ۔ اور ہم نہیں گواہی دیتے مگر اس بات کی جو ہم نے جانی ہے ۔ اور نہیں تھے ہم غیب کی بات کی حفاظت کرنے والے (۸۱) اور پوچھ لے تو اس بستی سے جس کے اندر ہم تھے ، اور اس قافلے سے جس کے اندر ہم آئے ہیں ۔ اور بیشک ہم البتہ سچے ہیں (۸۲) کہا یعقوب نے (ایسا نہیں) بلکہ بنایا ہے تمہارے نفسوں نے ایک معاملہ ۔ پس اب تو میرا صبر جمیل ہی ہے ۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ لے آئے میرے پاس اُن سب کو ۔ بیشک وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے (۸۳)

ربط آیات گذشتہ دروس میں بیان ہو چکا ہے کہ شاہی پیمانہ بن یامین کے سامان سے برآمد ہوا اور اُن کے اپنے بھائیوں کے مطابق چور کو ایک سال تک غلام بن کر رہنا پڑتا تھا ، لہٰذا یوسف علیہ السلام نے بن یامین کو واپس کنعان جانے سے روک دیا ۔ برادرانِ یوسف نے ہر چند بن یامین کو رہا کرانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں طاقت استعمال کرنے کی دھمکی بھی دی مگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے ۔ پھر انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور منت سماجت پر اُتر آئے ۔ یوسف علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمارا باپ بوڑھا اور نابینا ہو چکا ہے اور وہ اپنے چھوٹے بیٹے کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کے قابل نہیں ، لہٰذا آپ ہم میں سے کسی ایک کو بن یامین کے بدلے میں روک لیں اور اس کو جانے کی اجازت دے دیں ۔ یوسف علیہ السلام نے اُن کا یہ مطالبہ بھی مسترد کر دیا اور کہا کہ پناہ بخدا ، میں ایک بے گناہ شخص کو کیسے پکڑ لوں ؟ ہم تو اُسی آدمی

کو گرفتار کریں گے جس کے ہاں سے ہمارا پیمانہ برآمد ہوا۔ آپ نے اس بات کے لیے بڑے محتاط الفاظ استعمال کیے اور بن یامین کو چور نہیں کہا اور فی الحقیقت وہ چور نہیں تھے۔ فرمایا ہم قانون کے مطابق اُس شخص کو ماخوذ کریں گے جس سے ہمارا پیمانہ ملا ہے اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے واقعہ کا اگلا حصہ بیان فرمایا ہے۔

بھائیوں کی مشاورت

ارشاد ہوتا ہے فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ جب۔ وہ یعنی برادرانِ یوسف اُس سے مایوس ہو گئے۔ مِنْهُ کی ضمیر اگر یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کی جائے تو مطلب ہو گا کہ بھائی یوسف علیہ السلام کی طرف سے مایوس ہو گئے کہ وہ ہماری بات نہیں مانتے۔ اور اگر منه کی ضمیر بن یامین کی طرف ہو تو یہ بھی درست ہے کہ بھائی بن یامین کو ہمراہ لے جانے سے مایوس ہو گئے تو پھر انہوں نے کیا کیا؟ خَلَصُوْا الگ ہو گئے یعنی تنہائی میں چلے گئے نَجِيًّا مشورہ کرنے کے لیے۔ جب یوسف علیہ السلام کے سامنے ان کی دال نہ گلی تو باہمی مشاورت کے لیے تنہائی میں اکٹھے ہوئے تاکہ آئندہ کے لیے کوئی پروگرام بنا سکیں۔ چنانچہ اس مجلس مشاورت میں قَالَ كَبِيْرُهُمْ اُن میں سے بڑے نے کہا۔ عمر کے لحاظ تو بڑا روحیل تھا مگر عقل و دانش کے لحاظ سے یہودا زیادہ سمجھدار تھا۔ وہ یوسف علیہ السلام کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا اور پہلے واقعہ میں اُسی نے کہا تھا لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ یعنی یوسف علیہ السلام کو قتل نہ کرو بلکہ اسے کسی کنوئیں یا گڑھے میں پھینک دو۔ وہ تمہاری اور باپ کی نظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ اور تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ بہر حال ان دونوں میں سے روحیل یا یہودا نے دوسرے بھائیوں کو یاد دلایا اَلَمْ تَعْلَمُوْا کیا تمہیں معلوم نہیں اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ کہ تمہارے باپ نے تم سے اللہ کا پختہ عہد لیا تھا۔

اور تم نے قسم اٹھا کر وعدہ کیا تھا کہ تم بن یامین کو ضرور واپس لاؤ گے الا یہ کہ تم مغلوب ہو جاؤ یا ہلاک ہی ہو جاؤ۔ ایک تو تم باپ سے کیے گئے اس عہد سے جھوٹے پڑ رہے ہو، اور دوسرا اس بات کے بھی قصوروار ہو وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُمْ فِي يُوسُفَ جو اس سے پہلے تم نے یوسف علیہ السلام کے بارے میں کوتاہی کی۔ وہ گناہ بھی تمہارے سر پر ہے کہ تم نے یوسف علیہ السلام کو گم کر دیا۔ اب ان دو وجوہات کی بناء پر میرے لیے واپس کنعان جانا ممکن نہیں کہ باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

بڑے بھائی کا فیصلہ

چنانچہ اس نے فیصلہ کیا فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ کہ میں اس سرزمین سے نہیں ٹلوں گا یعنی میں یہیں مصر میں ہی قیام کروں گا حَتَّىٰ يَأْذَنَ لِي أَبِي یہاں تک کہ میرا باپ اس بات کی اجازت دے کہ میں واپس آ جاؤں أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي یا اللہ تعالیٰ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کر دے۔ مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کر دے کہ میں بھائی کو رہا کرا سکوں تو پھر بھی واپس چلا جاؤں گا، اور اگر کوئی صورت بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ میری موت کا فیصلہ ہی کر دے تاکہ یہ معاملہ میرے سر سے ویسے ہی ختم ہو جائے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ میں واپس کنعان نہیں جاؤں گا۔ اور کوئی بھی فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے کیونکہ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا وہی ہے۔

باپ کے سامنے سرگزشت

بہرحال بڑے بھائی نے اپنے متعلق تو یہ فیصلہ کیا اور دوسرے بھائیوں کو مشورہ دیا۔ ارْجِعُوا إِلَىٰ أَبِيكُمْ تم اپنے باپ کے پاس واپس چلے جاؤ فَقُولُوا اور اس سے کہو يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ اے ہمارے باپ! تیرے بیٹے نے چوری کی ہے۔ جس بیٹے سے تو بڑا پیار کرتا تھا اور ہمارے ساتھ بھیجنے کے لیے تیار نہ تھا، اس نے چوری کا ارتکاب کیا ہے۔ شاہی پیمانہ اس کے مال سے برآمد ہوا ہے

اور بنادو مصر نے اُسے روک دیا ہے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور مفسر قرآن حضرت ضحاکؒ کی روایت میں اس آیت کو اس طرح بھی پڑھا گیا ہے اِنَّ ابْنَكَ سُرِّقَ یعنی تیرے بیٹے پر چوری کا الزام لگایا گیا ہے اگرچہ حقیقت کچھ مختلف ہے بمطلب یہ کہ اس قراءت کے مطابق بن یامین پر چوری کا صرف الزام ہے کیونکہ ظاہری طور پر گمشدہ پیمانہ اُس کے سامان سے برآمد ہوا ہے مگر اس کا چور ہونا ضروری نہیں وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا اور ہم تو صرف اسی بات کی گواہی دیتے ہیں جو ہمارے علم میں ہے۔ وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ اور ہم تو غیب کی حفاظت کرنے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ (یونس) غیب تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہے اور اصل حقیقت کو وہی جانتا ہے ہم تو غیب دان نہیں ہیں جو مخفی بات کو بھی جان سکیں، اگر ہمیں غیب کا علم ہوتا تو ہم اس بھائی کو ساتھ ہی نہ لاتے، ہمیں کیا علم تھا کہ اس کے سامان سے شاہی پیمانہ برآمد ہوگا۔ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم چور کو غلام بنانے کے قانون کا ذکر ہی نہ کرتے اور نہ ہمارا بھائی روک لیا جاتا مگر یہ اپنی ہی کہی ہوئی بات کی زد میں آگئے اور بھائی کو پکڑوا بیٹھے۔ بہر حال غیب تو اللہ ہی جانتا ہے اور ہم تو اسی بات کی گواہی دیتے ہیں جو کچھ ہم نے دیکھا ہے۔

پھر اس ای سرگزشت کے ثبوت کے طور پر بیٹوں کو باپ کے روبرو یہ پیش کش کرنے کو بھی کہا وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا اے باپ! آپ اُن بستی والوں سے بھی دریافت کرلیں جس میں ہم ٹھہرے تھے (یعنی آپ اہل مصر سے ہماری اس بات کی گواہی بھی لے لیں کہ ہم کوئی جھوٹ تو نہیں کہہ رہے ہیں۔ آپ کوئی معتبر آدمی بھیج کر دریافت کر سکتے ہیں کہ وہاں چوری کا مذکورہ واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں اور کیا

بن یامین کو شاہِ مصر نے واقعی ماخوذ کیا ہے یا نہیں۔ آپ خود تو معذور ہیں، مصر کا سفر اختیار نہیں کر سکتے۔ اور اگر کسی دوسرے آدمی کو بھی تصدیق کے لیے نہ بھیجنا چاہیں تو دوسری صورت یہ ہے وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ان قافلے والوں سے دریافت کر لیں جن کے ساتھ ہم واپس آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ برادرانِ یوسف نے جس قافلے کے ہمراہ مصر کا سفر اختیار کیا، وہ قافلے والے بھی تو واپس آ گئے ہیں اور وہ لوگ کنعان کے قرب و جوار کے رہنے والے ہیں، آپ اُن سے ہماری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اور یقین جانیں وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ کہ ہم بالکل سچے ہیں۔ ہم نے جو کچھ آپ کے سامنے بیان کیا ہے، بالکل صحیح ہے۔

باپ کی بے یقینی

ظاہر ہے کہ بڑے بھائی کی ہدایت کے مطابق باقی بھائیوں نے یہ ساری سرگزشت من و عن باپ کے گوش گزار کی۔ اگرچہ ظاہری طور پر وہ سچ کہہ رہے تھے مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ اُدھر یعقوب علیہ السلام کو بھی اپنے بیٹے کے چور ہونے کا یقین نہیں آ رہا تھا، چنانچہ تَالَ آپ نے فرمایا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا بلکہ یہ تو تمہارے نے ایک بات بنائی ہے۔ آپ کا اپنے بیٹوں پر اعتبار اٹھ چکا تھا۔ اس سے پہلے جب آپ کے بیٹے یوسف علیہ السلام کو لے کر گئے تھے اور پھر واپس آ کر یہ کہانی سنائی تھی کہ اُسے بھیڑیا کھا گیا ہے تو اس وقت بھی یعقوب علیہ السلام نے یہی جملہ استعمال کیا تھا کہ یہ حقیقت نہیں بلکہ تمہارے اذہان کی وضع کردہ ایک کہانی ہے فرمایا میں تمہاری بات پر یقین نہیں کر سکتا کیونکہ عربی کا مقولہ ہے اَلْكَذُوْبُ لَا يُصَدَّقُ یعنی جھوٹے کی تصدیق نہیں کی جاتی جھوٹا آدمی اگر کسی وقت سچ بھی بولے تو اس پر یقین مشکل سے ہی

آتی ہے۔ اسی لیے محدثین ایسے آدمی کی روایت پر اعتماد اور یقین نہیں کرتے جس نے زندگی میں کسی ایک موقع پر بھی جھوٹ بولا ہو۔ اس کے بعد اگر وہ ہزار دفعہ بھی سچ بولے تو بھی وہ ایک دفعہ جھوٹ بولنے کی وجہ سے ناقابلِ اعتبار گردانا جاتا ہے۔ تو یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ تمہاری بات پر یقین تو نہیں آتا مگر میں تم کو سزا بھی نہیں دے سکتا، لہٰذا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں فَصَبْرٌ جَمِيلٌ کہ میں صبر جمیل کو ہی اختیار کروں۔ صبر جمیل وہ صبر ہوتا ہے جس میں جزع فزع نہ کی جائے اور نہ مخلوق کے سامنے کوئی شکوہ کیا جائے۔ تو بیٹوں کی سرگزشت کے جواب میں یعقوب علیہ السلام نے صبر کا دامن تھام لیا۔

یوسف علیہ السلام کی باپ سے بے رغبتی

مفسرین کرام اس مقام پر ایک نکتہ پیش کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو اپنے باپ سے بچھڑے چالیس سال کا عرصہ گزر گیا اور اس دوران میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو بڑی جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچی مگر اس عرصہ میں یوسف علیہ السلام نے کبھی باپ کی طرف رغبت نہیں کی اگرچہ باپ کو تو آپ کے متعلق علم نہیں تھا مگر آپ کو تو باپ کے وطن اور آپ کی تکالیف کا احساس تھا مگر آپ نے کبھی باپ کو اپنے متعلق اطلاع نہ دی۔ بھائیوں نے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی پھر بیگناہی کی حالت میں آپ کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں مگر آپ نے کبھی باپ کے سامنے حرفِ شکایت پیش نہ کیا۔ کسی آتے جاتے کے ہاتھ پیغام بھیج سکتے تھے، کم از کم باپ کو یہی اطلاع دے دیتے کہ میں زندہ سلامت ہوں تاکہ اس کے غم و اندوہ میں کچھ کمی آتی۔ اس کے بعد آپ منصب شاہی پر فائز ہوئے تو باپ کو مطلع کرنا ——— آپ کے لیے نہایت آسان تھا۔ پھر بھائیوں سے ملاقات بھی ہو گئی مگر آپ نے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا اور نہ باپ کی تسلی کے لیے کوئی پیغام دینا مناسب

سمجھا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس ضمن امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی یوسف علیہ السلام کو منع کر دیا تھا۔ کہ وہ باپ آپ کو ظاہر نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایک خاص وقت تک باپ اور بیٹے دونوں کی آزمائش مطلوب تھی۔ اُدھر اللہ تعالیٰ یعقوب علیہ السلام کو بھی بذریعہ وحی آگاہ کر سکتا تھا کہ تمہارا بیٹا زندہ ہے اور فلاں مقام پر اس حالت میں ہے۔ مگر اللہ نے نہیں بتایا کیونکہ یہ آپ کی آزمائش تھی۔ اس قسم کی آزمائش حضور خاتم النبیین علیہ السلام پر بھی آئی تھی۔ جب ام المومنین پر منافقین نے الزام تراشی کی تو آپ سخت پریشان ہو گئے۔ مہینہ بھر وحی کا سلسلہ بھی منقطع رہا حتیٰ کہ آپ منبر پر تشریف لائے اور لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا اَشِیْرُوْا اِلَیَّ لوگو! اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔ لوگ میری اہلیہ پر اتہام لگاتے ہیں مگر مجھے تو کوئی بات نظر نہیں آتی۔ پھر مقررہ وقت گزر گیا اللہ تعالیٰ نے ام المومنین کی بریت کا اعلان فرمایا تو آپ کو تسلی ہوئی تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کی ابتلا میں ڈال کر اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کے درجات بلند کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا انہیں ایسی آزمائش میں ڈالتا ہے۔

امید کا دامن

غرضیکہ یعقوب علیہ السلام کو بیٹوں کی بات پر یقین تو نہ آیا۔ مگر آپ نے صبر کو اختیار کیا اور ساتھ امید کا دامن پکڑتے ہوئے فرمایا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا شاید کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس لے آئے۔ یوسف علیہ السلام بچپن میں بچھڑ گئے۔ شمعون مصر کے پہلے سفر میں وہیں رہ گیا اور بن یامین دوسرے سفر میں رک گیا تو آپ کو قرائن سے کچھ معلوم ہو رہا تھا کہ شاید بچھڑنے والے سارے کے سارے ہی یکبارگی مل جائیں۔ اُدھر یوسف علیہ السلام کا بچپن کا خواب

بھی پیشِ نظر تھا۔ تو دل گواہی دیتا تھا کہ وہ زندہ سلامت کہیں نہ کہیں موجود ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو اکٹھا کر کے مجھے ملا دے۔

بہر حال یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کی سرگزشت سن کر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہے حتیٰ کہ یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے موقع پر انہوں نے کنعان کے قریب پانچ دس میل کے حلقہ میں بھی آپ کی تلاش کے لیے کوئی کوشش نہ کی بلکہ وہاں بھی صبر ہی کیا۔

آپ نے بالآخر یہی فرمایا، اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ بیشک اللہ تعالیٰ علیم ہے جو ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ حکیم بھی ہے کہ ہر واقع اس کی حکمت پر مبنی ہے اُس کی حکمت کو وہی جانتا ہے، کسی مخلوق کو علم نہیں ہوتا۔ لہذا جو بھی معاملات پیش آتے ہیں وہ حکمت سے خالی نہیں اور تمام تکالیف کو برداشت کرنے کے لیے صبر بہترین ذریعہ ہے۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ
عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا
تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ
الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّىْ وَحُزْنِىْٓ اِلَى
اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٦﴾ يٰبَنِىَّ اذْهَبُوْا
فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ
رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ
الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٧﴾

ترجمہ :- اور پھرے (یعقوب علیہ السلام) اُن (بیٹوں) کے
پاس سے اور کہا اے افسوس میرے یُوسف پر۔ اور سفید ہو
گئی تھیں اُن کی آنکھیں غم کی وجہ سے۔ پس وہ غم سے
بھرے ہوئے تھے ﴿٨٤﴾ تو کہا (بیٹوں نے) اللہ کی قسم
کیا آپ ہمیشہ یُوسف کا ذکر کرتے رہیں گے یہاں تک
کہ آپ گھُل جائیں یا ہو جائیں ہلاک ہونے والوں میں سے ﴿٨٥﴾
کہا (یعقوب نے) بیشک میں شکوہ کرتا ہوں اپنے اندرونی
دکھ کا اور اپنے غم کا اللہ تعالیٰ کے سامنے۔ اور میں جانتا
ہوں اللہ کی طرف سے وہ بات جو تم نہیں جانتے ﴿٨٦﴾
اے میرے بیٹو! جاؤ تلاش کرو یُوسف اور اس کے

بھائی کو، اور نہ مایوس ہو اللہ کی رحمت سے۔ بیشک نہیں مایوس ہوتے اللہ کی رحمت سے مگر وہ لوگ جو کفر کرنے والے ہیں (۸۷)

ربط آیات

برادرانِ یوسف کا مصر سے واپسی کا ذکر ہو رہا تھا۔ انہوں نے کنعان واپس پہنچ کر باپ کو چھوٹے بھائی کے چوری میں ملوث ہو جانے کا واقعہ سنایا اور اس ضمن میں اپنی صداقت کے لیے بعض شہادتوں کی طرف بھی اشارہ کیا مگر یعقوب علیہ السلام نے اُن پر اعتماد نہ کیا اور فرمایا کہ یہ ساری کہانی تمہارے اپنے نفسوں کی وضع کردہ ہے مگر اب میں صبرِ جمیل کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھتا ہوں کہ شاید وہ ان سب بچھڑے ہوئے افراد کو میرے پاس لے آئے کیونکہ خدا تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ ہر بات اس کے علم میں ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

یعقوب علیہ السلام کی حالتِ زار

بیٹوں سے مذکورہ گفتگو کرنے کے بعد وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ یعقوب علیہ السلام ان سے پھرے یعنی مزید بات چیت کرنے کی بجائے اُن سے علیحدگی اختیار کر لی کیونکہ گمشدہ بیٹوں کے ذکر سے اُن کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تنہائی میں پہنچکر بھی اُن کو چین نہ آیا بلکہ بن یامین کی جدائی نے یوسف علیہ السلام کی جدائی کو ایک دفعہ پھر تازہ کر دیا وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ اے افسوس میرے یوسف پر۔ دراصل عربی زبان میں یٰاَسَفٰی کا معنیٰ ہے۔ اے میرے افسوس! تم اس بات پر حاضر ہو۔ یعقوب علیہ السلام تو یوسف علیہ السلام کے فراق میں ہمیشہ غمگین رہتے تھے۔ تاہم بن یامین کی موجودگی اُن کے لیے کسی حد تک باعثِ تسکین ہوتی تھی۔ پھر جب وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو یعقوب علیہ السلام کا زخم پھر سے تازہ ہو گیا۔

فرمایا، یعقوب علیہ السلام کی حالت اس غم کی وجہ سے یہ ہو چکی تھی وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ کہ آپکی آنکھیں غم کی وجہ سے سفید ہو چکی تھیں فَهُوَ كَظِيْمٌ اور آپ غم سے بھرے ہوئے تھے اور چالیس سال سے اس غم میں مبتلا تھے جب کسی شخص کی بینائی کمزور

ہوجاتی ہے تو آہستہ آہستہ آنکھوں میں سفیدی آجاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی بینائی کثرتِ گریہ کی وجہ سے بالکل کمزور ہوچکی تھی بلکہ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس چالیس سال کے عرصہ میں سے چھ سال ایسے ہیں جن میں آپ کی بینائی بالکل جاتی رہی تھی۔ کظم کا معنیٰ اپنے اندر غم کو دبا لینا یعنی غم سے پُر ہوجانا ہوتا ہے، گویا آپ غم کی وجہ سے گھٹے ہوئے تھے۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا آپ اُن کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا، ہاں جانتا ہوں پھر آپ نے دریافت کیا کہ میرے ماں باپ پر میری جدائی کا کتنا غم ہے تو جبرائیل علیہ السلام نے بتایا کہ اُن کو تمہاری جدائی کا اس قدر غم ہے جتنا ان ستر عورتوں یا ستر مردوں کے غم کو اکٹھا کر دیا جائے جن کا کوئی آدمی گم ہوگیا ہو۔ گویا یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے کی جدائی کا ایک عام جدائی کے غم سے ستر گنا زیادہ تھا۔

بیٹوں سے مکالمہ

بیٹوں نے باپ کی یہ حالت دیکھ کر انہیں تسلی دلانے کی کوشش کی، کہنے لگے قَالُوْا تَاللّٰہِ تَفْتَؤُا تَذْکُرُ یُوْسُفَ اللہ کی قسم، تم ہمیشہ یوسف کا ہی ذکر کرتے رہو گے حَتّٰی تَکُوْنَ حَرَضًا یہاں تک کہ تم گھل جاؤ اَوْ تَکُوْنَ مِنَ الْھٰلِکِیْنَ یا ہلاک ہونے والوں میں ہوجاؤ۔ حرض کا معنیٰ برانگیختہ کرنا بھی ہوتا ہے اور جسم کا بگڑ جانا بھی مطلب یہ کہ کہیں تم گھل گھل کر ختم ہی نہ ہو جاؤ۔ اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ اب اس بات کو چھوڑ دو اور غم نہ کیا کرو۔ اس کے جواب میں یعقوب علیہ السلام نے فرمایا قَالَ اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ میں اپنی تکلیف اور پریشانی کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں اپنے اندرونی اندوہ..

غم کا اظہار اللہ رب العزت کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور اس معاملے میں کسی مخلوق کے سامنے آہ و بکا نہیں کرتا۔ نیز وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، لہٰذا میں بالکل مایوس نہیں ہوں جو یوسف علیہ السلام کو بھول جاؤں۔ میرے سامنے بعض قرائن ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مخفی رکھا ہوا ہے اور یہ اُس کی طرف سے ابتلا ہے کہ مجھے میرے بیٹے کے حالات سے مطلع نہیں کیا جا رہا۔ اور اُدھر یوسف علیہ السلام کی بھی آزمائش ہے کہ ان کو بھی میری طرف سے بے خبر رکھا گیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ خواب میں یعقوب علیہ السلام کی ملاقات ملک الموت سے ہوئی تو آپ نے دریافت کیا، کیا تو نے یوسف علیہ السلام کی روح قبض کی ہے، تو اُس نے نفی میں جواب دیا جس سے آپ کو یقین ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں۔ اُدھر بچپن میں یوسف علیہ السلام کو جو خواب آیا تھا اُس سے یہ اُمید بندھتی تھی کہ اس خواب کا کوئی نتیجہ نکلنے والا ہے۔ اگرچہ یہ قطعی بات نہیں تھی تاہم یوسف علیہ السلام کی زندگی کے متعلق یعقوب علیہ السلام کے سامنے کچھ قرائن موجود تھے۔ بہرحال بیٹوں کی بات کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں اپنے دکھ اور درد کا اظہار خدا تعالیٰ کے سامنے ہی کرتا ہوں اور ایسا کرنا دُعا کرنے کے مترادف ہے اور یہ کوئی قابلِ ملامت بات نہیں۔ البتہ اگر میں اپنی تکلیف کا اظہار مخلوق کے سامنے کروں، تو ضرور قابلِ اعتراض بات ہوگی۔

کثرتِ غم پر اشکال

اس مقام پر مفسرین کرام ایک اشکال پیش کرتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام تو اللہ کے جلیل القدر نبی اور عظیم المرتبت انسان تھے۔ انہوں نے بیٹے کا غم اس حد تک سینے سے لگائے رکھا کہ آنکھوں کی بینائی

ضائع ہوگئی حالانکہ ایک عام خدا پرست سالک بھی جب مقامِ فنا میں پہنچ جاتا ہے۔ تو اس کا تعلق دنیا کی ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا تعالیٰ کی ذات کے ساتھ رہ جاتا ہے۔ یوسف علیہ السلام بھی ایک انسان تھے اور ایک انسان کی محبت میں اپنے آپ کو اس قدر منہمک کر لینا حضرت یعقوب علیہ السلام کی شانِ رفیعہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں مفسرین فرماتے ہیں کہ غم کا لاحق ہونا امورِ طبعیہ میں سے ہے اور اس سے خواص بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ جب حضور علیہ السلام کے فرزند ابراہیمؓ وفات پا گئے تھے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور آپ فرماتے تھے کہ آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غمگین ہے اِنَّا بِفِرَاقِكَ لَمَحْزُوْنُوْنَ يَا اِبْرَاهِيْمُ اے ابراہیم! بیشک ہم تیری جدائی میں غمزدہ ہیں۔ ایسے موقع پر دل میں غم پیدا ہو جانا تو فطری امر ہے تاہم کپڑے پھاڑنا، سر نوچنا اور واویلا کرنا حرام ہے اور یعقوب علیہ السلام نے ایسا کوئی کام نہیں کیا بلکہ اپنے دکھ کا اظہار اللہ جل جلالہ کے سامنے ہی پیش کرتے رہے۔

امام مجددؒ کی توجیہہ

حضرت امام مجدد شیخ احمد سرہندیؒ برصغیر پاک و ہند میں گیارہویں صدی کی عظیم شخصیت ہوئے ہیں۔ یہ اس خطے کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کے انتی ! سو سال بعد اس سرزمین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پیدا ہوئے۔ پھر مزید تقریباً ایک سو سال بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا زمانہ آیا یہ عظیم شخصیتیں ہیں جن کی فکر اور حکمت بڑی بلند تھی اور انہوں نے بڑا کام کیا ہے۔ مغلوں کے ابتدائی دور میں جب اس برصغیر میں سخت گمراہی پھیل رہی تھی، مغل بادشاہ اکبر نے نیا دین وضع کر لیا تھا اور اس کے نورتن حواری جن میں ہندو اور مسلمان سبھی شامل تھے، محض اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ خود اکبر کا باپ کے دورِ حکومت میں لڑائیوں سے فرصت

نہ مِل سکی لہٰذا وہ تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا۔ اس لیے اپنے غلط حواریوں کے مشوروں کی زد میں رہا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کو مخلوق کی بہتری مطلوب ہوتی ہے تو بادشاہِ وقت کو اچھے مشیر عطا کرتا ہے اور جب کسی قوم کی برائی مقصود ہوتی ہے تو پھر حکومت کے مشیر بھی غلط قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ تو اکبر کی مشکل بھی یہی تھی کہ اُسے ابو الفضل فیضی اور مُلّا مبارک جیسے غلط مشیر میسّر آئے جنہوں نے اسے غلط لائن پر چڑھایا عقیدہ غلط ہو گیا اور شریعت کے احکام بھی غلط ملط ہونے لگے، اور ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر امام مجدد ؒ کو پیدا فرمایا جنہوں نے دینِ اسلام کی حفاظت کے لیے شدید مجاہدہ کیا۔ آپ کو جہانگیر کے دربار میں طلب کیا گیا تو آپ نے اسلامی طریقہ پر جا کر السلام علیکم کہا اور درباری طریقے کے مطابق بادشاہ کو سجدہ نہ کیا۔ بادشاہ ناراض ہو گیا۔ اور آپ کو تین سال یا بعض روایات کے مطابق سات سال تک گوالیار کی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

بہر حال امام مجددؒ نے یعقوب علیہ السلام کے غم واندوہ کے مسئلہ کو ایک دوسرے طریقے سے حل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ غم وہ معیوب اور قابلِ اعتراض ہوتا ہے جو کسی دنیاوی چیز کے لیے ہو مگر یعقوب علیہ السلام کا غم امورِ آخرت کی چیز کے متعلق تھا اور ایسی چیزوں سے محبت کرنا ممنوع نہیں بلکہ مطلوب چیز ہے۔ مثلاً جنت اس کی نعمتیں حوریں، پھل وغیرہ امورِ آخرت میں شامل ہیں اور ان سے محبت کرنا اور ان کے حصول کے لیے کام کرنا اچھی بات ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت اسی قسم کی تھی کیونکہ یوسف علیہ السلام باپ کے لیے محض ایک بیٹے اور اچھے انسان کی حیثیت سے نہیں بلکہ امورِ آخرت میں سے ایک امر بھی تھے حضور علیہ السلام کا ارشادِ مبارک ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں ملعون یعنی اللہ کی رحمت سے دُور ہیں اِلَّا ذِکرَ اللہِ

اَوْمَا وَالَاہُ اَوْ عَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ مگر چار چیزیں اس لعنت سے مستثنیٰ ہیں اور وہ ہیں (۱) اللہ کا ذکر (۲) ذکر سے متعلقہ دیگر امور (۳) عالم دین اور (۴) دین کا طالب علم۔ تو یوسف علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے ایسی پاکیزہ سیرت اور کمال پیدا فرمایا تھا جو امورِ آخرت سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، لہٰذا اُن کی محبت میں سرشار ہونا اور ان کی جدائی میں مغموم ہونا بالکل روا تھا۔

امام مجددؒ مثال کے طور پر فرماتے ہیں کہ انسانی ضروریات کی بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کے بغیر انسان سخت بے چین ہو جاتا ہے۔ مثلاً کمزور نظر والے شخص کی اگر عینک گم ہو جائے تو اُسے سخت زحمت ہو گی تو یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے بمنزلہ عینک کے تھے، جب وہ گم ہو گئے تو آپ سخت غم و اندوہ میں مبتلا ہو گئے حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ دیکھو! جنت بالکل خالی ہے، وہاں کی مٹی بڑی پاکیزہ ہے اور اس میں شجر کاری اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل کرنا ہے۔ جب کوئی شخص اس دنیا میں خلوص دل سے سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتا ہے اس کے لیے جنت میں ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔ اس دنیا میں تو یہ حروف اور کلمات ہیں مگر آخرت میں یہ درختوں کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ آخرت کی نعمتیں محض وہاں کے درخت اور پھل ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات، اس کے اسمائے پاک اور اس کی تجلیات بھی نعمتوں میں شامل ہیں جو تسبیح و تہلیل کے آئینہ یا عینک میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یعقوب علیہ السلام کے فرزند حضرت یوسف علیہ السلام بھی امورِ آخرت میں سے ہیں اور آپ یعقوبؑ کے لیے بمنزلہ عینک یا آئینہ تھے چونکہ آپ کی یہ عینک گم ہو گئی تھی اس لیے اس کے غم میں آپ

پریشان رہتے تھے ۔ مقصد یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی اپنے بیٹے سے محبت محض دنیاوی امر نہیں تھا ۔ بلکہ امر آخرت میں سے تھا اور اس کی محبت میں غم واندوہ کا اظہار بالکل جائز تھا ۔ لہٰذا اس وجہ سے آپ کی برگزیدہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا ۔

بہرحال یعقوب علیہ السلام نے امید کا دامن تھامے رکھا اور بیٹوں سے فرمایا یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اسکے بھائی کو تلاش کرو ۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ سب کو واپس کرے یعنی یوسف کے ساتھ اُس کا بھائی بنیامین بھی مل جائے اور ساتھ یہ مسئلہ بھی سمجھا دیا وَلَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۔ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو ۔ روح کا معنی فیضان اور مہربانی ہے سورۃ واقعہ میں موجود ہے کہ اللہ کے مقربین کے لیے "فَرَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِیْمٍ" ہے ۔ تو فرمایا خدا تعالیٰ کی مہربانی سے مایوس نہ ہو کیونکہ اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ کیونکہ اللہ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں ۔ ایماندار کبھی مایوس نہیں ہوتا بلکہ آخر دم تک پُرامید رہتا ہے ۔ چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں روایت موجود ہے کہ بڑے گناہوں میں سے عظیم ترین گناہ شرک ہے ۔ اس کے بعد خدا کے خوف سے بالکل بے نیاز ہو جانا بھی بہت بڑا گناہ ہے ۔ انسان اس بات کو بھول جائے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور وہ مجرموں کو سزا بھی دیتا ہے ۔ اور تیسرا بڑا گناہ یہ ہے کہ انسان خدا کی رحمت سے مایوس ہو جائے ۔ یہ تو کافروں کا شیوہ ہے ۔ لہٰذا مایوسی سخت گناہ ہے ۔ مایوسی گناہ ہے

درس بست و سه ۲۳ — آیت ۸۸ تا ۹۳

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا
الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ
تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَالَ
هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ
جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا
يُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِىْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ
يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾
قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ﴿۹۱﴾
قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ
وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِىْ هٰذَا
فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِىْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِىْ بِاَهْلِكُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۴ ۴

ترجمہ:- پھر جب وہ داخل ہوئے اُن کے پاس تو انہوں نے کہا اے عزیز! پہنچی ہے ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف اور لائے ہیں ہم ایک ناقص پونجی۔ پس پورا پورا دے ہمیں اناج اور صدقہ کر ہم پر۔ بیشک اللہ تعالیٰ بدلہ

دیتا ہے صدقہ کرنے والوں کو (۸۸) کہا (یُوسف نے) کیا
تمیں خبر ہے جو کیا تم نے یُوسف اور اس کے بھائی
کے ساتھ جب کہ تم ناسمجھ تھے (۸۹) وہ کہنے لگے، کیا
سچ مچ آپ یوسف ہیں تو انہوں نے کہا کہ میں یوسف ہوں
اور یہ میرا بھائی ہے۔ تحقیق اللہ نے احسان کیا ہے ہم
پر۔ بیشک جو شخص ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ پس بیشک
اللہ تعالیٰ نہیں ضائع کرتا اجر نیکی کرنے والوں کا (۹۰) تو
کہا انہوں نے اللہ کی قسم البتہ فضیلت دی ہے تجھ کو
اللہ نے ہم پر۔ اور بیشک تھے ہم خطاکار (۹۱) کہا (یوسف
نے) نہیں ملامت تم پر آج کے دن، اللہ معاف کرے
تمہیں۔ اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے (۹۲)
لے جاؤ میری یہ قمیص اور اس کو ڈال دو میرے والد
کے چہرے پر۔ وہ آئیں گے دیکھتے ہونے۔ اور لے
آؤ میرے پاس اپنے گھر والوں کو سب کے سب (۹۳)

ربطِ آیات

جب یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کنعان جاکر اپنے باپ کو بن یامین کی گرفتاری کا حال سنایا تو اُن کا پرانا غم پھر تازہ ہوگیا پہلے وہ یوسف علیہ السلام کی جدائی میں پریشان تھے۔ اب دوسرے بیٹے کی جدائی کی بات سنی تو دکھ دو چند ہوگیا مگر آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نااُمید نہیں ہوئے بلکہ بیٹوں سے کہا کہ جاؤ جاکر یوسف علیہ السلام اور اُس کے بھائی کو تلاش کرو، عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سب کو لے آئے۔ بن یامین بھی رہا ہو جائے اور یُوسف علیہ السلام جس کا نام و نشان تک معلوم نہیں، شاید وہ بھی مل جائے خدا تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اور اُس سے کوئی بعید نہیں۔ فرمایا خدا کی رحمت سے نااُمید نہ ہونا کیونکہ یہ کافروں کا شیوہ ہے۔

باپ کے اس حکم پر یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے مصر کے تیسرے سفر کی تیاری کی۔ اس سفر کا ایک مقصد تو بنیامین اور یوسف علیہ السلام کی بازیابی تھا اور دوسرا قحط کے اس زمانے میں اناج کا حصول بھی تھا۔ اس سفر کے دوران بھائیوں کو اپنی سابقہ غلط کارروائی پر ندامت ہو رہی تھی اور وہ اعتراف کر رہے تھے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام اور بنیامین کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ بہرحال برادران یوسف نے تھوڑی سی پونجی جو میسر آئی ہمراہ لی اور تیسری مرتبہ مصر پہنچ گئے۔

یوسف علیہ السلام سے تیسری ملاقات

اب اس تیسرے سفر میں پیش آنے والے حالات کو اللہ تعالےٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ جب برادران یوسف مصر میں یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انہوں نے سلسلہ کلام اپنی عجز انکساری، قحط سالی اور عزیز مصر کی خوشامد سے شروع کیا۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے تکلیف بیان کر کے اناج کے حصول کی بات کریں گے اور اگر حاکم کو نرم دل پایا تو پھر بنیامین کی رہائی کی درخواست بھی کریں گے قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ کہنے لگے۔ اے عزیز! ظاہر ہے کہ بھائیوں کو ابھی تک یوسف علیہ السلام سے تو تعارف نہیں ہوا تھا، وہ اپنے خیال میں جس حاکم کو خطاب کر رہے تھے، وہ بادشاہ کا مقرر کردہ عزیز مصر تھا کیونکہ زلیخا کے خاوند عزیز مصر کی وفات کے بعد بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو اس عہدے پر فائز کیا تھا اور گذشتہ دو مواقع پر برادران یوسف نے اسی کی میزبانی کا لطف اٹھانے کے علاوہ غلہ بھی حاصل کیا تھا اور پھر اسی کے سامنے بنیامین پر چوری کا الزام لگا اور اسی نے اُسے روک لینے کا حکم دیا تھا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام بظاہر تو عزیز کے عہدے پر متمکن تھے مگر بادشاہ نے انہیں مزید اختیارات دے کر بالکل خود مختار

بنا دیا تھا۔ بہرحال برادرانِ یوسف نے آپ کو عزیز ہی کے لقب سے خطاب کیا اور عرض کیا مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ کہ ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو سخت تکلیف پہنچی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے زمانے کا قحط اتنا شدید تھا کہ اس سے کوئی بھی چھوٹا بڑا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کنعان میں رہنے والا خاندانِ یعقوب بھی اس کی لپیٹ میں آگیا اور اس سے پہلے مصر سے دو دفعہ اناج لے جانے کے باوجود اُن کی خوردنی ضروریات پوری نہیں ہو رہی تھیں، لہٰذا انہوں نے سب سے پہلے اپنی تکلیف کا ذکر کیا۔ سعدی صاحب نے قحط سالی میں شدتِ تکلیف کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

یعنی دمشق میں اس قدر شدید قحط پڑا کہ سارے دوست اپنے اپنے عشق کو بھی بھول گئے۔ مطلب یہ ہے کہ فاقوں کی وجہ سے تمام معمولاتِ زندگی متاثر ہوئے اور کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہ رہی حتیٰ کہ لوگ عبادت و ریاضت بھی بھول گئے۔ فاقے کے متعلق ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان موجود ہے کہ انسان کے لیے چند لقمے ضروری ہیں جن کے ساتھ اُس کی کمر سیدھی ہو سکے۔ یعنی بھوک کی وجہ سے اتنا نڈھال نہ ہو جائے کہ کھڑا ہو کر عبادت بھی نہ کر سکے۔ ایک دفعہ مکے والے بھی سخت قحط کا شکار ہوئے تھے۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اہلِ مکہ کی مسلسل نافرمانی اور ایذا رسانی کی بنا پر حضور علیہ السلام نے اُن کے خلاف دعا کی تھی اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ اے اللہ اُن پر قحط کے ایسے سال ڈال دے جس طرح یوسف علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں پر ڈالے تھے چنانچہ مکے والوں پر

بھی قحط نازل ہؤا، اور پھر وہ اس قدر عاجز آ گئے کہ پرانے چمڑے، بوسیدہ ہڈیاں اور مردار تک کھانے پر مجبور ہوئے۔ بہر حال یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے عزیز مصر سے عرض کیا کہ ہم اور ہمارے گھر والے قحط کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہیں۔

اناج کی درخواست

اِن تمہیدی الفاظ کے بعد عرض کیا وَجِئۡنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزۡجٰىةٍ ہم ایک ناقص پونجی ہمراہ لائے ہیں۔ بِضَاعَة راس المال کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی چیز خریدی جاتی ہے۔ اور مزجی سے مراد ناقص اور گھٹیا ہے۔ دراصل ازجی کا معنی ہوتا ہے دھکیل دینا۔ دفع کر دینا یعنی کوئی ایسی چیز پیش کرنا جسے کوئی قبول نہ کرے اور کہے کہ اسے لے جاؤ۔ یہ کسی کام کی نہیں ہے۔ چنانچہ برادران یوسفؑ نے کہا کہ ہم تو گھٹیا سی پونجی لائے ہیں۔ آپ اسے قبول کر لیں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ وہ پونجی چند کھوٹے سکوں، پھلوں اور صنوبر کے دانوں پر مشتمل تھی۔ کچھ چمڑا تھا اور بھیڑوں کی کچھ اون تھی۔ جس کے بدلے میں وہ اناج حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تو بجائے اس کے کہ عزیز اس پونجی کو از خود ٹھکرا دے، انہوں نے اس پونجی کی حقارت کو پہلے ہی تسلیم کر لیا کہ یہ پونجی اس قابل تو نہیں ہے فَاَوۡفِ لَنَا الۡكَيۡلَ مگر ہمیں اس کے بدلے غلہ پورا پورا دے دیں۔ کَیل کا معنی ماپ ہوتا ہے۔ تاہم مراد غلہ ہی ہے کہ ہمیں ماپ کر دے دیں۔ وَتَصَدَّقۡ عَلَيۡنَا اور ہم پر صدقہ بھی کریں۔ ہمیں یہ غلہ خیرات سمجھ کر ہی دے دیں کیونکہ ہم اسے خریدنے کی طاقت تو نہیں رکھتے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَجۡزِى الۡمُتَصَدِّقِيۡنَ بیشک اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بدلہ دیتا ہے۔ احسان کرنے والوں کو اللہ اس دنیا میں بھی کچھ نہ کچھ بدلہ عطا کرتا ہے اور اگر صدقہ کرنے والا مومن ہے تو آخرت میں تو اس کیلئے بہت بڑا اجر و ثواب ہے۔

صدقے کا مفہوم

یہاں پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام تو اللہ کے جلیل القدر نبی تھے اور نبی اور اس کے گھرانے کے لیے صدقے کا مال جائز نہیں ہوتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی موجود ہے اِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ یعنی صدقہ محمد اور آپ کی آل کیلئے حلال نہیں ہے۔ آل محمد میں۔ آل علیؓ۔ آل عقیلؓ، آل عباسؓ، آل جعفرؓ، آل نوفل اور آل حارث آتے ہیں۔ ان سب کے لیے بھی صدقہ جائز نہیں تھا، تو یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے صدقے کا سوال کیسے کر دیا؟ اس کے جواب میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ صدقے کی حرمت صرف حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔ مگر دوسرے حضرت فرماتے ہیں کہ صدقہ ہر نبی اور اس کے گھر والوں کے لیے ناجائز رہا ہے اور آخری امت میں بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور نذر کے مستحقین صرف غربا، مساکین ہوتے ہیں اور ایسے کوئی صاحب نصاب آدمی وصول نہیں کر سکتا اور نہ ہی یہ نبی اور اس کے خاندان کے لیے ادا ہوتا ہے۔ تاہم جس صدقے کی بات برادران یوسف نے کی، اس سے حقیقی صدقہ مراد نہیں —————— بلکہ اس سے مراد احسان ہے کہ اے عزیز! ہمارے پاس پونجی تو نہیں ہے اور بھوک کی وجہ سے تکلیف بھی بہت ہے، لہٰذا آپ ہم پر احسان کرتے ہوئے غلہ عنایت کر دیں۔ اس قسم کے احسان کی مثال حدیث شریف میں بھی ملتی ہے۔ جب کوئی شخص شرعی مسافت پر ہو تو وہ چار رکعت کی بجائے صرف دو رکعت فرض ادا کرے گا۔ اس کے متعلق الفاظ یہ ہیں صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوا صَدَقَتَهٗ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک صدقہ ہے تم پر، لہٰذا اس کے صدقہ کو قبول کیا کرو۔ یہاں پر دو رکعت کی تخفیف کو صدقہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور مطلب

احسان ہے۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے بھی ان پر احسان کرنے کی درخواست کی اور اس صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں ہے۔

پردہ اٹھ گیا

جب بھائیوں نے اس قدر عاجزی اور خاندان کی تکلیف کا اظہار کیا تو یوسف علیہ السلام کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ اُدھر آپ کو قلبی شہادت بھی مل رہی تھی کہ ابتلا کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ لہذا انہوں نے دل میں فیصلہ کیا کہ اب اُن کے اور ان کے بھائیوں کے درمیان پردہ اٹھ جانا چاہیئے قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ کیا تمہیں خبر ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ جب کہ تم نادان تھے۔ آپ اس قدر بلند اخلاق واقع ہوئے کہ اتنی تکالیف برداشت کرنے کے باوجود بھائیوں کو براہ راست الزام نہیں دیا، بلکہ فرمایا کہ یہ کاروائی تم سے نادانی میں ہو گئی تھی۔

پہلے تو بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُن کا بھائی عزیز مصر کے عہدے پر فائز ہو سکتا ہے مگر جب آپ کی زبان سے اپنے متعلق دو ٹوک بات سنی قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ تو کہنے لگے، کیا سچ مچ آپ ہی یوسف علیہ السلام ہیں۔ یہ تو بڑی تعجب کی بات معلوم ہوتی ہے۔ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ فرمایا، ہاں! میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے۔ جس کو میں نے چوری کے الزام میں محبوس کر رکھا تھا۔ فرمایا قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اللہ نے ہم پر احسان فرمایا ہے۔ ہماری جدائی کو دور کر کے آپس میں ملا دیا ہے تنگی کو دور کر کے راحت بخشی ہے اور غلامی سے نکال کر عزت کے مقام پر بٹھایا ہے۔ فرمایا ہم دونوں نے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ تم نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی مگر بنیامین نے بھی بڑا صبر کیا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ

جب یوسف اور بنیامین کی ملاقات ہوئی تو اُس وقت بنیامین کے دس بیٹے تھے۔ بہر حال یوسف علیہ السلام کے ذہن میں بھائیوں کی طرف سے کی جانے والی تمام زیادتیاں تھیں مگر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے۔

تقویٰ اور صبر

یوسف علیہ السلام نے مزید فرمایا اِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ بیشک جو شخص ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ تو اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ تقویٰ کی پہلی منزل یہ ہے کہ انسان کفر، شرک اور نفاق سے بچ جائے۔ پھر کبائر سے اجتناب کرے اور پھر درجہ بدرجہ صغائر سے بھی بچ جائے۔ تقویٰ بہت بڑی حقیقت ہے جس کے متعلق سورۃ انفال میں ہے اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا اگر تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں فیصلہ کن حالات پیدا کر دیگا۔ اور تمہیں کسی مرحلہ پر بھی پریشانی کا سامنا نہیں ہو گا۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ آیت کریمہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ عدل اور احسان اجزائے تقویٰ میں سے ہیں اس طرح صبر بھی بہت بڑی حقیقت ہے۔ ملّتِ ابراہیمی کے بعض مسلّمہ اصول ہیں جنہیں قرآن کی اصطلاح میں بیّنات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان میں صبر، شکر، ذکر، تعظیم شعائر اللہ، نماز اور تقویٰ جیسی حقیقتیں شامل ہیں جو انسان کی کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ انہی حقائق کے ذریعے انسان حظیرۃ القدس کا ممبر بن سکتا ہے اور اللہ کے پاک مقام میں داخل ہو سکتا ہے۔

صبر کے مختلف مقامات ہیں۔ اس کے تین مادے ہیں، صبر مصیبت میں بھی ہوتا ہے اور اطاعت میں بھی خواہشات نفسانیہ

ؒ غنیۃ الطالبین ص۱۲

پر قابو پانے کے لیے بھی صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام نے صبرِ یوسف کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ جب آپ کی جیل سے رہائی کا پیغام پہنچا تو آپ نے اس وقت تک باہر آنے سے انکار کر دیا۔ جب تک آپ پر لگائے گئے الزام کی حیثیت واضح نہ ہو جائے۔ شاہ عبدالقادر دہلوی صبر کے متعلق یہ جملہ لکھتے ہیں " جس پر تکلیف پڑے اور وہ شرع سے باہر نہ ہو، اور گھبرائے نہیں تو آخر بلا سے زیادہ عطا ہے " یعنی صابر آدمی کو اللہ تعالیٰ اُس کی تکلیف سے زیادہ اجر عطا فرماتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تقویٰ کو " محافظت بر حدودِ شرع " سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی شریعت کی حدود کو قائم رکھنا ہی تقویٰ ہے۔

غلطی کا اعتراف

جب بھائیوں پر واضح ہو گیا کہ عزیزِ مصر ان کا بھائی یوسف ہے جس کے ساتھ وہ بڑی ہی بدسلوکی کرتے رہے ہیں۔ تو غلطی کا اعتراف اور حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہنے لگے قَالُوْا تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا اللہ کی قسم، بیشک اللہ نے تمہیں پسند کیا ہے ہمارے مقابلے میں۔ اثر کا معنی ترجیح دینا، فضیلت دینا یا پسند کرنا ہوتا ہے تو بھائیوں نے اقرار کیا کہ ہمارے بھائی، تمہیں اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی ہے وَاِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ اور بیشک ہم ہی خطا کار ہیں۔ اور غلطی کے اقرار کا نام ہی توبہ ہے۔ تو برادرانِ یوسف اپنی زیادتی سے تائب ہو گئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کُلُّ بَنِیْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ یعنی ہر انسان خطا کار ہے مگر بہتر خطا کار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں۔ غرضیکہ بھائیوں نے یوسف اور بنیامین کے ساتھ اپنی بدسلوکی اور اذیت رسانی کا اقرار کیا کہنے لگے کہ ہم تو انہیں ختم کرنا چاہتے تھے مگر اللہ نے انہیں زندہ رکھا اور ہم تو انہیں ذلیل کرنا چاہتے تھے مگر اللہ نے ان کو عزت بخشی۔

عام معافی کا اعلان

بھائیوں کی زبان سے اعتراف حقیقت سن کر یوسف علیہ السلام کا کریمانہ اخلاق جوش میں آگیا۔ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ فرمایا، آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں ہوگی۔ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب ہم تمہیں طعن ملامت نہیں کریں گے۔ تثریب کا مادہ ثرب ہے جس کا لغوی معنی چربی اور مراد ایسی بات ہوتی ہے جس کے ذریعے دوسرے کی عزت و آبرو خراب ہو، یہی چیز ملامت کہلاتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر تم میں سے کسی کی لونڈی برائی کا ارتکاب کرے اور پھر اس پر اصرار کرے تو اب اس کو زبانی ملامت نہ کرو۔ حدیث کے الفاظ ہیں وَلَا يُثَرِّبْ بِهَا بلکہ ایک رسی کے عوض بیچ ڈالو۔ گویا معمولی سے معمولی قیمت پر بھی بک سکے تو بیچ دو کیونکہ یہ رکھنے کے قابل نہیں۔ تو یہاں بھی ثرب کا معنی ملامت کرنا آتا ہے۔

بہرحال یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی معافی کا عام اعلان کر دیا۔ اسی قسم کا واقعہ فتح مکہ کے دن بھی پیش آیا تھا۔ اس دن وہ تمام لوگ آپ کے سامنے کھڑے تھے جو تیرہ سال تک آپ کو اذیت پہنچاتے رہے، پھر جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ آپ نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا "تم کیا خیال کرتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟" سب نے کہا "آپ ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ایک شریف بھائی اپنے بھائیوں کے ساتھ کرتا ہے" فرمایا، میں آج تمہارے ساتھ بھی وہی بات کرتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کی تھی لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ تم پر آج کے دن کوئی ملامت نہیں جاؤ اللہ تمہیں معاف کرے۔ بہرحال یوسف علیہ السلام نے بھائیوں

کے حق میں حضرت کی دعا فرمائی کہ اللہ تمہیں معاف کرے وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ اور وہ سب سے بڑھ کر مہربان ہے ۔

باپ کیلئے قمیص کا تحفہ

اب جب کہ حقیقت حال واضح ہو گئی ۔ یوسف علیہ السلام اور بنیامین کے تمام رازوں سے پردے اٹھ گئے تو یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے فرمایا اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا میرا یہ کرتہ لے جاؤ ۔ اس پورے واقعہ میں یوسف علیہ السلام کی قمیص کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے ۔ سب سے پہلے کرتے کا ذکر اس وقت آتا ہے جب بھائیوں نے اسے خون آلود حالت میں باپ کے سامنے پیش کیا وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۔ جھوٹے خون سے آلودہ قمیص باپ کے پاس لے آئے اور کہا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے ۔ پھر قمیص کا ذکر وہاں آتا ہے جب زلیخا نے اسے پیچھے سے پکڑ کر پھاڑ دیا تھا فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ کے الفاظ پہلے گزر چکے ہیں ۔ ان دونوں مواقع پر یوسف علیہ السلام کا کرتہ بری خبر کے طور پر استعمال کیا گیا ۔ مگر اب تیسری دفعہ یہی کرتہ ایک اچھی خبر لے کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس جا رہا ہے ۔

اس کرتے کے متعلق مفسرین کرام نے مختلف باتیں کی ہیں ۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ ایک خاص کرتہ تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برہنہ کر کے آگ میں پھینکا گیا تھا تو جبرائیل علیہ السلام نے یہی کرتہ آپ کو پہنایا تھا ۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ حشر کے میدان میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم کو لباس پہنایا جائیگا کیونکہ کافروں نے برہنہ کر کے آگ میں پھینکا تھا ۔ بہرحال تفسیری روایات میں آتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ کرتہ اسحاق علیہ السلام کے پاس آیا ، پھر یعقوب علیہ السلام کی تحویل میں گیا جنہوں نے اس کو تعویذ میں بند کر کے یوسف علیہ السلام کے گلے میں

ڈال دیا۔ جب بھائیوں نے آپ کا کرتہ اُتار کر آپ کو کنوئیں میں پھینک دیا تو کنوئیں میں جبرائیل علیہ السلام نے یہی کرتہ تعویذ سے نکال کر یوسف علیہ السلام کو پہنا دیا تھا۔ یہ تفسیری روایات ہیں، ان کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی ہستی اور ان کے جملہ احوال امورِ آخرت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے جسم کے ساتھ لگنے والا ہر کرتہ وہی کام کریگا جو امر واقع میں ہوا۔ فرماتے ہیں کہ اس کام کے لیے کسی خاص کرتے کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ پورے خاندان کو دعوت

غرضیکہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے فرمایا کہ میرا یہ کرتہ لے جاؤ فَاَلْقُوْهُ عَلٰی وَجْهِ اَبِیْ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دینا یَاْتِ بَصِیْرًا وہ بینا ہو کر آ لے گا۔ باپ کی بینائی کا لوٹ آنا بامرِ الٰہی معجزہ تھا۔ یوسف علیہ السلام کی جدائی میں رو رو کر پہلے عرصہ تک نظر کمزور رہی اور پھر آخری چھ سال تک بالکل نابینا رہے۔ اب ان کی بینائی کا ذریعہ اللہ نے یہ پیدا فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کا کرتہ ان کے چہرے پر ڈال دیا جائے تو وہ بینا ہو کر آ جائیں گے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ امورِ مملکت میں انہماک کی وجہ سے یوسف علیہ السلام کا خود باپ کے پاس جانا ممکن نہیں تھا، اس لیے انہوں نے باپ کی خدمت میں کرتہ بھیجا اور کہا کہ وہ بینا ہو کر آ جائیں گے۔ نیز بھائیوں سے یہ بھی کہا وَاْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ سارے گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ۔ یہاں پر باپ کا ذکر نہیں کیا کیونکہ انکے متعلق تو پہلے ہی فرما دیا کہ بینا ہو کر خود ہی آ جائیں گے۔ کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ جب باپ کو میرے متعلق علم ہوگا تو ملاقات کے لیے فوراً چل پڑیں گے۔ چنانچہ باقی گھر

والوں کو لاسنے کے لیے بھی کہہ دیا کیونکہ اب ابتلاء کا دور ختم ہو چکا تھا۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ
يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾ قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ
لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾ فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ
أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ
لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾
قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ﴿٩٧﴾
قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ
الرَّحِيمُ ﴿٩٨﴾

ترجمہ:۔ اور جب چلا ہوا قافلہ تو کہا اُن کے باپ
نے ، بیشک البتہ میں پاتا ہوں خوشبو یُوسف علیہ السلام کی
اگر تم مجھے بوڑھا بے عقل نہ کہو (۹۴) وہ کہنے لگے ، اللہ
کی قسم ، بیشک تو اپنی پرانی غلطی میں مبتلا ہے (۹۵) پس جب
آیا خوشخبری لانے والا تو ڈال دیا اُس کُرتے کو اُن کے
چہرے پر ، پس لوٹ کر وہ دیکھنے والے ہو گئے . تو انہوں
نے کہا کیا میں نے تم کو نہیں کہا تھا کہ میں جانتا ہوں اللہ
کی طرف سے وہ بات جو تم نہیں جانتے (۹۶) وہ کہنے
لگے ، اے ہمارے باپ ! بخشش طلب کر ہمارے لیے
ہمارے گناہوں کی . بیشک ہم غلطی کرنے والے تھے (۹۷)

کہا اُس نے کہ میں عنقریب بخشش طلب کروں گا تمہارے
لیے اپنے پروردگار سے بیشک وہ بہت بخشش کرنے والا
اور مہربان ہے ﴿۹۸﴾

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ مصر کے تیسرے چکر میں برادرانِ یُوسف نے یُوسف علیہ السلام کے روبرو نہایت عجز و انکساری کا اظہار کیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے یُوسف علیہ السلام کو اُن پر فضیلت بخشی ہے اور غلطی پر وہی تھے۔ یُوسف علیہ السلام نے اپنے کریمانہ اخلاق کی بنا پر اعلان کیا کہ آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری غلطیوں کو معاف فرمائے۔ نیز فرمایا کہ میں تو بوجوہ فوری طور پر والد کے پاس نہیں جاسکتا، تم میری یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے چہرے پر ڈال دینا، وہ بینا ہو کر میرے پاس چلے آئیں گے اور تم باقی خاندان کو بھی لے کر مصر میں آجاؤ۔

ان حالات میں برادرانِ یُوسف کا قافلہ کنعان کی طرف واپس روانہ ہوا جب یہ لوگ مصر کی طرف آ رہے تھے تو نہایت پریشانی کے عالم میں تھے۔ بن یامین کے مصر میں رہ جانے کی وجہ سے باپ سے سخت شرمندہ تھے اور اب باپ نے اس ہدایت کے ساتھ مصر بھیجا تھا کہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بن یامین کو رہا کرانے کی کوشش کرو اور ساتھ ساتھ یُوسف علیہ السلام کی تلاش بھی کرو، شاید وہ زندہ ہو اور پھر تم سب اکٹھے میرے پاس آجاؤ۔ اس کام کے علاوہ بھائیوں کو غلے کی بھی ضرورت تھی اور اُن کے پاس پونجی بھی بالکل معمولی تھی۔ اس لیے غلے کے حصول کے سلسلے میں بھی گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھے کہ اس مرتبہ ملتا ہے یا نہیں۔ بہرحال ان ناگفتہ بہ حالات میں مصر کی طرف آئے تھے۔ ؎

قریب سرحد حرماں جگر تھر جاؤ
سنا ہے قافلہ غم کا ادھر سے گزرے گا

مگر اب حالات یکسر بدل چکے چالیس سال سے گمشدہ بھائی ——

یوسف مِل چکا تھا اور خوشی کی بات یہ تھی کہ اب وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ عزیزِ مصر کی حیثیت میں پورے مصر اور اردگرد کے علاقوں کو غلہ تقسیم کر رہا تھا۔ اور اب اُسی کے حکم سے اہل خانہ کو لینے کے لیے جا رہے تھے اور ساتھ ہی اُس نے باپ کی بینائی لوٹ آنے کی خوشخبری بھی سنادی تھی۔
چنانچہ یہ قافلہ نہایت خوشی خوشی کنعان کی طرف جا رہا تھا۔

خوشبوئے یوسف

تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ یوسف علیہ السلام نے خوشخبری پہنچانے والے قافلے کے لیے دو سو سواریوں کا انتظام کیا۔ ظاہر ہے کہ اُن کے بھائیوں کے علاوہ دیگر لوگ بھی اس قافلے میں شامل ہوں گے آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس قافلے کی روانگی کا حال اس طرح بیان کیا ہے ۔ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ اور جب وہ قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو اس کی کیفیت عجیب وغریب تھی اور میر کے الفاظ میں ۔

یارب وہ وقت کیا ہوگا جب مصر سے چل کر
کنعان کی طرف قافلے شب گیر کریں گے

بہر حال جب یہ قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو اِدھر کنعان میں یہ ہوا ۔ قَالَ اَبُوْهُمْ اُن کے باپ نے کہا اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ اے لوگو! میں یوسف علیہ السلام کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں ، اگرچہ تم مجھے بوڑھا بے عقل ہی کیوں نہ کہو۔ مصر اور کنعان کے درمیان اڑھائی سو میل کا فاصلہ ہے جس کو طے کرنے کے لیے آٹھ دس دِن درکار ہوتے تھے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ قافلہ ابھی مصر سے روانہ ہی ہوا تھا کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی خوشبو محسوس کر لی حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو خوشبو آجانا معجزانہ طور پر ہوا کیونکہ جب یوسف علیہ السلام کنعان کے قریب صرف تین یا چار میل کے فاصلے پر کنوئیں میں پڑے تھے تو اُس وقت تو یعقوب علیہ السلام

کو کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ نہ خوشبو آئی۔ نہ کوئی قرینہ ظاہر ہوا اور آپ نے چالیس سال کا عرصہ غم واندوہ میں گزار دیا مگر اب جب کہ اللہ کی مہربانی شامل حال ہوئی، ابتلا کا زمانہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ نے اڑھائی سو میل سے یوسف علیہ السلام کی خوشبو باپ تک پہنچادی۔ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کی رحمت کا جھونکا آتا ہے تو ہر چیز روشن ہوجاتی ہے، اور اس کو منظور نہ ہوتو کچھ نہیں ہوتا۔ بہرحال یعقوب علیہ السلام نے کنعان کے لوگوں کو یوسف علیہ السلام کی خوشخبری سنادی۔ آپ نے یہاں اپنے لیے منفد کا لفظ استعمال کیاہے۔ تفند اس فساد کو کہتے ہیں جو عقل میں پیدا ہوجائے۔ فرمایا تم تو یوں کہو گے کہ اس بوڑھے بے عقل کا دماغ چل گیا ہے۔ یہ سٹھیا گیا ہے مگر میں یوسف علیہ السلام کی خوشبو ضرور محسوس کر رہا ہوں۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ منفد کا لفظ صرف مرد کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ اس کی عقل خراب ہوگئی۔ اس کا اطلاق عورت پر نہیں ہوتا کیونکہ قدرت نے عورتوں میں تو عقل کا مادہ ویسے ہی کم رکھا ہے۔ حضور علیہ السلام نے عورتوں کو ناقصات عقل و دین فرمایا ہے۔

جب یعقوب علیہ السلام کے گھر والوں یا اردگرد کے دیگر لوگوں نے آپ کے منہ سے یہ بات سنی تو کہنے لگے قَالُوْا تَاللّٰهِ اللہ کی قسم اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ بیشک تم تو پرانی غلطی میں مبتلا ہو، تم پر وہی یوسف علیہ السلام کا پرانا خبط سوار ہے۔ بھلا اب چالیس سال کے بعد یوسف کہاں سے آئیگا، نہ معلوم وہ اس دنیا میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو دنیا کے کس خطے میں کس حالت میں ہے۔ مگر یہ خوشبو تو مبنی بر حقیقت تھی اور یہ معجزہ تھا کہ اللہ نے یوسف علیہ السلام کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کے دماغ تک پہنچادی۔ یہاں پر ضلال کا معنی گمراہی نہیں ہے اگرچہ یہ گمراہی پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس لفظ کا

اطلاق بھی ہو جاتا ہے۔ تاریخی میں پڑ جانے یعنی ناکام ہو جانے پر بھی ہوتا ہے تاہم یہاں پر مطلب یہ ہے کہ تم پرانی غلطی میں مبتلا ہو کر بار بار یوسف کا نام لے رہے ہو۔

یعقوب علیہ السلام بینا ہو گئے

جب یہ قافلہ کنعان پہنچا تو اُن میں سے ایک شخص نے سب سے پہلے جا کر یعقوب علیہ السلام کو خوشخبری سنانا چاہی۔ تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کا بیٹا یہودا تھا جو یوسف علیہ السلام کے لیے نسبتاً زیادہ نرم گوشہ رکھتا تھا، اسی نے بھائیوں کو مشورہ دیا تھا کہ یوسف کو قتل نہ کرو بلکہ کسی کنوئیں میں پھینک دو۔ تمہارا مقصد حل ہو جائیگا۔ روایات میں آتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا خون آلود کرتہ باپ کو پیش کرنے والا بھی یہی تھا، تو اب جبکہ باپ کو خوشخبری سنانے کا وقت آیا تو سب سے پہلے اسی نے حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس واقعہ کے متعلق ارشاد ہے فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ پھر جب خوشخبری دینے والا یعقوب علیہ السلام کے پاس آیا اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ تو اس نے وہ کرتہ یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا فَارْتَدَّ بَصِيْرًا پس پلٹ کر وہ دیکھنے والے ہو گئے۔ یعنی اُن کا اندھا پن زائل ہو کر آنکھیں روشن ہو گئیں۔ پھر بیٹے نے خوشخبری بھی سنائی کہ جس بیٹے کے فراق میں آپ چالیس سال تک گریہ کرتے رہے ہیں۔ وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ مصر کا بادشاہ ہے اور یہ اُسی کا کرتہ ہے جس کی وجہ سے آپ کی بینائی لوٹ آئی ہے۔ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے حاضرینِ مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ یوسف ہلاک ہو چکا ہے۔ اس کے بچپن کا خواب بھی میرے پیش نظر تھا اور

قرینہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی پورا ہونے والا ہے، اسی لیے میں تمہیں کہتا تھا کہ جاؤ جا کر یوسف کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اب میرا خیال درست ثابت ہوا ہے کہ یوسف علیہ السلام نہ صرف زندہ ہے بلکہ اللہ نے اُسے دنیا میں حکومت بھی عطا کی ہے۔

منصبِ انبیاء

تفسیری روایت میں آتا ہے کہ جب خوشخبری دینے والے نے یعقوب علیہ السلام کو بتایا کہ آپ کا بیٹا تو بادشاہ ہے تو آپ نے فرمایا، میں بادشاہی کو کیا کروں گا، مجھے یہ بتاؤ کہ وہ کس دین پر ہے۔ جب آپ کو بتایا گیا کہ یوسف دینِ اسلام پر ہے تو یعقوب علیہ السلام نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اب یہ نعمت مکمل ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کا مشن فکرِ ایمان ہے اور اسی چیز کو وہ دنیا میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1] کہ انبیاء کا اصل منصب یہ ہے کہ وہ مخلوقِ خدا کو دین سے روشناس کرائیں۔ البتہ بعض غلط رسومات کی بیخ کنی بھی منصبِ انبیاء میں شامل ہے رَفْعُ التَّظَالُمِ مِنْ بَیْنِ النَّاسِ یعنی لوگوں کے درمیان سے ظلم کو ختم کرنا بھی انبیاء کا مشن ہے اور پھر غلط رسومات اور ظلم کو مٹانے کے لیے اجتماعیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس مقصد کے لیے انبیاء کو خلافت کا نظام بھی قائم کرنا پڑتا ہے تاکہ مادی قوت حاصل ہو اور اس کے ذریعے مذکورہ مقاصد بھی حاصل کیے جا سکیں، تاہم انبیاء کا بنیادی منصب دین سے روشناسی ہی ہے۔

معافی کی درخواست

یوسف علیہ السلام کی خوشخبری سنانے کے بعد آپ کے بیٹوں نے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا اور باپ کے سامنے معافی کی درخواست پیش کی قَالُوْا یٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ کہنے لگے، اے ہمارے باپ! معاف کرے ہمارے لیے ہمارے گناہ اِنَّا کُنَّا

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۴

خطِئِیْنَ بیشک ہم ہی خطا کار تھے۔ پہلے یوسف علیہ السلام کے سامنے بھائیوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی ہے اور ہم ہی گنہگار ہیں تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ تم نے یہ کام نادانی کی حالت میں کیا ہے۔ اب باپ کے پاس بھی اپنے جرم کا اقرار کیا اور کہا کہ ہم کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں جو ہمارے لیے کسی طور بھی مناسب نہیں تھا، لہٰذا باپ سے درخواست کی کہ ہم کو معاف کر دیں۔

بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ کسی شخص کے ذمے گناہ اس وقت تک ہی ہوتا ہے جب تک وہ اس پر مصر ہے۔ اور اس کے بعد اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اعْتَرَفَ وَتَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ جب کوئی بندہ اعتراف معصیت کر کے توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ یقیناً اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ اب برادران یوسف نے بھی اپنی غلطی کا اقرار کر کے توبہ کر لی اور اب وہ انابت کی طرف آگئے جو کہ بہت بڑی بات ہے۔

قَالَ بیٹوں کی معافی کی درخواست کے جواب میں یعقوب علیہ السلام نے فرمایا سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ میں عنقریب تمہارے لیے اپنے پروردگار سے بخشش طلب کروں گا۔ آپ نے فوراً بیٹوں کے لیے بخشش کی دعا نہیں کی بلکہ وعدہ کیا کہ عنقریب ایسا کروں گا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ یعقوب علیہ السلام سمجھتے تھے کہ زیادتی صرف انہی کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ یوسف علیہ السلام کو بھی سخت تکالیف پہنچائی گئی ہیں۔ اور حقوق العباد کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک صاحب حق خود معاف نہ کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے معاف نہیں کرتا۔ لہٰذا یعقوب علیہ السلام اس معاملہ میں یوسف علیہ السلام کا عندیہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اپنی بیماری کے آخری ایام میں منبر پر تشریف لائے شدتِ درد کی وجہ سے آپ نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ اس حالت میں آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ اے لوگو! جس کسی نے مجھ سے کچھ لینا ہے وہ اسی دنیا میں وصول کرلے تاکہ یہ حق یہیں ختم ہو جائے اور آگے چل کر اس کی جواب دہی نہ کرنا پڑے۔ آپ نے دوسرے لوگوں سے بھی فرمایا کہ اگر کسی نے کسی کا حق دینا ہے تو ابھی ادا کردو کسی کی بے آبرو‌ئی کی ہے تو اس سے معافی مانگ لو۔ کچھ دینا ہے تو ادا کردو کیونکہ آخرت میں جاکر اللہ تعالیٰ اُسوقت تک معاف نہیں کریگا جب تک کہ بندہ اپنا حق معاف نہیں کریگا۔

قبولیتِ دُعا کا وقت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی دُعا کو مؤخر کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ بخشش کی دُعا جمعہ کی رات کو کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ متبرک رات ہوتی ہے۔ ایک روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے تاخیر جمعرات تک نہیں بلکہ سحری کے وقت تک کی تھی۔ حضرت عمرؓ صبح کے وقت نماز کے لیے جا رہے تھے کہ کسی گھر سے دُعا کی آواز آئی، اے پروردگار! تونے پکارا تو میں نے تیری آواز پر لبیک کہی۔ تونے حکم دیا تو میں نے حتی الامکان اس کی تعمیل کی وَهٰذَا السَّحَرُ فَاغْفِرْ لِي یہ سحری کا متبرک وقت ہے، اے اللہ! مجھے معاف کردے۔ حضرت عمرؓ نے پتہ کیا تو دُعا کی یہ آواز حضرت عبداللہ بن مسعود کے گھر سے آرہی تھی آپ نے اُن سے دریافت کیا یہ دُعا تم مانگ رہے تھے تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ — کہ سحری کا وقت بڑا بابرکت اور قبولیتِ دُعا کا وقت ہوتا ہے۔ رات کے آخری حصے میں خاص قسم کی روحانیت پھیلی ہوئی ہے اور اُدھر سے آوازیں آرہی ہوتی ہیں کہ ہے کوئی دعا کرنے

والا کہ اس کی دُعا قبول کروں ۔

بہر حال یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کے حق میں بخشش کی دعا کو مؤخر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں عنقریب تمہارے لیے اپنے پروردگار سے بخشش کی دُعا کروں گا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ بیشک وہ خدا تعالیٰ بہت زیادہ بخشش کرنے والا اور ازحد مہربان ہے ۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ
ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ
عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ
رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ
بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ
مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ
اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ :- پھر جب وہ داخل ہوئے یوسف علیہ السلام کے
پاس تو انہوں نے جگہ دی اپنے پاس اپنے والدین کو اور کہا
داخل ہو جاؤ مصر میں ۔ اگر اللہ نے چاہا تو امن میں رہو گے ﴿۹۹﴾
اور اونچا کیا انہوں نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اور گر پڑے
وہ سب اُس کے سامنے سجدے میں ۔ اور کہا اُس نے
اے میرے باپ ! یہ ہے تعبیر میرے خواب کی جو اس سے
پہلے دیکھا تھا ۔ بیشک بنایا ہے اس کو میرے پروردگار نے
سچا ۔ اور بیشک اس نے احسان کیا ہے میرے ساتھ جبکہ
اُس نے نکالا مجھے قید خانے سے اور جب کہ لایا وہ تمہیں
دیہات سے بعد اس کے کہ جھگڑا ڈال دیا شیطان نے
میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان ۔ بیشک میرا

پروردگار بہت باریک تدبیر کرنے والا ہے جو چاہے۔ بیشک وہ علم والا اور حکمت والا ہے (۱۰۰)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں یہ بیان تھا کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں پر اپنے آپ کو ظاہر کر دیا اور پھر اپنی قمیص دے کر اُن کو واپس کنعان بھیجا کہ باپ کے چہرے پر ڈال دینا وہ بینا ہو کر میرے پاس آئے گا، اور تم باقی خاندان کے افراد کو بھی یہاں لے آؤ۔ حسب الحکم بھائیوں نے ایسا ہی کیا۔ باپ کو یوسف علیہ السلام کے مل جانے کی خوشخبری سنائی اور ساتھ اپنی سابقہ کوتاہیوں کی معافی بھی مانگی اور اللہ تعالیٰ سے معافی کے لیے باپ سے دُعا کی درخواست کی جسے آپ نے کچھ وقت کے لیے مؤخر کر دیا، گویا بیٹوں سے مشروط وعدہ کیا کہ وہ اُن کے لیے عنقریب بخشش کی دعا کریں گے۔

جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا یوسف علیہ السلام نے اہل خانہ کو لانے کے دو سو سواریاں بھیجی تھیں تاکہ خاندان کے افراد اور سازوسامان لانے میں دقت پیش نہ آئے حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپ کے خاندان پر مشتمل یہ قافلہ مصر کی طرف چل پڑا۔ البتہ افرادِ خانہ کی تعداد کے متعلق مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مختلف روایات میں نوّے ترانوے اور بہتّر کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے مطابق یہ قافلہ تریسٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ پھر سینکڑوں سال بعد جب موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے تو ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ حالانکہ فرعون اور اس کی قوم نے بنی اسرائیل پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ تفسیری روایات کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو روکنے کے لیے اُس زمانے کے فرعون نے نوّے ہزار نومولود بچوں کو قتل کرا دیا تھا۔

یعقوب علیہ السلام کا استقبال

اُس زمانے میں مصر کا آئینی بادشاہ ولید ابن ریان تھا جس نے یوسف علیہ السلام کو عزیز کے عہدے پر فائز کر کے آپ کو پورے اختیارات سونپ رکھے تھے۔ یوسف علیہ السلام کی حسنِ انتظامی رعایا کے ساتھ شفقت و محبت اور ملک کو قحط کے اثرات

سے محفوظ رکھنے کی وجہ سے تمام اہل مصر آپ سے دلی محبت رکھتے تھے جب کہ بادشاہ نے تو آپ کو پہلے ہی معتمد بنا رکھا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ یوسف علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا، تاہم اگر وہ نہ بھی ایمان لایا ہو تو آپ کی دیانتداری، رعایا پروری اور حسن تدبیر سے بہت خوش تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب خاندانِ یوسف کی کنعان سے روانگی کی خبر ملی تو سارا مصر آپ کے استقبال کے لیے امڈ پڑا۔ خود بادشاہ کے متعلق تو اختلاف ہے کہ آیا وہ بذاتِ خود استقبال کے لیے شہر سے باہر آیا تھا یا نہیں مگر روایات میں چار ہزار سے تین لاکھ افراد کا ذکر ملتا ہے جو خاندانِ یوسف کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل آئے تھے، ان میں بڑے بڑے عمائدین، فوجی اور سول افسر اور عوام الناس شامل تھے۔ شہر سے باہر ایک کھلا میدان تھا جہاں مصری لوگ قومی دن یا جشن منانے کے لیے جمع ہوتے تھے یعقوب علیہ السلام کے استقبال کے لیے بھی اسی جگہ کو منتخب کیا گیا۔ شاہی انتظام کے تحت وہاں خیمے لگائے گئے، اور مہمانوں کے استقبال کے لیے بہت بڑا اسٹیج تیار کیا گیا۔ بائبل کا بیان ہے

________________ کہ بادشاہ نے بھی یعقوب علیہ السلام کے مصر آنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ انہیں میرے پاس لایا جائے ان کا یہاں پر عزت و احترام کیا جائیگا۔ اور ضرورت کی ہر چیز مہیا کی جائیگی۔

الغرض! اہل مصر کی کثیر تعداد یعقوب علیہ السلام کے استقبال کے لیے مخصوص میدان میں جمع ہو گئی، وہاں خوب چہل پہل اور رونق تھی، جشن کا سماں تھا، تو جب یعقوب علیہ السلام کا قافلہ قریب پہنچا تو انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیوں جمع ہوئے ہیں؟ کیا یہ فرعون اور اس کا لاؤلشکر ہے؟ تو آپ کو بتایا گیا کہ یہ آپ کا بیٹا یوسف علیہ السلام ہے جو اہلِ مصر کے ہمراہ آپ کے استقبال کے لیے آیا ہے۔ استقبالیہ

میدان میں پہنچ کر یعقوب علیہ السلام سواری سے نیچے اُترے بیٹے نے آگے بڑھ کر استقبال کیا، پھر دونوں نے معانقہ کیا اور اس موقع پر یعقوب علیہ السلام خوب روئے۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ جب باپ اور بیٹا خوشی کے آنسو رو رہے تھے تو اس وقت فرشتے بھی رو رہے تھے۔ بڑا جذباتی منظر تھا۔ اور اُدھر اس بات کی خوشی بھی تھی کہ ایک عظیم باپ اپنے عظیم بیٹے سے چالیس سال کے بعد ملاقات کر رہا ہے چالیس سالہ دور کی تمام تکالیف اور پریشانیاں ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں۔ مگر اب اس ملاقات کی خوشیاں اِن تمام آلام پر غالب آ رہی تھیں اور اس طرح باپ اور بیٹے کے امڈے ہوئے آنسو خوشی کے آنسو بن چکے تھے پھر جبرائیل علیہ السلام نے یعقوب علیہ السلام کو بتایا کہ آپ کی ملاقات کی خوشی میں فرشتے بھی شامل ہو رہے ہیں۔

ابتدائی ملاقات کے بعد یوسف علیہ السلام نے باپ سے دریافت کیا، ابا جی! آپ چالیس سال تک روتے رہے حتیٰ کہ آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی، اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا آپ کو یقین نہیں تھا کہ اگر ہماری ملاقات اس دنیا میں نہ بھی ہو سکی تو آخرت کو تو ضرور ہو جائے گی، تو پھر اس قدر گریہ کی کیا ضرورت تھی؟ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، میرے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ کم عمری میں بچھڑ گئے تھے اور پتہ نہیں آپ کا دین بھی سلامت رہا ہوگا یا نہیں۔ اگر خدانخواستہ ایمان سلب ہو جاتا تو پھر قیامت کی ملاقات بھی ممکن نہ رہتی کیونکہ وہاں پر مومن اور کافر الگ الگ ہوں گے۔ اتنا عرصہ اللہ نے بذریعہ وحی بھی نہیں بتایا تھا کہ آپ کس حال میں ہیں اور کس دین پر ہیں۔ یہ سب باتیں پردہ غیب میں تھیں، لہٰذا میری تشویش فطری امر تھا۔

والدین کی عزت افزائی

اللہ تعالیٰ نے اس سارے واقعہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے فَلَمَّا

دَخَلُوا عَلٰی یُوسُفَ جب یعقوب علیہ السلام کے اہل خانہ یوسف علیہ السلام کے پاس داخل ہوئے یعنی شہر سے باہر استقبالیہ کیمپ میں پہنچے اٰوٰی اِلَیْہِ اَبَوَیْہِ تو آپ نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی ظاہر ہے کہ استقبالیہ کیمپ میں یعقوب علیہ السلام کے بیٹھنے کے لیے کوئی خاص قسم کی سٹیج وغیرہ بنائی گئی ہوگی یا نمایاں قسم کے خیمے ہوں گے جن کو اچھے طریقے سے سجایا گیا ہوگا اور جس میں آرام و آسائش کی تمام سہولتیں فراہم کی گئی ہوں گی۔ "اپنے پاس جگہ" سے ایسی ہی جگہ مراد ہے جہاں یوسف علیہ السلام نے باپ کو ٹھہرایا۔

استقبالیہ تقریب کے بعد یوسف علیہ السلام نے اپنے اہل خاندان سے کہا وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ اب مصر میں داخل ہو جاؤ، یعنی استقبالیہ کیمپ سے چل کر شہر میں داخل ہو جاؤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ اللہ نے چاہا تو آپ اب امن و امان میں رہیں گے۔ اب یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور ہر طرح کی آسائش حاصل ہوگی۔ جدائی کی گھڑیاں بیت چکی ہیں قحط کو برپا ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ابھی مزید پانچ سال قحط کے سال تھے مگر یوسف علیہ السلام کے حسنِ انتظام کی بدولت اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کسی مزید پریشانی کا خطرہ نہیں تھا۔ اسی لیے فرمایا کہ امن کے ساتھ مصر میں داخل ہو جاؤ۔

یہاں پر اَبَوَیْہِ کا لفظ آیا ہے جس کا اطلاق یوسف علیہ السلام کے باپ اور ماں دونوں پر ہوتا ہے۔ حالانکہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آپ کی والدہ بن یامین کی پیدائش کے وقت فوت ہو گئی تھیں۔ اس ضمن میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں بعض فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک کے ظاہری الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام

کے ہمراہ آنے والی آپ کی والدہ ہی تھیں اور اُس وقت زندہ تھیں۔ البتہ مشہور روایت یہ ہے کہ وہ آپ کی والدہ نہیں بلکہ خالہ تھیں، جو یعقوب کے نکاح میں تھیں۔ اور خالہ بھی بمنزلہ والدہ کے ہوتی ہے اور اس کا ادب و احترام اور قدر و منزلت بھی ماں کی طرح ہی ہوتا ہے اس لیے یہاں پر الابویہ کا لفظ آیا ہے۔

سب سجدہ ریز ہو گئے

شہر میں داخل ہو کر مہمانوں کا قافلہ یوسف علیہ السلام کے اصل مقام پر پہنچا جہاں آپ کی رہائش تھی اور آپ امور سلطنت انجام دیتے تھے وَرَفَعَ اَبَوَیۡہِ عَلَی الۡعَرۡشِ یہاں پہنچ کر یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔ ظاہر ہے کہ جس جگہ پر بیٹھ کر یوسف علیہ السلام اپنے فرائض منصبی ادا کرتے تھے، وہ خاص جگہ ہوگی، جہاں عام آدمی کی رسائی نہیں ہوتی، تو آپ نے اپنے ماں باپ کو اس خاص جگہ پر بٹھایا۔ وَخَرُّوۡا لَہٗ سُجَّدًا اور وہ سب آپ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، جن میں آپ کے والدین، بھائی اور دیگر اہل خاندان تھے۔ اور اس طرح یوسف علیہ السلام کا بچپن کا وہ خواب پورا ہو گیا، جس میں آپ نے دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے سورج اور چاند آپ کو سجدہ کر رہے ہیں۔ چالیس سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس خواب کی تعبیر اس طرح ظاہر کی کہ آپ کے گیارہ بھائی اور باپ اور ماں آپ کے سامنے سجدہ ریز تھے۔

یہاں پر لَہٗ کی ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے جس کا مطلب ہے کہ تمام اہل خاندان مع والدین نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا، حالانکہ بیٹے کا مرتبہ باپ سے کم ہوتا ہے۔ بھائیوں کی طرف سے تو سجدہ کرنے کا جواز نکل سکتا ہے کہ انہوں نے آپ کو بڑی تکالیف پہنچائی تھیں اور وہ معافی کے خواستگار تھے مگر باپ کا سجدہ کرنا قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح والدہ یا خالہ کا سجدہ کرنا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا

کیونکہ بیٹے سے ان کا مرتبہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سجدہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک سجدہ عبادت اور دوسرا سجدہ تعظیم۔ جہاں تک سجدہ عبادت کا تعلق ہے یہ تو اللہ کے سوا کسی وقت اور کسی امت میں روا نہیں رہا، البتہ قرآن پاک میں دو واقعات کا ذکر ملتا جہاں سجدہ تعظیمی بجالایا گیا پہلے موقع پر فرشتوں نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا تھا اور اب دوسرا موقع ہے کہ یعقوب علیہ السلام اور آپ کے اہل خانہ نے یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا۔ گویا پہلی شرائع میں سجدہ تعظیمی ناجائز نہیں تھا، اسے آداب بجالانے پر محمول کیا جاتا تھا مگر اس آخری امت میں کسی قسم کا سجدہ بھی روا نہیں ہے تو یعقوب علیہ السلام کا سجدہ بھی تعظیمی تھا۔ اور محض اللہ کے حکم سے تھا۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں کا سجدہ بھی بامر الٰہی تھا، ورنہ غیر اللہ کے لیے سجدہ روا نہیں ہے۔

سجدہ کی شرعی حیثیت

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ سجدہ کی حلت و حرمت کا حکم آدمی کی نیت کی بنا پر لگایا جاتا ہے کیونکہ بظاہر تو سجدے کی ہیئت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص غیر اللہ کو سجدہ کرتے وقت اس سے وہی تعظیم مراد لیتا ہے جو ایک بندہ اپنے پروردگار کے سامنے کرتا ہے تو یہ سجدہ تعظیمی کرنے والا واضح طور پر کافر اور مشرک ہوگا۔ اور اگر اس سجدہ سے اس کی مراد ایسی تعظیم ہے جیسی شاگرد استاد کی، بیٹا باپ کی یا رعیت بادشاہ کی کرتی ہے تو یہ شرک نہیں ہوگا۔ اسی لیے شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں توحید اور شرک پر بحث کرتے ہوئے یہ بات سمجھائی ہے کہ بعض چیزیں مظنات شرک ہیں یعنی شرک کے محل ہیں اور وہاں پر شرک کا ارتکاب کرنے والا قطعی کافر اور مشرک ہوگا مثلاً کوئی شخص بت کے سامنے سجدہ کرتا ہے اور ساتھ کہتا ہے کہ میری مراد محض

تعظیم ہے تو اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائیگا اور اس پر کفر و شرک کا
قطعی حکم لگ جائے گا کیونکہ اس نے منطقہ شرک کا ارتکاب کیا ہے اسی
طرح اگر کوئی شخص اپنے قصد اور ارادے سے اللہ کے کلام کو گندگی میں
میں پھینک دیتا ہے تو ایسا شخص کتاب اللہ کی توہین کے جرم میں کافر
ٹھہرے گا اور اس کی کوئی تاویل اسے اس جرم سے بری قرار نہیں دے
سکے گی۔ ہاں! اگر کوئی شخص کسی دوسرے انسان کے سامنے یا قبر کے سامنے سجدہ کرتا
ہے، تو اس پر فوراً حکم نہیں لگے گا بلکہ اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے
یہ سجدہ کس نیت اور ارادے سے کیا ہے اگر وہ کہے کہ میں نے سجدہ
عبادت کیا ہے یعنی مسجود کی ایسی تعظیم کی ہے جیسی اللہ کی ہونی چاہیئے
تو وہ شخص صریح کافر اور مشرک ہوگا۔ اور اگر وہ اسے سجدہ تعظیمی بتاتا ہے
تو کہیں گے کہ تو ایک حرام فعل کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ اس آخری امت
میں غیر اللہ کے سامنے ہر قسم کا سجدہ حرام ہے۔ بہرحال ایسے شخص پر کفر کا
فتویٰ نہیں لگے گا بلکہ وہ فعل حرام کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ انتہائی تعظیم
کی شکل رکوع یا جھکنا بھی ہے۔ تورات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض
لوگ تو بالکل ہی سجدہ ریز ہو جاتے تھے مگر بعض جھک کر بھی تعظیم بجا
لاتے تھے۔ تو اس آخری امت میں تعظیم کے لیے جھکنا بھی مکروہ تحریمی
میں آتا ہے لہذا سلام کرنا ہو یا مصافحہ کرنا مطلوب ہو تو سیدھے کھڑے
ہو کر کرنا چاہیئے۔ بہرحال پہلی صورت میں سجدہ بالکل کفر اور شرک ہے
اور دوسری صورت میں حرام ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس مقام پر لَهٗ کی ضمیر یوسف علیہ السلام
کی طرف نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کی طرف لوٹتی ہے اور یوسف علیہ السلام تو محض
قبلہ کے تھے۔ اس کی مثال بیت اللہ شریف کی ہے جسے قبلہ ٹھہرا کر
ہم خدا تعالےٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں نہ کہ بیت اللہ کے سامنے

جس طرح بیت اللہ شریف سجدہ کے لیے ایک سمت اور جہت ہے اسی طرح خاندانِ یعقوب نے یوسف علیہ السلام کو قبلہ ٹھہرا کر سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کو کیا تھا اور ان کی مشکلات دور ہونے پر یہ سجدۂ شکر تھا۔ ظاہر ہے کہ سجدہ شکر بھی صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی ہو سکتا ہے، لہٰذا انہوں نے ایسا کیا۔ بہر حال یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کی یہ دو توجیہات مفسرین بیان کرتے ہیں، ان میں سے پہلی توجیہ عام ہے اور اس کی وجہ بھی میں نے عرض کر دی ہے۔

خواب کی سچی تعبیر

غرضیکہ جب سب کے سب یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تو آپ نے کہا وَقَالَ يَاأَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ اے میرے باپ! یہ اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھی تھی۔ یعنی میرے خواب کی تعبیر چالیس سال کے بعد ظاہر ہوئی ہے قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا میرے پروردگار نے اس کو سچا بنا دیا ہے گویا اس میں میرا کوئی کمال نہیں بلکہ یہ خواب میرے رب نے پورا کیا ہے۔ پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کے احسانات کا ذکر بھی کیا وَقَدْ أَحْسَنَ بِي اور میرے پروردگار نے مجھ پر احسان کیا إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ جب کہ مجھے قید سے رہائی دلائی۔ قید کا تو ایک دن بھی بڑا دشوار ہوتا ہے مگر یوسف علیہ السلام سات سال تک جیل میں رہے۔ بعض روایات میں نو، بارہ اور چودہ سال کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اللہ نے بڑا احسان فرمایا کہ نہ صرف جیل سے رہائی دلائی بلکہ عزت و اکرام بھی دلایا۔ اور اس مالک الملک کا یہ بھی احسان ہے وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ کہ آپ کو یعنی یعقوب علیہ السلام اور خاندان کو صحرا اور دیہات سے نکال لے آیا۔ کنعان کا شہر خود کوئی دیہات میں نہیں آتا کیونکہ یہ شہری آبادی تھی اس

لیے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر دیہات سے مراد کنعان کی قریبی صحرائی آبادیاں ہیں۔ جہاں یعقوب علیہ السلام اکثر جایا کرتے تھے اور وہاں لوگوں کے ساتھ آپ کی مجلس بھی ہوتی تھی۔ البتہ دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مصر کے مقابلے میں کنعان کی تمدنی حیثیت کمتر تھی اس لیے اگر کنعان کو بھی بادیہ کہہ دیا گیا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی کہ خاندان یعقوب کو کنعان سے مصر پہنچا دیا۔

شیطان کی مداخلت

فرمایا اللہ نے مجھ پر یہ احسانات فرمائے مِنۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ بعد اس کے شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان جھگڑا کھڑا کر دیا۔ یوسف علیہ السلام نے یہاں پر بھی بھائیوں کو براہ راست الزام نہیں دیا۔ حالانکہ بھائی آپ کو سخت ترین تکلیفیں دینے میں پوری طرح ملوث تھے۔ مگر پھر بھی آپ کو ان کی دل آزاری مطلوب نہ تھی کیونکہ وہ اقرار کر چکے تھے اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ یعنی خطا کار وہی ہیں۔ لہٰذا ان کو ملامت کرنے کی بجائے آپ نے شیطان کو ملعون کیا کہ اسی نے میرے بھائیوں کے اذہان کو خراب کر کے انہیں غلط کاروائی پر آمادہ کیا تھا۔

فرمایا اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ بیشک میرا پروردگار لطافت والا ہے جو چاہے۔ لطافت کے دو معنے آتے ہیں۔ ایک باریک بین جیسے وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ یعنی وہ بہت ہی مخفی طریقے سے تدبیر کو چلانے والا ہے۔ اور لطیف کا دوسرا معنی مہربان ہوتا ہے۔ تاہم اس مقام پر باریک تدبیر کرنے والا مراد ہے۔ وہ ایسے مخفی طریقے سے کوئی تدبیر کرتا ہے کہ کسی کو علم نہیں ہو پاتا۔ یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ آپ کے ساتھ اس قسم کے حالات پیش آئیں گے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی

صفت لطیف کام کر رہی تھی جو اس قسم کے حیران کن واقعات پیش آئے ۔ فرمایا اِنَّہٗ ھُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ وہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے ۔ وہ ہر ایک کی نیت، ارادے اور عزم سے واقف ہے اور وہ حکیم بھی ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں مگر اس کی حکمت کو مخلوق نہیں جان سکتی ۔ یہ اس کی حکمت کام کر رہی تھی کہ یوسف علیہ السلام کو اتنے عروج پر پہنچا دیا وگرنہ حاسدین اور بدخواہوں نے کچھ اور ہی سوچا تھا ۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ
الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِىّٖ فِى
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾
ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ
لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾
وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾
وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا
ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ ع ۵

ترجمہ :- (یوسف نے کہا) اے میرے پروردگار! بیشک
تو نے عطا کی ہے مجھے حکومت، اور سکھلایا ہے تو نے مجھے
باتوں کو ٹھکانے لگانا۔ اے پیدا کرنے والے آسمانوں اور زمین
کے! تو ہی میرا کارساز ہے دنیا اور آخرت میں۔ مجھے وفات
دینا اسلام پر اور مجھے ملا دینا نیک لوگوں کے ساتھ ﴿۱۰۱﴾ یہ
ہیں غیب کی خبریں، ہم وحی کرتے ہیں اس کو آپ کی طرف
اور نہیں تھے آپ ان کے پاس جب انہوں نے ٹھہرایا اپنے معاملے
کو، اور وہ تدبیر کر رہے تھے ﴿۱۰۲﴾ اور نہیں ہیں اکثر لوگ چاہے
آپ حریص ہوں، ایمان لانے والے ﴿۱۰۳﴾ اور آپ نہیں مانگتے
ان سے اس پر کوئی بدلہ۔ نہیں ہے یہ مگر نصیحت

سب جہان والوں کے لیے (۱۰۴)

ربطِ آیات

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اختتام پذیر ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام اور آپ کے بیٹوں کا تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ برادران یوسف نے آپ کو نہایت ظالمانہ طریقے سے وطن سے نکالا۔ وہ آپ کو باپ کی نظروں سے اوجھل کر کے حسد کی آگ کو بجھانا چاہتے تھے، مگر خدا تعالیٰ کی تدبیر اپنا کام کر رہی تھی۔ بھائیوں کا یہ حسد اور بغض ہی یوسف علیہ السلام کے بامِ عروج تک پہنچنے کا سبب بن گیا، آپ نے مصر میں نظامِ حکومت سنبھالا، قحط سالی میں حسنِ تدبیر سے نہ صرف مصر کو اس کے اثرات سے بچا لیا بلکہ دوسرے ملکوں کو بھی غلہ فراہم کیا۔ پھر آپ نے آخر میں اپنے والد گرامی اور پورے خاندان کو مصر میں بلا لیا اور ان کو نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ رکھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے اخلاقِ کریمانہ کا ذکر بھی کیا کہ انہوں نے نہ صرف بھائیوں کو معاف کر دیا بلکہ اُن کے درمیان نزاع کو شیطانی فعل قرار دے کر انہیں الزام سے بری قرار دیدیا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کو یاد کیا کہ اُس نے آپ کو جیل سے رہائی دلائی اور پھر پورے مصر کا کارمختار بنا دیا۔

یعقوب علیہ السلام کی وفات

حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنعان سے آنے کے بعد زندگی کے بیس سال نہایت اچھے طریقے سے مصر میں گزارے۔ یوسف علیہ السلام نے آپ کی خوب خدمت کی۔ پھر جب چوبیس سال کا عرصہ گزرا تو یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آپہنچا وہی وقت جو ہر انسان پر آتا ہے اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" (آل عمران) کہ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ انسان نیک ہو یا بد، نبی ہو یا ولی، موت کا پیالہ پینا ہی پڑے گا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ جب یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت قریب آیا تو آپ نے یوسف علیہ السلام اور دیگر اہلِ خانہ کو وصیت کی کہ انہیں اُن کے والد حضرت اسحاق علیہ السلام کے قریب ہی دفن کیا جائے۔ آپ نے بیٹوں کو دینِ اسلام پر ثابت قدم اور کفر و شرک سے بیزار

ہونے کی وصیت بھی کی جس کا ذکر سورۃ البقرہ میں موجود ہے۔ بہرحال جب آپ کی وفات ہوگئی تو وصیت کے مطابق آپ کا جسم مبارک ایک تابوت میں رکھ کر مصر سے فلسطین اور بیت المقدس لے جایا گیا جہاں حضرات اسحاق اور ابراہیم علیہما السلام کی قبور ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام خود میت کے ساتھ گئے اور اس کو دفن کرنے کے بعد مصر واپس آگئے۔

حضرت سعید بن جبیرؓ کی تاریخی روایت کے مطابق جس دن یعقوب علیہ السلام کی میت کنعان پہنچی تو اسی دن آپ کے بڑے بھائی عیص ابن اسحاق کا بھی انتقال ہوگیا، چنانچہ دونوں بھائیوں کو باپ کی قبر کے قریب ہی دفن کر دیا گیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اور عیص جڑواں بھائی تھے۔ البتہ عیص کی ولادت پہلے ہوئی اور یعقوب علیہ السلام کی بعد میں، اور اسی بناء پر آپ کا نام یعقوب یعنی پیچھے آنے والا مشہور ہوگیا۔ دونوں بھائیوں نے ایک سو سینتالیس ۱۴۷ سال کی عمر پائی۔

یوسف علیہ السلام کا آخری زمانہ

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ باپ کی وفات کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام تیئیس ۲۳ برس مزید مصر کے سیاہ و سفید کے مالک رہے اس دوران آپ نے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی، مخلوقِ خدا کی خدمت کرتے رہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔ آہستہ آہستہ آپ کا دل مادی زندگی سے اچاٹ ہونے لگا اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق بڑھ گیا، چنانچہ زندگی کے آخری حصے میں آپ اللہ تعالیٰ کے حضور اس طرح دست بدعا ہوئے

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ اے پروردگار! بیشک تو نے مجھے ملکِ مصر پر حکومت عطا فرمائی۔ یہاں پر لفظ "مِنْ" بیانیہ بھی ہو سکتا ہے اور تبعیضیہ بھی۔ اگر اس کو بیانیہ تسلیم کیا جائے تو مطلب ہوگا کہ تو نے مجھے مصر کی بادشاہی میں سے حصہ عطا کیا مصر کا

اصل حکمران تو فرعون تھا اور اس نے آپ کو عزیز کے عہدے پر فائز کر رکھا تھا، تاہم آپ کو بہت حد تک مکمل اختیارات دے رکھے تھے اور اس طرح عملی طور پر یوسف علیہ السلام ہی مصر کے کرتا دھرتا تھے۔ اس کی تصدیق بائیبل کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ فرعون نے کہا تھا کہ اے یوسف! اس ملک میں کوئی آدمی تمہارے حکم کے بغیر قدم نہیں اٹھا سکے گا۔ بادشاہ نے آپ کو "جہاں پناہ" کا خطاب بھی دیا تھا اور فرعون محض برائے نام ہی بادشاہ تھا۔

اور اگر اس کو من تبعیضیہ تصور کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے پروردگار! تو نے مجھے حکومتوں میں سے حکومت کا ایک اہم حصہ عطا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ساری دنیا کی حکومت تو آپ کے پاس نہ تھی بلکہ صرف مصر پر آپ کو اقتدار حاصل تھا۔ ساری دنیا کا اقتدار چار آدمیوں کو ملا ہے جن میں سے دو مومن اور دو کافر ہیں۔ مومنین میں سے ذوالقرنین اور سلیمان علیہ السلام ہیں جیسا کہ تفسیری روایات کے مطابق کفار میں سے شداد اور بخت نصر ہیں۔

تاویل حدیث کا علم

یوسف علیہ السلام نے ایک تو اس احسان کا ذکر اپنے رب کے سامنے کیا جس کے ذریعے آپ کو عنان حکومت دی گئی اور دوسرا احسان یہ ذکر کیا وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ مولا کریم! تو نے مجھے باتوں کو ٹھکانے لگانے کا علم بھی عطا فرمایا۔ اس سورۃ کے پہلے رکوع میں یعقوب علیہ السلام نے خواب کے ضمن میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو برگزیدہ بنائے گا۔" وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ" اور باتوں کو ٹھکانے لگانے کا علم سکھائے گا۔ تو یہاں پر یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور اسی احسان کا ذکر کیا ہے تاویل کا لغوی معنی کسی چیز کو لوٹا کر اس کی اصل حقیقت تک پہنچانا

ٹھکانے لگانا ہوتا ہے اور اس میں خواب کی تعبیر بھی شامل ہے جو ایک مشکل کام ہے مگر اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو اس میں کمال عطا فرمایا تھا۔ الجھی ہوئی بات کو سلجھانا، کسی مشکل کا حل پیش کرنا یا کسی معاملے میں صحیح نتیجے پر پہنچنا عام آدمی کا کام نہیں، اس کے لیے خاص صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو بھی عطا فرمائی تھی۔ اس ضمن میں حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے رُبَّ قَضِيَّةٍ وَلَا اَبَا حَسَنٍ لَهَا یعنی کتنے ہی فیصلہ طلب امور ہیں مگر افسوس کہ ابوالحسن یعنی حضرت علیؓ اس وقت موجود نہیں۔ بہرحال یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا بھی ذکر کیا کہ اس نے انہیں تعبیر خواب کا علم عطا فرمایا یا معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت عطا فرمائی۔

اللہ کے سامنے انکساری

اس کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے۔ فاطر اور بدیع خدا تعالیٰ کی صفت ہے اور دونوں کا معنی یکساں ہے۔ فطور ایسی ایجاد کو کہتے ہیں جو بغیر کسی مادے، آلے اور نمونے کے کر لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو محض اپنی صفت اور تجلی سے ایجاد فرمایا جس کی کیفیت کوئی نہیں جانتا البتہ اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ تو آپ نے فرمایا، اے آسمان اور زمین کے ایجاد کرنے والے اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا ولی ہے۔ ولی کا معنی سرپرست، رفیق دوست اور کارساز ہوتا ہے۔ تو فرمایا تو ہی میرا کارساز ہے، میرے کام کو بنانا تیرے ہی اختیار میں ہے اس طرح گویا یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و انکساری کا اظہار فرمایا، اس کی صفت فاطر

حضرت علی الاسلام کی دعا

کا ذکر کیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ دنیا و آخرت میں اس کا وہی کارساز ہے۔ اس کے بعد یوسف بر سر مطلب آئے تو اللہ تعالیٰ کے حضور یہ درخواست پیش کی تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ اے اللہ! مجھے اسلام پر وفات دینا اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دینا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ خود موت کی تمنا کرنا گوارا نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے، خواہ اسے تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ اگر دعا کرنا ہی ہو تو یوں کہے اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیٰوۃُ خَیْرًا لِّیْ خداوند کریم! مجھے زندہ رکھ جب تک زندگی میرے حق میں بہتر ہے وَتَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِّیْ اور مجھے موت دے جب موت میرے حق میں بہتر ہو۔ جب کسی کو تکلیف یا پریشانی ہو تو اس قسم کی دعا کرنی چاہیئے اور براہ راست ہلاکت کی دعا نہیں کرنی چاہیئے۔ البتہ مفسرین فرماتے ہیں کہ دو مواقع ایسے ہیں جب موت کی تمنا کرنا درست ہے۔ ایک موقع وہ ہے جب انسان کو دینی طور پر فتنے میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ زندگی میں ایمان ضائع ہو جانے سے بہتر ہے کہ انسان کو ایمان کی حالت میں موت آ جائے۔ حضرت محمود ابن لبیدؓ کی روایت میں آتا ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ انسان دو چیزوں کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ وہ اس کے لیے بہتر ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ یَکْرَہُ الْمَوْتَ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ وہ اس کے لیے فتنے سے بہتر ہے دوسری چیز فرمایا یَکْرَہُ قِلَّۃَ الْمَالِ وَقِلَّۃُ الْمَالِ اَقَلُّ لِلْحِسَابِ انسان مال کی کمی کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ قلت مال اس کے لیے قلت حساب کا باعث ہوگا۔ جتنا مال کم ہوگا، قیامت کو حساب بھی کم دینا پڑے گا، اور جس کے پاس زیادہ ہوگا۔ اسے حساب بھی زیادہ دینا

پڑے گا اور پھر پریشانی میں مبتلا ہو گا۔

بہرحال انسان کے لیے ایک تو فتنے کے خوف سے موت کی تمنا کرنا جائز ہے اور دوسرے اگر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا ہو تو یہ بھی درست ہے۔ تو یوسف علیہ السلام اشتیاقِ الٰہی میں کہہ رہے تھے کہ مولا کریم! مجھے اسلام پر وفات دینا۔ اس دنیا میں رہ کر بڑے بڑے مصائب و آلام دیکھے، تکالیف پائیں، اور پھر اللہ تعالیٰ نے حکومت اور ہر طرح کی آسائش بھی مہیا فرمائی۔ اب اس فانی دنیا سے دل اچاٹ ہو چکا ہے، لہٰذا اب اپنے پاس بلا لے۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی مرضِ الموت ـــــ میں فرمایا تھا اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی۔ اے اللہ! اب رفیق اعلیٰ میں بلا لے۔ یہ اللہ کی بارگاہ میں حاضری اور اس سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ تو یوسف علیہ السلام نے بھی اشتیاقِ الٰہی میں اسلام پر موت کی تمنا کی تھی۔

تمام انبیاء کی دعا

اسلام پر موت کی تمنا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آخرت کا خوف انبیاء پر بھی طاری ہوتا ہے۔ اللہ کا نبی تو یقیناً ایمان پر ہوتا ہے اور اس کی نجات بھی یقینی ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کے سامنے وہ بھی عجز و انکساری کا اظہار کرتے ہیں کہ پروردگار! ایمان کی حالت میں وفات دینا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی بارگاہِ رب العزت میں یہی دعا کی تھی وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ" اے پروردگار! مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما لے۔ آپ اللہ کے عظیم الشان رسول ہیں جنہیں ساری دنیا پر اقتدار حاصل ہوا، مگر اللہ کی بارگاہ میں عجز و انکساری کا اظہار کر رہے ہیں اور اس سے ڈر رہے ہیں، یہی ان کا کمال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی انبیاء علیہم السلام کی یہ تعریف بیان کی ہے یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَھَبًا (الانبیاء ۹۰)

ہمیں پکارتے ہیں ہماری نعمتوں کی طرف رغبت رکھتے ہوئے اور ہماری کبریائی اور جلال سے ڈرتے ہوئے۔ یہی تعلیم تمام اہل ایمان کو بھی دی گئی ہے کہ انہیں بھی خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی طرف رغبت اور اس کی گرفت کا خوف ہونا چاہیئے۔ اسی لیے امام ابو حنیفہؒ نے اپنی عقیدے کی کتاب میں لکھا ہے اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ یعنی انسان کا ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔ نہ تو وہ کافروں کی طرح بے خوف ہو جائے اور نہ اُمید کا دامن چھوڑے کہ یہ بھی کفر کے مترادف ہے۔

نیک لوگوں کی معیت

یوسف علیہ السلام نے نیک لوگوں میں شامل ہونے کی دعا کی۔ نیک لوگوں کی جماعت کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے بھی کیا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو مخاطب کر کے فرمائیگا فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ پہلے میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا، پھر جنت میں داخل ہو۔ گویا نیک لوگوں کی معیت مقدم ہے معلوم ہوا کہ خود انبیاء علیہم السلام بھی نیک سوسائٹی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی نیک لوگوں میں شامل ہونے کی دعا کی، اسی طرح بعض دوسرے انبیاء کا ذکر بھی ملتا ہے نیک لوگوں کی رفاقت سے ہی انسان کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ الگ تھلگ رہنے سے ہو سکتا ہے کہ انسان برائی سے بچ جائے مگر کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے اَلْمُؤْمِنُ الَّذِیْ یُخَالِطُ النَّاسَ وَیَصْبِرُ عَلٰی اَذَاھُمْ (الحدیث) جو مومن آدمی لوگوں سے مل جل کر رہتا ہے اور اُن کی ایذا رسانی پر صبر کرتا ہے وہ اُس مومن سے بہتر ہے جو نہ کسی سے ملتا ہے نہ اُسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور نہ وہ صبر کرتا ہے۔

بہرحال "صالحین" کا لفظ اچھی سوسائٹی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کہ ایک مطلوب چیز ہے۔ جب تک اچھی سوسائٹی میسر نہ ہو، اخلاق اچھا نہیں ہو سکتا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں اِنَّمَا الْاَخْلَاقُ بِالْاَحْوَالِ وَلَا بِالتَّعَلُّمِ یعنی اخلاق تعلیم سے نہیں حاصل ہوتا، بلکہ ماحول سے ملتا ہے[1]، اس لیے اہل ایمان کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا ماحول ٹھیک ہو۔ اگر ماحول درست نہیں ہو گا تو اخلاق بھی درست نہیں ہو گا۔ بُرے ماحول میں بچے خاص طور پر بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ مگر آج دنیا میں اچھا ماحول ہی نایاب ہو گیا ہے۔ اس چیز کو رومی صاحبؒ نے اپنی مثنوی میں سوز و گداز کے ساتھ بیان کیا ہے اور ڈاکٹر اقبال نے بھی اسی بات کا رونا رویا ہے کہ اچھی سوسائٹی میسر نہیں۔ یہ ایسی چیز ہے کہ جس کی انبیاء بھی دُعا کرتے رہے ہیں کہ اللہ! ہمیں اچھی سوسائٹی کا ممبر بنا دے۔

صالح مرد وہ ہے جو اللہ کا حق بھی ادا کرتا ہے اور مخلوق کا بھی۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے اُحِبُّ الصّٰلِحِیْنَ وَلَسْتُ مِنْھُمْ میں نیک لوگوں سے محبت کرتا ہوں، اگرچہ اُن میں سے نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ایسی صلاحیت عطا فرما دے۔ آج کی دنیا میں اچھی سوسائٹی کا فقدان ہے۔ اس کی بجائے ہر طرف فحاشی، عیاشی، شرک، کفر، بدعت، معاصی، خیانت اور دھوکہ کا دور دورہ ہے تاہم ہر سچے مومن کی خواہش یہی ہے کہ اُسے آخرت میں اچھی سوسائٹی نصیب ہو جائے۔

اختتام واقعہ یوسف

اس دُعا کے ساتھ ہی حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اختتام پر پہنچتا ہے۔ یہ پورا قصہ سورۃ ہذا کے گیارہ رکوعات پر محیط ہے۔ قرآن کریم میں دو انبیاء یعنی حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام

[1] بدور بازغہ ص ۲۱۵

کے واقعات دو مکمل سورتوں میں بیان ہوئے اور ان میں کسی دوسرے نبی کا ذکر نہیں۔ سورۃ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کا مکمل ذکر ہے اور سورۃ یوسف میں یوسف علیہ السلام کا۔ اگرچہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات کے مختلف اجزا، دوسری صورتوں میں بھی بیان ہوئے تاہم یہ سورۃ صرف آپ ہی کے واقعات پر مشتمل ہے اللہ تعالیٰ نے یہ واقعات اس لیے بیان کیے ہیں تاکہ لوگ ان سے عبرت اور نصیحت حاصل کریں۔ قرآن پاک نے ان واقعات کے صرف وہی حصے بیان کیے ہیں جن سے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ قرآن پاک کوئی تاریخ کی کتاب نہیں کہ جس میں واقعہ کی تمام جزئیات بیان ہوں تاہم بعض تاریخی باتیں بھی اس میں آجاتی ہیں۔ بہرحال اس آیت پر یوسف علیہ السلام کا واقعہ ختم ہو گیا ہے۔

رسالت کی صداقت

اب اگلی آیات میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کی صداقت کو بیان کیا گیا ہے اور اسے ایک دلیل کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جو واقعات ہم نے بیان کیے ہیں۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم بذریعہ وحی آپ پر نازل کرتے ہیں۔ وگرنہ آپ نے کسی سکول یا کالج میں تو تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ ہی کوئی تاریخ کی کتاب پڑھی ہے آپ کے ماحول میں تو نناوے فیصدی سے بھی زیادہ لوگ امی یعنی ان پڑھ تھے۔ لہٰذا ان واقعات کو صحیح صحیح بیان کرنا بجز وحی الٰہی کے ممکن نہیں اور یہی چیز آپ کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے۔ تاریخ میں تو سچ اور جھوٹ خلط ملط ہو جاتا ہے۔ اس میں سنی سنائی اور غیر مصدقہ باتیں بھی آجاتی ہیں، اس لیے عربی کا مقولہ ہے اکذب الناس الاخباریین تاریخ میں بہت زیادہ جھوٹ کی ملاوٹ ہوتی ہے

مگر جوبات حضور علیہ السلام وحی کی وساطت سے بیان کرتے ہیں ۔ وہ سو فیصدی حق ہے ۔ اللہ نے انہیں غیب کی خبروں سے تعبیر کیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کی حقانیت پر دلیل بنایا ہے۔

مسئلہ حاضر وناظر

فرمایا یہ غیب کی خبریں ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اور آپ ان کے پاس تو نہیں تھے۔ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ جب انہوں نے اپنے معاملے پر اتفاق کیا وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ اور جس وقت وہ تدبیر کر رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جب برادرانِ یوسف آپ کے خلاف منصوبہ بندی کر رہے تھے اور جب انہوں نے آپ کو کنوئیں میں پھینک دیا تو آپ وہاں موجود تو نہیں تھے جوان واقعات کے چشم دید گواہ ہوں گویا آپ حاضر وناظر نہیں تھے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ نبی نہ تو غیب دان ہوتا ہے اور نہ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے مگر آج اسی مسئلہ کو لوگوں نے متنازعہ بنا دیا ہے۔ حاضر وناظر تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ہر جگہ موجود ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے ، مخلوق میں سے کوئی بھی اس صفت سے متصف نہیں ہے لوگوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاضر وناظر بنانے کی کوشش کی ہے یہ تو ایمان کو ضائع کرنے والی بات ہے ۔ شیطان نے محبت اور عشق کے نام پر ایسے سبق پڑھائے ہیں اور گمراہی کے لیے جال پھیلائے ہیں کہ جن میں پھنس کر لوگ عقیدہ توحید سے محروم ہو جائیں اور پھر جہنم کا ایندھن بن جائیں ۔ شیطان نے ایسی ایسی رسومات بھی ایجاد کی ہیں ۔ جنہیں دین کے نام پر انجام دیا جاتا ہے اور کمزور ایمان والا آدمی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

قرآن پاک میں دوسرے انبیاء کے واقعات میں بھی صاف موجود ہے

کہ آپ ہر جگہ موجود نہیں تھے مثلاً سورۃ القصص میں ہے وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا جب موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہو رہی تھی تو اس وقت آپ طور کے کنارے پر تو نہیں کھڑے تھے۔ اسی طرح مریم علیہا السلام کے واقعہ میں فرمایا وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (آل عمران) جب مریم علیہا السلام کی کفالت کے لیے قرعہ اندازی ہو رہی تھی تو بھی آپ وہاں موجود نہیں تھے کہ آپ نے زکریا علیہ السلام کے نام قرعہ نکلتے ہوئے بچشم خود دیکھا ہو۔ یہ سب باتیں آپ کو وحی کے ذریعے بتلائی جاتی ہیں اور یہی چیز آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔

اکثریت گمراہ ہے

فرمایا حقیقت یہی ہے جو بیان کر دی گئی ہے وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ مگر آپ کتنی بھی حرص اور خواہش کریں، اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ گمراہ ہی رہیں گے۔ لوگوں کی اکثریت ضد، عناد، ہٹ دھرمی اور باطل رسومات کو نہیں چھوڑے گی۔ البتہ کچھ ایسے لوگ بھی ضرور ہوں گے جو حق کے طالب اور منصف مزاج ہوں گے۔ ہر دور میں ایسا ہی رہا ہے کہ دنیا کی غالب آبادی گمراہی میں مبتلا رہی ہے اور ایمان والے ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں۔ آج بھی دنیا کی پانچ ارب کی آبادی میں سے چار ارب افراد ایمان کی دولت سے محروم ہیں اور کفر و شرک میں مبتلا ہیں۔ یہود و نصاریٰ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور اسلام کو مٹانے کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ ہر وقت سازشیں کرتے رہتے ہیں تاکہ اللہ کا دین غالب نہ آسکے۔ سکول اور ہسپتال کھول کر اور پھر مالی امداد دے کر لوگوں کو دین حق سے بدظن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ آپ کی شدید خواہش کے

باوجود اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

اللہ نے فرمایا کہ آپ جو حق تبلیغ ادا کر رہے ہیں، اس کے لیے وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ آپ ان سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے۔ آپ تو ان کی خیر خواہی کے لیے لوگوں کو بے لوث تبلیغ کرتے ہیں۔ ہر نبی نے اپنی اپنی امت کو یہی کہا يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (ھود) میں تم سے کوئی بدلہ تو طلب نہیں کرتا، میری بات تو سن لو۔ اَنْصَحُ لَكُمْ (ھود) میں تو تمہیں نصیحت کرتا ہوں وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ (الاعراف) میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ ایمان قبول کر لو، تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں بلکہ اس میں خود تمہارا ہی فائدہ ہے کہ میری اس بے لوث خدمت سے فائدہ اٹھالو۔ بے لوث خدمت

فرمایا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ یہ تو تمام جہان والوں کے لیے نصیحت کی بات ہے۔ قرآن پاک تمام اہل جہان کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔ اگر کوئی شخص اس نصیحت کو قبول نہیں کرتا اور اس ہدایت سے فیضیاب نہیں ہونا چاہتا تو یہ اس کی اپنی بدبختی ہے، اس سے قرآن کی حقانیت پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اور اللہ کے نبی کا کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ اس نصیحت سے مستفید نہ ہونے والا ہی خسارے میں رہے گا۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ
عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ
أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ أَفَأَمِنُوْٓا
أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ
السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ
سَبِيْلِيْٓ أَدْعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَا وَمَنِ
اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

وقف النبی علیہ السلام

ترجمہ:- اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن پر یہ لوگ گزرتے ہیں مگر اُن سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں ﴿۱۰۵﴾ اور نہیں ایمان لاتے اکثر اُن میں سے اللہ تعالیٰ پر ، مگر وہ شرک کرنے والے ہوتے ہیں ﴿۱۰۶﴾ کیا یہ لوگ بے فکر ہو گئے ہیں اس بات سے کہ آجائے اُن پر ڈھانپ لینے والی اللہ کے عذاب سے ۔ یا آجائے اُن کے پاس قیامت ہی اچانک ، اور اُن کو خبر بھی نہ ہو ﴿۱۰۷﴾ اے پیغمبر ! آپ کہہ دیجئے یہ میرا راستہ ہے ، بلاتا ہوں میں اللہ کی طرف ۔ میں بصیرت پر ہوں اور وہ لوگ بھی جو میری پیروی کرتے ہیں ۔ اور پاک ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ، اور نہیں ہوں میں شرک کرنے والوں میں سے ﴿۱۰۸﴾

یوسف علیہ السلام کی تدفین

یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا کا ذکر کیا کہ انہوں نے نہایت عجز و انکساری کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں درخواست کی کہ اُن کی موت اسلام پر آئے اور وہ نیک لوگوں میں شامل ہو جائیں۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات کے تقریباً ربع صدی بعد یہ دُعا کی تھی جبکہ آپکا دِل اس دنیا سے اچاٹ ہو کر آخرت کی طرف زیادہ راغب ہو چکا تھا۔ پھر جب آپ کی وفات ہوگئی تو تاریخی روایات کے مطابق آپ کو تابوت میں بند کر کے دریائے نیل کے بالائی علاقے میں دفن کر دیا گیا مگر آپ کی وصیت یہ تھی کہ اگر بنی اسرائیل کو کسی وقت مصر سے نکلنا پڑے تو پھر وہ اس تابوت کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں اور انہیں اُن کے آباؤ اجداد کے قریب فلسطین میں دوبارہ دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کے ہمراہ مصر سے نکلے تو وہ یوسف علیہ السلام کا تابوت بھی ہمراہ لے گئے اور پھر اُسے وہیں دفن کر دیا۔ جہاں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی قبور ہیں۔

تصدیقِ رسالت

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے مفصل واقعات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کے ذریعے نازل کرتے ہیں اور آپ کی طرف سے ان واقعات کا بے کم و کاست بیان کر دینا ہی آپ کی رسالت کی دلیل ہے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام پڑھے لکھے تو نہیں تھے اور نہ آپ نے تاریخ کی کتابیں کسی سے پڑھی سنی تھیں، اس کے

باوجود اِن واقعات کو ٹھیک ٹھیک بیان کر دینا وحی الٰہی کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ اور یہی بات ثابت کرتی ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روشن مستقبل

یوسف علیہ السلام کے ان واقعات سے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ دونوں انبیاء کے بعض واقعات میں مماثلت پائی جاتی ہے مثلاً یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی طرح طرح کی تکالیف پہنچائیں مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو عروج نصیب کیا۔ بالکل اسی طرح حضور علیہ السلام کے بھائی بندوں نے بھی آپ کے ساتھ سخت بدسلوکی کی، آپ کو تکلیفیں پہنچائیں۔ آپ کے مشن کو ناکام کرنے کی کوشش کی مگر اس تمام تر مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کو بام عروج تک پہنچایا جس طرح یوسف علیہ السلام کے بھائی آخر میں نادم ہوئے تھے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کے عزیز و اقارب کو بھی آپ کے سامنے نادم ہو کر پیش ہونا پڑا۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بات سمجھا دی کہ آپ کفار و مشرکین کی ایذا رسانیوں سے بددل نہ ہوں بلکہ آپ کا مستقبل حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح روشن ہے اور آخر میں آپ ہی کامیاب و کامران ہوں گے۔ اللہ نے آپ کو اس بات پر بھی تسلی دی کہ دنیا کی اکثر آبادی ہمیشہ گمراہی میں مبتلا رہی ہے۔ لہٰذا اگر یہ لوگ آپ کے کہنے پر ایمان نہیں لاتے تو آپ بددل نہ ہوں بلکہ اپنا کام جاری رکھیں، جن کی قسمت میں اللہ نے ہدایت مقدر رکھی ہے۔ وہ ضرور ایمان لائیں گے اور باقی اہل ایمان کی تقویت کا باعث بنیں گے۔

نشانات قدرت سے اعراض

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اُن کفار و مشرکین پر افسوس کا اظہار کیا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر بھی اُن سے سبق حاصل

نہیں کرتے بلکہ ان نشانات سے اعراض کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور آسمانوں اور زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا لوگ ان پر سے گزر جاتے ہیں۔ وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ مگر وہ ان سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں۔ آیت کا لفظ عام ہے اور یہ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً آیت کا اطلاق حکم پر بھی ہوتا ہے جیسے "تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ" (البقرۃ) یہ اللہ کی آیتیں جنہیں ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں اور آیت کا معنیٰ دلیل بھی ہوتا ہے "اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ" (العنکبوت) اس میں مومنوں کے لیے دلائل ہیں۔ پھر آیت کا معنیٰ واضح نشانی بھی ہوتا ہے، جسے دیکھ کر انسان کوئی چیز اچھی طرح سمجھ جاتا ہے۔ جیسے فرمایا کہ زمین و آسمان کی پیدائش اور دن اور رات کے اختلاف میں "لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ" (آل عمران) اہل عقل و خرد کے لیے نشانیاں ہیں۔ آیت کا معنیٰ معجزہ بھی ہے اور اکثر منکرین انبیاء علیہم السلام سے معجزے طلب کرتے رہے۔ کہتے تھے "لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ" (یونس) اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا۔ بہرحال یہاں پر آیت کا معنیٰ واضح نشانی ہے۔ اللہ نے فرمایا۔ کہ ہم نے کائنات میں بے شمار نشانیاں پھیلا رکھی ہیں، لوگ ان کو دیکھتے ہیں مگر ان سے عبرت حاصل کیے بغیر گزر جاتے ہیں، گویا ان نشاناتِ قدرت سے اعراض کرتے ہیں جس طرح لوگ احکامِ الٰہی کو سن کر ان پر عمل نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ اللہ کی نشانیاں دیکھ کر بھی ان سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے اور ان نشانات سے ایسے گزر جاتے ہیں جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ راستے میں میل کا نشان لگا ہوتا ہے، جسے دیکھ کر مسافر سمجھ جاتے

ہیں کہ وہ اپنی منزل کے کس حصے میں ہیں۔ وہ اس چھوٹی سی نشانی سے تو فائدہ اٹھا لیتے ہیں مگر اتنے بڑے بڑے نشانات قدرت کو دیکھ کر بھی انہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا یقین نہیں آتا۔ زمین، چاند، سورج، کرات، پہاڑ، جنگل، دریا۔ اتنے بڑے بڑے نشانات ہیں کہ معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی انہیں دیکھ کر اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے مگر مشرکین پر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ ان نشانات سے لاپرواہی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ غرضیکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی تنزیلی اور تکوینی دونوں قسم کی نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ان کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے ان پر غور و فکر ہی نہیں کرتے۔

مشرکین کی کثرت

آگے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ان کے اعراض کی وجہ سے دل برداشتہ نہ ہوں کیونکہ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ مگر وہ شرک کرنے والے ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے کے باوجود لوگوں کی اکثریت مشرک ہی رہتی ہے۔ زبان سے ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ شرک کا ارتکاب بھی کرتے جاتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود اور خالق ہونے کو تو مشرک بھی مانتے ہیں۔ سوائے دہریوں کی قلیل تعداد کے تمام یہود و نصاریٰ ہنود اور قدیم و جدید مشرک اللہ کی ان دو صفات کو تو تسلیم کرتے ہیں مگر اللہ کی تدبیر اور عبادت میں شرک کرنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا دوسرے بھی تدبیر کرتے ہیں۔ وہ بھی مدبر ہیں اور لوگوں کی حاجتیں پوری کرتے ہیں اور بگڑی بناتے ہیں۔ اسی طرح قولی، فعلی اور عملی عبادت میں بھی دوسروں کو شریک کر لیتے ہیں، ان کی نذر و نیاز دیتے ہیں، ان کی دہائی دیتے ہیں یا ان کی ایسی تعظیم

کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام میں ابنیت یا تین خداؤں کا عقیدہ مان کر مشرک بنے۔ مجوسی، یزدان اور اہرمن دو خداؤں کو مان کر شرک میں مبتلا ہوئے۔ بعض مشرک جنات اور ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر مشرک ہو گئے اور اکثر لوگ غیر اللہ کی انتہائی تعظیم کر کے، غیروں کی نذر و نیاز دے کر، قبروں پر تعظیماً چڑھاوے پڑھا کر شرک کے مرتکب ہوئے۔ قبروں کو پختہ بنانا، ان پر چادریں اور پھول چڑھانا، ان پر گنبد بنانا اور ان پر روشنی کرنا بدعت اور ناجائز ہی تو ہے اور یہ بیماری برصغیر میں عام ہے۔ قبروں پہ جاؤ تو فاتحہ پڑھو۔ استغفار کرو، مرنے والوں کے لیے بخشش کی دعا کرو۔ جو سنت طریقہ ہے۔ مگر یہاں تو مسئلہ ہی دوسرا بن گیا ہے۔ یہاں لوگ قبروں پر جاتے ہیں کہ صاحبانِ قبر کو راضی کر سکیں اور پھر وہ خوش ہو کر ہماری مرادیں پوری کر دیں۔ قبروں کا عرق گلاب سے غسل۔ رنگ برنگی روشنیاں اگر بتیوں کی خوشبوں اور پھولوں کی مہک آخر کس لیے کی جاتی ہے۔ ان پر سجدہ کیوں کیا جاتا ہے؟ ان کو بوسہ کیوں دیا جاتا ہے؟ اور ان پر ہاتھ لگا کر منہ پر کیوں پھیرا جاتا ہے؟ یہ سب کچھ قبر والے کو راضی کر کے اپنی مطلب براری کے دھندے ہیں اور یہی شرک ہے اسی لیے فرمایا کہ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے باوجود، اس کی وحدانیت کو زبان سے تسلیم کرنے کے باوجود مشرک ہی رہتے ہیں۔

پیر پرست لوگ بزرگوں میں کرشمہ مان کر شرک کا ارتکاب کرتے ہیں کسی پیر اور مولوی نے اگر کسی چیز کو حلال کہہ دیا تو اسے حلال تسلیم کر لیا اور حرام کہہ دیا تو اسے ترک کر دیا۔ یہ تو وہی نصاریٰ والا عقیدہ ہے جس کے متعلق سورۃ توبہ میں آتا ہے "اِتَّخَذُوٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کہ انہوں نے اپنے پیروں اور علماء

کہ اللہ کے سوا رب بنا رکھا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اس کی تشریح میں یہی فرمایا کہ غیر اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حلال اور حرام کردہ چیزوں کو حرام تسلیم کر لینے کا نام اللہ کے سوا دوسروں کو رب بنانا ہے۔ بعض لوگ تعویذ، گنڈے کے ذریعے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے تعویز جن میں غیر اللہ سے مدد طلب کی گئی ہو۔ یا جبرائیل اور میکائیل وغیرہ کے الفاظ ہوں یا جنات سے مدد طلب کی گئی ہو قطعی حرام اور شرک ہے۔ بعض عورتیں خاوندوں کو رام کرنے کے لیے شرکیہ جتن کرتی ہیں۔ بعض لوگ نجومیوں کو مؤثر مان کر نجومیوں سے قسمت کا حال معلوم کرتے ہیں۔ کاہنوں سے غیب کی خبریں پوچھتے ہیں۔ بعض چیزوں سے اچھا یا بُرا شگون لیتے ہیں شرک کی تمام شکلیں انسانی سوسائٹی میں رائج ہیں اور ان کو کارِ ثواب سمجھ کر ادا کیا جاتا ہے۔ ہاں! اگر تعویز میں اللہ کا کلام ہو اور مشرکانہ بات نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر اکثر لوگ شرک میں ملوث پائے جاتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ظلمِ عظیم سے تعبیر فرمایا ہے اور جس کی معافی نہیں ہے۔

حضرت امام حسن بصریؒ اس آیت میں مذکورہ شرک کو شرکِ خفی پر محمول کرتے ہیں۔ اپنے عمل میں ریاکاری یا دکھلاوا شرکِ خفی ہے۔ اس کی وجہ سے انسان کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ مگر آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ بڑے بڑے عابد، زاہد اور عامل اس قبیح بیماری میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اب نیکی کا کون سا عمل ہے جو بے ریا ہو۔ کسی کی ذاتی عبادت ہو تو لاؤڈ سپیکر پر نشر کی جاتی ہے۔ کسی غریب کی امداد کا مسئلہ ہو تو اخباروں میں تصویریں چھپتی ہیں اور اللہ تعالیٰ حج کی توفیق دے دے تو اس کی وسیع تشہیر کی جاتی ہے۔ یہی تو شرکِ خفی ہے جس میں لوگوں کی اکثریت مبتلا ہے۔

عذابِ الٰہی سے بے فکری

کفار و مشرکین کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا اَفَاَمِنُوْٓا کیا یہ

سب لوگ بے فکر اور نڈر ہو گئے ہیں اس بات سے اَنْ تَاْتِیَهُمْ غَاشِیَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ کہ آجائے اُن پر ڈھانپ لینے والی اللہ کے عذاب سے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دن کے وقت یا رات کو کوئی افتاد آپڑتی ہے۔ اچانک رات کے وقت زلزلہ آیا اور تباہ کر دیا۔ بدرتہ کا زلزلہ رات تین بجے آیا تھا۔ کوئٹہ کا زلزلہ بھی رات کے وقت آیا تھا جس میں ہزاروں انسان موت کی نیند سو گئے۔ تو فرمایا۔ کیا یہ لوگ کسی آفت کا انتظار کر رہے ہیں اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ یا ان پر اچانک قیامت ہی آجائے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ قیامت کا آنا دو صورتوں میں ہے پہلی شکل تو یہ ہے[1] مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُهٗ جو مر گیا اس کی تو قیامت برپا ہو گئی اور عقبیٰ کی منزل یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ جونہی انسان موت کی آغوش میں گیا، اس مادی دنیا کا خاتمہ ہوا تو عقبیٰ کی پہلی منزل شروع ہو گئی۔ پھر آگے برزخ کی منزل ہے۔ پھر حشر کی منزل آئے گی اور پھر حساب کتاب کی منزل سے ہوتا ہوا، انسان یا تو ابدی راحت میں پہنچ جاتا ہے یا پھر جہنم کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور پھر قیامت کی دوسری شکل اجتماعی قیامت ہے جب ہر چیز فنا ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو گا اور پھر آگے تمام منزلوں سے گزرنا پڑے گا۔ تو فرمایا کیا یہ لوگ اللہ کے عذاب کے منتظر ہیں کہ اسی دنیا میں اُن پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں یا قیامت کے انتظار میں ہیں کہ وہ برپا ہو کر اس دنیا کا سلسلہ مکمل طور پر ختم کر دے۔ اب جبکہ تمام تنزیلی اور تکوینی دلائل آچکے ہیں تو اب ایمان لانے میں کون سی چیز مانع ہے۔ کیا کسی عذاب یا قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ آئے تو پھر ایمان لائیں۔ یاد رکھو! جب وہ وقت آگیا تو پھر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ اس وقت تک انسان مکمل طور پر ناکام

ـــــــــــــــــــ

[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ صفحہ ۲۴۳ / ۱۰۶

ہوچکا ہوگا۔

صراطِ مستقیم

فرمایا، اے پیغمبر! قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ آپ کہہ دیں یہ ہے میرا راستہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ میں تو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ ایمان اور توحید خالص کی طرف بلاتا ہوں کہ اس کو صحیح شکل وصورت میں تسلیم کرو کیونکہ فلاح اسی میں ہے۔ اگر کفر وشرک میں ملوث ہے تو فلاح حاصل نہیں ہوگی۔ فرمایا عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ میں بھی بصیرت پر ہوں اور میرے پیروکار بھی۔ ان کو اس معاملہ میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا۔ فرمایا، میں اور میرے متبعین اسی بصیرت کی طرف دعوت دیتے ہیں جو خالص ایمان پر مبنی ہے اور اس میں کفر وشرک کی کوئی آمیزش نہیں ہے۔

بصارت آنکھ سے دیکھنے کو کہتے ہیں اور بصیرت سے مراد دل کی روشنی ہے۔ جب دل میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا پختہ یقین ہو جائے تو یہی بصیرت ہے۔ سورۃ الانعام میں موجود ہے "قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ" تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بصیرت آچکی ہے۔ جو کوئی اسے اختیار کرے گا۔ اس میں اسی کا فائدہ ہے اور جو اس سے اعراض کرے گا۔ اس کا وبال بھی اسی پر پڑے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے اسی بصیرت کا اعلان کروایا مگر آج شیطانی پراپیگنڈے نے اس بصیرت کو خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلام کے مخالفین قرآن وسنت کے متعلق ایسا پراپیگنڈا کرتے ہیں کہ اہلِ ایمان دین سے متعلق تردد کا شکار ہو کر اپنی بصیرت کھو بیٹھیں۔ کبھی جدید تمدن کے نام پر اور کبھی مادی ترقی کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کو دین سے بدظن کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اکثر مسلمان قرآن پاک کے قانون سے متزلزل ہو گئے ہیں۔ اگر انہیں وحی

الٰہی کے قوانین پر یقین ہوتا تو دنیا میں اس طرح ذلیل نہ ہوتے۔ اللہ نے اپنی کتاب میں تجارت کا مکمل ضابطہ بیان فرمایا ہے اور مکمل حقائق کو واضح کیا ہے مگر ہمیں یہ ضوابط پسند نہیں۔ ہم تجارتی قوانین کے لیے امریکہ، روس اور چین کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک خدا کے بتلائے ہوئے صنعت و حرفت کے قانون بہتر نہیں، بلکہ ہم اغیار کی طرف دیکھتے ہیں۔ اسلام کے تعلیمی نظریات بھی ہماری ضروریات پوری نہیں کر سکے، ہمارے سیاسی مسائل اور ہمارے معاشی مسائل بھی حل طلب ہیں مگر قرآن پاک سے راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے باہر سے مشیر منگواتے ہیں۔ جب اپنے نظریات ہم پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے اندر قرآنی بصیرت کیسے آسکتی ہے ہم تو ہمیشہ دوسروں کے دست نگر رہیں گے۔ یہ تو خود ہمارا فرض تھا کہ ہم قرآن پاک سے بصیرت حاصل کرنے کے لیے وقت دیتے، محنت کرتے اور مال صرف کرتے۔ ہمارے اکابرین دین نے قرآن کو سینے سے لگایا تو ان کے دل روشن ہوگئے۔ آج کوئی جمہوریت کے گیت گا رہا ہے تو کوئی اشتراکیت کی طرف دیکھتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہم نے اپنے پاس موجود حقیقی نظام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ دین میں اجتہاد علمائے حق کا کام ہے مگر آج ایسے ایسے مجتہد سامنے آرہے ہیں، جو غلط نظریات کو قرآن پر چسپاں کر کے اپنی مطلب براری کرنا چاہتے ہیں ابھی پچھلے دنوں علامہ اقبال کے فرزند اور پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے کہا تھا کہ موجودہ دور کے علما، اجتہاد کے اہل نہیں ہیں اور یہ کام وکلاء کے سپرد ہونا چاہیئے۔ سبحان اللہ! اجتہاد کے اہل وہ لوگ ہیں۔ جو نماز اور روزہ سے عاری ہیں، جنکی شکل و صورت صحیح نہیں اور جو پاکی پلیدی کے احکام سے واقف نہیں، وہ دین میں اجتہاد

کے اہل ہیں۔ اگر چہ اس زمانہ میں روایتی علماء بیشک انحطاط میں ہیں مگر وکلاء کو اہل اور علماء کو نااہل کہنا کتنی غلط بات ہے۔ وکلاء کی اکثریت تو جان بوجھ کر ظالم کی حمایت کرتی ہے۔ انہیں سچ اور جھوٹ کا علم ہوتا ہے مگر ان کے پیشے کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر صورت میں اپنے مؤکل کو صحیح ثابت کریں۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے اور ایسے وکلاء سے کون سا اجتہاد درست ہوگا؟ آپ اندازہ لگائیں کہ ہماری بصیرت کس قدر خراب ہو چکی ہے۔ تمام ادیان اور اقوام کے برخلاف حقیقت تو صرف اہل ایمان کے پاس تھی مگر انہوں نے خود دوسروں کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے تمام قوانین کو فرسودہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے اور جدید نظام کو اپنایا جا رہا ہے۔ جو دنیا کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔

فرمایا، آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں تمہیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ میں اور میرے پیروکار بصیرت پر ہیں۔ اور یاد رکھو! وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں اور میرے پیروکار ہر قسم کے شرک سے بیزار ہیں اور اللہ کی ذات تمام شرکیہ باتوں سے منزہ ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ
اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ
خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا
اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ
نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ
الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١١٠﴾ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي
الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى
وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١١١﴾ ع

ترجمہ:- اور نہیں بھیجے ہم نے آپ سے پہلے رسول
مگر مرد ، ہم وحی کرتے ہیں اُن کی طرف اور وہ بستیوں کے
بسنے والوں میں سے تھے ۔ کیا یہ لوگ نہیں چلے زمین میں ،
پس دیکھتے کیسا ہوا انجام اُن لوگوں کا جو اِن سے پہلے گزرے
ہیں ، اور البتہ آخرت کا گھر بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو
بچتے ہے ۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے (۱۰۹) یہاں تک کہ جب
ناامید ہو گئے اللہ کے رسول اور گمان کیا اُن لوگوں نے کہ

تحقیق وہ جھٹلائے گئے ہیں، تو آگئی اُن کے پاس ہماری مدد، پس
ہم نے بچایا اُن کو جن کو ہم چاہتے ہیں۔ اور نہیں لوٹایا جاتا ہمارا
عذاب اُن لوگوں سے جو مجرم ہیں (۱۱۰) البتہ تحقیق اُن کے
واقعات میں عبرت ہے اُن لوگوں کے لیے جو عقل والے ہیں۔
نہیں ہے یہ قرآن ایسی بات جو گھڑی گئی ہو، لیکن یہ تصدیق
ہے اُس کی جو اِس کے سامنے ہے۔ اور یہ تفصیل ہے ہر چیز
کی۔ اور ہدایت اور رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے
ہیں (۱۱۱)

ربطِ آیات

حضرت یُوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق فرمائی کہ یہ واقعہ آپ نے نہ تو کسی سے سُنا ہے اور نہ کسی کتاب میں پڑھا ہے بلکہ ہم نے وحی کے ذریعے آپ کو بتلایا ہے اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ آپ اپنی دعوت الی اللہ کے لیے کسی سے کوئی معاوضہ تو طلب نہیں کرتے بلکہ آپ یہ خدمت بے لوث انجام دے رہے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی تنزیلی اور تکوینی دونوں قسم کی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں مگر یہ لوگ انہیں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے بلکہ کفر و شرک میں مبتلا رہتے ہیں۔ بھلا ان کے ایمان لانے میں کون سی چیز مانع ہے کیا یہ عذاب کا انتظار کر رہے ہیں یا قیامت کے برپا ہو جانے کے منتظر ہیں۔ پھر نبی علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمایا کہ آپ کہہ دیں کہ میرا راستہ تو ایمان اور توحید کا راستہ ہے۔ میں اور میرے پیروکار بصیرت پر ہیں اور میں اسی راستے کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اس دعوت کو قبول کر لو گے تو بچ جاؤ گے، ورنہ خدا تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤ گے۔

پھر اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم کے لیے تسلی کا مضمون بیان

فرمایا کہ تمام دلائل کے واضح ہو جانے کے بعد بھی اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو قبول نہیں کرتے اور آپ کو نبی برحق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں۔ یہ معاملہ صرف آپ ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا بلکہ پہلے لوگ بھی اپنے انبیاء کی دعوت کا اس طرح انکار کرتے رہے ہیں۔

انبیاء از نوعِ انسانی

اب آج کی آیات میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیثیت کو مزید واضح کیا گیا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا اور نہیں بھیجے ہم نے اس سے پہلے رسول مگر مرد۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ بنی نوعِ انسان کیطرف ہمیشہ انسانوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کسی جن یا فرشتے کو لوگوں کیطرف مبعوث نہیں کیا گیا کیونکہ بحیثیت انسان انکا اسوہ بھی انسان ہی بن سکتے ہیں کوئی جنس غیر جنس کے فائدہ نہیں اٹھا سکتی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسانوں کیطرف انسانوں کو رسول بنا کر بھیجا تاکہ وہ ان کی تعلیمات سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں اور ان کے اعمال کو بطور نمونہ اختیار کر کے خود بھی احکام الٰہی پر کاربند ہو سکیں۔ مگر یہ لوگ پھر بھی انکار ہی کیے جا رہے ہیں۔ نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ ہم پہلے انبیاء کی طرف بھی اسی طرح وحی کرتے رہے ہیں جس طرح آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ ہمارا پیغام رسانی کا طریقہ بھی ہمیشہ یکساں رہا ہے اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام انبیاء مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى بستیوں کے رہنے والوں میں سے مبعوث ہوتے رہے ہیں تو اللہ نے یہاں پر تین باتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ پہلی بات یہ کہ نبی ہمیشہ مرد ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے اور تیسری بات یہ کہ انبیاء ہمیشہ بڑی بستیوں یعنی شہری علاقوں سے ہوتے رہے ہیں۔

مرد و زن میں تفریق

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اللہ نے مرد کو ہی نبی بنایا ہے اور آج تک کسی عورت کو نبوت عطا نہیں کی کیونکہ عورت اپنے مخصوص

فطری تقاضوں کی بنا پر منصب نبوت کے مناسب حال نہیں ہے
عورتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو تمام جہان کی عورتوں
پر فضیلت بخشی ہے مگر نبوت کا منصب انہیں بھی عطا نہیں کیا۔ بلکہ
آپ کو صدیقیت کے مرتبے تک رکھا گیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں موجود
ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول تھے وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ اور آپکی
والدہ حضرت مریمؑ صدیقہ تھیں۔ چنانچہ دورِ جدید میں عورت اور مرد کے
مساوی حقوق کا مطالبہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ نے مرد و زن میں
فطرتاً امتیاز رکھا ہے، لہٰذا نہ تو ان کے فرائض برابر ہیں اور نہ ہی حقوق
مساوی ہیں۔ البتہ نوع انسانی میں عورت اور مرد دونوں صنفیں شامل ہیں اور دونوں ہی اپنے اپنے
دائرہ کار میں احکام الٰہی کے پابند ہیں اللہ تعالیٰ نے بعض کام مردوں کیساتھ خاص کیے ہیں جنکی ذمہ داری
عورتوں پر نہیں ڈالی گئی کیونکہ عورتیں ایسے امور کی اہل ہی نہیں ہیں۔

علم کلام والے نبی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں هُوَ اِنْسَانٌ
بَعَثَهُ اللّٰهُ لِتَبْلِيْغِ مَا اَوْحَاهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ یعنی نبی ایک انسان
ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اُس چیز کی تبلیغ کے لیے مبعوث فرماتا ہے
جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تبلیغ وارشاد
کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر مردوں کے سپرد کیا ہے۔ اور
عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اجتماعی نوعیت کے تمام امور مثلاً جہاد،
تجارت اور تبلیغ وغیرہ مردوں کی ذمہ داری میں ہیں۔ عورتوں کے
لیے حکم یہ ہے "وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ" کہ وہ اپنے گھروں میں
رہیں۔ زمانہ جاہلیت کی طرح بے پردہ نہ گھومتی پھریں۔ البتہ "وَاذْكُرْنَ
مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ" (الاحزاب) گھروں میں بیٹھ کر
اللہ کی نازل کردہ حکمت کا تذکرہ کریں۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت
عورتیں کر سکتی ہیں مگر محدود پیمانے پر۔ باہر جا کر کام کرنا مردوں کی ذمہ داری

ہے اگر عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ نکلیں گی تو معاشرے میں خرابیاں پیدا ہوں گی۔ بہت سے امور کے لیے اندرون و بیرون ملک سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اکیلے رہنا پڑتا ہے، اس لیے ایسے کام اللہ نے مردوں پہ ڈالے ہیں۔ باہر جا کر کام کرنا تو دور کی بات ہے، عورت تو خاوند یا محرم کے بغیر سفر بھی نہیں کر سکتی۔ چونکہ منصب نبوت ایک اہم اور مشکل کام ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ منصب عورتوں کو عطا نہیں فرمایا۔ اور دوسری بات اللہ نے یہ فرمائی کہ ہم انبیاء کی طرف وحی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وحی غیر نبی پر تو نہیں آتی بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کے پاس ہی جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر وحی نازل کرتا ہے۔ چونکہ انبیاء صرف مرد ہوتے ہیں، اس لیے وحی بھی انہی پر نازل ہوتی ہے۔

دیہاتی اور شہری تمدن

تیسری چیز اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ نبی اور رسول بستیوں میں رہنے والے تھے۔ قریہ کا اطلاق اگرچہ چھوٹی اور بڑی سب بستیوں پر ہوتا ہے۔ تاہم اس مقام پر قریٰ سے مراد بڑی بستیاں یعنی شہر ہیں۔ دیہات وغیرہ کے لیے بادیہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے مگر اللہ نے بادیہ سے کوئی نبی نہیں اٹھایا کیونکہ بادیہ کے لوگ تہذیب سے قدرے دور ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف شہر کے لوگوں کی تہذیب و تمدن بہتر ہوتی ہے کیونکہ انہیں تعلیم و تربیت کے بہتر مواقع اور اچھی مجالس حاصل ہوتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے مَنْ سَكَنَ الْبَادِيَةَ جَفَا جس نے بادیہ میں سکونت اختیار کی، اس نے زیادتی کی کیونکہ وہ بہتر تمدن سے محروم رہا۔ منافقوں کی مذمت کے بیان میں بھی اللہ نے فرمایا ہے اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا (التوبۃ) دیہاتی لوگ کفر اور نفاق میں بڑے سخت ہوتے ہیں۔

غرضیکہ شہری ماحول کو پسند کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں مکے اور طائف کے لیے قریتین کا لفظ آیا ہے کہ یہ دونوں بڑی بستیاں یعنی شہر شمار ہوتے ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ نبی اکثر شہروں سے ہوتے ہیں مگر لوگ ہمیشہ انکار کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔

نیک و بد کا انجام

آگے فرمایا اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے۔ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وہ چل پھر کر دیکھ لیتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا۔ پرانی تہذیبوں کے کھنڈرات ملاحظہ کریں گے تو انہیں پتہ چلے گا کہ نافرمان قوموں کا کیا حال ہوا۔ جب گزشتہ اقوام نافرمانی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں تو اس دور کے نافرمان لوگ کیسے بچ سکتے ہیں۔ یہ تو اس دنیا کا حال ہے۔ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَۃِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو بچتے رہے۔ جنہوں نے کفر و شرک سے اعراض کیا، معاصی سے بچتے رہے اور دنیا میں نہایت محتاط طریقے سے زندگی بسر کی، آخرت کی بھلائی انہی کے لیے ہے اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے کہ اگر آج اس دنیا میں نافرمان لوگ کامیاب نہیں تو کل آخرت میں کیسے کامیاب ہوں گے؟ قیامت کو بھی ان کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

انبیاء کی مایوسی

اگلی آیت بھی تسلی ہی کے باب میں آرہی ہے۔ اللہ کے نبی طویل عرصہ تک تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے، اس کام میں بڑی بڑی تکالیف برداشت کیں مگر قوم کی طرف سے مسلسل نافرمانی ہوتی رہی۔ حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ حتیٰ کہ جب رسول ناامید ہو گئے۔ وَظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا اور انہوں نے گمان کیا کہ تحقیق وہ جھٹلائے

گئے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول اس بات سے مایوس ہوگئے کہ اب نافرمانوں کو اس دُنیا میں سزا نہیں ملے گی مگر بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ نبیوں کی طرف مایوسی کی نسبت کرنا درست نہیں ہے کیونکہ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ اگر اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے مایوس ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے جو نافرمانوں کے لیے سزا کا وعدہ فرمایا تھا یا اہل ایمان کی نصرت کا وعدہ کیا تھا، وہ غلط ثابت ہؤا اور انبیاء کی بات کی تکذیب ہوگئی فرماتے ہیں کہ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے کُذِبُوْا کا معنیٰ خطا کیا ہے یعنی نبیوں نے از خود سمجھ لیا تھا کہ شاید اُن کی زندگی میں ہی فلاں لوگوں کو سزا مل جائیگی ایسا سمجھنے میں انہوں نے خطا کی کیونکہ عذاب کا آنا مصلحتِ الٰہی کے تابع ہے۔

امام ابوبکر حصاصؒ، امام ابن کثیرؒ اور بعض دوسرے مفسرین لکھتے ہیں کہ ابوحمزہ جذریؒ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے احباب کی دعوت کی جس میں حضرت سعید ابن جبیرؒ کو بھی مدعو کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ باقی سب احباب دعوت میں شریک ہوگئے مگر حضرت سعیدؒ نہ آئے تو میں خود اُن کو جا کر لایا۔ دورانِ مجلس ایک نوجوان نے سعید ابن جبیرؒ سے کہا کہ جب میں آیت "اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ" پہ پہنچا ہوں تو مجھے یہ بات بڑی سخت معلوم ہوتی ہے کہ بھلا اللہ کے نبی کیسے مایوس ہو سکتے ہیں اور پھر ساتھ یہ بھی "وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا" انہوں نے گمان کیا کہ اللہ کی طرف سے نافرمانوں کو سزا نہ دے کر یا انبیاء کی مدد نہ کر کے اُن کی تکذیب کی گئی ہے۔ تو اس نوجوان نے کہا کہ مجھے تو یہ الفاظ پڑھنے سے سخت ڈر لگتا ہے اور صدمہ ہوتا ہے۔ بھلا آپ اس کو کس طرح پڑھتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں تابعین کے زمانے

کے مفسّرِ قرآن حضرت سعید ابن جبیرؒ نے فرمایا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہاں تک کہ اللہ کے رسول مایوس ہو گئے لوگوں کے ایمان سے نہ کہ خدا کی نصرت سے" اللہ کے نبیوں نے بڑی محنت کی، بڑا لمبا عرصہ ان پر گزرا۔ حتیٰ کہ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک حق تبلیغ ادا کیا مگر قوم کے ایمان لانے کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ اللہ نے بڑی مہلت دی مگر وہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لائے۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں وَظَنُّوا سے مراد انبیاء کا گمان نہیں بلکہ "گمان کردن قوم ایشاں" یعنی انبیاء علیہ السلام کی قوم نے یہ گمان کیا۔ کہ ان کی تکذیب کی گئی ہے کیونکہ عذاب آنے کا جو وعدہ ان سے کیا گیا تھا، وہ پورا نہیں ہوا۔ مرسل الیہم میں دونوں قسم کے لوگ آسکتے ہیں۔ یعنی کافر بھی ایمان دار بھی۔ اگر اس سے کافر مراد لیے جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ تو کہیں گے کہ کوئی عذاب نہیں آیا اور ان کے ساتھ جھوٹ بولا گیا کہ کوئی ایسا ویسا عذاب آنے والا ہے۔ اور اگر تکذیب کی نسبت ایمانداروں کی طرف کی جائے تو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس طرح جھٹلائے گئے۔ تو ظاہری طور پر جب اللہ کی طرف سے لمبی مہلت دی گئی، اور نافرمانوں پر عذاب نہ آیا تو مومنوں نے گمان کیا کہ شاید وہ جھٹلائے گئے ہیں۔ بہرحال تکذیب کی نسبت کافروں یا مومنوں کی طرف تو ہو سکتی ہے مگر اللہ کے نبیوں کی طرف نہیں ہو سکتی کہ وہ جھٹلائے گئے ہیں۔ البتہ مایوسی کا مرجع نبیوں کی طرف ہو سکتا ہے کہ ان کی قوم کے لوگ ایمان نہیں لاتے مگر پھر بھی اللہ کی رحمت اور اس کی مدد سے مایوسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

نصرتِ الٰہی

بہرحال جب اس قسم کے حالات پیدا ہو گئے کہ طویل مہلت کی وجہ سے مایوسی کے آثار پیدا ہونے لگے اور تکذیب کا خطرہ پیدا ہو

گیا تو اللہ نے فرمایا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ان کے پاس ہماری مدد آن پہنچی فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ پھر ہم نے نجات دی جس کو چاہا۔ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ اور مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب لوٹایا نہیں جاتا۔ اگرچہ منکرین کو مہلت دی گئی۔ مگر بالآخر اُن کو عذاب نے آپکڑا اور وہ ہلاک کر دیے گئے۔

یہ حضور علیہ السلام کے لیے تسلی کا مضمون بیان ہو رہا ہے کہ پہلے رسولوں پر بھی بڑی آزمائش آئی تھی کہ نبی اور اہل ایمان پکار اٹھے "مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ" اللہ کی مدد کب آئے گی، ہم تو بہت انتظار کر چکے اور بڑی تکالیف برداشت کر چکے۔ تو ادھر سے آواز آئی اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ "فکر نہ کرو، اللہ کی نصرت قریب ہی ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہوتی ہے وہ نافرمانوں کو مہلت دیتا رہتا ہے بعض باتوں کو ان نہیں جانتے مگر اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ پھر جب اس کی مصلحت کے مطابق وقت پورا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچ جاتی ہے اور منکرین و مکذبین کو پکڑ لیا جاتا ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ان واقعات کو بیان کرنے کا دوسرا بڑا مقصد یہ ہے کہ لوگ اِن واقعات کو جان کر عبرت حاصل کریں۔ اگلی آیت کریمہ میں یہی بات بیان کی گئی ہے لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ بیشک اِن کے واقعات میں عبرت ہے عقل رکھنے والوں کے لیے۔ یوسف علیہ السلام کے ساتھ بھائیوں نے حسد کیا۔ آپ کے خلاف بغض و عناد رکھا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے برخلاف یوسف علیہ السلام نے صبر و استقامت کا ثبوت دیا۔ تمام مصائب سامانِ عبرت

کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیاب کیا اور ان کے حاسد بھائی ان کے پاس ذلیل ہوکر آئے بمعلوم ہوا کہ ایمان اور توحید والے ہی آخر کار کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر ان واقعات سے پاکیزگی اور طہارت کی نشاندہی ہوتی ہے عفت و عصمت کا نمونہ پیش ہوتا ہے صبر و ثبات کا سبق ملتاہے اور تبلیغ دین کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ غرضیکہ یوسف علیہ السلام کا پورا واقعہ عقلمند لوگوں کے لیے باعثِ عبرت اور نصیحت ہے۔

قَصَصِهِمْ جمع کا صیغہ ہے اور اس کا مرجع باقی سابقہ انبیاء بھی ہو سکتے ہیں۔ گزشتہ سورتوں میں تاریخ انبیاء کے سلسلے میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام حضرت لوط علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بیان ہو چکے ہیں۔ ان تمام واقعات میں اہلِ خرد کے لیے عبرت کا مکمل سامان موجود ہے۔

قرآن پاک کی حیثیت

اب آخر میں قرآن پاک کی صداقت و حقانیت کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ یہ قرآن کریم کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں ہے وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ بلکہ یہ تو تصدیق کرنے والی ہے اُس کی جو اس کے سامنے ہے۔ قرآن سے پہلے تورات، انجیل، زبور اور صحائف نازل ہو چکے ہیں۔ ان تمام کتب سماویہ کی قرآن پاک تصدیق کرتا ہے کہ اللہ نے ان کو لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا۔ اور پھر قرآن یہ بھی بتلاتا ہے کہ ان کتب کے حاملین نے ان میں کیا کیا خرابیاں پیدا کیں اور ان میں کس کس طرح لفظی اور معنوی تحریف کی۔ تصدیق میں یہ دونوں باتیں آجاتی ہیں۔

اس قرآن کریم کی دوسری صفت یہ ہے وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ

اس میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے۔ ہر چیز سے وہ چیزیں مراد ہیں کہ جو انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے ضروری ہیں۔ سورۃ النحل میں ہے وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کو واضح طور پر بیان کرتی ہے اور کسی چیز میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ یہاں پر بھی ہر چیز سے وہ چیز مراد ہے جو بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ مِّنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ یعنی حلال حرام، جائز ناجائز یا صحیح اور غلط کے متعلق یہ کتاب الٰہی ہر چیز کو واضح کرتی ہے اور اس میں کوئی اشتباہ نہیں رہنے دیتی اور اگر کوئی شخص ہر چیز سے دنیا کی ہر چیز مراد لیتا ہے تو وہ درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ قرآن پاک صابن بنانے، مشینری جوڑنے یا پرزے بنانے کی تفصیلات تو نہیں بتائے گا، بلکہ وہ تو ایسے اصول بتائے گا جن کے ذریعے عقیدے، عمل اور اخلاق کی اصلاح ہو۔ قرآن بتائے گا کہ کون سے کام کرنے چاہئیں اور کن کاموں سے بچنا چاہیئے کون سے کام کامیابی کی طرف لے جاتے ہیں اور کون سے ناکامی کا باعث بنیں گے۔

ہدایت اور رحمت

فرمایا اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے وَهُدًى اور اس میں ہدایت بھی ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی راہنمائی کرتی ہے مگر اس کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سورۃ بقرہ میں دو چیزوں کا ذکر آتا ہے مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى ایک بینات ہے اور دوسری ہدایت۔ بینہ واضح چیز کو کہا جاتا ہے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے جیسے صبر، شکر وغیرہ مگر ہدایت کے لیے اُستاد کے پاس جانا پڑتا ہے۔ ہدایت میں شریعت کی باریک باتیں ہوتی ہیں اور اِنَّمَا الْعِلْمُ[1]

[1] بخاری ص۱۷

بالتَّعَلُّمِ یعنی علم سیکھنے سے آتا ہے۔ ایسی چیزوں کے لیے زانوئے ادب طے کرنا پڑتا ہے۔ تو فرمایا کہ قرآنِ حکیم میں ہدایت کا سامان بھی موجود ہے۔

اور تیسری چیز فرمایا وَرَحْمَةٌ اس میں رحمت بھی ہے ظاہر ہے کہ رحمت کا نزول اس وقت ہوتا ہے جب کوئی انسان ہدایت کا صحیح طریقہ اختیار کر کے اُس پر عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ کی رحمت بندے کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ قرآن پاک ہدایت اور رحمت ہے لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ اُن لوگوں کیلئے جو ایمان لاتے ہیں۔ ہدایت کو اختیار کرتے ہیں۔ صحیح راستے پر چلتے ہیں۔ اللہ کی رحمت ایسے ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

معالم العرفان فی دروس القرآن مکمل ۲۰ جلدوں میں

افادات

مفسر قرآن مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

لعل دین ایم۔اے علوم اسلامیہ لاہور

زیر انتظام انجمن محبان اشاعت القرآن

صدر انجمن شیخ محمد یعقوب عاجز صاحب

جنرل سیکرٹری بابو غلام حیدر صاحب

خازن محمود انور بٹ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ خزانچی مکتبہ دروس القرآن

ناظم مکتبہ دروس القرآن محمد منیر صاحب فون:4221943